

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اکتوبر 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

انوار صدیقی کی نئی سلسلے دار اور دلچسپ کہانی

"کشکول"

اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

تم کمالاں نہیر ہو!

انشائیہ

جون ایلیا

کائنات اپنی قہاری کے ساتھ زندہ اور انسان جو وجود کا سرمایہ اور کائنات کا شرف ہے، زخم کاری کی اذیت سے سبک رہا ہے۔ فنا، پھول جیسے بچوں سے لے کر کھکشاؤں تک سب کا مقصوم ہے۔ وہ ماں جس نے بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ اپنی گود میں اپنی بچی کی آخری بچگی سنی۔ اس بچی کی آخری بچگی سنی، جس کے لب اپنی اذیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اسے ابھی بولنا نہیں آتا تھا۔ بس اس کی اذیت زدہ اور اذیت ناک آنکھیں یہ بتاتی تھیں کہ میں اذیت کی حدوں سے گزر رہی ہوں۔ کوئی ڈراؤنی چیز ہے جو مجھے ننگے کے لیے میری طرف بڑھ رہی ہے۔

آہ! وہ باپ جس نے بے بسی کے ساتھ اپنی لخت جگر، اپنی مہکتی ہوئی بچی کو اپنے ہاتھوں سے خاک سلا یا، جسے وہ اپنے سینے پر لٹاتا تھا تو اس کی روح معطر ہو جاتی تھی۔

وائے قسمت، وائے نصیب کہ جن ماں باپ کے دل اپنی بچی، اپنی معصوم خوب صورتی کو دیکھ کر گنگنا اٹھتے تھے، وہی اب اس کے لیے نوحہ کنائیں ہیں، ان کی سوگوار آنکھیں کہتی ہیں۔

ہائے مرا پھول لے گیا کون

ہائے مجھے داغ دے گیا کون

وہ جن کی آنکھوں میں اس سے روشنی تھی، جن کے ہونٹوں پر اس کے معصوم اشاروں سے مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی، انہوں نے، ماں ان ماں باپ نے اپنی، رنگ و بھت، بچی کا پر سالا، موت سے کس کو رستگاری ہے۔ رستگاری، کیسی رستگاری! زمین سے لے کر آسمانوں تک کہاں ہے رستگاری؟ کائنات کے ہر گوشے میں مرگ، ہلاکت اور فنا کا تقارہ بچتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان، زندگی، الامان، الامان، پکارتی ہے مگر کہیں بھی امان نہیں ہے۔ یہاں تو عالم بنا ہوں کو بھی پناہ نہیں ملتی۔

تو کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے، زندگی اور زندگی کا معنی؟ زندگی اور زندگی کی اذیتیں؟ وہ سارے دکھ جو زندگی کی خاطر جھیلے جاتے ہیں۔ وہ ساری شان و شوکت جس کو حاصل کرنے کے لیے آدمی ہر داؤ چلتا ہے۔ جب ہر چیز بے معنی تو پھر زندگی کے آخر کیا معنی ہیں؟ ہزاروں سال کی تاریخ، ہزاروں سال کی تہذیب اور ہزاروں سال کا تمدن، کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے؟

ہاں، یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ اس قدر بے معنی کہ اگر انسان حقیقت پر غور کرے، چیزوں کی اصلیت اور مابیت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ ہر شے میں گھانا ہی گھانا پائے گا اور صرف پشیمانی نکمائے گا۔

”اگر یہ سب کچھ بے معنی ہے تو آخر معنی کے کیا معنی ہیں؟“

”بے معنی ہونا، بکسر بے معنی ہونا؟“

”ہاں، بکسر بے معنی ہونا۔ مگر ایک حقیقت ایسی ہے جو اس ساری گفتگو کے برعکس ہے اور بس وہی سب کچھ ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہی ساری باتوں کی ایک بات ہے اور وہی رمز حیات ہے۔ اور وہ ہے چیزوں کو بامعنی بنانا۔ ورنہ زندگی اور وہ سب جو زندگی کا حاصل ہے، وہ از خود بے معنی ہے۔ انسان اسے بامعنی بناتا ہے۔“

یہ سب کچھ تو درست ہے مگر کیا وہ کھلونے بھی بے معنی ہیں جن سے کھیلتے کھیلتے ہماری ننھی مٹی گڑیا شادیم کے اندھیرے میں جا چھپی ہے؟

نہیں، وہ کھلونے بے معنی نہیں ہیں۔ وہ کھلونے بے معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ وہ کھلونے ہیں اور انہیں ان سے کھیلتے والی ایک مصومیت نے بامعنی بنایا تھا۔ ان کھلونوں کو پیار کرو اور انہیں اپنے سینے سے لگا لو۔

ہم ان کھلونوں کو پیار کرتے ہیں اور انہیں، اپنی شاکہ کھلونوں کو اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اس شاکہ کھلونوں کو جو مرجھا

مٹی ہے۔

ٹٹا! ہم تمہیں آواز دیتے ہیں۔ تم ہماری آواز کا جواب دو۔ تم مرجھائی نہیں ہو۔ ٹٹا، تم ہماری یادوں کے گلدستے میں، ہمارے دل میں کھلی ہوئی ہو۔ تم بھلا کیسے مرجھا سکتی ہو، دل میں۔ ہمارے دل میں!

مقبول عام ٹی وی سیریلز اور شاہکار ناولوں کی تخلیق کار

عمیرہ احمد



جنہوں نے میدان

میں آتے ہی قارئین

ناظرین سے اپنے

فن تحریر کا لوہا منوالیا



..... جو ہر نئی تحریر میں

اپنے ہی نئے ہوئے

سنگ میل عبور کرتی

جاری ہیں



ایک نئی اور تازہ،
سلیس و اراکھانی

عمیرہ احمد کے قلم سے نئی ہوئی ہدایوں
کی گہرائیوں کو چھو لینے والی

ماہنامہ پاکیزہ میں ملاحظہ فرمائیں



عزیز قارئین
السلام علیکم!

اکتوبر 2011ء۔ آپ کا سن پندرہ سو سو تمام تر اوقات سے آراستہ آپ کے پیش نظر ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے سربراہ مہکت نے عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کیا۔ اس دورے سے واپسی کے بعد وفاقی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ چند برس میں پاکستان میں پرائمری کلاسز میں چینی زبان کی تعلیم دی جائے گی۔ خبر تو خوش آئند ہے مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہمارے قائدین بجائے زبان کے، ان اصولوں کو بھی اپناتے جن کے تحت چین نے ترقی کی دوڑ میں دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، چین میں ایک کھاوت بہت مقبول ہے کہ کسی بھوکے کو پھنسی دے دو تو وہ خود بخود کھانسی پھینک دے اور چین ہم سے بھی نیکی چاہتا ہے لیکن ہم ہیں کس سے کس سے صرف پھنسی پر ہی اکتفا کرتے آ رہے ہیں۔

تا کہ وہ خود بخود کھانسی پھینک دے اور چین ہم سے بھی نیکی چاہتا ہے لیکن ہم ہیں کس سے کس سے صرف پھنسی پر ہی اکتفا کرتے آ رہے ہیں۔

پچھلے دنوں ہذا صیام کے دوران اور عید الفطر کے بعد ہمارے یہاں بااختیار طبقے نے جس طرح اپنی طاقت کا بے دریغ استعمال کیا ہے شاید ہی بربریت کی ایسی مثال پچھلے پچیس سالوں میں قائم ہوئی ہو۔ جوان نسل کو پھیلے روزگاری اور ناداری کی اذیتوں میں مبتلا رکھا اور پھر شاید توجہ دینے کے لیے پوری بندھنوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کراچی پچھلے دنوں بدلتی ہوئی عکاسی کر رہا تھا۔ اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔ کراچی رفتہ رفتہ مذبح خانوں اور عقیقت خانوں میں تبدیل ہو جا رہا ہے۔ یہ کچھ فکر ہے کہ جو ریز سیاست کا یہ سلسلہ آ خر تک جاری رہے گا۔ ایسے میں سلاب، ڈسٹریکٹ کاغذ اور دیگر آفتوں کا عتاب نازل نہ ہو گیا ہو۔ لگتا ہے خدا کی رحمت نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے نہ شہر میں رونق نظر آئی ہے اور نہ ہی ملکوں میں خوشی کی رقص ہی محسوس ہوتی ہے۔ عذاب کی ایک صورت مسلسل برسنے والی بارشیں بھی ہیں مگر انہوں کو ذخیرہ گاؤں نہ ہونے کے باعث وہ پانی جسے ہم کئی برسوں تک کے لیے محفوظ کر سکتے تھے، ہمارے لیے زحمت بنا ہوا ہے بقول شاعر۔

وہاں بہار کی مائی تو اتنے پھول کھلے
تمہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

اس شعر کے ساتھ چلتے ہیں اب اپنی گفتگائی مغل کی جانب۔

✽ اور میں احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے مغل میں شریک ہوئے ہیں۔ ”سب کا سہنس جھکتے دیکتے رنگوں کی بہار لیے ہا کر سے موصول ہوا تو انہو جیسے دل کی کل مل گئی۔ ناٹل بھی مٹنے کی مناسبت سے بہت خوب ہے۔ مہ جیس گمن کی جوت آنکھوں میں لیے جو انتظار و بے قرار ہے۔ ہمیشہ کی طرح انتظار بھی حکمت و دانائی کی باتوں سے مہک رہا ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو انجمن کھکشاں میں جاو اور وہ جہاں خوبصورت گل بوٹوں کی فصل میں نامہ دل موجود ہیں، انہی کی قطار میں اپنا بھی نامہ دل حال دل سنا رہا تھا مگر شاید کمری کی تمنا سے نہ کچھ متحضر کر دیا یہ اپنے شعر کو تلاش کیا مگر وہ اپنے نامہ دل کا امید ہی سب کچھ ہے۔ اس کے بعد انڈی کے در پر جا پہنچے جہاں اور خوشیاں، بے باکیاں، جلالیاں اور نئی جینتیں بے باکیاں جاری ہیں۔ انڈی کی کہانی جاری ہے، رانا قسم تو انڈی کی کہانی ختم۔ اس کے بعد انوار صدیقی کی مشکوٰۃ شروع کی، پہلی قسط کی طرح اس دوسری قسط میں بھی یہ حال رہا کہ پہلی سطر سے قسط کی آخری سطر تک ڈائجسٹ سے نظریں نہ ہٹ سکیں باوجود بخار کی حرارت ہونے کے، جس کی وجہ سے حرارت زیادہ ہو گئی۔ عشق چچاں بھی کہہ نہیں سکتے مصنف و محقق کا رڈ آکٹر ساجد امجد صاحب کی محبت کی منہ بولی تصویر ہے۔ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ہم مغلیہ دور میں ہوں اور ہر واقعہ چشم کشا ہو۔ اکبر اعظم کے حالات و واقعات، سلیم جہانگیر کی سلطنت آرا کی دور جہاں کی دانائی اور محبت کے گدگداتے کلمات سے لطف اندوز ہوتے جہاں مملاتی ریشہ و انیاں بھی ہیں۔ بازگشت بھی ایک چمچنی ہوئی تحریر بھی کہ ہمارا معاشرہ بھی مغرب کی اندھی تقلید میں آنکھیں بند کر دے گا تو ہمارے جس سے ظاہر ہے ٹھوکر تو لگے گی ہی مگر بچوں کو اپنی ڈگر پر چلانے کے لیے ماں باپ خصوصاً ماں کا کردار زیادہ اہم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہر گھرانے کا کہنا ہے کہ تم تاثیر صحت کا اثر یہی نسل یہی اثر لیے ہوئے۔ مغرب کی کہانی بھی۔ پھر جس کے بازار میں جہاں جنگاری ہوگی وہاں آگ تو لگے گی ہی۔ شناسا چہرہ بھی خشک بھی جو کہ واقعات کے گھاؤ پھراؤ کے ساتھ بھی۔ منظر امام کی بیوی کی زانو سالانہ چٹائی کراچی کا تاثیر لیے ہوئے تھی۔ آج کل کے پر مساند حالات کے لیے اس جیسی کہانیاں ضرور ہونی چاہئیں جو اس صحن زدہ ماحول میں راحت کا احساس دلا سکیں۔ مغل شعرو سخن میں اچھے اور با معنی اشعار تھے۔ مختار آزاد کی انتظار بھی اچھی تھی۔ انتظار کی سلیب پر لکھے متعدد افراد اور حدوں کے دونوں طرف پڑے ہوئے ہیں اور ہائی کی امید کی خواہش شدید رکھتے ہیں۔ جو رہا ہوتے ہیں ان کی رہائی زندگی کی نوید بن جاتی ہے۔ ایم اے راحت صاحب کی تحریر خیر خواہ بہت اچھی لگی کہ ہمارے کو حرام کا مال مال مفت دل بے رحم کے مصداق وہ اپنے باپ کی جاگیر بچھا۔ اتنا بڑا جرم کر کے وہ اگر دولت کو غریبوں میں بانٹ دیتا تو شاید اس کو بھی کچھ سکون کے لمحے مل جاتے۔ حضرت پر سیاہ علیہ السلام کا قصہ اختتام کو پہنچ جو ایمان کو تازہ کرنے کا سبب بنا۔ درمیان میں لطائف سے بہت محفوظ ہوئے اور انہوں نے اس سے بھی رہنمائی کا سبق ما۔ پرنیک سیٹ اپ بھی۔ اچھی کہانی تھی کہ بہترین حکمت عملی سے سمیت نے مظہر جرن گردہ کو پکڑ لیا۔ آخری صفحات کی بہترین کہانی نارت کلنگ آج کی کہانی ہے۔ آج میں سب کچھ کراچی کی سڑکوں پر ہو رہا ہے اور تو اتر سے یہ سلسلہ جاری

ہے جو ملک کے لیے ناسور اور لوگوں کی نیندیں مرام کیے ہوئے ہے۔ اب موت کا خوف کہ آج ہر انسان گھر سے نکلے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ گھر بھی واپس آئے گا یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو، پورے پاکستان کو اپنی حفظ امان میں رکھے۔ سب ہی شرکت کرنے والے دوستوں کو عید کی پر خلوص مبارکباد۔

✽ حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ میانوالی سے تشریف لائے ہیں ”آپ کا ماہنامہ۔ سنس ڈائجسٹ ماہ جنبر لا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اس سے قبل سرگزشت کے لیے چار پنج خط لکھے مگر مغل میں شامل نہیں ہوئے۔ میرے خیال میں آپ مستقل خطوط لکھنے والوں کو شامل مغل کرتے ہیں۔ (ہمیں افسوس ہے کہ اگر آپ کے خط شامل نہ ہو سکے، وقت پر خط لکھنے کی صورت میں ضرور شائع کیے جاتے ہیں یا کم از کم نام شائع کر دیا جاتا ہے) بہر حال ہمارے رمضان اچھا گزر گیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی عشق چچاں پڑھی۔ نور الدین محمد جہانگیر اور نور جہاں ملک کے واقعات پڑھے۔ یہ کہانی پہلے بھی سنس کے صفحات کی زینت بن چکی ہے۔ ویسے تو مغل بادشاہوں کے درحالی کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں مگر جہانگیر بادشاہ کا شیرازہ اور کاتب اور نور علی کے کاسلوک پڑھ کر شدید ہندامت ہوئی۔ بازگشت ایک سبق آموز کہانی ہے۔ نئی الدین نواب کی کہانی واپسی ختم ہوئی۔ کہانی.... متوسط تھی۔ اس میں دیوتا کا عکس تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مشکوٰۃ (انوار صدیقی) ایک اچھا سلسلہ ثابت ہوگا۔ دونوں سطیں بہت اچھی تھیں۔ مرزا امجد بیگ کی شناسا چہرہ پڑھی۔ مکافات عمل کا بہترین نمونہ ہے۔ انتظار اچھی کاوش ہے۔ انڈی کو خواہ خواہ دھیل دی جاتی ہے اور نواب رفیق احمد آف ست بدھائی کے اور دشمن پیدا کیے جا رہے ہیں۔ بہر حال ایک بہتر سلسلہ ہے۔ خیر خواہ اور پرنیک سیٹ اپ عمدہ کہانیاں ہیں۔ جیسے کو تیسرا کی بہترین مثال ہیں۔ احمد اقبال صاحب کی نارت کلنگ پڑھی۔ کراچی درویشوں کا شہر کے بارے میں بہترین تصویر کشی ہے۔ خدا اس شہر کو نظر بند سے بنائے۔ اس شہر کو اس کا گہوارہ بنائے۔ پتا نہیں اس شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔“

✽ خواجہ مدنی، چوک ظاہر پیر سے مغل میں شریک ہوئے ہیں ”خط لکھنے کی پہلی مرتبہ جسارت کر رہا ہوں۔ 20 اگست کو رسالہ ملا۔ سب سے پہلے احمد اقبال کی کہانی ”نارت کلنگ“ پڑھی۔ بہت اچھی لگی۔ وقار اور زبیا کی لازوال محبت اور کہتے ہیں نا کہ زخم اپنے ہی دیتے ہیں۔ وقار کو زبیا کے بھائی نے جرائم کی دلدل میں پھنسا کر اس کا گھر برباد کر دیا۔ رضوانہ ساجد کی اسلامی معلومات پر مبنی تحریر حضرت یرمیاہ نے بہت سی معلومات فراہم کیں۔ ایم اے راحت کی ”خیر خواہ“ اچھی کہانی تھی۔ اس میں جمالاتو حد سے زیادہ جھجھکا۔ بہر حال دولت اس کے ہمدرد کو بھی سلسلہ وار کہانی ”انڈی“ بھی پہلے کی طرح بڑھیا تھی۔ نواب صاحب پہلے کی طرح مشکلات میں پائے گئے۔ میرے خیال میں رفیق احمد شیرازی اور نور کی گرفتاری میں شاکر کا ہاتھ ہے۔ ”انتظار“ مختار آزاد کی اچھی کاوش تھی، یہ ہوتی ہے چچی محبت، مسز احمد نے اپنی ساری زندگی فراز صاحب کے انتظار میں گزار دی۔ اس دفعہ منظر امام کی کہانی بس گزرا رہی۔ مرزا امجد بیگ نے ”شناسا چہرہ“ کی مٹی کو کینگر کردار تک پہنچایا۔ اچھا لگا۔ غیر ملکی کہانیوں میں ”نئی نسل“ اچھی لگی۔ کاشف زبیر و بلال ان جنس نے بغیر دیکھے بھالے ایک سنگدل بڑھے سے دوستی کر لی جو اس کی زندگی برباد کرنے کا سبب بنا۔ انوار صدیقی صاحب کی ”مشکول“ کی دوسری قسط پڑھی۔ لیاقت اور فرحان کی محبت، فیض حامد، افضل خان کے جرائم اور سراج اسپنسر کے کردار نے بے حد متاثر کیا۔ تار بچی کہانی ”عشق چچاں“ میں ڈاکٹر ساجد امجد نے مغلیہ دور میں رونما ہونے والے واقعات پر مشتمل معلومات فراہم کیں۔ جلال الدین محمد اکبر اور اس کا بیٹا شہزادہ سلیم جو جہانگیر کے لقب سے اور مہر النساء جو ملکہ نور جہاں کے بارے میں تھی۔ اب پتہ چلتے ہیں انشا اللہ کی طرف جس میں جون ایلیا نے ارتقا کو مدعا بنا کر بیان کیا۔ جو اپنے اندر بہت سی عجیب سی باتیں چھپے ہوئے تھے مغل خطوط میں پہنچے تو اس مرتبہ شارقہ بلوچی کو کرسی صدارت پر پایا۔ واقعی ان کا تبصرہ قابل تحسین تھا اور وہ اس کرسی کی مستحق تھیں۔ جناب ایک ماہ کے لیے بادشاہت مبارک ہو۔ اس کے علاوہ محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ اچھا لگا۔ اس دفعہ ڈائجسٹ میں پھر غائب، وہابی واہ۔ طاہرہ یاسمین جی میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ”انسان بمقابلہ شیطان“ دوبارہ چھپنی چاہیے۔ ماہ ایمان آپ کو سیر و تفریح میں مزہ آیا کہ نہیں؟ سعید عباسی، سیدہ نسreen، رضادی گریٹ کو بلیک لسٹ میں پاکر انہوں کو جگہ جگہ تعان پیار سے، روشنی رشید اور حمیرا رضا کو مغل یاداں میں نہ پا کر بھی انہوں ہوا۔ مغل شعرو سخن میں ماہ ایمان اور ناصر اقبال جہاں کے شعرا اچھے لگے۔ تغیر عباس ہار کے لطائف پڑھ کر مٹی آئی۔“ (تبصرے کا شکریہ)

✽ دانیال کا کٹر، بہاولپور سے چلے آ رہے ہیں ”سنس ڈائجسٹ تین ماہ پہلے پڑھنا شروع کیا، میرا بھائی سنس ڈائجسٹ پڑھتا ہے۔ ایک دن میں نے بھی پڑھا تو بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے میں انڈی کے بارے میں بات کروں گا۔ یہ آخر نواب صاحب ہر بار انہو ہوتا ہے پھر واپس خود ہی اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ یہ بات مجھے یقین نہیں ہوتی میرا اندازہ ہے کہ جولوگ نواب صاحب کو اغوا کرتے ہیں وہ لوگ ہی نالائق ہیں اور نارت کلنگ میرے سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا آج کل اسی طرح کراچی میں نارت کلنگ ہوتا ہے تو پھر ہر روز اتنے لوگ کیوں مرتے ہیں۔ اس طرح واقعات تو کبھی بکھار دیتا ہے۔ مشکوٰۃ بھی اچھی کہانی ہے اس دفعہ جب لیاقت حسین کو گولی لگی یہ بات مجھے یقین نہیں ہوتی اگر لیاقت کے جسم پر گولی کے نشانات رہ گئے تھے تو پھر نشان کس طرح ختم ہو گئے۔“

✽ حیدر خان، روکھڑی ڈسٹرکٹ میانوالی سے تشریف لائے ہیں ”ڈاکٹر انکل اگر سرورق کی حین کے چھچھو میں آپ نے اس سبب کے رنگ کا تجزیہ کر دیا یا تو بہت سوٹ کرتا۔ بہر حال جموں تار اچھا رہا۔ اشتہارات بھلا جتنے جون ایلیا صاحب کی خدمت

صوبہ دار (ر) حاجی عبدالکظیم، خانیوال سے ملے آ رہے ہیں "مورخہ 23 اگست کو میرا پیار اسٹیشن آج میرے سینے سے آگیا ہے۔" صوفیہ نمبر 17 پر اپنا خط دیکھ کر انھوں میں خوشی کے آسوا گئے۔ ذرا صاحب نے جو وردق بنایا ہے وہ ہماری شہرٹی روایت کی پوری پوری عکاسی کر رہا ہے، ہماری بچیاں آج بھی مید کے موئے قنبر پر تھوں میں مہندی لگا کر اور چوڑیاں پہن کر عید کی خوشیوں کو آپس میں مل کر عید کے تہوار کو چار چاند لگاتی ہیں۔ اب آتے ہیں جون ایلیا صاحب کی محفل میں۔ جون ایلیا صاحب نے اس واقعہ ایک نئے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ جون ایلیا صاحب نے اس واقعہ ہمیں دین کی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے اور ہم سب کو کچھ مکمل امن و امان کے ارشادات پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی چاہیے۔ اب چلتے ہیں اپنی خطوط کی محفل میں، شاعر نے جو قسطی صاحبہ کی عمارت پر اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ ان کو واپسی کی آخری قسط دیکھ کر چھٹکا لگا جا تا کہ اسٹیشن کے زیادہ قارئین نے واپسی کی آخری قسط دیکھ کر آپ کا شکریہ ادا کیا۔ اب کچھ اناڑی کے بارے میں اپنی رائے پیش کر رہا ہوں۔ شکر ہے آپ نے اس قسط میں نواب صاحب کو انور نہیں کروایا اور کہانی کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ مشکوٰۃ نے ہمیں اپنی دوسری ہی قسط میں اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے، لگتا ہے انور صدیقی بھی ہمیں اب سب سے پہلے مشکوٰۃ کی قسط پر ہنسنے پر مجبور کر دیں گے۔ میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی توجہ ان تصنیف عشق چچاں کی آخری جبرگراف کی طرف دلانا چاہتا ہوں، انہوں نے لکھا ہے جہانگیر کے انتقال کے بعد نور جہاں کو جہانگیر کے پہلو میں دفن کر دیا گیا حالانکہ نور جہاں کو جہانگیر کے مقبرے سے دو فرلانگ دور اس کی پہلے جہانگیر خانقاہ کی مٹی لاڈلی بیگم کے ساتھ شہادہ میں مقبرہ نور جہاں میں دفن کیا گیا ہے۔ اسٹیشن کی دیر سے معمول ہونے کی محذرت میں نے قبول کر لی ہے کیونکہ چند دن پہلے مجھے خانیوال اسٹیشن پر جانے کا اتفاق ہوا تھا کہ راجی سے آنے والی خیر بیگل اور انور سے آنے والی خیر بیگل دونوں انھارہ انھارہ گھنٹے

سپیس ڈائجسٹ 15 اکتوبر 2011ء



اور بے لگام محبت اور ملکہ ہندوستان کی شاطرا اند سازشیں دلچسپ شاہکار ثابت ہوئیں۔ تاہم سلطانہ اختر کی تحریر بارگشت نے بہت متاثر کیا۔ معاشرے اور ماحول کے بگڑے ہوئے چال چلن سے انکار کہاں ممکن ہے موبائل فون، انٹرنیٹ کمپیوٹر سائنس کی ترقی نے اخلاقی اقدار کا جنازہ نکال دیا ہے۔ یہی کچھ کاشف زیر کی عبرت اثر تحریر بنی نسل میں ہوا۔ مورخ جیسے تنگ انسانیت یقیناً معاشرے کا دیو بھی ہیں۔ مرزا احمد بیگ کا شناسا چہرہ بھی خوب رہا۔ منظر امام کی دلچسپ کوشش بھولی زاد اسلاہی اچھی رہی۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک نم نم تاک پہلو ہے۔ مختار آزاد کی دلگداز تحریر انتظار، نے دل کے تاروں کو چھو لیا تو ایک قسمت پر زنبیل چاہی بھی کہ وصال یار ہوتا۔ ایم اے راحت کا دلچسپ واقعہ، خیر خواہ جمال شاہ نے جو بویا وہ کاٹ بھی لایا یہی قانون ہے، کاف کاٹا ٹھل کا۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی ایمان افروز تحریر ماہ مبارک کی خصوصی سوغات اور تسلیم انور کا سیت اپ واقعی پر فیکٹ رہا۔ آخر میں ایک اچھی خبر یہ ہے کہ 18 اگست 19 رمضان جمعۃ المبارک رب عظیم نے ہمیں ہمارے بیٹے عون عباس بابر کی پیدائش کے دو سال بعد ایک اور بیٹا عطا کیا ہے ہم نے اس کا نام قتی عباس بابر رکھا ہے۔“ (بیٹے کی پیدائش پر بے حد مبارک)

✽ محمد جاوید بلوچ کی تجلیل علی پور سے چلے آ رہے ہیں "خواہیدہ رنگوں سے آراستہ ویراستہ سرورق نہایت خوبصورت لگا، آنکھوں میں سندر سے سجائے حنا کے کاہیزہ رنگ میں رنگے ہاتھوں میں دلکش پڑیاں چاند جیسے چہرے پر ستاروں کی چادر اوڑھے حسینہ یقیناً اب باہل کے آئین سے... دواغ چاہتی ہے۔ انٹائیڈ کے مطالعہ کے بعد سو چاہید ہمارے ملک میں بے لوث جید عالم ختم میل ابن داؤد جیسے استاد ہزار ہا بہترین جہند جیسے جنگی علم رکھنے والے شاگرد پیدا ہونا ختم ہو گئے ہیں۔ بے شک علم غیر فانی اور مال و زر فانی ہیں۔ انٹائیڈ اس بار بہتر رہی۔ فیفا پتھر بڑی مشکل میں چپس گیا ہے، مسکین شاہ جیسے سفید پوش درندے ہمارے ملک میں بکھر پائے جاتے ہیں۔ فنی پتھر کا جذبہ انسانیت لائق تحسین اور آج کے اہل ارباب اختیار کی شہرگ پر انگوٹھا ہے کہانی میں تبدیلی اور تیزی لائی جانی چاہیے۔ سستی خیر کنگول میں انوار صدیقی کی بہترین منظر نگاری کی بدولت سارے مناظر دماغ کی پردہ اسکرین پر واضح ہوتے چلے گئے۔ اسٹوری ابھی پہلے ہیروں پر کامیابی سے چل رہی ہے، آگے دیکھیں کیسے گیل کھلائی ہے۔ صوبیدار (ر) ٹکس، این ایس آر مدر، پلوشہ پشاور کے شعر زیادہ پسند آئے۔ بانی اشعار بھی سن کو بھائے۔ بانی کہانیاں ابھی زمر مطالعہ ہیں۔ خط 21 کو لازمی پوسٹ کرنا ہے کیونکہ امتحان میں بیٹھنے کا ارادہ رکھتے ہوں زندگی سلامت رہی تو عید الفطر کے بعد باقی شمار پڑھوں گا لکھنا معذرت چاہتا ہوں۔ شارقہ سلوکی جی آپ کا نام دوبندہ کچھ کہانی کے لئے اتنا دوزنی نام اور آپ کا ڈھائی من کا وجود یعنی یک نشدہ شد والا معاملہ توجہ سے پتا نہیں دونوں کو ساتھ ساتھ لیے آپ کیسے چلتی پھرتی ہیں تبصرہ بیارالگا ست بدھائی ہو آپ کو کوئی بچی چلی گئی باقی باتیں موبائل لائٹ سے کام چلا کے لکھتا ہوں۔ حمیرا رضا مجھے آپ سے ہمدردی اور اتفاق ہے کہ آپ کے محبت نامے بھی ضرور شائع ہونا چاہئیں۔ واہ واہ آ ایمان عرف ماہا ایمان آپ کی سیدہ نسرین کا ناؤیدہ سچ تو نظر آ گیا ہے۔ تبصرے کے شمارے میں تفسیر عباس بابر کی بڑی بھولی زوردار فرسٹ لک بھی آپ کو ضرور محسوس ہوئی ہوگی۔ خدا کرے آپ کی ناک اور دانت سلامت ہوں۔ این ایس آر مدر بھی بھی آتے ہیں مگر بہترین تبصرے کے ساتھ تعریف لاتے ہیں۔ سیدہ نسرین آپ ہمیں بالکل دسر چڑھا ہیں نہ ہی نہیں ضرورت ہے مگر آپ چڑیلوں کو ہم اپنے قدموں میں جگہ ضرور عنایت کریں گے آپ کے خط پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ رسالہ صرف خطوط پڑھنے کے لیے لکھی ہیں۔ دلشیں بلوچ جی میں آپ کی محبت و ملامتی کے لیے تبول سے دعا گو ہوں خدا آپ کو شفا کے کامل دے۔ حاجی عبدالغنی صاحب واپسی ایک پیچیدہ اور منفرد موضوع کی اسٹوری تھی۔ ساری دنیا ہالی ووڈ کی عجیب و غریب فلمیں دیکھتی ہے تو واقعی پر اتنا اعتراض اور انتقام پر اتنی خوشی کیوں؟ قدرت اللہ صاحب ماہا ایمان مگر چین چہائے یا نمک کی ڈلیاں جو سے آپ کو کیا؟ آپ ان کی خاطر مدارت کے لیے دونوں اشیا کا ذخیرہ جمع رکھیں بس۔ تفسیر عباس کے خطوط بہترین الفاظ پر مشتمل اور اعلیٰ پائے کے ہوتے ہیں۔ تفسیر عباس صاحب شہزادے کی پیدائش کی مبارک باد قبول کیجیے۔ ہمایوں راج سعید آپ کو خوبصورت فلمی چہرے کی بجائے خوب سیرت شریک حیات کی تمناؤں میں رکھیں۔ حسن فانی ہے اور خوب سیرلی لافانی ہے۔ نیک عورت مرد کے لیے اس دنیا میں جنت سے کم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی حاجن کی تلاش بزم دوستان میں سے شروع ہو کر بینک پر بھی پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ طاہرہ یاسین مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ صنف نازک کے بغیر محفل اجموسی ہے۔ رضوان تولی اور جودھری سرفراز کے تبصرے شوق سے پڑھتا ہوں۔ سرفراز کی عرصہ سے غائب ہیں پلیز اعزی دیجیے۔ انکل جی آپ نے مجھے محفل اور بلیک لسٹ دونوں سے غائب کر دیا؟ راجا تھب نواز اور دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ رنگی پیکل اور ڈاؤرشید خاں کی تحریروں کو سسٹنس کی زینت بنائیں۔ آخر میں اہل وطن بالخصوص بزم دوستان کو میری جانب سے عید الفطر روزہ تراویح کی مبارک باد ہو۔“ (آپ کو بھی مبارک ہو)

✽ ایم ڈیل اے، مانسہرہ سے تبصرہ فرما رہے ہیں "ماہ ستمبر کا شمارہ 20 اگست 2011 کو ملا۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ حسینہ نائل بن سنو کو شاید ہمایوں سعید راج کے انتظار میں تھی، اس لیے بانی ٹائٹل پر تبصرہ بیاہ سے دوست ہمایوں سعید راج کے حوالے۔ جون ایلما کی محفل میں حاضری دے کر اپنی بیماری کی محفل میں اسٹری دی اور اپنا خطا شاہا یسین۔ لیکن خط ہوتا ہوتا... (چیدہ کی کمی کی وجہ سے بھی ایسا ہی ہو جاتا ہے) (کری صمدارت اس دفعہ شارقہ سلوکی کے حصے میں آئی۔ مبارک، کری صمدارت اور اتنا اچھا اور تفصیلی تبصرہ کرنے پر۔



تفسیر عباس بابر صاحب میں آپ کی بات سے صد فیصد متفق ہوں کہ ہم نے پاکستان کو کیا دیا ہے۔ عمران حیدر بلوچ آپ کی سزائے موت کا سن کر دلی رنج ہوا۔ طاہرہ یاسین جی، انکل ہے آپ کی محفل کے ساتھ ساتھ نظر بھی کافی کمزور ہے یا پھر عمر کا تقاضا ہے۔ دیے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ارمی ہم زندگی کی 21 ویں بھاریاں ہیں۔ ہمایوں سعید راج، آپ کو نیک پردین اور حاجن صاحب کی تلاش ہے، اچھا انداز ہے طنز کرنے کا۔ حسین عباس بلوچ، آپ کو بھی مبارک باد۔ اللہ پاک آپ کو جلد از جلد رہائی عطا فرمائے۔ این ایس آر مدر صاحب، رب کا نعت آپ کو جلد مل صحت یابی عطا فرمائے۔ آپ نے جو یہ کہا کہ یہ اس محفل کا حسن ہے کہ ایک دوسرے کو یاد کیا جاتا ہے، دکھ دوشیز کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خط شائع نہ ہونے کے باوجود پھر خط لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ کہانیوں میں ابتدا ہمیشہ کی طرح اپنی فورٹ انٹازی سے کی۔ جہاں نواب نو دمن کی قید سے نکل آیا لیکن نور ہنوز دمن کی قید میں ہے جو کہ ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا۔ اس کے بعد نئی سلسلے وار کہانی کنگول پڑھی جو کہ مزہ دے گی۔ ہمیں امید ہے کہ کنگول، واپسی کی کمی کو پورا کر دے گی۔ کیونکہ پہلی دو قسطیں انتہائی شاندار رہی ہیں۔ اولین صفحات پڑا کر ساجد احمد کی تحقیق ان کے قلم کا کمال عشق بچان کی صورت میں ان کے زور قلم اور تحقیق و جستجو کا منہ بولا ثبوت ہے۔ ایک بات کی وضاحت ہو جانی تو اچھا تھا کہ اکبر بادشاہ نے کس وجہ سے نیارین بنایا؟ اور کس طرح کا دین بنایا؟ مرزا احمد بیگ کا کارنامہ "شناسا چہرہ"، ابھی اچھی تحریر تھی۔ مرزا احمد بیگ صاحب جیساق پرست ویل نہ ہوتا تو عمران یقیناً چھائی کا حق قرار دیتا اور کنگولیت اللہ عرف کئی مزے کی زندگی بسر کرتا لیکن کاف کاٹا ٹھل بھی کوئی چیز ہے۔ انسان جو بوتا ہے ضرور وہی کاٹا ہے۔ تاہم سلطانہ اختر کی بارگشت موجودہ دور کے حالات کی عکاسی کرتی ایک سبق آموز تحریر بھی۔ شاکی ایک غلطی کی وجہ سے اتنی بڑی معصیت کہ اپنا مستقبل بھی تباہ اور جگہ ہنسائی علیحدہ۔ کاشف زیر کی نسل بھی اچھی رہی۔ کاشف انکل نے بہترین انداز میں پرانی اور نئی نسل میں فرق واضح کیا۔ لیکن پھر بھی ہمیں این کا رد مل بڑا عجیب لگا۔ ویسے اگر یوں کہا جائے کہ یہ فرق ہے مشرقی معاشرے اور مغربی معاشرے میں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ منظر امام کی بھولی زاد اسلاہی گزارے لائق ہی تھی۔ مختار آزاد کی انتظار بھی بہترین کہانی تھی۔ ایم اے راحت کی تحریر خیر خواہ بھی اچھی تھی۔ جمال شاہ تہائی کا احساس کم کرنے کے لیے اگر ڈائری لکھنے کی بجائے دوست بنانا تو اس کے حق میں اچھا ہوتا۔ حضرت یرمیاہ کے واقعات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ پرفیکٹ سیٹ اپ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ اس دفعہ کترینیں کم تھیں۔ شعروں میں پہلا شعر اور اسلا افضل کے شعر پسند آئے۔ (پسندیدگی کا شکر ہے)

✽ ریاض بٹ، حسن ابدال سے محفل میں تعریف لائے ہیں "سرورق کی حسینہ مہندی لگے ہاتھوں سے قارئین سسٹنس کو عید مبارک کہہ رہی ہے۔ جون ایلما کی تحریر ارتقا حسیہ معمول سوچوں کے نئے دروازہ کر رہی ہے۔ اب ہم کیا بتائیں؟ اور کیسے بتائیں کہ ہم آگے بڑھے ہیں یا؟ تمام حالات سامنے ہیں۔ ہمیں پتھر کے دور کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اس میں تصور کس کا ہے؟ کون ان حالات کا ذمے دار ہے۔ روشنیوں کا شہر ابھوں، سبکیوں اور خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہمارا دل خون کے آنسو رو دیا ہے۔ محفل خطوط میں شارقہ سلوکی کری صمدارت مبارک ہو۔ محمد فرید کا ٹھہر صاحب میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکر ہے، تفسیر عباس بابر آف اوکاڑہ بھائی دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں سسٹنس بہت عزیز ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی دوست احباب ایک کرنے لے جائے۔ اس لیے... عمران حیدر بلوچ خوش آمدید، خدا آپ کی مشکلیں آسان کرے، آئیں۔ حاجی عبدالغنی صاحب کس کس بات کا رونا روئیں۔ میں نے بھی نور جہاں اور لاڈلی نیگم کی قبروں کو دیکھا ہے۔ واقعی ان کی حالت دیکھ کر محفلہ جھکے کی جگہ پوٹی، کوتاہی اور رعبروانی پر کھڑا اور افسوس ہوتا ہے۔ اس بار ڈاکٹر صاحب تاریخ کے جھروکوں سے ان بی کی داستان لے کر آئے ہیں۔ مختار آزاد کی انتظار جنگ کے ہل منظر میں لکھی ایک امر کہانی ثابت ہوئی۔ سزا احمد کا انتظار اس وقت ان کی نگاہی موت کے ساتھ ختم ہوا جب ان کا شوہر آئے والا تھا۔ بہر حال انجام ہمیں ڈلا لگیا۔... صرف احمد بیگ صاحب اس بار ایک مشکل کیس کی پیروی کر کے نظر آئے۔ انہوں نے آخر تک سسٹنس کو برقرار رکھا۔ صمد صاحب کی شخصیت بالکل آخر میں جا کر ظاہر کی۔ حالانکہ ان کا نام کہانی کے شروع میں ہی آ گیا تھا۔ بھولی زاد اسلاہی منظر امام نے بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے لفظوں کے کور دکھ دھندے میں لپیٹ کر سسٹنس کے صفحات کی زینت بنایا۔ واقعی بات کا پتنگ بن ہی گیا۔ ایسے خیر خواہ سے اللہ بجائے۔ بانی کہانیوں میں ایم اے راحت کی خیر خواہ کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوئی اور اس سے بڑی زیادتی یہ ہوئی کہ بانی سلسلوں کے متعلق کچھ نہ لکھا جائے۔ محفل شعروں میں صوبیدار (ر) اور ٹکس، نور کے ناصر اور سوزنیہ انتم سلطانات کے اشعار پسند آئے۔ اب شعر و سخن کا معیار بہتر ہو رہا ہے۔ کڑتوں میں ماہا ایمان کی ایمان افروز باتیں دل میں گھر کر گئیں۔ اس کے علاوہ خالد محمد کا انتخاب بھی خوب ہے۔ تفسیر عباس بابر کے سرداروں کے متعلق لطیف بھی مسکراہٹ کا سامان کر گئے۔"

✽ محسن علی موم، بالاکوٹ سے لکھتے ہیں "ماہ ستمبر کا شمارہ 24 تاریخ کو ملا تو واہ ہاری عید سے پہلے ہی عید ہو گئی۔ نائل پر موجود حسینہ اس مرتبہ کافی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ محفل بہاراں میں کری بی راں پر "شارقہ سلوکی" کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مبارک باد جی۔ تفسیر عباس کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح خوب تھا۔ ہمایوں سعید راج اسے خواب میں خیر ناں راج بکھوڑے تھیں۔ ماہا یمن لوٹ کے بدو گھر کو آئے اور مختلف نازک آواز اور جونی کے علاوہ اور اچھا بھی کیا سسٹنس ہیں؟ بانی سب دوستوں کے تبصرہ اچھے تھے۔ کہانیوں میں سبھو سے پہلے انٹازی پڑھی جسے پڑھ کر ہم خود اچھے بھلے کھاڑی ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے قیہ پتہ کو انوٹا نے کاچک پڑ گیا ہے جو بر قسط میں انوٹا ہو جاتا ہے ہیں

اس ماہ فیکا اغوا نہیں ہوا اس پر شکر ہے۔ واپسی کی واپسی کے بعد سکھول نے اس کی جگہ لی ہے۔ جاہد تحریر ہے، افضل کا خدا پر یقین ہی اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ آخری مضمون پر احمد اقبال نے خوب صورت تحریر پڑھنے کو دی۔ پاکستان کی اقتصادی شاہ رگ کراچی کے حالات روز بروز خرابی کی طرف جا رہی ہیں۔ پتا نہیں وہ کون سے عناصر ہیں جو حالات میں خرابی کے ذمہ دار ہیں؟ بہر حال کہانی میں دنیا نے وقار کو دیکھنے میں دیر کی لیکن اس کا انتقام بھی خوب لیا۔ پھوٹی زاد اسلا پڑھ کر یوں پرستار ہوتے ہیں کہ خدا ایسے لوگوں سے بچائے جو پاگل بنادیں۔ بازگشت شاکی برادری میں قہور واقعی معاشرے کے بے جسمی کا بھی ہے اور ویسے بھی جن بچوں کے والدین باہر ہوں ان کو اکثر ایسی ہی ناخوشگوار باتوں سے پالا پڑھتا ہے کیونکہ دولت جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ نئی نسل خوبصورت تحریر بھی۔ تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا۔ نئی نسل اور پرانی نسل میں زمین و آسمان کے فرق کو مصنف نے خوب دکھایا۔ اسٹوری آف منٹھ مختار آزاد کی تحریر انتظار دہری۔ فوجیوں کی زندگی کا بھی کوئی پھر و سائنس۔ آج ہم چند لوگوں کی وجہ سے پوری فوج کو بدنام کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف سبکی سوچیں کہ یہ مفری سرحد پر نہ ہوں تو کیا ہم ایک شام بھی سکون کی نیند سو سکتے ہیں یقیناً نہیں کٹھن یعنی سزا احمد کا طویل انتظار بالکل اچانک ہی ختم ہو گیا۔ جذباتی انداز میں لکھی گئی تحریر بے حد پسند آئی۔ بانی کہانیاں اچھی زیر مطالعہ ہیں۔

❖ **ذیشان افتخار دھلوں**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ لکھتے ہیں: "اس ماہ رمضان مبارک کے 21 روزے کو عید کا تحفہ ملا۔ ناکسل پر براجمان دوشیزہ اپنی تمام دلکشی کے ساتھ مہندی ہاتھوں پر سجائے عید کا چاند دکھ رہی تھی۔ اس کو عید مبارک کہنے کے بعد ہم بیچے اپنی محبوبہ محفل میں خوشاقدہ سبوت کو کمر و پوزیشن پر فائز پایا گیا۔ مبارکباد دانا دانا انصافی ہوگی۔ محترمہ مانا، دادا، اکل تو میں ہی سکتا ہوں اگر کوئی بنائے تب تا۔ محترمہ ماہا ایمان جی، جی آپ سے اپنا شکوہ واپس مانگتے ہیں اگر ہو سکے تو کر دینا۔ تفسیر عباس بار صاحب، بار عباس کی جب اولاد دجوان ہے تو ہمارے لیے تو قائل احترام ہیں اور انشاء اللہ رہیں گے۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ حلوے تو آپ اپنے بھائیوں کو بنا کر کھلاتی ہیں ہم بھی تو آپ کے بھائی ہی ہیں اور تو اور آپ کے شہر میں ہی پابند سلاسل ہیں۔ اب سمجھ نہیں آتی کہ ہم آپ سے شکوہ کریں یا آپ کا شکوہ قبول کر لیں۔ اشعار کی محفل میں رانا مختار احمد کا شعر بے حد سراہا گیا۔ کہانیوں میں انٹری پڑھی اس مرتبہ یاسمین شاہ فیکے پتر کے مد مقابل آیا۔ سکھول میں لیاقت حسین پر قسمت کی دیوی مہربان بھیری، ملک یاسمین اپنا سب کچھ دے کے غائب ہو گئے۔ لیاقت حسین کی باجوں انگلیاں بھی میں اور سر کڑا رہی ہیں۔ رانا شرف زبیر صاحب کا پروین زبیر صاحبہ سے کیا تعلق ہے اگر معلوم ہو تو آگاہ کریں۔ (قلم کا تعلق ہے) اس ماہ سسٹن کا دیوار 21 رمضان المبارک کو ہوا۔ قائل پر کول گرل بڑی نازک چوڑیوں اور ہاتھوں کو کسی کے پیار کی مہندی سے رنگے اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ کب عید کا چاند نظر آئے اور میں اپنے پیاروں کو عید مبارک کہوں، قدم بڑھاتے ڈرتے ڈرتے پہلی مرتبہ محفل جہان میں پہنچے کہ شاید ہم ان خوش نصیبوں میں شامل ہو جائیں جن کو یہ خوشی مل چکی ہے۔ محفل یاروں کے تمام خطوط پڑھ کے بے حد انجوائے کرتا ہوں، خاص طور پر بار عباس اور ماہا ایمان کی گفتگو بڑا فرحت بخشی ہیں۔ حیران رضانی بی بی لاہور میں میری کچھ یادیں وابستہ ہیں جب بھی آپ کے تبصرے کو دیکھتا ہوں مجھے سب یاد آ جاتا ہے۔ تفسیر عباس بار، دل نشیں بلوچ، رمضان یا شا صاحب، پرنس تنویر، نعمان بیارے، ایم ذیل اے، رضادی گریت، سیدہ نسیم، ہمایوں سعید راج، محمد اسماعیل اجاگران سب دوستوں کو سلام۔ انہی کے دم سے اس محفل میں جا چاند لگتے ہیں۔ اشعار کی محفل میں تمام اشعار بہت خوبصورت تھے۔ رانا مختار احمد کا شعر قائل داد تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انٹری پڑھی۔ نئی اسٹوری سکھول، لیاقت حسین کا کردار بے ادا اچھا اور عمدہ ہے، ہر لحاظ سے پرفیکٹ اسٹوری ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی اب تک جتنی بھی اسٹوری پڑھی ہے مجھے نہ بھولنے والی ہیں۔"

❖ **ہمایوں سعید راج**، بنوں سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں۔ "سب کے عید اچھل رونا تک سرورق کو سید حادل میں اترنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ سبوتی شہزادی شارقہ جی شاہی کفر کے ساتھ تخت پر براجمان نظر آئی۔ جواہری لیدی سپہ سالار ماہا ایمان چنگیزی کو کھانا جنگ میں ڈنرے پڑنے پر مبارکباد اور انعامات سے نوازا رہی تھی۔ حاجی صاحب! آپ بجا فرما رہے ہیں یہ دنیا بھر کدہ ہے، نور جہاں جیسی ہزاروں مثالیں حضرت انسان کو چھوڑ دیتی ہیں مگر انسان جاگنے کو تیار ہی نہیں۔ حسین بھائی، بالآخر آپ نے بھی تسلیم کر ہی لیا کہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں راج ہی کرتے ہیں۔ ماہا کی یہ صنف نازک کے نازک ہاتھوں کے نازک بیچ درد دینے کے لیے تھوڑے ہوتے ہیں۔ ویم صاحب! ڈاکٹر بو کے خواہشیں کی ہمسرہ پھر سننے کے لیے دونوں کان ہر دم کھڑے رکھتے ہو؟ طاہرہ بی بی اس میں حسین صاحب کا کوئی دوں نہیں انہوں نے آپ کو بھی بہت شدت سے یاد فرمایا تھا۔ عمران بھائی! انہد دل سے خوش آمدید۔ تفسیر صاحب نے حسب عادت ماہا پر چڑھائی جاری رکھی۔ ناصر صاحب! ایک بار آپ اس بزرگ کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سن لیں۔ پھر آپ انہیں کراس کرنے کی کٹھنی نہیں کریں گے۔ قدرت اللہ صاحب! بڑے بد ذوق واضح ہوئے ہیں آپ تو، کوئی اتنی اچھی اور خوبصورت لڑکی کو چھوڑ کے آگے بڑھتا ہے؟ کہانیوں کی ابتدا عشق جہانگیر سے کی۔ کہتے ہیں کہ جس میت میں دوطرفہ خلوس نہ ہو اس کا اثر دھوپ میں رہی برف کی طرف تیزی سے زائل ہوتا ہے، مگر حیرت سے عظیم منسل بادشاہ کی عقل سلیم پر دھمکی سے دم نہ ہوا اس نام نہاد میت کے علم میں مگر رفتار رہا؟ محبت جہانگیر نے بھی کی اور شا جہاں نے بھی۔ مگر کتنا فرق ہے دونوں میں۔ نور جہاں جیسی عورتوں نے عورت کے ساتھ کراس کی طرح ہوسٹ کر دیا کہ یہ ضرب المثل بن گیا۔ اس کے بعد تیز رفتار سکھول پڑھی۔ لیاقت اور فرخین پر شیطان تو تمیں اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ افضل

خان چوکیدہ ہے اس لیے حسب تاریخ عورت سے بری طرح دھوکا کھا گیا۔ سراج کا کردار بے حد پراثر ہے۔ آئی مل ایماندار افسر غیر حقیقی سا لفظ لگتا ہے۔ انٹری میں فیکا ایک بار پھر اپنی خوش سستی، بہادری اور ذہانت سے دشمن کے چنگل سے زندہ سلامت نکل آئے۔ رفیق واقعی نور سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے اسے اتنے غیض و غضب میں دیکھا۔ کراچی کے موجودہ حالات کے تناظر میں لکھی گئی نازک کلنگ بے حد پسند آئے۔ پولیس کی روایتی کمپنی نے سیروں خون جلا دی۔ پروفیسر جوڑے کے بے رحمانہ نکل نے بھی آبدیدہ کیا۔ زیبا کے بہادرانہ فیصلے نے جی خوش کر دیا۔ پرفیکٹ سیٹ اپ اس نوسے پر پوری اترتی ہے کہ لوہے کو اوہ سے ہی کاٹا جاتا ہے۔ میٹ کی سیٹ اپ واقعی پرفیکٹ تھی۔ پھوٹی زاد اسلا پڑھتے ہوئے بھیجا گرم ہو گیا۔ مرزا احمد بیگ کافی عرصے بعد ایک مشکل کیس کے ساتھ حاضر ہوئے۔ سبکی کا جذباتی فیصلہ غیر دانش مندانہ تھا۔ بیگ صاحب ہرجوئے کو گھر تک پہنچانے کا اتنا مضبوط بندوبست کرتے ہیں کہ بندہ اش اش کراھتا ہے۔ اس ماہ کی سب سے سبق آموز کہانی بازگشت رہی۔ واقعی نو جوان لڑکیوں کے ہاتھ میں موبائل فون دینا اسے برادری کی راہ پر چھلنے کے مترادف ہے۔ کاشف زبیر کی نئی نسل میں بھی ایک معصوم دوشیزہ کو غیر معصوم بنانے میں اسی موبائل نے اہم کردار ادا کیا۔ خیر خواہ میں شاہ صاحب کی غیر معمولی نجوی نے بہت غصہ دلایا۔ رحمان نے کچھ شہ جی کو ہر شکل سے نجات دلادی۔ نرم نازک احساسات سے گندمی کہانی انتظار نے ہمارے نازک دل پر بہت برا اثر ڈالا۔ محبت کے ہزار پھلوں اور ہر پھلوں میں ہزار رنگ ہیں۔ سزا احمد کا انتظار اراگان نہیں جانے گا اتنا تو یقین تھا مگر انتظار کی گھڑیاں یوں ختم ہو گئی ایسا تو سوچا ہی نہیں تھا۔ صوبیدار کے شعر نے متاثر کیا اور ماہ کے شعر نے رات بھر سوچنے پر مجبور کیا۔"

❖ **طاہرہ یاسمین**، ضلع سرگودھا سے فرماری ہیں "سب سے پہلے تو میری طرف سے آپ کو دلی عید مبارک اور دھروں دعا ہیں۔ آپ کا ٹکڑیہ کہ میرا خط اس بار بھی محفل میں شامل تھا سارا ماہ اسی خوشی میں گزر جاتا ہے اور آئندہ ماہ کے شمارے اور اپنے خط کا انتظار رہتا ہے۔ اب آئی ہوں سب کے شمارے کی طرف تو سب سے پہلے ناکسل گرل بڑی خوبصورت لگی۔ سر پہ پلٹے سے رکھا دو پٹا تاروں بھرا آسمان اور چاند و کیا بات ہے۔ شارقہ سبوت جی کرسی صدارت مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ اس بار سب سے اچھا تھا۔ ہمیں اس ماہ کا شمارہ ایک دن لیٹ ملا یعنی 18 اگست کو۔ تفسیر عباس بار کا ذکر، بھی آپ نے ماہا ایمان کے بارے میں جو لکھا کہ آج سے پندرہ سال پہلے آپ جھولے میں شاد پڑے تھے میں عقل آپ کے پاس نہیں۔ مجھے ماہا ایمان کے بارے میں آپ کا اس طرح کہنا بہت برا لگا۔ خیر دار آئندہ ماہ اس کے بارے میں ایسا لکھا۔ اس دفعہ تو سرگودھا جیل سے بہت خط اور شعر شائع ہوئے۔ عمران حیدر بلوچ آپ کی سزائے موت کا بہت دکھ ہوا میرے بھائی کا نام بھی عمران ہے۔ خدا کرے آپ کی سزا ختم ہو جائے میرا کزن بھی سرگودھا میں سزائے موت کاٹ رہا ہے۔ ہاویں سعید راج آپ کو میری کس بات میں بے چینی و حیرتیں نظر آگئی ذرا وضاحت کرنا۔ حسین عباس بلوچ خدا کرے آپ جلد اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر روزے رکھیں اور عید منائیں۔ ماہا ایمان اس بار آپ کا شعر بہت اچھا تھا۔ ڈاکٹر ویم خالق، میری دعا ہے کہ آپ کی کہانی ضرور شائع ہو اور مجھے امید ہے آپ کی کہانی اگر شائع ہوگی تو سب کو خسرو پسند آئے گی۔ نصر حیات لک، سرگودھا جیل آپ کا تعلق سرگودھا کے شہر ماڑی لک سے تو نہیں؟ خسرو بتانا، مجھے لگتا ہے میں نے آپ کا نام سن رکھا ہے ماڑی لک سے۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر اس ماہ کا شمارہ تو میں نے چاروں میں ختم کر لیا کیونکہ گھر کا کام دھیرہ تو سحری تا نیم ہی ختم کر لیتی تھی۔ اس دفعہ سب سے پہلے مرزا احمد بیگ کی شناسا چہرہ پڑھی بہت شاندار مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ قائل بلڈنگ کے صدر صاحب ہوں گے پھر پڑھی انٹری۔ واضح اب انٹری اتنا مزہ نہیں دیتی ست روئی سے چل رہی ہے۔ پھر سکھول پڑھی آیا۔ مزہ آگیا کہ کہانی پڑھ کر تو رسالے کے پیسے ہی پورے ہو گئے۔ نئی نسل کے اینڈ نے تو چونکا دی۔ میں تو یہی سمجھتی رہی کہ ان کو اپنی آبرو لٹ جانے کا دکھ تھا۔ انتظار کا اینڈ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کاش سزا احمد مرنے سے پہلے احمد سے مل پائیں۔ بازگشت میں جو کچھ شاکے ساتھ ہوا برا برا مگر شاہجی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جولا کیوں باں باپ کی عزت کا خیال نہیں کرتی انہیں عزت سے جیسے کا کوئی حق نہیں۔ شاہجی لڑکیوں پر دم کرنا فضول ہے۔ پھوٹی زاد اسلا پور کہانی تھی۔ خیر خواہ اچھی کاوش تھی۔ بے چارے بڑے میاں جمال شاہ عرف جمال جیسا کرو گے ویسا بھرو گے والی مثال بن گئے۔ ان کے خیر خواہ رحمان نے تو کمال ہی کر دیا، بڑے میاں کو تمام پریشانیوں سے نجات دلادی۔ آخر کو جمال شاہ کے خیر خواہ جو تھے سزا رحمان۔ پرفیکٹ سیٹ اپ، مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ سبے چاری تانیا خود کو بڑا چالاک سمجھتی تھی مگر نکلنے سے اس کی ساری چالاکی چٹا چور کر دی۔ عشق جہاں تاریکی کہانی بہت مزہ آیا پڑھ کر اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ نازک کلنگ بہت اچھی لگی۔ اس قسم کی کہانی ہر ماہ آتی چاہیے۔ واہ احمد اقبال صاحب اتنی خوبصورت کہانی لکھنے پر شکر یہ۔"

(ملک آصف مجید اعوان و رحم یار خان سے..... آپ نے ہم سے جو سوال کیا ہے جواب حاضر ہے، آپ اگر سسٹن کے لیے کچھ بھیجتا چاہتا ہیں تو ڈائجسٹ میں موجود ہے پھر اپنی تحریر روانہ کر سکتے ہیں)
اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
حمیرا رضا، کراچی۔ عائشہ افتخار، مغل، کویت۔ ڈاکٹر ویم خالق، ضلع سمراٹ۔ محمد قدرت اللہ انٹری، حکیم ڈاؤن، خانیوال۔ سیدہ نسیم، ضلع تاروال۔ راجا قتب نواز قتب، رتی، مئی، سامیوال۔ ماہا ایمان، حافظ آباد

صحرا

پاکستان

جاری رہنے والے عہد کو کبھی یہ سوچ کر نہیں گزرا جاتا کہ اسے ایک طویل عرصے تک یاد بھی رکھا جائے گا مگر تاریخ وہ واحد ذریعہ ہے جو واقعات کو خود پر رقم کر کے زمانوں کو ناقابل فراموش بنا دیتی ہے۔ مغل دور حکومت کے کسی بھی مخصوص عہد کی بات کی جائے... بہت خاص بن کر تاریخ میں ڈھل گیا ہے۔ ہمایوں جب شہنشاہ ہند بنا تو اسے بھی اقتدار کی جنگ جیتنے کے لیے بہت سے رشتوں کو قربان کرنا پڑا... اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خود قربان ہو جاتا کیونکہ شیرشاہ سوری نے اس کے رستے میں ایسے کانٹے بچھا دیے تھے جن پر چلتے چلتے اس کے پیر لبو لہان ہو چکے تھے مگر پھر... ایسا ہوا کہ دشمن کے اتحاد کو توڑنے کے لیے اس کی فوج میں پھوٹ ڈالنا ضروری ہو گیا۔ اقتدار میں رہنا... محلاتی سازشوں سے مقابلہ کرنا اور پھر کامیابی سے خود کو منوانا اگرچہ کسی بھی شہنشاہ کے لیے آسان نہیں رہا مگر اس کے باوجود تاریخ انہیں آج بھی حکمرانوں کے حوالے سے آنے والی تسلوں سے متعارف کرا رہی ہے۔



ایک سوار آگرہ کی طرف سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ طویل مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ اتنی طویل مسافت کہ اس کے گھوڑے تک کو پھینا آ رہا تھا۔ اس نے راستے میں کئی گھوڑے بدلے ہوں گے۔ اس کے باوجود اس کا گھوڑا تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی عام سوار نہیں تھا۔ سرکاری قاصد تھا جو بنگال سے ہمایوں بادشاہ کے لیے کوئی پیغام لے کر آیا تھا۔ آگرہ پہنچ کر بھی اس کی مسافت کم نہیں ہوئی تھی۔ اگر بادشاہ اس وقت آگرہ میں نہ ہوا تو اسے دلی جانا پڑے گا۔

ہمایوں کی افیون کا شمار ابھی ٹونا نہیں تھا کہ اسے اطلاع مل گئی۔ بنگال سے قاصد آیا ہے اور بارگاہ میں حاضری کے لیے بے قرار ہے۔

”کہو قاصد، کیا پیغام لائے ہو؟“

”حضور، شیر شاہ سوری کے ارادے اچھے نہیں۔ وہ بہار کا حکمران تو بن ہی چکا ہے، اب بنگال کو بھی قبضہ اقتدار میں لینے کے لیے فوجیں جمع کر رہا ہے۔ بعض جگہوں پر اس کی فوجوں کی نقل و حرکت بھی دیکھی گئی ہے۔“

”تم جا سکتے ہو۔“ ہمایوں نے قاصد کی اطلاع کو غور سے سنا اور اسے جانے کا حکم دے دیا۔

قاصد کے جاتے ہی اس نے مجلس مشاورت طلب کی اور حکم دیا کہ مرزا عسکری اور مرزا ہندال (ہمایوں کے بھائی) کو خاص طور پر بلا لیا جائے۔ داروغہ توپ خانہ رومی خان کو بھی اس مجلس میں شامل کیا جائے۔

دور دراز کے اسرا کے جمع ہونے میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں وہ بدلتے ہوئے حالات پر برابر غور کرتا رہا۔ گجرات سے آنے والی خبریں بھی امید افزا نہیں تھیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ بنگال اور گجرات میں سے وہ پہلے کس طرف متوجہ ہو۔ ہمایوں کی یہ کمزوری بھی کہ وہ اکثر اہم مسائل کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ افیون کی مقدار بڑھالی اور مجلس مشاورت میں ہونے والے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک ہفتے بعد جب تمام اسرا جمع ہو گئے تو بنگال کا قبضہ ان کے سامنے رکھا گیا۔ سب سے پہلے ہمایوں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

”سہرام کے ایک معمولی سے جاگیردار کی اب اتنی ہمت ہو گئی ہے کہ بہار اور پٹنہ پر قبضہ جمانے کے بعد اب بنگال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مقامی حاکم اس کے تابع دار بن چکے ہیں۔ آگرہ بنگال پر قابض ہو گیا تو دہلی ہندوستان اس

کے پاس چلا جائے گا۔ پھر اس کا اگلہ ہدف آگرہ اور دہلی ہوگا۔ ہمارے والد بزرگوار نے لودھیوں کا قلع قمع کیا تھا۔ اب یہ سوری پٹھان مغلیہ سلطنت کے درپے ہے۔ اس کی تلوار اگر اس وقت نہیں توڑی گئی تو پھر یہ موقع کبھی نہیں آئے گا۔“

مؤید بیگ نے جو ہمایوں کا نہایت مت پرور چڑھا ہوا سوار تھا، گرج کر کہا۔ ”وہ جاہل پٹھان چند مقامی حکمرانوں کو شکست دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ مغل فوجوں سے بھی ٹکرا جائے گا۔ اس کا یہ گھمنڈ دور کرنا ضروری ہے۔“

”گجرات کا مسئلہ جیسا کہ انتہائی اہم ہے۔ ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پارہے ہیں کہ پہلے گجرات سے نہیں یا بنگال کی طرف جائیں۔“

”اس وقت ہندوستان میں دو ہی طاقتیں ہیں، مغل اور پٹھان۔“ مرزا ہندال نے کہا۔ ”اب یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ یہاں مغل رہیں گے یا پٹھان۔ اگر شیر شاہ کو آگے بڑھنے دیا گیا تو پٹھانوں کی طاقت بڑھتی چلی جائے گی۔ یہ لوگ ہمارے لیے بیحد درد منے رہیں گے۔ ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ لہذا پہلے ہمیں بنگال پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہیے۔ گجرات کو بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”مالوہ اور گجرات میرے ہاتھوں سے چلے گئے ہیں۔ انہیں مجھے دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ پہلے میں گجرات کی طرف چلا جاؤں تو کیا حرج ہے؟“

”بنگال کا حاکم سلطان محمود شاہ بہادر ضرور ہے لیکن وہ زیادہ دیر تک شیر خان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اگر اسے شکست ہوگی تو پھر بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ شیر شاہ سوری اپنے قدم بجا چکا ہوگا۔ اگر ہم نے بروقت بنگال کا رخ کیا تو شیر شاہ بہادر کو بچانے کے لیے واپس لوٹ آئے گا، نہیں لوگا تو ہم بہار پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔“

تجویز معقول تھی لیکن ہمایوں گجرات کی مہم پر جانے کے لیے بے ہمت تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمایوں کا وہ حریف جس نے مالوہ اور گجرات پر قبضہ کر لیا تھا، پرٹھالیوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور ہمایوں چاہتا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے لیکن ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد شیر شاہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ مغلوں کا راستہ روکنے والا اب کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ اب تک وہ مطمئن تھا کہ مغل بہادر شاہ سے اٹھ رہیں گے لیکن اس کے انتقال نے نقشہ ہی الٹ دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر حاکم بنگال سے صلح کر لی۔

ہمایوں کی مجلس مشاورت سے یہ فیصلہ دے چکی تھی کہ بنگال کی مہم پر روانہ ہونا ہے لیکن ہمایوں کو اطمینان نہیں تھا۔ اس

نے فوجیوں کو طلب کیا کہ ستارے دیکھ کر بتائیں۔ ستارہ شناسوں پر اس کا اتنا اعتقاد تھا کہ ان کے خلاف وہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ ستارہ شناسوں نے بھی غالباً بادشاہ کی رغبت دیکھتے ہوئے اس کے بنگال جانے کی مخالفت کی اور مشورہ دیا کہ وہ گجرات کی مہم پر روانہ ہو جائے۔

اب اسے گجرات جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن اس کے ستارے کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ شیر شاہ نے معاہدہ صلح تو کر محمود شاہ پر حملہ کر دیا، محمود شاہ زخمی ہو کر فرار ہوا۔ اس کی فوجیں شکست سے دو چار ہو گئیں۔

حالات نے ایسا پلٹا دکھایا کہ ہمایوں کو فوجیوں کی باتوں کو ایک طرف رکھ کر بنگال کی مہم پر روانہ ہونے کا حکم جاری کرنا پڑا۔

فوجی تیار یاں شروع ہو گئیں۔ ایسی تیاریاں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ بنگال کا علاقہ مغلوں کے لیے انتہائی مشکل تھا اور مشکل بھی، اس لیے کچھ زیادہ ہی جاں فشانی دکھائی جا رہی تھی۔ سامنا بنگال کے دریاؤں کا تھا لہذا متعدد کشتیاں تیار کر لی گئیں۔ رومی خان کے زیر نگرانی غیر معمولی وزنی توپیں جو محاصرے کے وقت کارآمد ثابت ہوں انہیں کی گئیں۔ شاہی پیش خانہ آگرہ سے باہر نصب کر دیا گیا۔ اس عرصے میں موسم صاف ہو گیا تھا۔ جتنا کایا سلا ب اتر چکا تھا۔

ہمایوں ایک بحری بیڑے میں رونق افروز تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیگمات سوار تھیں۔ عالی مرتبہ امرا اور اس کے جگزی دوستوں کی کشتیاں اس کے پہلو پہلو تھیں۔ بہت سے سپاہیوں نے امراء، افسران اور خود شہنشاہ کی تقلید میں اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا تھا جیسے کسی تفریحی مقام کی میر کے لیے جارہے ہوں۔ رسالہ اور توپ خانہ سڑک کے ذریعے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

یہ قافلہ ”پریاگ“ کے مقام پر پہنچا تو ہمایوں کی جنگی کونسل کا اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ پہلے گوڈہ پر حملہ کیا جائے یا چنار کے قلعے پر قبضہ کیا جائے۔ ہمایوں کی بد قسمتی کہ اس نے ان بزرگوں کی رائے مان لی اور قلعہ چنار پر قبضے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ راستے میں اسے خبر ملی کہ شیر شاہ سوری اپنے بیوی بچوں کو نکالنے کے لیے چنار کے قلعے میں آیا ہوا ہے۔ گوڈہ کو وہ اپنے بیٹے جلال خان کے سپرد کر آیا ہے اب وہ بڑھ چلا ہے۔ اس کے گھوڑے کوڈہ کی جانب بڑھ جاتا تو چرخ آسان تھی۔ رسد پہنچانے کے دروازے شیر خان پر بند ہو جاتے۔ اس کو اتنی فرصت بھی نہ ملتی کہ بیوی بچوں کو نکال لے جائے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ واپس لوٹنا مشکل تھا۔

صبح کاذب کا وقت تھا۔ تارے ابھی ابھی ڈوبے تھے کہ مغل فوج کا ہرادل دست چنار کے قلعے کے سامنے طلوع ہوا۔ شیر خان کو جیسے ہی اطلاع ملی اس نے اپنے چند افغان سرداروں کو قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود نہایت چل پہاڑی کے پیچھے بھار کھنڈ مقام سے مغلوں کی نقل و حرکت کی نگرانی بغیر کسی قسم کے تضادم کے کرتا رہا۔

چنار کا قلعہ پہاڑ کی نیچی ہوئی ایک لوک پر واقع تھا۔ دریائے گنگا کا پانی ایک دائرہ سا بناتا ہوا شمال کی طرف بہہ رہا تھا جہاں مغل کشتیاں ٹنکر انداز ہو گئیں۔ کشتیوں کی اس حرکت سے قلعے کی رسد بند ہو گئی۔

مغل فوج پہاڑ کے دامن میں تھی۔ نشیب میں ہونے کی وجہ سے توپ کے گولے قلعے تک پہنچنے میں تکلف کر رہے تھے۔ قلعے سے افغان بڑے بڑے پتھر ٹوٹ کر رہے تھے جن سے مغل سپاہیوں کی بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہو رہی تھیں۔

ہمایوں یہ سب دیکھ رہا تھا اور داروغہ توپ خانہ رومی خان کو بلا کر بار بار تنبیہ کر رہا تھا۔ رومی خان ہر ترکیب آزما کر دیکھ چکا تھا لیکن اس کی ہر ترکیب ناکام ہو رہی تھی۔ پوری فوج بے کار پڑی تھی۔ سارا دار و مدار رومی خان کے توپ خانے پر تھا اور وہ بے اثر تھا۔ ایک مہینہ ہو چکا تھا اور فوج ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

رومی خان اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کہ ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے اپنے غلام کھانت کو اپنے پاس بلایا۔

”میں تم پر کوڑے برساؤں گا۔ تم دو چار کوڑوں کے بعد چھینے ہوئے پہاڑ پر چڑھ جانا، جیسے قلعے میں پناہ لینے کے لیے آ رہے ہو۔ اگر کسی نے رحم کھا کر دروازہ کھول دیا تو ٹھیک ورنہ واپس چلے آنا۔“

”اگر انہوں نے مجھے اندر بلا لیا تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”اندرا کا جائزہ لے کر جب بھی موقع ملے بھاگ آنا۔“

غلام تیار ہو گیا اور اس پر کوڑے برسے گئے۔ وہ چنچا رہا اور پھر منصوبے کے مطابق قلعے کی طرف بھاگا۔ سادہ لوح افغانوں کو اس پر رحم آ گیا۔ انہوں نے اسے قلعے میں پناہ دے دی۔ غلام نے رو رو کر اپنی داستان سنا لی۔

”میں رومی خان کا غلام ہوں۔ میرا آقا بہت ظالم ہے۔ بات بات پر میری چڑی اڑھڑ دیتا ہے۔ میں اس کے پاس سے بھاگنا چاہتا تھا مگر کہاں بھاگتا۔ اس نے آج مجھے پھر مارا۔ اب آپ لوگوں کا مجھے سہارا تھا۔ میں یہاں چلا آیا۔ غلامی ہی کرتی ہے تو آپ لوگوں کی کرلوں گا۔“

افغان اس سے بہت متاثر ہوئے۔ غلام نے بھی شمال

ہوشیاری سے چند ہی روز میں ان لوگوں کا اعتبار حاصل کر لیا۔
افغان اس سے یہ جانتا چاہے تھے کہ روی خاں کے
توپ خانے کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ اس غرض سے انہوں
نے غلام کو قلعے کا ایک ایک کونا دکھایا اور اپنی حفاظت کی سب
ترکیبیں اسے بتا دیں۔ غلام کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قلعے میں
گولہ بارود اور غذائی اجناس اور مقدار میں موجود ہیں۔

یہ سب معلومات لے کر ایک دن وہ چپکے سے وہاں
سے نکل بھاگا اور اپنے آقا روی خاں کو تمام راز سے آگاہ کر
دیا۔ ان رازوں سے واقف ہونے کے بعد روی خاں نے
بادشاہ کی اجازت سے تین کشتیوں پر ایک بلند مینار تیار
کرا لیا۔ یہاں سے قلعے کا کونا کونا دکھائی دے رہا تھا۔ اس
مینار کو وہ قلعے کے نزدیک لے گیا۔ دوسری جانب روی خاں
کے کہنے پر بادشاہ نے فوج کو حکم دے دیا کہ وہ قلعے پر حملہ
کر دے اور اس وقت تک پیچھے نہ ہٹے جب تک قلعے پر مکمل
قبضہ نہ ہو جائے۔ دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔
زمینی فوج نے بھی لڑائی شروع کر دی، آدھی رات تک لڑائی
چلتی رہی۔ بڑے بڑے پتھر لڑھک کر آ رہے تھے۔ مغل
نشیب میں تھے لہذا بھاری نقصان ہو رہا تھا۔ صبح ہوئی تو
سات سو مغل سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ مینار کا ایک حصہ بھی
گولہ باری سے تباہ ہو چکا تھا۔

رات بھر لڑائی نے افغانوں کو یقین دلادیا کہ مغلوں
کا ارادہ مستحکم ہے۔ وہ بھی نہ کبھی قلعے پر قبضہ کر لیں گے۔
لہذا وہ وقت آنے سے پہلے ہی صلح کر لی جائے۔ شیر شاہ پہلے
ہی قلعے سے نکل چکا تھا۔ غازی خاں، اس کا ایک سردار قلعے کی
محافظت کر رہا تھا۔ اس نے گھنٹے ٹیک دیے اور صرف اس شرط
پر صلح کی درخواست بھیج دی کہ وہ قلعے میں موجود تمام لوگوں کی
جان کی سلامتی کا وعدہ کر لیں۔ بادشاہ نے اس آسان شرط کو
پورا کرنے کا حکم صادر کر دیا اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔

روی خاں نے افغانوں کو یقین دلایا تھا کہ ان کی جان
بخش کا وعدہ ہو چکا ہے، بہت جلد تحریری حکم نامہ بھی پہنچ
جائے گا۔ یہ تحریر جب موید بیگ کے ہاتھ لگی تو اس نے اس
تحریر میں ردوبدل کر دیا اور اس میں لکھ دیا کہ افغانوں کے
ہاتھ حکم کر دیے جائیں۔ قلعے پر قبضہ تو ہو ہی چکا تھا۔ وہ بڑا
افغانوں کو قیدی بنالیا گیا تھا۔ اس حکم نامے کو دیکھ کر روی خاں
نے سات سو توپچیوں کے ہاتھ کوا دیے۔ یہ ایسا ظلم تھا کہ
آسمان بھی کانپ اٹھا ہوگا۔

شیر خاں افغان مستورات اور چند جانبار افغانوں کے
ساتھ پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ چند افغان قلعے سے اپنی

جان بچا کر اس کے پاس پہنچے اور پوری روداد سنائی۔ اس ظلم
نقصان پر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بے اختیار آسمان
کی طرف ہاتھ اٹھا دیے۔
”اے اللہ! تو اس خون کے صدمے میں مغلوں کی
سلطنت کا خاتمہ کر دے۔ ایسے ظالموں کو حکومت کرنے کا
کوئی حق نہیں جنہیں اپنے وعدے کا بھی پاس نہیں پھر اپنے
سامنیوں سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ گواہ ہو۔ میں مغلوں کے
خلاف نہیں تھا۔ میں تو اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اب
ہمایوں نے خود مجھے اشتعال دلایا ہے۔ میں اب اس کی
سلطنت ختم ہونے تک جنگ کروں گا۔ اب میرے غضب
سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار
کروں گا۔“

وہ جنگل میں بے یار و مددگار کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ
مستورات اور خزانے کو کس جگہ محفوظ کرے۔ اسے شیر گڑھ کی
یاد آئی۔ یہ قلعہ اس نے اپنے علاقے سہرام کے نزدیک بنایا
تھا لیکن یہ قلعہ کسی طویل محاصرے کے لیے موزوں نہیں تھا۔
اس نے اس منصوبے کو خود ہی رد کر دیا پھر اس کی آواز گونجی۔
”فلک شیر خاں!“ ایک ہیبت ناک شکل کا افغان اس کے
پاس آ کر کھڑا ہوا۔

”حضرت! کیا حکم ہے۔“ (اس کے ساتھی اسے
حضرت کے لقب سے یاد کرتے تھے)

”تم ابھی روہتاس کے راجا ہرکشن کے پاس جاؤ اور
ہمارا یہ پیغام اس تک پہنچا دو۔“
”جو حکم حضرت۔“

شیر شاہ نے ہرکشن کے نام تحریر لکھی۔

”مغل ہر طرف سے میرے پیچھے پڑے ہوئے
ہیں۔ اگر یہ علاقہ امیر تیمور کے خاندان کے ہاتھ لگ گیا تو
قلعہ روہتاس آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میرے پاس
میری عورتیں اور بچے ہیں اور کافی بڑا خزانہ ہے۔ مغلوں کے
مقابلے میں اب میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ ان
سب کو لے کر مقابلے پر جانا خلاف مصحت ہے۔ اگر قلعے
میں عورتوں، بچوں اور خزانے کو رکھنے کی اجازت مل جائے تو
میں ان کی طرف سے بے فکر ہو کر مغلوں سے لڑنے چلا جاؤں
گا اور ان کو اپنے علاقے سے اور آپ کی سرحدوں سے دور
بھگا دوں گا۔“

اگر میں مغلوں پر غالب آ گیا تو آپ کے اس احسان
پر تا عمر شکر گزار ہوں گا اور اگر خدا نخواستہ کوئی اور معاملہ پیش
آتا تو میرے اہل و عیال اور خزانہ آپ کی پناہ میں محفوظ رہے

گا۔ میرے مال و ناموس کی اپنی حفاظت میں لاج رکھ لیتا۔“
راجا نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر
شیر شاہ مارا گیا تو یہ خزانہ اس کے قبضے میں آ جائے گا، اس نے
اجازت دے دی۔

شیر شاہ مغلوں کی نظر بچا کر دشاہ گزار گھائیوں سے
گزرتے ہوئے قلعہ روہتاس تک پہنچ گیا۔ شیر شاہ نے ایک
ہزار ڈولیاں تیار کرائی تھیں۔ ہر ڈولی میں دو افغان بٹھائے
گئے تھے۔ چند ڈولیوں میں عورتیں بھی تھیں جنہیں آگے رکھا
گیا تھا۔ ڈولیوں میں ننگی کنواریں چھپا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ان
ڈولیوں کو اٹھا کر چلنے والے بھی دراصل سپاہی تھے جنہوں
نے بھی بدل لیا تھا۔

یہ ڈولیاں قلعے میں داخل ہوئیں تو راجا نے یہ سوچ کر
کہ افغان عورتیں بہت سخت پردہ کرتی ہیں، پہرے داروں کو
حکم دیا کہ کوئی ان ڈولیوں کی تلاشی نہ لے مگر جیسے ہی یہ
ڈولیاں قلعے میں داخل ہوئیں تو ان میں سے خواتین کے
بجائے جوان نکلے۔ یہ سب کے سب بہادر پٹھان سپاہی
تھے۔ ان سب نے دربانوں پر حملہ کر دیا اور پکڑ پکڑ کر نکل کرنا
شروع کر دیا اور چند لمحوں میں ڈیوڑھی پر قبضہ کر کے
دروازوں کو چو پٹ کھول دیا۔ شیر شاہ باہر منتظر کھڑا تھا۔ اپنی
ہمیت کو لے کر قہار سے بجائے تھے قلعے میں داخل ہو گیا۔
راجپوت سپاہیوں نے تادیب مقابلہ کیا مگر کب تک۔ راجا کو خبر
ہونے تک سارا قلعہ چو پٹ ہو چکا تھا۔ اب اس کے پاس
فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنے چند آدمیوں کے
ہمراہ خفیہ راستے سے نکل بھاگا۔ شیر شاہ نے روہتاس کے
قلعے پر قبضہ کر کے اپنے چارے نقصان کی تلافی کر لی۔

اب شیر شاہ بے فکر تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو
قلعے میں چھوڑا اور خود ایک طویل سحرانوردی کے لیے نکل کھڑا
ہوا۔ یہاں سے نکل کر اس نے جہار گھنڈ کے راجا پر فوج کشی
کی۔ اس علاقے کے تسلط کے بعد وہ جنگل کی سرحد کے بالکل
قریب پہنچ گیا۔ یہ علاقہ روہتاس اور بنگال کے درمیان واقع
تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ دونوں سرحدوں کی گمرانی کر سکتا تھا۔
اسے یہ خوش خبری بھی ملی کہ اس کے سرداروں نے ”گوڈ“ پر
قبضہ کر لیا ہے۔

ہمایوں چار پر قبضہ کر کے مطمئن تھا۔ اس کی فوجیں بھی
میش دوستی میں تھیں کہ ایک خبر نے سب کے ہوش اڑا دیے۔ خبر
فی کہ شیر خاں نے بنگال فتح کر لیا ہے۔ ہمایوں نے روہتاس
اور جہار گھنڈ کے خلاف فوج کشی کرنے کا اعلان کر دیا۔
حملے کی دھمکی اسے پیچھے صلح کی بات پھروری تھی۔

ہمایوں نے شیر شاہ کے نام پیغام بھجوایا۔
”بنگال کا تخت اور خزانہ ہمارے پاس روانہ کر دو۔
اس کے بدلے میں چنار، جو نیور یا کوئی بھی پسندیدہ جگہ دے
دی جائے گی۔“

یہ پیغام ہی عجیب تھا۔ شیر اپنے جہزے کا شکار کسی کے
حوالے کرتا ہے؟ اس نے لکھ بھیجا۔

”میں نے بنگال کی تسخیر میں چھ سال تک جاں فشرانی
کی ہے اور میرے بہت سے سپاہی اس مہم میں کام آئے
ہیں۔ میں بنگال کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“

ہمایوں ابھی شیر خاں کے جواب پر لا جواب ہونے بھی
نہیں پایا تھا کہ بنگال کے حاکم سلطان محمود کا سفیر بارگاہ
ہمایوں میں حاضر ہو گیا۔

سلطان محمود فرماتے ہیں۔ ”افغان نے گوڈ کے قلعے پر
ضرور قبضہ کر لیا ہے لیکن باقی ملک ہنوز میرے قبضے میں ہے۔
بادشاہ سلامت فوج کو اس جانب کوچ کا حکم فرمائیں اور کل
اس کے کہ افغانی اس علاقے میں اپنے قدم جما سکیں، ان کو
بنگال سے نکال باہر کریں۔ اس مہم میں مجھے بھی آپ اپنا
معاوند پائیں گے۔“

سلطان محمد کی درخواست ہمایوں کے گوش گزار ہوئی تو
اس نے اپنی فوج کو بنگال کی جانب کوچ کرنے کا حکم دے
دیا۔ فوج کا ایک حصہ جہار گھنڈ کی جانب روانہ کیا جہاں شیر شاہ
مقیم تھا۔

شیر خاں کو خبر ملی تو اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ
روہتاس کی جانب بھیج دیا اور خود چند گھڑ سواروں کے ساتھ
چپ چاپ گوڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔

شیر شاہ کے تعاقب میں مغل فوج کا ایک دستہ بھاگتا
پھر رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سہرام کی پہاڑیوں میں چھپا
لیا۔ مغل یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ آگے کی طرف بھاگ رہا ہے
لہذا وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے جبکہ شیر شاہ ان کے پیچھے
پیچھے چلا آ رہا تھا۔

تعاقب کرنے والا دستہ ایک ندی کے کنارے پہنچا۔
اس ندی کا نام سونم تھا۔ یہاں پہنچ کر اس دستے نے پڑاؤ
ڈال لیا اور باقی فوج کا انتظار کرنے لگے۔ چند روز بعد بادشاہ
بھی وہاں پہنچ گیا۔

بادشاہ پہنچ گیا تھا کہ دور غبار اڑتا نظر آیا۔ کھلبلی مچ گئی
کہ کہیں یہ شیر شاہ نہ ہو۔ بادشاہ سنبھل کر اس کو راستہ
روکنے کے لیے آگے بھیج دیا۔ یہ کوئی اور نہیں، بد نصیب
سلطان محمد، حاکم بنگال تھا جو زمی بھی تھا اور ہمایوں کی آنکھ

میں شامل جراحوں نے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے ہمایوں کے سامنے پیش کر دیا۔ ہمایوں نے بنگال کا تخت واپس دلانے کا وعدہ کر کے اسے تہی دی۔

”شیر شاہ ہم سے چھپ کر بھاگتا پھر رہا ہے۔ اس کا کہیں سراغ ملے تو بنگال کا فیصلہ ہوتے دیر نہیں لگے گی۔“ مجھے راستے میں یہ خبر ملی ہے کہ وہ چنہ کے قریب کہیں چھپا ہوا ہے۔“

”کیا ہم تمہاری بات پر یقین کر لیں؟“

”آپ لوگ تو پار کریں۔ اگر وہ چنہ میں نہ ہو تو آپ کو گوڑ کی طرف بڑھنے میں آسانی ہو جائے گی۔“

ہمایوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔ ہمایوں کی فوج ان علاقوں سے ناواقف تھی لیکن اب سلطان محمود اس کے ساتھ شامل ہو گیا تو اس کی ہمت بندھ گئی۔ اس نے گنگا پار کی اور ہراول دستے کو آگے روانہ کر دیا۔

ہراول دستہ چنہ پہنچا تھا کہ اسے خبر ملی، شیر شاہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ خبر رساں ادھر ادھر دیہات میں پھیل گئے اور شیر شاہ کی تلاش کی جانے لگی۔

تلاش کی ٹھوکروں سے پہنچے ہوئے یہ خبر رساں ایک باغ کے قریب سے گزرے تو انہوں نے وہاں چند گھوڑے بندھے ہوئے دیکھے۔ اس معمولی سے گاؤں میں ایسے شاندار گھوڑے دیکھ کر انہیں تعجب ہوا۔ وہ باغ سے باہر نکلے اور ایک دیہاتی کو پوچھا۔

”کون ٹھہرا ہے یہاں۔ یہ گھوڑے کس کے ہیں؟“

”مجھے کیا معلوم؟ باندھ گیا ہو گا کوئی۔“

وہ دیہاتی کچھ بتانے سے قاصر تھا لیکن جب کوار اس کی گردن پر رکھ دی گئی تو اس نے اٹھ کر دیا کہ بذات خود شیر شاہ ہے جو یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔

خبر رساں اسے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ شیر شاہ اس وقت کہاں ہے اور اس کے ساتھ کتنی فوج ہے؟ انہوں نے دیہاتی کو وہیں چھوڑا اور لشکر میں پہنچ کر خبر پچھا دی۔ اس وقت تک ہمایوں بھی چنہ پہنچ چکا تھا۔ بادشاہ نے اسی وقت جاسوس روانہ کر دیے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ شیر شاہ کہاں چھپا ہوا ہے؟

شیر شاہ کو غالباً خبر مل چکی تھی کہ مغلوں نے اس کا سراغ لگا لیا ہے۔ جب تک جاسوس اس گاؤں میں پہنچے، شیر شاہ وہاں سے رن پھر ہو چکا تھا۔

جاسوس یہ خبر لے کر آئے تو شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس اندھیرے میں تعاقب کے لیے روانہ نہیں ہوا جاسکتا

تھا۔ دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو ہی تعاقب شروع کر دیا گیا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں فاصلے سمیٹتے بڑھتے رہے۔ ایک روز تو ایسا وقت آیا کہ شیر شاہ آنکھوں سے نظر آنے لگا۔ وہ ہوا سے بھی تیز رفتار جا رہا تھا لیکن تعاقب کرنے والے بھی کم نہیں تھے۔ اس نے اپنے چند سواروں کو روک جانے کا حکم دیا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔ پیچھے رہ جانے والوں نے مغلوں کو کئی گھنٹوں تک روکے رکھا۔ بس اتنا وقت کافی تھا۔ شیر شاہ مونگیر پہنچا اور یہاں سے تیز رفتار کشتی میں بیٹھ کر گوڑ پہنچ گیا۔ گوڑ پہنچ کر اس نے ہمایوں سے بے خطر ہو کر رسم تاج پوشی ادا کی اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اس رسم تاج پوشی سے وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ سابقہ حاکم کا اقتدار ختم ہو چکا اور اب وہ بنگال کا بادشاہ ہے۔

اسے معلوم تھا کہ ہمایوں کی توپیں اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے بس پہنچنے ہی والی ہوں گی لہذا رسم تاج پوشی کے دوسرے ہی دن وہ گوڑ سے فرار ہو گیا۔

مغل فوج خوش و خرم گوڑ کی جانب روانہ ہوئی اور چار دن میں بنگال کے دار السلطنت میں بادشاہ جلوہ افروز ہو گیا۔ شیر شاہ نے اپنی فوج سہرام اور روہتاس میں اکٹھی کر لی تھی۔ برسات نے اسے مزید فرصت دی۔ برسات ختم ہوتے ہی اس نے مغلوں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کا آغاز ہو گیا۔ شیر شاہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح چنار کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے آئے لیکن یہاں مغلوں کا تسلط نہایت مستحکم تھا۔ شیر شاہ نے ہوشیار فلاح کی طرح یہاں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر بنارس پر قبضہ کر لیا پھر جو پور کے گرد گھبرا ڈال دیا۔ یہاں اس کی مزاحمت ہوئی۔ اس نے اس محاصرے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اس محاصرے کو جاری رکھتے ہوئے مغلوں کی سلطنت میں موجود فوج تک کے علاقے کو اپنے تصرف میں کر لیا۔

مغلوں کے تمام علاقوں پر شیر شاہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اب صرف دو ہی علاقے چنار اور جو پور شیر شاہ کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا محاصرہ کیا گیا۔ ہمایوں گوڑ میں تھا اور شیر شاہ نے مغل علاقوں میں تباہی مچائی ہوئی تھی۔ یہ خبریں ہمایوں تک پہنچیں تو اسے یقین نہیں آیا کہ صورت حال اتنی ابتر ہو گئی ہے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ”شیر شاہ کو یہ سب کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔“ اب اسے جلد سے جلد دار الخلافہ آگرہ کی طرف لوٹنا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ بنگال کا انتظام کس کے سپرد کر کے جائے؟ اسے اپنے ہمراز زہد

بیگ کا خیال آیا جو اس کے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا۔

”زہد بیگ! تم ہم سے اپنی ترقی پر اصرار کرتے رہے ہو۔ ہم نے سوچا ہے تمہیں بنگال کا حاکم (گورنر) بنادیا جائے۔“

زہد بیگ نے رعب شادی کا خیال کیے بغیر براہ فرود نہ ہو کر کہا۔ ”کیا مبادولت کے خیال میں مجھے ذبح کرنے کے لیے بنگال سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔“

اس کا یہ جواب ایسا گستاخانہ تھا کہ ہمایوں اس کو سخت نرا دینے کی سوچنے لگا۔ اس بارے میں اس نے اپنے کچھ افسروں سے مشاورت بھی کی۔ زہد بیگ کو اس کی بھٹک پڑ گئی۔ وہ ایک دن چپکے سے نکلا اور آگرہ بھاگ گیا۔ آگرہ پہنچ کر اس نے حالات درگروں دیکھے۔ لوگ شیر شاہ کی فتوحات کو تشویش سے دیکھ رہے تھے اور بادشاہ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ بادشاہ کا بھائی مرزا ہندال بھی سخت بدظن تھا۔ زہد بیگ نے اس موقعے کا فائدہ اٹھایا۔ مرزا ہندال کو اکسایا کہ وہ خود بادشاہ بن جائے۔

”ہمایوں بنگال میں گھرے ہوئے ہیں۔ آپ کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔“

بات معقول تھی مرزا نے رضامند بھی ہو گیا تھا لیکن اسی وقت بادشاہ کا سفیر شیخ بھلول آگرہ آیا۔ بادشاہ نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ مغل حاکم کی مدد کے لیے جو پور پہنچے۔

اسے بھائی کی بے بسی کا خیال آیا اور جو پور جانے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ زہد بیگ نے اسے پھر دغلا یا، اسے ترغیب دی کہ وہ شیخ بھلول کو قتل کر دے اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ مرزا کے منہ میں ایسا پانی بھرا کہ شیخ بھلول کو قتل کر دیا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور جو پور جانے کے بجائے دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

بادشاہ گوڑ میں بیٹھا تھا کہ اسے شیخ بھلول کے قتل اور مرزا ہندال کے بادشاہ بننے کی خبر موصول ہوئی۔ اب ایک لمحہ بھی یہاں نہیں گزارا جاسکتا تھا۔ اس نے کوچ کا حکم دے دیا۔ مغل سپاہی اس سے زیادہ مضطرب تھے کہ جلد از جلد شیر شاہ کے گھٹنے سے نکل بھاگیں۔ گوڑ کا حاکم بننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا بالآخر بڑی مشکل سے ایک افسر جہانگیر علی بیگ کو رضامند کیا گیا۔ ہمایوں نے اسے پانچ ہزار فوج دے کر گوڑ کی حفاظت پر مامور کیا اور خود آگرہ پہنچنے چل دیا۔

شیر شاہ ابھی تک جو پور اور چنار کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے فوج کے سارے علاقے پر اپنا تصرف کر لیا تھا۔ اب اپنی فوج روہتاس کے نزدیک اکٹھی کر لی۔ اسے یقین تھا کہ ہمایوں روہتاس پر حملہ آور ہوگا۔ اس لیے وہ یہ

اختطامات کر رہا تھا۔

گوگ کا شمالی کنارہ خالی پڑا تھا۔ شیر شاہ کی فوج کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہمایوں نے حکم دیا کہ اس مقام سے دریا پار کیا جائے۔ تمام افسروں کا بھی یہی خیال تھا لیکن موید بیگ کو اس سے اختلاف تھا۔

اس نے مشورہ دیا۔ ”آپ شہنشاہ ہند ہیں۔ آپ پر لازم ہے کہ جس راستے سے آپ آئے تھے اسی راستے سے واپس جائیں ورنہ دشمن یہ کہے گا کہ اصل راستہ اختیار نہ کر کے مغل فوج دوسرے راستے سے دم دبا کر بھاگ رہی ہے۔“

بادشاہ، موید بیگ کی ہر بات مان لیا کرتا تھا یہ مشورہ بھی مان لیا۔ اس مشورے نے بادشاہ کو شیر شاہ کے چنگل میں ڈال دیا۔ شیر شاہ کا ہمایوں سے ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو روہتاس بچانے کی فکر میں تھا لیکن غلط جگہ سے دریا پار کرنے اور مغرب کی طرف بڑھنے سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب وہ مغل لشکر کے عقب میں تھا۔ اس کے لیے بڑا آسان ہو گیا تھا کہ وہ مغل لشکر پر عقب سے حملہ کر دے۔ اس نے یہی کیا۔ فوج کے پچھلے حصے پر حملہ کر دیا۔ دونوں طرف سے تیر و فتک چلے۔ اگلے روز شیر شاہ نے پھر چھاپہ مارا۔

اسے اتنی کامیابی ملی کہ وہ شکر توپیں مغلوں کے قبضے سے نکل گئیں۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ صبح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو جائیں۔ سپاہیوں نے زرہ کٹر پہن لی اور چوسہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ شیر شاہ بھی تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ گیا۔ یہ موقع اچھا تھا۔ شیر شاہ کے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ اس وقت لڑائی چھیڑ دینی چاہیے تھی۔ شہنشاہ کا بھی یہی خیال تھا لیکن موید بیگ نے پھر مخالفت کی۔ غالباً وہ کسی سازش کا حصہ بنا ہوا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی بات مان لی اور لڑائی موخر ہو گئی۔ فوج رک گئی اور پڑاؤ ڈال دیا۔ شیر شاہ نے بھی شاہی فوج کے بالمقابل خیمے ڈال دیے۔

لڑائی موخر ہوتی رہی۔ محل وقوع ایسا تھا کہ شیر شاہ کو دھوکا دے کر ٹکنا ممکن نہیں تھا اور ہمایوں فی الحال الجھنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ دلی اور آگرہ سے آئے دن تشویشناک خبریں آرہی تھیں۔ ہمایوں بار بار اپنے بھائیوں کو مدد کے لیے پکار رہا تھا لیکن بھائی اپنے باہمی عداوت میں مصروف تھے۔

اس انتظار میں تھے کہ شہنشاہ کے متعلق کوئی بدخبر آئے اور وہ سلطنت کے حصے بخرے کریں۔ کوئی راستہ نہ دیکھ کر مجبوراً بادشاہ صلح کے لیے جھکا۔ لڑائی اس وقت تک ملتوی ہوئی رہی جب تک صلح کے لیے بات چیت چلتی رہی۔ دم مہینے کی کدو کاوش کے بعد یہ کیوشش ناکام ہوئی۔ شیر شاہ نے شرط رکھی تھی

کہ بادشاہ چنار کو اس کے حوالے کر دے۔ ہمایوں اور اس کے امیروں نے یہ شرط قبول نہیں کی۔
اب دونوں فریق آزاد تھے لیکن ہمایوں یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شیرشاہ لڑائی چھیڑنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ اس نے کوئی غیر معمولی اقدام نہیں کیے۔ بس اتنا کیا کہ دونوں لشکروں کے درمیان جوندی بھی اس پر نگاہ کا حکم دے دیا۔
صبح کاؤب کی ٹھنڈی ہوا مغلوں کو لوریاں دے کر سلا رہی تھی۔ ہتھیار کھلے رکھے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے لہذا سپاہیوں کے جسموں پر کپڑے بھی آدھے تھے۔ کچھ اندھیرا کچھ اجالا تھا کہ ندی کی طرف سے ہزاروں سائے زمین کے سینے پر ریٹکتے ہوئے آگے بڑھے اور سونے ہوئے مغلوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ شیرشاہ کے افغان سپاہی تھے۔ قیامت کا شور مچا۔ مغل سپاہی بیدار ہوئے تو ہتھیار سنبھالنے کا وقت نہیں تھا۔ بھاگ کر ہی جان بچائی جا سکتی تھی۔ جس کو جدھر راستہ ملا بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کثرت سے میدان خالی ہوا کہ جب بادشاہ کے حکم سے جنگ کا نفاذ ہوا تو صرف 300 سپاہی فراہم ہو سکے۔ تیوری خون نے جوش مارا۔ اس قلیل تعداد کے باوجود وہ میدان میں کود پڑا۔ بادشاہ خود میدان میں تھا۔ اسے دیکھ کر افغان سراپید ہو گئے لیکن مغل سپاہیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ ان میں سے بھی بہت سوں نے فرار کا راستہ اختیار کیا۔ ہمایوں کی تلوار ادھر ادھر چمک رہی تھی۔ سیکڑوں افغانوں کو اس نے تھک کر دیا تھا کہ ایک تلوار نے اس کا بازو زخمی کر دیا۔ اب وہ دانتوں سے گھوڑے کی باگیں پکڑے ہوئے تھا اور ایک ہاتھ سے تلوار چلا رہا تھا۔ دشمن اسے چاروں طرف سے گھیرنے لگے تھے۔ چند وفادار سپاہی آگے بڑھے اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر میدان جنگ سے نکال کر گنگا کی جانب دوڑ پڑے۔ بادشاہ نے اپنا گھوڑا اور یا میں ڈال دیا لیکن اتنا بدحواس تھا کہ گھوڑے سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ چند سپاہی اور کودے تھے جو گرداب میں پھنس کر غرق ہو گئے۔ ایک سبقت جس کا نام نظام تھا اپنی مشک کے ذریعے دریا پار کر رہا تھا، اس کی نظر پڑی تو وہ بادشاہ کے قریب آگیا اور ہاتھ پاؤں مارے ہوئے ہمایوں کو اپنی مشک پر لے لیا اور دریا کے پار لے آیا۔
جو سپاہی ڈوبنے سے بچ گئے تھے وہ بھی ہمایوں کے ساتھ کنارے پر پہنچے۔ سب کے سب حیران تھے کہ اب کیا کیا جائے اور کہاں جایا جائے؟ ہمایوں کی نظر اچانک نظام سے پڑی جو اپنی مشک لیے کھڑا تھا۔

ہمایوں نے اسے گریب پکڑ لیا اور ہاتھ میں لے کر لے گیا۔
ہو۔ تم نے ہماری جان بچائی ہے۔ کہو کیا مانگتے ہو؟
نظام سجدہ دل میں ہنسنا تو ضرور ہوگا کہ بادشاہ کے کپڑوں کا پانی بھی ابھی خشک نہیں ہوا ہے، سرنگا ہے۔ شاید قیمتی کلاہ بھی پانی میں بہہ گئی۔ اس وقت یہ سمجھ گیا دے سکتا ہے پھر بھی وہ دل کی بات زبان پر لے آیا۔
”مغلوں میں یہ چاہتا ہوں کہ میں تم ازم ایک دن کے لیے آپ کے تحت پریشیوں۔ سب مجھے بادشاہ سلامت کہہ کر پکاریں اور میرے حکم پر چلیں۔“
”ہم تمہاری اس خواہش کو ضرور پورا کریں گے لیکن اس کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ آکر ہونا ہوگا۔“
”میں تیاری ہوں سرکار۔ بادشاہت حاصل کرنے کے لیے یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“ ہمایوں نے اس سے کو ساتھ لے لیا۔

ہمایوں کے تقریباً چھ ہزار آدمی اس معرکے میں کام آئے۔ ان میں سے آدھے تو وہ تھے جو دریا میں غرق ہو گئے۔ ہمایوں یہاں سے بنارس اور پھر چنار کی طرف بھاگا۔ چنار ابھی تک اس کے افسروں کے قبضے میں تھا۔ بہت چھوٹا سا لشکر اس کے ساتھ تھا۔ اس لشکر میں یہ مشکل دو سو سپاہی ہوں گے اور ان میں بھی آدھے سے زیادہ نپتے۔ ان کی تلواریں راستے ہی میں کہیں گر گئی تھیں۔
ہمایوں نے سوچا تھا کہ وہ چنار کے قلعے میں کچھ دن قیام کرے گا لیکن تیسرے ہی دن اسے معلوم ہوا کہ شیرشاہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے والا ہے۔ اب وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ مقابلہ کرتا۔ اس نے قلعہ خالی کر دیا اور گنگا کے جنوبی کنارے کی سمت گامزن ہوا۔
قسمت کی گردش ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شیرشاہ کو معلوم ہوا کہ ہمایوں فرار ہو چکا ہے تو اس نے اپنے رسالے کے ایک نامور افسر کو اس کے تعاقب کے لیے روانہ کر دیا۔ ہمایوں اس نئی صورت حال سے بے خبر چلا جا رہا تھا کہ اس کے ہمراہیوں نے احساس دلایا کہ کوئی تعاقب میں ہے۔ اس نے رفتار تیز کر دی۔

نظام سبقت بھڑکا رہا تھا کہ بس اب آگرہ پہنچے لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ٹھوکر تو آسانی سے کھا لیتا لیکن اب تو جان پر ہی بن گئی تھی۔ بادشاہوں کو کیسے پاؤں پیٹنے پڑتے ہیں اس سے تو میں غریب ہی بھلا۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں بھاگ جائے لیکن اس بیباک میں کہاں بھاگتا۔ اس کی حالت تو اب قیدی جیسی تھی، جی کڑا کر کے بیٹھا رہا۔

ہمایوں چلتے چلتے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں جتنا، گنگا سے آکر مل جاتی ہے۔ یہاں وہ حیرت زدہ ہو کر رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دریا کس طرح پار کیا جائے۔ اس کی قسمت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن خدا اب بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک اور غبار بلند ہوا اور پانچ چھ سو سوار نمودار ہوئے۔ یہ ارمل کا راجا تھا۔ الہ آباد قلعے کے پار ریاست ارمل تھی اور یہ اس کا راجا تھا۔ اس نے ہمایوں کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔
”ان داتا، اس مشکل وقت میں، میں آپ کی مدد کروں گا۔“

”میری خاطر کیوں شیرشاہ سے دشمنی مول لیتے ہو۔ اس اتنا تودہ میں دیا کہاں سے پار کروں؟“
”کشتیوں کے بغیر ناممکن ہے کہ دریا پار ہو۔ مجھے خشکی کے ایک راستے کا علم ہے۔ آئیے میرے ساتھ۔“
وہ ہمایوں کو ایک گزرگاہ سے اس پار لے گیا۔ ہمایوں کے سپاہی پانچ دن سے بھوکے پیاسے تھے، راجا نے ان کے لیے ایک بازار کھلوایا۔ ان لوگوں نے کھانا پینا؟ کچھ وقت آرام سے گزرا۔ گھوڑوں کو بھی راحت ملی۔ جن کے گھوڑے شائع ہو گئے تھے انہوں نے نئے گھوڑے خرید لیے۔
راجا کی اعلیٰ طرفی سے کچھ دن آرام سے کٹ گئے۔ پھر پھر شروع ہوا لیکن وہ اب اپنے علاقے میں تھا، خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ زندگی قسمت میں لکھی تھی کہ بالآخر آگرہ پہنچ گیا۔

ہمایوں کے دونوں بھائی تو کسی خبر بد کے انتظار میں تھے۔ کامران مرزا تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ بس دہلی اس کے قبضے میں ہے۔ جیسے ہی ہمایوں کے مرنے کی خبر آئے گی وہ تخت پر پاؤں رکھ دے گا لیکن غیر متوقع طور پر جب ہمایوں واپس آیا تو امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ہمایوں لاپتا آیا تھا۔ کوئی بڑا لشکر بھی دستیاب نہیں تھا۔ اس کی سمیت بھی جواب دے سکتی تھی۔ ان کے باوجود دونوں بھائیوں کو اس کے مقابل آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

مستور عدویوں نے بادشاہ کو دائمی بنار میں بتلا کر لیا۔ کسی پر یہ خبر ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ بادشاہ بیمار ہے بلکہ جی کہہ گیا تھا کہ مسلسل جسمانی مشقت کے بعد اب وہ آرام فرما رہے ہیں۔ اس کے دونوں بھائیوں نے یہ موقع غنیمت بنا کر اس وقت وہ اپنا قصور معاف کرالیں۔

اس کی آرام گاہ کے گرد سخت پہرا تھا۔ کسی کو اس تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف اہلکار و بیگمات جا سکتی تھیں۔ لہذا کامران مرزا اور ہندال مرزا اس سے ملنے آئے تو انہیں

روک لیا گیا۔ وہ بہر حال بھائی تھے۔ سخت ٹھکرارے بعد انہیں جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ دونوں چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑا بھائی شہنشاہ ہند ہمایوں بستر راحت پر دراز تھا۔ اسے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا اس لیے اس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔
”برادر کلاں، ہم دونوں نامد ہیں اور اپنے کیے پر شرمندہ۔“

”تم لوگوں نے کیا کیا ہے جو شرمندہ ہو؟“
”آپ بنگال میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ہم آپ کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔“

”بنگال میں ہم نہیں، تیوری و قار خطرے میں تھا۔“
ہمایوں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تم نے ہم سے نہیں بلکہ اپنے خون سے نجات دہاری کی ہے۔“

”میں نے تمام تیاری مکمل کر لی تھی لیکن حاسدوں نے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔“ کامران نے کہا۔
”تم اگر آگئے ہوتے تو میں افغانوں کو نیست و نابود کر دیتا۔“ ہمایوں نے بستر پر دوبارہ لیٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرے خلاف بغاوت کا اشارہ دے کر دشمن کو طاقت بخشی۔ جب آپس ہی میں پھوٹ پڑ جائے تو دشمن سے کون لڑ سکتا ہے؟“
ہمایوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے اسے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ کامران مرزا آگے بڑھا اور ہمایوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”آپ ہمارے باپ کی جد ہیں۔ ہمیں معاف فرما دیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہماری تلواریں ہمیشہ آپ کے حکم پر اٹھیں گی اور افغانوں کو نیست و نابود کر کے ہی نیام میں جا سکیں گی۔“

ہمایوں کی طبیعت میں شفقت بہت تھی۔ بھائیوں کا تو وہ بہت ہی خیال رکھتا تھا۔ اس کا دل بھرا آیا اور کمال شفقت سے دونوں کو معاف کر دیا۔

”جاؤ اور شیرخان سے مقابلے کی تیاری کرو ورنہ یہ آندھی بابر کی چرانوں کو کھل کر دے گی۔ نہ صرف تم پر بلکہ تمام مغلوں پر یہ فرس ہے کہ وہ افغانوں کو نیست و نابود کر دیں۔“
بھائیوں کی طرف سے بے لکڑی ہوئی تو ہمایوں تیزی سے صحت یاب ہونے لگا۔ صحت یاب ہونے ہی اسے نظام سبقتی یاد آئی جس سے اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اسے تخت پر بٹھائے گا۔ اس کی تلاش ہوئی تو وہ مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا اور غالباً اپنی جان کو رو رہا تھا کہ اچھے دنوں میں وعدہ

لیا کہ قیدی بن کر رہ گیا۔ اسے تو امید بھی نہیں تھی کہ بادشاہ کو اپنا وعدہ یاد رہا ہوگا لیکن بادشاہ کو یاد تھا۔ اس نے نظام کو مہمان خانے سے نکالا اور دہلی لے گیا۔ یہاں اس کے لیے شاہی پوشاک تیار کرائی گئی اور اسے القاب و آداب کی منادی کے ساتھ تخت پر بٹھایا گیا اور تمام امیروں کو آداب بجا لانے کا حکم دیا۔ نظام نے جس عہدے پر جس کو چاہا سرفراز کیا اور جس کو چاہا انعام دیا۔ کہتے ہیں اس ہنسی نے چڑے کا سکہ بھی جاری کیا تھا۔

ہمایوں نے اسے دو روز تک اور بعض مؤرخین کے نزدیک تین روز تک تخت پر بٹھائے رکھا اور چوتھے روز بہت سامان دولت دے کر رخصت کیا۔ مغل دربار ایک طرف جشن و شادمانی کا دور تھا تو دوسری طرف سازشوں کا جال بھی پھیل رہا تھا خصوصاً اس کے بھائی نظا ہراس کا ساتھ دے رہے تھے لیکن دل ہی دل میں اس کے خلاف تھے۔ ان کی یہی منافقت بعد میں ہمایوں کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئی۔

☆☆☆

افغانوں کے ہاتھوں مغلوں کی شکست نے خاندان تیموری کے قومی جذبے کو ابھار دیا۔ انہیں افغانوں سے دلی نفرت تھی۔ یہ خیال کہ اب افغان ان پر غالب آجائیں گے ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ سخت سے سخت باغی تیموری بھی اب ہمایوں کے جھنڈے تلے آنے لگے۔ بنگال میں جو فوج منتشر ہو چکی تھی وہ بھی سٹ کر ہمایوں کی خدمت میں آگئی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ عالم یہ تھا کہ ان کی کواریر نیاموں سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ وفاداریوں کے پیمانے باندھے جا رہے تھے۔ افغانوں سے بدلہ لینے کے مطالبے پیش کیے جا رہے تھے۔

ہمایوں نے اپنی شکست کا داغ بڑی ثابت قدمی سے مٹایا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اس کی غیر حاضری میں جو تازیانہ رو بہ اختیار کیا تھا اسے اس نے بڑی فراخ دلی سے فراموش کر دیا تھا۔ یہ بھائی بھی اب اس کے لیے لڑنے مرنے پر آمادہ تھے۔ تقریباً ایک لاکھ فوج بھی جمع ہو چکی تھی۔ مغل ٹوپ خانے کی از سر نو تعمیر ہو گئی۔

☆☆☆

الہ آباد تک ہمایوں کا تعاقب کرنے کے بعد اب شیر شاہ کا پہلا کام بنگال پر دوبارہ قبضہ کرنا تھا۔ اس نے ایک دستہ ”گھوڑ“ کی جانب روانہ کیا جہاں ہمایوں اپنا حاکم مقرر کر گیا تھا۔ اس دستے نے معمولی سی جھڑپ کے بعد گھوڑ پر قبضہ

کر لیا۔ شیر شاہ ایک فوج کی حیثیت سے گھوڑ پہنچا۔ یہاں اس کی دوبارہ تاج پوشی ہوئی۔ ہمایوں کی شکست نے اسے یہ ہمت بخش دی تھی کہ وہ آگرہ تک پہنچے۔ اب تک صرف بنگال پر اس کی نظریں تھیں، شیر خان نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرے گا۔ ہمایوں نے خود اس کے دل میں یہ امنگ پیدا کر دی۔

اس نے بنگال کا انتظام اپنے سرداروں کے سپرد کیا اور خود ایک بھاری لشکر لے کر ہمایوں کے علاقوں میں لوٹ مار کے لیے چل دیا۔ وہ ہمایوں کو سنبھالنے کا زیادہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے یہ سفر بڑی تیزی سے طے کیا۔

وہ اپنی فوج لے کر گھنٹوں سے چل کر گنگا کے کنارے کنارے پر یاگ تک آیا۔ یہاں سے اس نے اپنے بیٹے قطب خاں کو جتنا کے کنارے کنارے کا پکی کی جانب روانہ کیا۔ اس کے ساتھ جو فوج بھیجی گئی تھی اس کا مقصد مغلوں سے لڑنا نہیں بلکہ مغل فوج کو دو حصوں میں منقسم کرنا تھا۔ شیر شاہ سے یہ بڑی غلطی ہوئی۔ اسے مغل فوج کی تعداد کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ یہ بھی غلطی تھی کہ اس ہم کو اس نے قطب خاں جیسے نو عمر اور نا تجربہ کار کے حوالے کیا۔

ان علاقوں میں لوٹ مار کی خبریں آگرہ پہنچیں تو ہمایوں نے اپنے نامور امیروں کے ہمراہ ایک دستہ فوج کا اس طرف روانہ کر دیا۔ اس دستے نے افغانوں پر شدید حملے کیے اور افغانوں کی ایک بڑی تعداد مغل قطب خاں ماری کی۔ ایک روز آگرہ کے لوگ سو کر اٹھے تو انہوں نے شہر کے دروازے پر ایک سر لٹکا ہوا دیکھا۔ ٹھوڑی دیر میں یہ خبر عام ہو گئی کہ یہ شیر شاہ کے بیٹے قطب خاں کا سر ہے۔ یہ سنا تھا کہ ہمایوں کے حق میں نعرے لگنے لگے۔ ایک جشن سا برپا ہو گیا۔ لوگوں کا خوف و خطر جاتا رہا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اب افغان اس ملک پر قبضہ نہیں کر سکیں گے۔

ابھی یہ جشن جاری تھا کہ یہ خبر موصول ہوئی کہ شیر شاہ گنگا کے مغرب میں آگیا ہے اور اپنے سب سے چھوٹے لڑکے قطب خاں کی شہادت کا بدلہ لینے پر آمادہ ہے۔ اس اطلاع پر ہمایوں خود ایک لاکھ سواروں کو لے کر بٹھانوں کی سرکوبی کے لیے نکلا۔ شیر شاہ پچاس ہزار سواروں کے ساتھ ٹنگ راستے پر گھائیوں اور غاروں میں دیکھا ہوا بیٹھا تھا اور شاہی لشکر کا راستہ روکے ہوئے تھا اس لیے دو مہینے تک وہاں ٹھہرا پڑا۔

اس عرصے میں ہمایوں کے لشکر میں بھر پھوٹ پڑ گئی۔ محمد سلطان مرزا (ہمایوں کے چچا) نے اپنے بیٹوں اور مرزا

کا مران کے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ غدار کی اور لشکر سے نکل کر واپس چلا گیا۔ کا مران مرزا پہلے ہی ساتھ نہیں آیا تھا اور لاہور کی طرف چلا گیا تھا۔ مغل ویسے ہی افغانوں سے خوف زدہ تھے۔ اس غدار کی باتوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی نوئی لشکر سے نکل کر فرار ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دو حصے سے زندہ فوج بھاگ گئی۔

دوسری مصیبت یہ آئی کہ ایک روز چانک بڑی سخت بارش شروع ہو گئی۔ سارے لشکر میں جل پھل ہو گیا۔ بادشاہ نے لشکر گاہ کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیا۔ خیمے اکھاڑے جانے لگے۔ سپاہی کچھڑ میں لت پت ساز و سامان اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ عین اس وقت شیر خاں دس بارہ ہزار سواروں کو لے کر نکلا اور دو طرف سے شاہی لشکر پر حملہ کر دیا۔ کسی کو ہتھیار اٹھانے کا موقع تک نہ مل سکا اور قتل عام شروع ہو گیا۔

یہ عظیم الشان فوج ایسی حواس باختہ ہوئی کہ لڑنے کے بجائے فرار کے لیے گنگا کے پل کی طرف دوڑی کہ دریا پار کر لے۔ پل پر ایسی دوڑ ہوئی کہ پل ٹوٹ گیا۔ بہت سے پل کمر کر گئے، بہت سوں کو دریا کے پانی نے غرق کر دیا۔

ہمایوں بھی اس عالم نا مرادی میں اپنے گھوڑے سمیت دریا میں کود گیا اور کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے پر جا اتر۔ وہ جب دریا میں کودا تھا اس کے ساتھ ایک ہزار آدمی تھے لیکن جب وہ دوسرے کنارے پر اتر تو اس کے ساتھ صرف آٹھ آدمی تھے جو زندہ بچے تھے۔ برہنہ سر، برہنہ پا، حواس باختہ ہمایوں آگرہ کی طرف چل پڑا۔

ننگے گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار یہ قافلہ 9 روز کا سفر طے کر کے آگرہ پہنچا۔ ہمایوں ایسا افسردہ خاطر تھا کہ قلعے میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔

”قلعوں میں تو بادشاہ قیام کرتے ہیں۔ اب میں بادشاہ نہیں رہا۔ ایک دہقانی نے باری چراغوں کو مل کر دیا۔ میں کہتا رہا کہ باریک اولاد! خود کو متفق و متحد رکھو۔ میری کسی نے نہیں سنی، میرے بھائی ہندوں نے مجھ سے غدار کی۔“ یہ ایسی مصیبت تھی کہ پہاڑ بھی ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ یہ ہمایوں کا پائے استقامت ہی تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں البتہ نا امید تھی جو اسے گھیرے کھڑی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب آگرہ شیر شاہ سے دور نہیں اور اسے روکنے والی طاقت کوئی نہیں۔

شیخ فریح الدین صفوی اسے بھلا پھسلا کر اپنے مکان پر لے گئے۔ لوگ اس کے پاس یوں آ رہے تھے جیسے عیادت کو

آتے ہیں۔

شہنشاہ ہمایوں منسٹر مزاج ہو رہا تھا۔ اس وقت کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ کسی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک بار کی غیرت نے جوش مارا۔ ہندال کو حکم دیا۔ ”شاہی حرم کی بیگمات کو قلعے سے یہاں لے آؤ۔“

”وہ کس لیے بھائی صاحب؟“

”دیکھتے نہیں افغان ہماری ناموس کے کتنے قریب آ گئے ہیں۔ میں اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا تاکہ افغانوں کے ہاتھ ان کی طرف نہ بڑھ سکیں۔ اس کے بعد مجھے آزادی ہوگی۔ جس طرف چاہوں نکل جاؤں۔“

”گستاخی معاف! یہ فیصلہ قبل از وقت ہے۔“

”اب وقت کہاں ہے۔ شیر شاہ ضرور آگرہ کا رخ کرے گا۔“

”میں اس سے پہلے تمام بیگمات کو لاہور لے جاؤں گا۔ وہاں کا مران موجود ہے۔ اس کے پاس عظیم الشان فوج موجود ہے۔ اگر اس نے ساتھ نہیں بھی دیا تو ہمیں اتنا وقت مل جائے گا کہ ہم آگے بڑھ جائیں۔ آپ یہاں رہ کر حالات کا جائزہ لیجیے ورنہ آپ کو کبھی میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی لاہور چلے آئے۔ وہاں رہ کر دوبارہ اپنی سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔“

شیر شاہ کی تو جیسے مرادیں برآئیں۔ فقط ایک ہی فتح سے اس کو اتنے ہاتھی گھوڑے اور توپیں مل گئیں کہ ہندوستان کی فتح کے لیے اس کو آلات حرب کی کمی نہ رہی۔ دوسرے ہی دن اس نے گنگا پار کی اور فوج میں قیام کیا۔ یہاں سے اس نے اپنے سپہ سالار کو فوج دے کر آگرہ کے کی جانب روانہ کیا۔ بعد میں وہ خود بھی روانہ ہو گیا۔

مغلوں پر بے حد خوف طاری تھا۔ وہ آگرہ اور دہلی کی جانب سر پر چیر رکھ کر بھاگ رہے تھے لیکن کہیں جھڑپ نہ ہو سکی کیونکہ شیر شاہ کی فوج ایک منزل پیچھے تھی۔ جیسے ہی یہ خبر پہنچی کہ شیر شاہی فوجیں آمدنی طوفان کی طرح آگرہ کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہمایوں نے آگرہ خالی کیا اور فتح پور سیکری کی جانب بھاگا۔ اس نے یہاں صرف ایک دن گزارا اور پھر موجودہ بھرت پور کے شمالی حصے میں کاٹا پہاڑی کے سنان راستے سے گزرتے ہوئے ریواڑی پہنچ گیا۔

اس اثناء میں شیر شاہ کے ایک دوسرے دستے نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ مغرور شہنشاہ اور بھی زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ دہلی کے گرد و نواح سے سر پٹ بھاگا تو شیر شاہ کو فرصت مل

اس تمام عرصے میں بادشاہ اور تمام سکن پھاڑوں میں پنہا
گزین رہیں۔ اس تجویز کی سب نے مخالفت کی۔

مرزا ہندال کا کہنا تھا کہ شیرشاہ سے لڑنے کا ارادہ
ملتی کر دیا جائے۔ سندھ کو فتح کر کے ”کچھ“ کے راستے سے
گجرات پر قبضہ کر لیا جائے اور پھر وہیں تب تک انتظار کیا
جائے جب تک حملہ کرنے کا کوئی اچھا موقع نہ مل جائے۔
ایک تجویز یہ بھی آئی کہ کشمیر فتح کر لیا جائے تاکہ وقت
ضرورت تمام مغل وہاں پنہا لے سکیں۔

ہر شخص کی اپنی اپنی رائے تھی۔ کوئی بھی کسی کی تجویز پر
عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ دم بھر کو ایک چنگاری سی بھڑکی تھی
کہ تمام مغل ایک ہو جائیں گے، ہل بھر میں خواب ٹوٹ گیا۔
ہر شخص اپنا الگ راستہ تلاش کرنے لگا۔

موسم برسات شروع ہو چکا تھا۔ کسی فوجی بہم پر عمل نہیں
ہو سکتا تھا۔ ایک اندھیری رات میں ہمایوں کے دل میں ایک
خیال جگنو کی طرح چکا۔ یہ ایسا خیال تھا جو کسی مفتوح ہی کے
دل میں آ سکتا تھا۔ اس نے شیرشاہ کے نام ایک خط تحریر کیا
جس میں اس نے شیرشاہ کی منت ساجت کی تھی اور لکھا تھا کہ
وہ اس (ہمایوں) کے لیے کم از کم سر ہند کے پار پنجاب کا
علاقہ چھوڑ دے۔

یہ خط اس نے لاہور کے صدر قاضی کے حوالے کیا اور
اسے شیرشاہ کے پاس روانہ کر دیا۔ شیرشاہ اس وقت دہلی میں تھا۔
شیرشاہ نے خط پڑھا۔ اس کے چہرے پر ایک
مسکراہٹ ابھری۔ فتح کا انشور اور گہرا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں
کو جنبش ہوئی۔

”ہمایوں سے کہنا، شیرشاہ نے تمہارے لیے کابل
چھوڑ دیا ہے، وہیں چلے جاؤ۔“

قاضی عبداللہ کی زبانی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمایوں اور
اس کے بھائیوں میں جو صلح اور مصالحت کی بات چیت چل رہی
تھی، وہ ختم ہو چکی ہے چنانچہ اس اختلاف کا فائدہ اٹھا کر وہ دہلی
سے سر ہند کی جانب روانہ ہو گیا اور اپنے سپہ سالار خواص خاں کو
بھی حکم دیا کہ وہ سچ پار کرے۔ یہ خبر سنتے ہی کامران مرزا نے
ہمایوں کو لاہور میں چھوڑا اور خود فرار ہو گیا۔

جب ہمایوں کو یہ خبر ملی کہ دشمن نے بیس دریا پار کر لیا ہے
تو لاہور میں روز قیامت پھا ہو گیا۔ مغل خاندان داری کا دولاکھ کا
ایک قافلہ طوفانی دھار کی مانند دریائے راوی کو پار کر کے مغرب
کی سمت بے سروسامانی کی حالت میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔

ہمایوں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا، بالآخر اس نے
سندھ جانے کا ارادہ کر لیا اور جہنم کے مشرقی کنارے سے

گئی۔ وہ آگرہ پہنچا اور وہاں کے انتظام و انصرام میں مشغول
ہو گیا۔ دو ہفتے قیام کے بعد وہ دہلی پہنچ گیا۔

ہمایوں روہتک کی جانب تیزی سے بھاگے چلے جا رہا
تھا۔ اس مصیبت کے وقت میں روہتک کے فوجی دستے نے
اسے شہر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ شہر کے دروازے بند تھے
اور ہمایوں ان لوگوں کے ساتھ جو ریوازی سے دہلی کے سفر
میں ہمایوں کے ساتھ ہو لیے تھے حیران پریشان کھڑا تھا۔
کھلے آسمان کو کبھی اپنے سائے کو دیکھ رہا تھا جو اس سے دور
ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مرزا ہندال جو بیگمات کو لے کر اپنی
جاگیر الوری کی طرف چلا گیا تھا اب لاہور جانے کے لیے نکلا
تھا، ہمایوں سے آلا۔ دونوں کے سپاہیوں نے روہتک پر حملہ
کر دیا۔ اس کا منشا یہاں ٹھہرا نہیں تھا بلکہ اس حملے کا مقصد
اپنی عزت و آبرو بچانا تھا۔ انواہیں اثر رہی تھیں کہ شیر خاں
روہتک کی طرف آ رہا ہے۔ ہمایوں سر ہند کی طرف بھاگا۔

شیرشاہ نے اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا تھا کہ کسی
مرسلے پر بھی بادشاہ سے جھڑپ کا موقع نہ آئے۔ بس اسے
آگے کی طرف دھکیلتے رہو یہاں تک کہ وہ ملکی سرحدوں سے
باہر نکل جائے۔

ہمایوں نے سر ہند پہنچ کر مرزا ہندال کو وہیں چھوڑا اور
ہدایت کی کہ وہ تعاقب کرنے والوں کا راستہ روکے رکھے اور
خود وہاں سے نکل کر جالندھر پہنچ گیا۔ کچھ دنوں میں مرزا
ہندال بھی اس سے آ کر مل گیا۔ یہاں کسی نے ان کا تعاقب
نہیں کیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے شیرشاہ خود یہ چاہتا ہو کہ وہ
لاہور تک بے آسانی چلا جائے۔

ہمایوں لاہور پہنچا تو سب بچھڑے ہوئے لاہور پہنچ
چکے تھے۔ وہ بھی جنہوں نے اس سے غداری کی تھی اور وہ بھی
جو اتفاق الگ الگ ہو گئے تھے۔ سب شیرشاہ کے ڈسے
ہوئے تھے۔ خستہ و خراب تھے، سب کا دشمن مشترک تھا۔ سب
مغل تھے اور افغانی ان کے دشمن تھے۔ مغلوں کی آن بھی
بچانی تھی اور اقتدار بھی۔ ہر فرد صلح و مصالحت کی بات کرنے
لگا۔ ہمایوں کے پہنچنے ہی سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔

ہمایوں کی آواز گونج رہی تھی۔

”حضرات! اگر ہم لوگوں کی باہمی نا اتفاقی، بغض
و کینہ کی وجہ سے ہندوستان تیوری خاندان سے نکل کر ناکسوں
کے تسلط میں چلا گیا تو اہل مغل ہم کو کیا کہیں گے؟“

اقتدار بچانے کے لیے تجویز کا بازار گرم ہو گیا۔ مرزا
کامران نے تجویز پیش کی کہ وہ خاندان کی سب بیگمات کو
کابل چھوڑ آئے اور وہاں سے ایک فوج لے کر واپس آئے۔

ہم سے ہیں یہ عھفیں ہم سے دل لگانا ہے
اور کیا ہے چاہیے ہم سے ہی زمانہ ہے



روح افزا اور کیا چاہیے!

ہمدرد

ہوتے ہوئے متان پہنچنے کے لیے جنوب کی سمت کوچ کر دیا۔ کچھ منزلوں تک مرزا ہندال اس کے ساتھ رہا اور پھر ایسی بے مروتی دکھائی کہ خوشاب کے مقام پر ہمایوں سے علیحدہ ہو گیا۔ شیر شاہ کی فوج بھاگتے ہوئے مغلوں کے قریب آتی جاری تھی۔ اب ہمایوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہذا وہ مغرب کی سمت بھاگا اور دریائے جہلم عبور کر کے اس پار چلا گیا۔ اتفاق سے کامران مرزا بھی یہیں تھا۔ اس وقت شیر شاہ، جہلم کے دوسرے کنارے پر تھا۔ دہشت ایسی تھی کہ دونوں بھاگی دریائے سندھ کی طرف بھاگتے رہے۔ اب یہ دونوں ایک تنگ درے کے پاس کھڑے تھے۔ یہاں سے سڑک دو جانب جاتی تھی۔ ایک ملتان کی طرف اور دوسری کوہاٹ ہوتے ہوئے کامل جاتی تھی۔

کامران مرزا، بھاگی کے ساتھ سفر ضرور کر رہا تھا لیکن ابھی تک دل صاف نہیں تھا۔ اس نے سوچا جو اس درے کو پہلے پار کر لے گا وہ راستے کے انتخاب میں آزاد ہوگا۔ اگر ہمایوں درے میں داخل ہو گیا تو ممکن ہے وہ ملتان جانے کے بجائے کامل چلا جائے اور کامل پر قبضہ کر لے۔ کامران تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا کہ اس درے کو پہلے وہ پار کرے گا۔ اس لشکر میں ایک درویش ابوالہنا نامی بھی سفر کر رہا تھا۔ دونوں نے اس کا فیصلہ اس فقیر پر چھوڑ دیا۔ اس نے فیصلہ ہمایوں کے حق میں دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بادشاہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہ بڑا بھائی تھا۔

چند میل دور جا کر یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ دونوں بھاگی اس مقام پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شیر شاہ نے خوشاب میں قیام کیا اور تمام قابل افسروں کو فوجی دستوں کے ساتھ مغلوں کی تلاش میں اطراف و جوانب بھیج دیا۔ اپنے سپہ سالار خواص خاں کو حکم دیا کہ وہ جہلم کے مغربی کنارے کنارے ہمایوں کے تعاقب میں جائے۔ حسب سابق یہ ہدایت بھی کر دی کہ بادشاہ سے لڑائی کی نوبت نہ آئے بلکہ متواتر اس کا پیچھا کرتے رہو جب تک کہ وہ سلطنت کی حدود سے باہر نہ چلا جائے۔ خواص خاں یہ سنتے ہی روانہ ہو گیا تھا لیکن وہ ہمایوں سے سات منزل دور تھا۔

خواص خاں، ہمایوں کے راستے کا پتا لگاتے لگاتے ستانج کے شمالی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہاں سے خواص خاں کو ہمایوں کے راستے کا پتا نہ لگ سکا کیونکہ ہمایوں روہڑی کی سیدھی سڑک چھوڑ کر جنوب مشرق کی جانب مڑ گیا تھا۔

جنوری 1541ء کے آخری ہفتے میں وہ خستہ حال روہڑی پہنچا تو اس نے سکھر کے شاہ حسین ارغون کے فوجدار

سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس قلعہ کو اس کے حوالے کر دے اور اسے وہاں سکونت پذیر ہونے دے۔ فوجدار ڈر گیا اور اس نے کئی سوکشتیوں پر غلہ لاد کر ہمایوں کے لشکر میں بھیج دیا۔ اس کامیابی نے ہمایوں کا حوصلہ بلند کر دیا۔ اس نے سندھ کے فرمانروا شاہ حسین کو پیغام بھیجا کہ وہ فوراً اس کے دربار میں حاضر ہو۔ اگر تاخیر ہوئی تو وہ ٹھٹھہ (صدر مقام) پر حملہ کر دے گا۔

ہمایوں انتظار کر رہا تھا کہ شاہ حسین اس کے پاس حاضر ہو جائے گا لیکن اسے یہ خبر ملی کہ شاہ حسین نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے اور جو رسد اس کے فوجدار نے روانہ کی تھی اسے بھی راستے ہی میں ضائع کر دیا۔

ہمایوں کے پاس نہ تو بے خانہ تھانہ، کشتیاں پھر بھی اس نے بذات خود اس جزیرے کا گھیراؤ کر لیا اور مرزا ہندال اور یادگار مرزا کو جو دریائے پارک کے سندھ کے مغربی کنارے پر لاڑکانہ میں باتر کے مقام پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے، سیون کے قلعے پر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن کسی نے اس کے حکم پر عمل نہیں کیا۔

جب بھکر میں غلہ نایاب ہو گیا تو ہمایوں کوچ کر کے باتر پہنچا جہاں مرزا ہندال قیام کیے ہوئے تھا۔ یہاں آنے کا مقصد یہ تھا کہ مرزا ہندال کو سمجھا بھجھا کر اپنے ساتھ ملا لے۔

جب بادشاہ مرزا ہندال کی قیام گاہ پر پہنچا اور دور اتریں اور ایک دن مرزا ہندال سے ضروری باتیں ہو چکیں تو مرزا ہندال کے حرم اور باقی تمام لوگ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام پیش کیا۔ ہمایوں باری باری سب کا سلام قبول کر رہا تھا کہ ایک لڑکی کود کچھ کر چوک گیا۔ چودہ پندرہ سال کی یہ لڑکی نہایت حسین اور باتھیز تھی، سلام پیش کر کے واپس پلٹ رہی تھی کہ کسی چیز میں پاؤں الجھا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ ہمایوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔ اس لڑکی نے سنبھلتے سنبھلتے ایک سلام اور کیا، یہ شکر یہ کا سلام تھا۔

جب وہ لڑکی جا چکی تو ہمایوں نے اس کی بابت پوچھا۔ ”یہ ذات شریف کون ہیں جو ابھی ابھی گری اور سنبھلی تھیں۔“ ”یہ دختر میر بابا دوست ہیں۔ میر بابا دوست میرے استاد تھے۔ ان کے بعد یہ لڑکی میری کفالت میں ہے۔“

”ہم نے نام پوچھا چاہا تھا۔“ ”اس کے والد نے اس کا نام حمیدہ بانو بیگم رکھا تھا۔“ اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ہمایوں اس لڑکی پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ یہ تو خود ہمایوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے تو اس وقت معلوم ہوا جب وہ اپنی سوتیلی

ماں دلدار بیگم سے ملاقات کے لیے گیا اور بے اختیار کہہ اٹھا۔ ”ہم چاہتے ہیں حمیدہ بیگم ہمارے عقد میں آجائیں۔“

”کون حمیدہ بیگم۔“ بادشاہ کی والدہ نے کہا۔ ”وہی جو کل بجرے کے وقت گرنے لگی تھیں۔“

”آپ بابا دوست کی دختر کی بات کر رہے ہیں تو ان کے کفیل مرزا ہندال ہیں۔ اس سلسلے میں تو وہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔“

”وہ کون سے دور ہیں۔ انہیں بھی بلا لیا جائے۔“ کچھ دیر میں مرزا ہندال بھی آگئے۔ بادشاہ نے مرزا ہندال کے سامنے بھی یہی سوال رکھا لیکن مرزا کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر بادشاہ کو تعجب ہوا۔

”ہندال، کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔ کیا مجھ سے بہتر بھی کوئی رشتہ ہو سکتا ہے؟“

”آپ بادشاہ ہیں اسی لیے مجھے کچھ سوچنا پڑ رہا ہے۔“

”ہم کچھ سمجھے نہیں ہندال۔“

”آپ بادشاہ ہیں۔ سہاوا ٹھیک ٹھیک اور مناسب گزراوقات نہ ہونے پائے اور یہ بات باعث تکلیف بن جائے۔“

ہمایوں کو یہ بات اتنی ناگوار ہوئی کہ ناراض ہو کر اٹھ آیا۔

دلدار بیگم ہمایوں کی دلدار کی خواہاں تھیں لیکن مجبور بھی تھیں کہ حمیدہ بانو ان کے اختیار میں نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ حمیدہ کی والدہ کو اس شادی کے لیے مجبور کرتی رہیں۔ مرزا ہندال کو اعتراض تھا اس لیے وہ بھی کچھ نہ بولتی تھیں۔ ہمایوں کو بھی کئی کارکردہ لکھوایا۔

”لڑکی کی ماں اپنی بیٹی کو ترغیب دے رہی ہے۔ وہ جیسے ہی راضی ہوگی آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔“

ہمایوں نے بھی جواب میں لکھوا بھیجا۔ ”آپ نے جو حکایت لکھی ہے اس سے میں بہت خوش ہوا ہوں۔ آپ جو تجویز و تحریک فرمائیں گی میں اسے بسر و چشم قبول کروں گا۔ باقی آپ معاش کے سلسلے میں جو لکھیں گی اسے مان لیا جائے گا۔ میں چشم براہ ہوں۔“

اس شادی کا قصہ کیا چلا تھا، ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بہت کم لوگ حمایت کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ مخالف ہی تھے۔ مرزا ہندال نے تو اسے سیاسی مسئلہ بنا لیا تھا۔ خود حمیدہ بانو بھی اس شادی کے لیے تیار نہ ہوتی تھی۔

ہمایوں اپنی سوتیلی والدہ کے پاس بیٹھے تھے کہ جی چاہا

اس وقت حمیدہ بانو بھی ہوتی۔ دے لفظوں میں درخواست کی کہ کسی کو بھیج کر حمیدہ بیگم کو بلوائیں۔ فوراً ایک آدمی کو بھیج دیا گیا۔ وہ واپس تو آ گیا لیکن جواب ایسا لایا کہ ہمایوں طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

حمیدہ نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ ”اگر غرض یہ ہے کہ میں تسلیمات بجالاؤں تو میں یہ عزت پا چکی ہوں پھر میں کیوں آؤں؟“

”آپ دیکھ رہی ہیں، مرزا ہندال نے اس کے کیسے کان بھر دیے ہیں۔“

”بچی اپنی شرم میں نہ آئی ہوگی، اس میں ہندال کا کیا قصور؟ اگر ایسا ہی ہے تو ہندال سے کہو۔ وہ اپنا اثر استعمال کرے اور اسے یہاں بھیج دے۔“

اس بار جواب اور بھی زیادہ سخت آیا تھا۔ بیگم نے کہلا بھیجا تھا۔ ”بادشاہوں کو ایک بار دیکھ لینا تو جائز ہے دوسری مرتبہ جائز نہیں کیونکہ وہ نامحرم ہیں۔ اس لیے میں انہیں دیکھنے نہیں آؤں گی۔“

بادشاہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ”اگر میں نامحرم ہوں تو عمرم بن جاؤں گا۔“

خاندان میں شور مچا رہا۔ خود حمیدہ بانو بھی کسی طرح تیار نہیں ہوتی تھی۔ دلدار بیگم نے ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ آخر کار تم کسی نہ کسی شخص سے شادی کرو گی۔ بادشاہ سے کون آدمی بہتر ہے؟

حمیدہ بیگم نے بھی کیا خوب جواب دیا۔ ”یقیناً میں کسی آدمی سے ضرور شادی کروں گی لیکن ایسے آدمی سے جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے نہ کہ اس سے کہ میں اس کے دامن تک بھی نہ پہنچ سکوں۔“

یہ سوال جواب چلتے رہے اور بالآخر حمیدہ بانو تیار ہو گئی۔ ایک نیک ساعت میں ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا۔ مرزا ہندال اس نکاح سے اتنا برگشتہ ہوا کہ قدحہار کی طرف چل دیا۔ یادگار ناصر مرزا بھی قدحہار جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہمایوں نے یہ مشکل تمام اپنی طرف کر لیا اور اس شرط پر اس کو اپنے ساتھ روہڑی لایا کہ ہندوستان کی سلطنت تسخیر کرنے کے بعد ایک تباہی حصہ اس کو دیا جائے گا۔

ہمایوں کو اپنا عہد یاد آ گیا۔ شادی کے بھیسیوں نے سب کچھ بھلا دیا تھا، اس سے منٹے ہی اسے یاد آیا کہ وہ قلعہ سیون پر حملے کی غرض سے نکلا تھا۔ بھائیوں کی بے وفائی نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس سنے یادگار ناصر کو روہڑی کے محاصرے پر چھوڑا اور خود سیون چلا گیا۔ اس نے

دریا عبور کیا اور قلعہ سپہون کا محاصرہ کر لیا۔

ہمایوں کے پہنچنے سے قبل شاہ حسین کے امرا قلعے میں داخل ہو چکے تھے اور قلعے کی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا تھا لہذا ایک ایک مہینہ کر کے سات مہینے گزار گئے اور فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ ہمایوں نے تلخ آکر یادگار ناصر کو لکھا کہ وہ فوراً اس کی مدد کو آئے۔ ہم دونوں مل کر یہی اس قلعے کو فتح کر سکتے ہیں۔ اس اثنا میں شاہ حسین اپنا کام دھکا چاتا تھا۔ اس نے یادگار ناصر کو لالچ دیا کہ وہ اس کو بادشاہ تسلیم کر لے گا اور اپنا داماد بھی بنا لے گا۔ یہ سب لالچ اس لیے تھا کہ وہ ہمایوں کا ساتھ چھوڑ دے۔ اس کی یہ ترکیب کامیاب ہو گئی تھی۔ یادگار ناصر نے تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیا تاکہ ہمایوں کو دیارِ سندھ نہ پار کر سکے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ہمایوں کو گرفتار کرنے کی بھی راہ دیکھنے لگا۔ شاہ حسین کو دیارِ سندھ میں اترا اور ہمایوں کی ان تمام کشتیوں پر جو کہ سیہون پر انگر اعزاز تھیں، قبضہ کر لیا۔ ان میں اس کا تمام خزانہ لدا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی سوار تھے۔ جو مال و اسباب شیر شاہ کے حملوں سے بچ گیا تھا، وہ اب ہاتھ سے نکل گیا۔

ہمایوں مقامی زمینداروں کی مدد سے بہ مشکل تمام روہڑی کی جانب بچ کر نکل گیا لیکن یادگار ناصر، شاہ حسین کے پرکاوے میں آکر جنگ کرنے پر تیار بیٹھا تھا۔ اس کے یہ تیور دیکھتے تو ہمایوں نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ اس کے پڑوس سے ہٹ جائے پر کہاں جائے.....؟

جب تک ٹھٹھہ کی فتح کا یقین تھا اس نے زمیندار مالدیو کی عرضیوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ مالدیو ہندوستان کے معتبر زمینداروں میں سے ایک تھا۔ تسخیر ہندوستان میں مدد دینے کا وعدہ ہمایوں سے کر چکا تھا۔ اب ٹھٹھہ کی فتح کی طرف سے وہ مایوس بیوگیا تو اس نے اعلان کر دیا۔ ”میں اب مالدیو کے پاس جاؤں گا۔“

مختصر سی فوج اس کے پاس رہ گئی تھی کیونکہ اس کے زیادہ تر سپاہی داگدار مرزا (ہمایوں کے بیٹے) اور شاہ حسین (حاکم ٹھٹھہ) سے مل گئے تھے۔

سندھ کا سفر، ریگستان ہی ریگستان، گرمی، اجنبی راستے، عورتیں ساتھ۔ یہ لشکر کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے مالدیو کی ولایت کی حدود میں پہنچ کر رک گیا۔ اطمینان کی چادر سر پہنچی کہ مالدیو نہایت طاقتور زمیندار ہے۔ وہ شیر خاں سے خوش بھی نہیں ہے لہذا ہندوستان کی دوبارہ تسخیر میں وہ ضرور ہمایوں کی مدد کرے گا۔ ہمایوں ایک علاقے میں بیٹھا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ راجا مالدیو جو دھپور میں ہے۔ اس نے

اپنے ایک سفیر کو تحائف دے کر مالدیوے پاس بھیجا۔

ہمایوں اپنے سفیر کی واپسی کا انتظار کھڑی رہا تھا کہ اسے مالدیو کی نیت بدل جانے کی اطلاع ملی۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس اطلاع پر یقین کرے لیکن جب وہ سفیر واپس آگیا اور اس نے اس اطلاع کی بذات خود تصدیق کی تو ہمایوں کو مالدیو کی بے مروتی کا یقین ہو گیا۔

راجا مالدیو کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہمایوں کے پاس بہت مختصری فوج ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اگر ہمایوں کے پاس لاکھ دو لاکھ کا لشکر ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر شیر شاہ کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیر شاہ وہ علاقے بھی چھین لے جو اسے مل چکے ہیں۔

مالدیو نے حالانکہ یہ کہ ایک کثیر جماعت ہمایوں بادشاہ کی طرف بھیجی کہ اسے گرفتار کر کے لے آئیں اور سفیر کو رخصت نہیں کیا تا کہ ہمایوں غافل رہے لیکن سفیر کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اس نے ہمایوں کو خبردار کر دیا کہ مالدیو غدار پر آمادہ ہے۔ حتیٰ جلد ہو سکے اس کی ولایت سے دور طے جانا بہتر ہے۔

اطلاع مل چکی تھی لیکن شاید دیر سے ملی تھی۔ دوسری نماز کا وقت تھا کہ شواہد، المالیہ آن پہنچا ہے۔ کوئی ایسا گھوڑا قریب نہیں تھا جس پر حمیدہ بانو کو سوار کیا جاسکتا۔ وہ حاملہ تھی لہذا اونٹ کی سواری اس کے لیے مناسب نہیں تھی۔ بادشاہ نے اپنا گھوڑا حمیدہ بانو کو دیے اور خود اونٹ پر سوار ہوئے۔ مختصر سی جماعت ساتھ تھی۔ ایک رہبر کو ساتھ لے لیا تھا کہ راستہ دکھائے۔ گرم ہوا چل رہی تھی گھوڑے اور دوسرے چوپائے گھنٹوں گھنٹوں تک ریت میں دھنسنے جا رہے تھے اور مالہ بوتغا قب میں تھا۔

مالدو کا لشکر نزدیک آ گیا تھا۔ ہمایوں نے کچھ لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑا کہ وہ غنیمت کا راستہ روکیں اور خود آگے بڑھ گئے۔ وہ لشکر جو پیچھے چھوڑ آئے تھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ تین دن ہو گئے تھے، گھوڑوں کو پانی میسر نہیں آیا تھا۔ ایک جگہ پانی میسر آیا۔ یہیں اس کے وہ ساتھی بھی مل گئے جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ یہاں سے اس سفر کا پھر آغاز ہوا اور راستے کی اور بہت سی مشکلیں اٹھانے کے بعد یہ قافلہ عمر کوٹ پہنچ گیا۔

عمر کوٹ کا رانا ایسا باسروٹ نکلا کہ ہمایوں کے استقبال کے لیے خود باہر آیا اور ہمایوں کو قلعے کے اندر لے گیا۔ نالے کے باہر شاہی فوج نے قیام کیا۔

ہمایوں کو اعتماد میں لے کر حرف مطلب بیان کیا۔

”مہاراج (ہمایوں) آپ کا اور میرا دشمن مشترک ہے۔ شاہ حسین نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔ اب میں لشکر جمع کر کے اس سے بدلہ لینے جا رہا ہوں۔ آپ بھی اپنے آدمیوں کو لے کر میرے ساتھ چلیں۔“

ہماہوں نے شاہی حرم کو مرکز میں چھوڑا۔ ان میں حمیدہ بانو بیگم بھی تھیں جو حاملہ تھیں۔ حمیدہ بانو کے بھائی کو ان عورتوں کا نگران مقرر کیا اور خود رانا کے ساتھ بھکر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی وہ پندرہ بیس کوس پہنچا ہوگا کہ اس کا ایک معشوق جنگجو گھوڑا دوڑتے ہوئے آ پہنچا۔ اس وقت ہمایوں دس ہزار فوج کے ساتھ ایک باغ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ تروی بیگ نے خوش خبری سنائی کہ حمیدہ بانو کے بطن سے اللہ نے اسے فرزند عطا کیا ہے۔ ہمایوں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ اسے وہ خواب یاد آ گیا جو اس نے عرصہ پہلے لاہور میں دیکھا تھا۔ اسے کسی بزرگ نے بشارت کی تھی کہ ہمایوں غی شادی کرے گا۔ اس نبی سے ایک فرزند پیدا ہو گیا۔ اس کا نام جلال الدین اکبر رکھا جائے تو وہ ہندوستان پر حکومت کرے گا۔

اب جو فرزند پیدا ہوا تو ہمایوں کو یقین آ گیا کہ خواب سچا تھا۔ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ بہت جلد ہندوستان اس کے قبضے میں ہوگا۔ اس نے بیٹے کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھا۔ جب پرگنہ جون ہمایوں نے فتح کر لیا تو اہل حرم کو عمر کوٹ سے اپنے پاس بلا لیا۔ ان میں نومولود اکبر بھی تھا جس کی عمر اس وقت چھ ماہ کی تھی۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ متعلقین مل سکیں لیکن حوادث نے ابھی
 کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے امرا آپس میں لڑ پڑے اور ایک
 ایک کر کے الگ ہو تے رہے۔ جو لوگ اطراف سے آکر اس
 کے گرد جمع ہو گئے تھے، اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ کہا جاتا ہے
 صرف ہتر آدمی اس کے گرد رہ گئے تھے۔ ان میں اس کے
 بیٹے، بیٹیاں بھی شامل تھیں۔ ایسے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا۔
 معلوم ہوا میرم خاں گجرات سے اس کی مدد کو آن پہنچا ہے۔

بیرم خاں مغلیہ خاندان کا پرانا نمک خوار تھا۔ مہد
جہاں میں وہ اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ اس
وقت سے لے کر اب تک وہ مغلوں کا نمک خوار تھا۔ اس نے
سوچا کہ ہمایوں مشکل میں ہے تو وہ مدد کو آن پہنچا۔ بیرم خاں
اس وقت آیا تھا جب ہمایوں تنہا رہ گیا تھا اور ایران کی طرف
کوچ کا ارادہ کر چکا تھا۔ بیرم خاں نے بھی اس کے ساتھ چلے
گئے۔ مانی بھری۔ ہمایوں نے شاہ حسین کے پاس آدمی بھیج کر

دریا عبور کرنے کے لیے چند کشتیاں طلب کیں جو اس نے فوراً فراہم کر دیں۔ وہ تو خدا سے چاہتا تھا کہ یہ بلا کسی طرح نکلے۔ تو مولودا کبر کو سنا تھ لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے اس کو اس کی دایا کے پیر و در کے خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا۔ صرف اکبر کی والدہ اور چند خاندانوں کو سنا تھ لے کر دریا عبور کر گیا۔

شاہ حسین نے مرزا عسکری اور مرزا کامران کے پاس آدمی بھیجا اور اطلاع دی کہ ہمایوں قندھار چلا گیا ہے۔ بے مروت بھائیوں نے پہلے تو یہ کیا کہ لشکر گاہ پر حملہ کر کے ساز و سامان لوٹ لیا اور شہزادہ اکبر کو پہلے تو قلعہ قندھار میں لے جا کر رکھا۔ پھر کسی مصلحت کی بنا پر کابل کے قلعے میں پہنچا دیا۔ دوسری طرف مرزا کامران نے جو قندھار میں تھا ہمایوں کا راستہ روکا۔ ہمایوں قندھار جانے کے بجائے ایران کی طرف چلا گیا۔

ہمایوں مراحل طے کرتے ہوئے خراسان کے گرم ترین علاقہ سیستان جا پہنچا اور بیرم خاں کو شاہ طہماسپ صفوی کی خدمت میں بھیجا۔ اسی کے ہاتھوں اپنے تاجہ کا لکھا خط بھی روانہ کیا جس میں اپنے حالات کا تذکرہ کیا تھا اور یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کی مدد سے قندھار پر قبضہ کرنے کا خواہاں ہے۔

ہمایوں کے حالات ہی ایسے تھے کہ سناؤ ایران خط پڑھنے کے بعد آبدیدہ ہو گیا۔ اپنے امیروں کو متعین کر دیا اور حکم دیا کہ راستے میں ہر منزل پر کھانے پینے کی اشیاء مہیا کی جائیں اور گانے بجانے والے بھی متعین کیے جائیں جیسا کہ بادشاہوں کے شایان شان ہے۔

بادشاہ نے اس کے مزاج کا ایسا خیال رکھا کہ جب وہ اس کا مہمان ہوا تو اس کی دل بخشی کے خیال سے بھی اس شکست کا ذکر نہیں چھیڑا جو اسے افغانوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی۔ کبھی بھائیوں نے خود بھی تذکرہ کرنا چاہا تو اسے تسلی دے کر خاموش کر دیا۔

ایک روز اتفاق سے ذکر پھڑ گیا۔ بھائیوں نے بھی یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ ”بھائیوں کی منافقت ہی کی وجہ سے دشمن اساطور ہو گیا تھا۔“

شاہ سلیمان، ہمایوں کی اس مختصر بیانی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کی امداد کے لیے دل و جان سے حاضر ہو گیا اور اسے تیس ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج مہیا کر دی۔ ہمایوں نے چلے وقت عہد کیا کہ وہ فتح کے بعد قندھار، شاہ کے بیٹے شہزادہ مراد کی نذر کر دے گا۔

ہمایوں اس نوح کو لے کر روانہ ہوا اور راستے کے قلعوں کو فتح کرتے ہوئے قندھار پہنچ گیا۔ قندھار پر مرزا

عسکری قابض تھا۔ ہمایوں نے چھ مہینے کے عرصے کے بعد اس کو شکست دی اور قلعے پر قبضہ کر لیا اور حسب معاہدہ قندھار شہزادہ محمد مراد کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔

عرصہ دراز کے بعد وہ کسی فتح سے دوچار ہوا تھا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اب اسے کامل فتح کرنا تھا۔ اس وقت اس کے عزائم ایسے تھے کہ پہاڑ کو چوٹی بھٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ شہزادہ مراد کے فوت ہو جانے کی خبر پہنچی۔

جس وقت یہ خبر پہنچی، اس وقت کچھ لوگ ہمایوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ کامل فتح ہونے تک اہل و عیال کو قلعہ قندھار میں رکھا جائے۔ ہمایوں نے کچھ لوگوں کو قلعہ قندھار کی طرف واپس بھیجا۔ قزلباش قلعہ دار نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب قلعہ ہماری تحویل میں آچکا ہے۔ اس لیے اب ہم کسی کو بھی قلعے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

یہ بات ہمایوں کو بڑی ناگوار گزری۔ بیرم خاں اور دوسرے امرا نے فیصلہ کر لیا کہ ہر قیمت پر قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لینا چاہیے۔

قندھار پر قبضے کی یہ تدبیر کی گئی کہ چند ہندوستانی اور منسل سپاہیوں کو اونٹوں پر گھاس اور جلانے کی لکڑیاں دے کر شہر میں پہنچا دیا۔ اسی طرح چند دن تک ہمایوں کے لشکری گھاس کے گھسے لے کر شہر میں آتے جاتے رہے۔ ان گھسوں میں ہتھیار تھے جو اندر پہنچتے رہے پھر ایک رات جب دربان اور محافظ غافل تھے، سپاہی ہتھیار لے کر ان پر ٹوٹ پڑے اور قلعے کے دروازے کھول دیے قلعہ دار کو اس وقت خبر ملی جب سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لشکر قلعے کے قریب ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اشارہ پاتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ قلعہ دار نے لڑائی کو بے سود جانا اور قلعے سے نکل کر عراق کی طرف بھاگ گیا۔

ہمایوں نے قندھار بیرم خاں کے سپرد کیا اور خود کامل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب ہمایوں کا لشکر کامل کے دروازوں پر پہنچا تو مرزا کامران اپنی جان بچا کر غزنی بھاگ گیا۔ ہمایوں فتح کے تقاریرے بجاتے ہوئے کامل میں داخل ہوا۔

مرزا عسکری، شہزادہ اکبر کو کامل لے آیا تھا۔ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی اسے فتح کا یہ انعام ملا کہ بھڑے ہوئے بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوئیں۔ حمیدہ بیگم تو ماں تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کتنی زور سے لپٹا کر پیار کریں۔

مرزا کو دیکھ رہی تھی۔

”بہن! تمہارا شکر یہ کہ تم نے میرے بیٹے کو زندہ رکھا۔ اس کے بدلے میں تمہیں کیا دے سکتی ہوں؟“ حمیدہ بانو نے کہا۔

”زندگی کا بدلہ زندگی ہوتی ہے۔ میرے شوہر کی زندگی بچا لو۔ اگر وہ اطاعت پر آمادہ ہوں تو ان کی جان بخشی کی جائے۔“

”بہن میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔“

حمیدہ بانو نے ہمایوں کو راضی کر لیا کہ اس احسان کے بدلے میں اپنے بھائی کو معاف کر دے۔ مرزا عسکری نہایت شرمندگی کے ساتھ ہمایوں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ گزشتہ باتوں کا مطلق ذکر نہیں ہوا۔ منسل قبائل کے سردار گردن میں گوار لٹکا کر اور کفن ہاتھ میں لے کر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہمایوں نے فراخ دلی سے اسے معاف کر دیا۔ اس احسان کا بدلہ اس نے یہ دیا کہ بدلتی کو کام میں لایا اور موقع ملنے ہی فرار ہو گیا۔

مرزا کامران نے پہلے تو پٹھانوں کے پاس جا کر پناہ لی تھی مگر اسے وہاں سے بڑی بے آبروئی کے ساتھ نکلنا پڑا۔ وہ بھگ کر چلا گیا اور کچھ دن اپنے چچا زاد بھائی شاہ حسین کامہمان رہا۔ یہیں اسے یہ اطلاع ملی کہ ہمایوں بادشاہ بدخشاں کی طرف گیا ہوا ہے۔ اس نے لشکر فراہم کیا اور تیزی سے یلغار کرتے ہوئے کامل پہنچ گیا اور اندھیری رات میں قلعے کے نیچے جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ جیسے ہی صبح کے وقت قلعے کے دروازے کھولے گئے۔ اس کا لشکر اچانک اندر داخل ہو گیا اور قبضہ کر کے چند امیروں کو قتل کر دیا۔

یہ سن کر ہمایوں نے بدخشاں سے لوٹ کر دوبارہ کامل کا محاصرہ کر لیا اور چند دن کے اندر ہی کامران کو وہاں سے بے دخل کر دیا مگر وہ بھی چھٹلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس نے تین مرتبہ کبھی تو مرزا عسکری کی مدد سے، کبھی دوسرے مرزاؤں سے ساز باز کر کے کامل پر قبضہ کر لیا۔ ہمایوں نے ہر مرتبہ اسے نکال باہر کیا اور بالآخر ہمایوں نے اسے اندھا کر کے کعبۃ اللہ بھجوا دیا۔

مرزا ہندال کے سر میں بھی خود سری کی ہوا بھری۔ اس نے ہمایوں کے لشکر پر شب خون مارا مگر جلد ہی گرفتار ہو کر آیا اور قتل کر دیا گیا۔

مرزا کامران کا بھی حشر اچھا نہیں ہوا۔ وہ کعبۃ اللہ گیا ضرور لیکن جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

☆☆☆

برکات کے انتظام کے بعد شیر شاہ آگرہ آیا اور وہاں کا بندوبست کرنے کے بعد سکھ اور خطبہ اپنے نام جاری کیا اور مالوہ کی تسخیر کے ارادے سے گوالیار کا رخ کیا۔

شیر شاہ کی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ مالوہ اور ماڑواڑ کی فتوحات اس کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ بہترین منتظم اور نہایت دلیر تھا۔ اس نے نہ صرف ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا بلکہ ہمایوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستان پر پانچ سال تک نہایت کروفر سے حکومت کی لیکن اس کی وفات کے ساتھ ہی پٹھانوں میں پھوٹ پڑنے لگی۔ اس کا جانشین سلیم شاہ بھر بھی کچھ لائق بادشاہ تھا لیکن اس کے انتقال نے بغاوتوں کے دروازے کھول دیے۔

ہمایوں کے کانوں تک یہ خبریں برابر پہنچ رہی تھیں لیکن ابھی وہ ہندوستان پر حملے کے حق میں نہیں تھا بلکہ اس عرصے میں وہ دوسرے ملک، سیستان اور کشمیر پر فوج کشی کر کے مخالفوں کو نیچا دکھا کر کامل واپس آتا رہا تھا۔

سکندر شاہ سوری نے فتح و غلبہ کے بعد تمام سوری سرداروں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہونے کے لیے یہ تقریر شروع کی۔

”اب میں صاف صاف یہ کہتا ہوں کہ میں سلطنت کے قابل نہیں ہوں۔ تم سے میری درخواست ہے کہ جس کو تم اس کا اہل جانتے ہو اسے تخت پر بٹھا دو۔ میں اس کا اطاعت گزار رہوں گا لیکن اچھی طرح یاد رکھو کہ اس نازک وقت میں جبکہ ہمایوں نے قزلباشوں کا ایک خون خوار اور جرار لشکر لے کر اپنے ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ کامل کو بھی فتح کر چکا ہے اور اپنے بھائیوں کی سرکوبی کر کے بہت جلد ہندوستان میں داخل ہونے والا ہے۔ ہم پٹھانوں میں لوہیوں اور سوریوں کی نزاع رہا ہے۔ یہ خاندانی جھگڑے اس ملک سے ہماری سلطنت کا قطع قلع کر دیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم غنیمت کامل کر رہا ہے۔“

اس تقریر پر تمام پٹھان سرداروں نے اتفاق و اتحاد کی قسمیں کھائیں اور اطاعت کے عہد و پیمان کر کے سکندر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا جو شیر شاہ کا چچا زاد بھائی تھا۔

اس تقریر نے ابھی پر پڑے نکالے بھی نہیں تھے کہ ہمایوں کی ہندوستان آمد کی اطلاعات پہنچنے لگیں۔ ان اطلاعات نے اتفاق کی جگہ انتشار پھیلادیا۔ اس وقت تک افغانی اقوام گلوڑوں میں بٹ چکی تھیں۔ ہر قوم اپنی اپنی جاگیر میں خوش تھی۔ ممکن ہے سکندر شاہ انہیں آپس میں ملوادیتا لیکن ہمایوں کے ہندوستان پہنچنے کی اطلاع نے ان سب کو

اپنے اپنے دفاع میں مشغول کر دیا۔ ہر طرف دہی افراتفری پھیلی ہوئی تھی جیسے کبھی شیر شاہ کی موجودگی سے منسل خائف رہا کرتے تھے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرائی تھی۔ اب افغانوں پر وہی وقت آ رہا تھا حالانکہ ابھی ہمایوں ہندوستان پہنچا نہیں تھا۔ صرف اس کی خبریں تھیں جو دہشت بن کر چھاری تھیں۔

☆☆☆

ہمایوں کامل میں تھا۔ ہندوستان پر حملے کا عزم کر چکا تھا لیکن ابھی سوار نہیں ہوا تھا۔ شکار کا موسم تھا اور وہ ہندوستان پر حملے میں الجھ کر اس موسم سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔

وہ مقتدر امرا کے ہمراہ شکار کے لیے سوار ہوا اور ازراہ تعین فرمایا۔

”اس وقت تین آدمی یکے بعد دیگرے راستے میں ملیں، ان کے نام دریافت کر کے قال کا اندازہ کیا جائے، شاید اس قال سے اندازہ ہو کہ ہندوستان پر حملے کا نتیجہ کیا ہوگا؟“

قالہ روانہ ہوا۔ پہلا شخص جو سامنے آیا، اس کا نام دریافت کیا گیا۔ اس نے جواب دیا، میرا نام دولت خواجہ ہے۔ ہمایوں نے اس کو بشارت سمجھا اور اس شخص کو انعام و اکرام عطا کر کے جانے دیا۔ جب کچھ اور آگے بڑھے تو ایک اور یہابی ملا۔

”اے شخص، تیرا نام کیا ہے؟“

”میرا نام مراد خواجہ ہے۔“

”خوب ہو اگر تیرا آدمی اپنا نام سعادت خواجہ بتائے۔“ ہمایوں نے کہا۔

جب کچھ اور راستے طے ہوا تو ایک شخص دکھائی دیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس تیسرے آدمی نے اپنا نام سعادت خواجہ بتایا۔

اس عجیب و غریب واقعے پر ہمراہی تعجب کرنے لگے۔ سب کو یقین آ گیا کہ امداد غیبی ہمارے ساتھ ہے، ہمیں ہندوستان میں ضرور فتح نصیب ہوگی۔

اس قال نیک کے بعد ہمایوں نے اپنی سلطنت واپس لینے کے لیے لشکر ترتیب دیا اور روانہ ہو گیا اور کہیں رکے بغیر پشاور جا کر قیام کیا۔ قندھار کا حاکم بیرم خاں حسب الحکم حاضر ہوا۔ شاہی لشکر دریاے سندھ سے گزرا۔ روہتاس کا حاکم تاتارا خاں کا شی تھا۔ قلعہ مستحکم ہونے کے باوجود وہ مقابلے پر نہ ٹھہر سکا اور فرار ہو گیا۔ ہمایوں کوچ پر کوچ کرتے ہوئے لاہور کی طرف متوجہ ہوا۔ لاہور کے افغان ہمایوں کے لشکر کی آمد کی خبر پا کر فرار ہو گئے۔ ہمایوں بغیر جنگ کے شہر لاہور میں داخل ہو گیا۔

اور دوستوں کی کمی کے باوجود جنگ کرنا طے ہوا چنانچہ کوچ کر کے دریائے سندھ کو عبور کیا۔

افغان لشکر کو شام کے قریب ان لوگوں کے دریا عبور کرنے کی اطلاع پہنچی۔ سورج ڈوب رہا تھا کہ دونوں لشکر مقابل ہوئے۔ مغلوں نے تیر اندازی شروع کی تو افغانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے محل تیر انداز دکھائی نہیں دیتے تھے۔ افغانوں نے روشنی کے حصول کے لیے قریب کے گاؤں کو آگ لگا دی۔ پھونس کے مکان شعلہ بن کر بھڑکے، میدان جنگ روشن ہو گیا۔ افغانوں کے لیے یہ ترکیب اٹلی پڑ گئی۔ محل تیر اندازوں کو نشانہ لینے میں جو دشواری پیش آ رہی تھی وہ بھی دور ہو گئی۔ روشنی میں افغان بہ آسانی تیروں کا نشانہ بننے لگے۔

بیرم خاں کی بہادری نے تو پاناسای پلٹ دیا۔ اس نے اپنے امیروں کو بھی اطلاع نہیں دی۔ بس اپنے خاصہ کے سواروں کو لے کر وہ اچانک دشمن پر جا پڑا اور ایسا بھرپور حملہ کیا کہ دشمن کو شکست فاش ہوئی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ چغتائی لشکر کو اس معرکے میں ہاتھی گھوڑے اور بڑا مال و اسباب ہاتھ آیا۔

بیرم خاں لوٹ کر آیا تو ہمایوں نے بڑی قدر افزائی کی اور خان خانان یا روفادار کا خطاب مرحمت کیا۔

سکندر شاہ کو جب اس شکست کی اطلاع ملی تو ہوش اڑ گئے۔ اس فتح کے نتیجے میں ہمایوں کو دہلی کے ارد گرد کے کئی پرگوں پر قبضہ حاصل ہو گیا تھا اور اب دہلی کا تخت ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔ سکندر شاہ نے پٹنانون کے تمام قبائل کو یکجا کیا اور انہیں یہ باور کرایا کہ آپس کی نا اتفاقی ہمایوں کے قدم جمانے میں معاون ثابت ہوگی۔ اس وقت ہمیں تمام اختلافات بھلا کر ہمایوں کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے۔

”دیکھ لو جب“ فلوں میں پھوٹ پڑی تھی تو ہمایوں جیسا خاتو ر بادشاہ گھاس پھوس کی طرح ہوا میں اڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی سلطنت چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ برسوں صحراؤں کی خاک چھانتا بھڑا۔ وہ بھر طوفان بن کر سامنے آیا ہے۔ اب تک مغل ہندوستان میں نظر نہیں آتے تھے اب وہ ایک مرتبہ پھر ہر طرف گھومیں پھریں گے اور ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ میرے ساتھ شامل ہو جاؤ اور دشمن کا مقابلہ کرو۔“

سکندر شاہ کے گرد 80 ہزار کا لشکر جمع ہو گیا۔ بے شمار ہاتھی اور تعداد تو نہیں اس کے علاوہ تھیں۔

ایک آمد جمی تھی جو لشکر کی صورت میں نمایاں ہوئی اور سر

ہمایوں اپنی قیام گاہ پر بیٹھا اس زمانے کو یاد کر رہا تھا جب وہ شیر شاہ سوری کے لشکر سے شکست کھا کر لاپٹا لاہور کی طرف بھاگا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اس سے غداری کی تھی اور اسے لاہور سے بھی فرار ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد اس نے کسی کسی تکالیف اٹھائی تھیں۔ ایک ایک تکلیف کا ڈانڈا اس کی زبان پر اب بھی موجود تھا۔ وہ اب بھی لاہور میں موجود ہے لیکن ایک فلاح کی حیثیت سے۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف پندرہ ہزار سوار ہیں لیکن فتح اس کے قدم چوم رہی ہے۔ اب دہلی دور نہیں۔ دہلی کا خیال آتے ہی کیسے کیسے مناظر آنکھوں کے سامنے آگئے۔ وہ ایک آہ سرد بھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہراول دستے کے امرا جاں دھڑا اور سر ہند کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ہمایوں بے چینی سے ان کی واپسی کا منتظر تھا۔ اگر انہیں ان محاذوں پر فتح مل جاتی ہے تو پھر دہلی کے دروازے مغلوں کے لیے کھلے ہوئے ہوتے۔

افغانوں پر ہمایوں کی دہشت اس وقت کچھ ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کوئی بھی مقابلے پر آنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ علاقے بھی بغیر جنگ کے محل لشکریوں کے قبضے میں آگئے۔ عساکر ہمایوں لاہور میں کیمپ لگائے بیٹھی تھیں کہ اطلاع ملی۔ سکندر شاہ کی طرف سے تا تا رخاں اور بیت خاں چالیس ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے آرہے ہیں۔

”بیرم خاں!“ ہمایوں کی آواز نے بیرم خاں کو حاضر کر دیا۔

”بیرم خاں شہنشاہ ہند کے حضور حاضر ہے۔“

”جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ سکندر شاہ کا لشکر مقابلے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ پیش خانہ لگایا جائے ہم خود مقابلے کے لیے روانہ ہوں گے۔“

”گستاخی معاف! حضرت کا مقابلے پر جانا مناسب نہیں۔“

”کیا تم نہیں جانتے کہ ہندوستان پر قدم رکھنے کے بعد یہ ہماری پہلی باقاعدہ جنگ ہوگی۔ اس فتح میں خیروری ہے۔“

”میری اطلاع کے مطابق سکندر شاہ اس لشکر کے ساتھ موجود نہیں۔ اس لیے آپ بھی یہ کام میرے سپرد کیجیے۔“

”اس جنگ میں فتح پر ہماری کامیابی کا دار و مدار ہے۔“

”یہ غلام اس فتح کو جیتتی بنائے گا۔“

بیرم خاں کی بہادری کسی سے دھکی چھپی نہیں تھی۔ ہمایوں میٹروں مرتبہ اس کی وفاداری اور بہادری کا امتحان لے چکا تھا۔ اس کی درخواست پر ہمایوں لاہور میں ٹھہرا رہا اور اس مقابلے کے لیے بیرم خاں کو نامزد کر کے رخصت کیا۔

اس کے گرد جمع ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمایوں نے اس کے ازالے کے لیے بیرم خاں کو شہزادہ محمد اکبر کی اتالیقی پر مقرر کیا اور شہزادے کی ہمرای میں سکندر کو دفع کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔

ملک کا سارا نظم و نسق بگڑا ہوا تھا۔ ہمایوں نے از سر نو انتظامات کرائے۔ امیروں کو ان کے صوبوں کی طرف روانہ کیا۔ دہلی کے انتظامات منٹ چکے تھے۔ اب وہ دہلی سے آگرہ جانا چاہتا تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ بادشاہ کی جانب سے حکم جاری ہوا کہ کل صبح کوچ کا قنارہ بنایا جائے۔

سورج غروب ہونے کا وقت نزدیک تھا۔ ہمایوں اس وقت بالا خانے پر نکل رہا تھا۔ جب احساس ہوا کہ اذان کا وقت قریب ہے تو اس نے نیچے اترنے کے لیے ڈیڑے پر قدم رکھا۔ ابھی دوسری سیر می پڑھا کہ موزوں نے اذان شروع کر دی۔ وہ اذان کے احترام میں دوسری سیر بھی پڑھ گیا۔ اس کے ملازمین اس کے احترام میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اذان ختم ہوئی۔ ہمایوں نے اٹھنا چاہا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ زمین سے گر کر زین پر آ گیا۔ ہر طرف کھرام مچ گیا، اہل مجلس نے کسی نہ کسی طرح اسے محل کے اندر تک پہنچایا۔ آنکھوں میں اندیشے، چہروں پر گھبراہٹ لیے اطبا حاضر ہو گئے۔ بے ہوش کو ہوش میں لانے کی تدابیر کی جانے لگیں۔

ایک امیر کو پنجاب کی طرف دوڑایا گیا کہ شہزادہ اکبر، سکندر شاہ کے دفع کے لیے پنجاب میں ٹھہرا تھا۔ ہمایوں کی حالت بھی بگڑتی، بھی سنبھل جاتی تھی۔ کبھی وہ ہوش میں آ جاتا تھا بھی ضعف طاری ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حکم دیا کہ میرے بعد اکبر کو تخت پر بٹھا دینا اور میں بیرم خاں کو اس کا اتالیق مقرر کرتا ہوں۔ مملکت کے کام آسان نہیں ہوتے۔ جیسے تک اکبر ہوش کی عمر کو نہیں پہنچ جاتا، بیرم خاں کے احکامات کی تعمیل سب پر لازمی ہوگی۔ یہ اس کی آخری گفتگو تھی جو اس نے اپنے امیروں سے کی۔ اس کے بعد اس کی روح قفس غصہ سے پرواز کر گئی۔

اکبر اس وقت لاہور کے قریب قصبہ کمانور میں تھا کہ اس کو باپ کی رحلت کی خبر ملی۔ امرائے دربار، ہمایوں کی وصیت کی بجا آوری کے لیے مستعد تھے۔ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اکبر کا دہلی یا آگرہ تک پہنچنے کا انتظار نہ کیا جائے، اسے تخت شاہی پر بٹھا دیا گیا۔ اس وقت اکبر کی عمر تقریباً چودہ سال تھی۔

خان خانان یا روفادار بیرم خاں کے سلاطین چغتائی سے قدیم روابط تھے۔ سفیران میں آئیں نے جس طرح ہمایوں کی رفاقت کا حق ادا کیا اور سائے کی طرح اس کے ساتھ

بند پہنچ کر رک گئی۔ اس نے لشکر کے چاروں طرف خندق کھدوائی اور قلعہ بنوایا۔ محل امرا شہر میں شہر بند ہو گئے اور شہر کو منہ و بظاہر کر لیا۔

ہمایوں نے پہلے مرحلے میں شہزادہ اکبر کو جس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، بیرم خاں کی اتالیقی میں سکندر شاہ کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ امرائے اس انتظام کو نا کافی سمجھ کر بادشاہ کو بلا نے کی درخواست لاہور پہنچی۔ بادشاہ جو، اب تک لاہور کے باہر کیمپ لگائے ہوئے تھا ایک عظیم لشکر لے کر سر ہند روانہ ہوا۔

جب بادشاہ قریب آیا تو ہراول دستے کے امرا استقبال کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ صفیں آراستہ کی جائیں۔

افغانوں کی تعداد مغلوں سے کہیں زیادہ تھی لیکن ہمایوں کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ اس نے ہراول دستے کو حملے کا حکم دیا۔ اس دستے کی نگرانی شہزادہ اکبر کر رہا تھا۔ کم سن شہزادہ ایک ہاتھی پر سوار تھا جس پر اس کے ملازمین حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھی کے برابر بیرم خاں کا ہاتھی تھا۔

کم سن شہزادے کو دیکھ کر کئی افغان سرداروں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ اس پھول کو ہمایوں کیوں میدان میں لے آیا۔ اکبر کے دلاوروں نے حملہ کیا تو زبردست شجاعت دکھائی پھر عام جنگ چھڑ گئی۔

چند روز تک جنگ ہوتی رہی۔ طرفین کے بہادروں نے خوب دادرماگی دی۔ لاشوں سے میدان پٹ گیا۔ پٹھان شکست کھا کر بھاگے اور بے شمار گرفتار ہوئے۔ سکندر شاہ فرار ہو کر لاہور کی طرف بھاگا اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔

فتح مند فوج کا ایک دستہ سکندر کے تعاقب میں روانہ ہوا اور بادشاہ خود دہلی میں داخل ہوا۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ہمایوں بادشاہ کے نام کا خطبہ و مسکند بارہ جاری ہوا۔ وہ لوگ جنہوں نے ہمایوں بادشاہ کی ہمرای میں تختیاں برداشت کی تھیں ان پر خوب نوازشیں ہوئیں اور ہر ایک امیر کو ایک ولایت کا حاکم بنادیا گیا۔

شاہ ابوالمعالی نے جو سکندر کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا، ان امرائے اس کے ساتھ جو ملک کے لیے گئے تھے، اچھا سلوک نہیں کیا اور ان کی جاگیروں میں دخل اندازی کر کے خزانہ عامرہ پر بھی ہاتھ ڈالا۔ یہ شکایتیں برابر دربار تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ تعاقب میں ڈھس دیے کہ سکندر شاہ اپنی فوت میں روز بروز اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ منتشر پٹھان پھر

لگا رہا۔ اس کی وفاداری کا تقاضا تھا کہ وہ مشکل کی اس گھڑی میں ڈوبتے ہوئے ہندوستان کو بچاتا۔ ہمایوں کی وصیت کے الفاظ اکبر کے کانوں تک پہنچ چکے تھے، اس نے بیرم خاں کو خان بابا کو لقب دیا اور وکالت اتالیقی اور سپہ سالاری کے عہدے تفویض کر کے سلطنت کے سارے اختیارات اس کے سپرد کر دیے۔ فرامین شاہی دہلی اور آگرہ کو روانہ کر دیے گئے۔ ہمایوں کو ہندوستان کا نظم و نسق دوبارہ سنبھالنے ہوئے پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ دشمنوں کی پوری طرح سرکوبی نہیں ہو سکی تھی۔ منفرد زمینداروں نے ابھی تک اپنا سر نہیں جھکا یا تھا۔ ہمایوں کے رخصت ہوتے ہی سارے ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ لودھی، سوری، نیاز، پٹھانوں کے الگ الگ جتھے تھے، جس کو جہاں موقع مل گیا اس نے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ مغلوں کا تسلط پنجاب میں تو مضبوط تھا، باقی دوسرے مقامات پر نظم و نسق پوری طرح ان کے قابو میں نہیں تھا۔ جیسے ہی یہ نو عمر جانیس (اکبر) تخت نشین ہوا، ان طاقتوں نے مزید تیزی سے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اور تو اور ہمایوں کے مقرب درباری ابو المعالی نے بغاوت کا ارادہ کر لیا۔ اکبر تو شاید اس سے بے خبر ہی رہتا لیکن بیرم خاں کو اس کی بروقت اطلاع مل گئی۔ ابو المعالی کو گرفتار کر لیا گیا لیکن وہ قید سے بھاگ نکلا بہر حال بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ تو گھڑی بغاوت تھی لیکن سکندر شاہ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا تھا۔ اس کی آزادی کسی وقت بھی مغلوں کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔

☆☆☆

شیر شاہ سوری کے جانیس سلیم شاہ سوری کی وفات ہوئی تو اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت پر بیٹھا لیکن تیسرے ہی دن اس کا ماموں مبارز خاں اپنے آدمیوں کو لے کر فیروز خاں کے قتل کا ارادہ کر کے محل میں گھس آیا۔ فیروز خاں کی ماں مبارز خاں کے قدموں میں گر پڑی اور اپنے بیٹے کی زندگی مانگنے لگی۔

”میرے بیٹے کی جان بخش دو۔ تخت پر قبضہ کرو۔ میں اپنے بیٹے کو کسی دور دراز ملک میں لے کر چلی جاؤں گی یا پھر زندہ قید خانے میں ڈال دو۔“

مبارز خاں اس کا بھائی تھا لیکن ایسا سنگ دل کہ بہن کی باتیں بے اثر ہو گئیں۔ اس کے آنسو مبارز خاں کے قدموں میں گر کر سوکھ گئے۔ مبارز خاں نے فیروز خاں کو قتل کر دیا اور محمد شاہ عادل کے خطاب سے دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا مگر دہلی کے عوام نے اس کے خطاب عادل کو بدل کر عدلی شاہ کر دیا کیونکہ

عادل سے کسی بے گناہ کا خون بچید ہے۔ وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمایوں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔

عدلی شاہ عیاش اور نفیس پرست انسان تھا۔ وہ قائل تو تھا، حاکم بننے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔ اس کے گرد بہت جلد ادنیٰ اور ذلیل اشخاص جمع ہو گئے۔ انہی میں ایک شخص بیہو نام کا تھا، یہ کوتوال تھا لیکن بہت جلد اتنا مقرب اور معتد بن گیا کہ عدلی شاہ نے اسے اپنی سلطنت کا مددگار (وزیر) بنا دیا۔ سارا نظم و نسق اس بقال کے حوالے کر کے خود شاہد و شراب میں مشغول ہو گیا۔

اب بیہو بقال کی بن آئی تھی یا پھر مسخروں اور بھانڈوں کے مزے آگئے تھے۔ عدلی شاہ کی ان کمزوریوں نے اسے اپنے ہم قوموں میں بے وقار کر دیا تھا۔ مختلف طاقتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں جو اس سے اقتدار چھین لینا چاہتی تھیں۔ تاج خاں کرانی نہایت نامور امیر تھا۔ اس نے بغاوت کا اعلان کیا اور نقارہ بجاتے ہوئے بگال اور چنار کی طرف کوچ کر گیا۔ عدلی شاہ نے اس کا تعاقب کیا اور اسے شکست دے کر بغاوت کو فرو کیا۔

عدلی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلیم شاہ کے بڑے بھائی عادل خاں کے سالے ابراہیم خاں نے ہتھیار سنبھالے اور آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوا یا اور سکے جاری کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا پھر اس نے آگرہ کی طرف پیش قدمی کی اور اکثر علاقوں پر قابض ہو گیا۔ اب تو عدلی شاہ کو اس کے مقابلے پر آنا پڑا۔ اس کا گماشتہ بیہو خاں پیش پیش تھا۔

ابراہیم خاں نے جب دیکھا کہ جنگ میں اسے شکست بھی ہو سکتی ہے تو اس نے ایک چال چلی۔ عدلی شاہ کے پاس پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے امیروں کو اس کے پاس بھیج دے۔ ”میں ان سے عہد و پیمان کی گفتگو کر کے خدمت شاہی میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

عدلی شاہ اس کی باتوں میں آگیا اور اپنی حکومت کے اہم ترین ارکان کو ابراہیم خاں کے پاس بھیج دیا۔ ابراہیم خاں نے ان امیروں کو لاٹچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

عدلی کے اہم ترین امرا لوٹ گئے تھے۔ ایک بیہو بقال تھا جو اس کی وفاداری میں ڈبہ ہوا تھا۔ وہ اکیلا کیا کرتا۔ عدلی شاہ بھی کیا کرتا۔ وہ چنار کی طرف فرار ہو گیا اور ایک محدود علاقے پر اکتفا کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ پنجاب کا حاکم احمد خاں سوری، ابراہیم خاں کی مدد

کا میا بیوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے موتی پاتے ہی خود ہنسی کا اعلان کر دیا اور سکندر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ اس نے دس ہزار سواروں کا لشکر ساتھ لیا اور لاہور سے آگرہ کی تحریک کے لیے روانہ ہو گیا۔ ابراہیم خاں نے بھی تیاری کی اور مقابلے پر آگیا۔ سکندر شاہ نے مصالحت کا پیغام بھیجا کہ پنجاب پر اس کی حکومت رہنے دی جائے باقی علاقوں پر وہ حکومت کرے لیکن ابراہیم خاں نے اس کی یہ تجویز منظور نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ چھڑ گئی۔

سکندر شاہ نے مقابلے سے پہلے اپنے بادشاہی علم اور نشان دوسرے سرداروں کو دے کر انہیں غنیم کے مقابلے پر آگے بڑھا دیا اور خود ایک جانباز اور وفادار فوج لے کر ایک طرف گھات میں بیٹھ گیا۔

حسب توقع ایک سخت لڑائی کے بعد سلطان ابراہیم نے سکندر شاہ کے لشکر کو شکست دے دی۔ اس کے سپاہی مال و اسباب لوٹنے میں مصروف تھے کہ عین موقع پر سکندر شاہ کمین گاہ سے اپنے بہادریوں کو لے کر نکل آیا اور اچانک سلطان ابراہیم پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا چالاک تھا کہ ابراہیم خاں سنبھل ہی نہ سکا اور اسے ایک ناقابل تھمن شکست ہوئی۔ سکندر شاہ آگرہ پہنچا اور شیر شاہ سوری کی جانشینی کا حق ادا کرنے لگا۔ انہی دنوں ہمایوں کی ہندوستان آمد کی خبریں مشہور ہوئیں۔ سکندر شاہ سے ہمایوں کا مقابلہ ہوا اور سکندر شاہ شکست کھا کر فرار ہوا جس کی سرکوبی کے لیے ابھی تک کوششیں کی جا رہی تھیں۔

ہمایوں کی موت نے ہر طاقت کو آزاد کر دیا۔ عدلی شاہ کا گماشتہ بیہو بقال بھی حرکت میں آیا اور آگرہ پر حملہ کر دیا اور کسی جنگ اور محاصرے کے بغیر ہی آگرہ پر قبضہ کر لیا کیونکہ آگرہ کا حاکم سکندر خاں بیہو کی آمد کی خبریں سن کر ہی مقابلہ کیے بغیر قلعے سے نکل گیا تھا۔

جلال الدین اکبر، بیرم خاں کی اتالیقی میں حکومت سنبھال چکا تھا لیکن بیہو بقال ہندوستان بھر میں دندا تا پھر رہا تھا۔ اس نے پہلے آگرہ پر قبضہ کیا اور اب دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہمایوں نے تردی بیگ خاں کو دہلی کا حاکم مقرر کیا تھا۔ بیہو کے آنے کی خبریں سن کر ایسا بدحواس ہوا کہ اکبر سے ملک چھیننے کی درخواست کرنے کے بجائے مختصری فوج لے کر دہلی سے باہر آگیا۔ بیہو کے لشکر نے اسے تلواروں پر رکھ لیا۔ بری طرح شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

آگرہ شہر میں محصور ہو کر شاہی کمک کا انتظار کرتا تو دہلی

پر بیہو کا قبضہ مشکل ہو جاتا۔ ہمایوں کے ایک اہم امیر نے ایک اہم موقع ضائع کر دیا۔

دہلی پر بیہو کا قبضہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ اطراف و اکناف اسی کے اعمال اور کار پرداز مقرر ہو گئے۔ قبضہ ریواری کا ایک معمولی سا کوتوال عدلی شاہ کے دربار میں اتنا مقام و مرتبہ پا گیا کہ آج مغل لشکر سے نکل لیتا پھر رہا تھا۔ وہ جب آگرہ پر قابض ہوا تھا اس کے پاس پچاس ہزار سوار تھے اور دہلی فتح ہونے کے بعد اس کی رکاب میں فوج کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔

اس نڈی دل فوج کو لے کر وہ اکبر بادشاہ کے مقابلے کے لیے پنجاب کی طرف بڑھنے لگا۔ بیہو کی ہمت اتنی ہو گئی کہ ارد گرد کے علاقے خود بخود خالی ہونے لگے۔ میرٹھ کا حاکم خان زماں جو بیرم خاں کا مقرب اور بڑا بہادر امیر تھا، میرٹھ چھوڑ کر چلا گیا۔ اکبر کے بڑے بڑے امرا اپنے علاقوں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

صرف یہ وحشت ناک خبریں ہی شاہی لشکر گاہ تک نہیں پہنچ رہی تھیں بلکہ بعض امیر بھی شکست کھا کھا کر پنجاب کی طرف آرہے تھے۔

وہی موسم دوبارہ لوٹ آیا تھا جو ہمایوں بادشاہ کو آنکھیں دکھا چکا تھا۔ اکبر کے امیروں کے حوصلے گر گئے تھے اور سب کی رائے اور مصلحت یہ تھی کہ حسب دستور بادشاہ سلامت کا دل چلے جائیں اور وہاں سے لشکر کی تیاری کر کے دوبارہ ہندوستان فتح کرنے کی مہم پر تشریف لائیں۔ صرف ایک بیرم خاں تھا جو وہیں ٹھہرنے اور مقابلہ کرنے کی رائے دے رہا تھا۔

تردی بیگ دہلی سے شکست کھا کر فرار ہوا اور بیرم خاں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس وقت اکبر کلانور میں موجود نہیں تھا۔ ان خراب حالات کے باوجود اکبر ایسا بے خوف تھا کہ دل بہلانے کے لیے شکار پر نکل گیا تھا۔ تردی بیگ حاضر ہوا تو بیرم خاں نے اسے سامنے آنے کی اجازت نہیں دی اور بادشاہ کی مرضی معلوم کیے بغیر بے تامل حکم دیا۔ ”اس کی گردن مار دو“ اکبر واپس آیا اور اسے تردی بیگ کے قتل کی اطلاع ہوئی تو اس نے بیرم خاں کو طلب کیا۔

”خان بابا، اب آپ اتنے با اختیار ہو گئے کہ ہماری آمد کا انتظار تک نہیں کیا اور تردی بیگ جیسے امیر کے قتل کا حکم دے دیا۔“

”میں اس قصور اور جسارت پر غور خواہ ہوں۔ حضور اس قصور کو اپنے علم و عقو سے کام لے کر معاف فرماویں کیونکہ میں نے یہ سزا صرف اس مصلحت سے دی کہ ان جنگاویں اور



دھک دھک دل سے بول... مرحبا اسپغول

مرحبا اسپغول بدن میں لائے طاقت اور جتنی کیلک جب نہ ہو جزیرہ است،
معدے کی جلن اور کولیسرول بھی ہو کم تو آپ رہیں لٹ اور سمارٹ ہیوٹ



www.marhaba.com.pk

بد نظمی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ چغتائی لشکر پر غنیم کا پلہ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ ہیمل پٹھانوں کی ایک جماعت لے کر فوج کے آگے نکل آیا کہ مغلوں کے قلب پر یکبارگی حملہ کر دے۔ مغلوں کی فوج میں شور و غل برپا ہو گیا۔ قریب تھا کہ شکستِ مقدس جتنی کہ قسمت نے پادری کی۔ تیوری لشکر کے کسی تیر انداز نے اس طرح تیر جوڑ کر کمان سے چھوڑا کہ وہ سیدھا ہیملی کی آنکھ میں آکر لگا۔ بس پھر کیا تھا اس کے گرتے ہی تمام پٹھان، راجپوت اور میواتی سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہیمو جی حالت میں تھا۔ خان خانان بیرم خاں نے ہیملی کو دست بستہ لاکر بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور درخواست کی کہ اس کا فری گردن حضورِ خود اپنے ہاتھ سے اڑادیں مگر اکبر نے انکار کیا۔ بعد میں بیرم خاں نے خود اپنے ہاتھ سے اسے قتل کیا۔ حکم شاہی ہوا کہ اس کا سر کامل بھیج دیا جائے اور اس کے جسم کو دہلی کے دروازے پر لٹکا دیا جائے۔

دوسرے دن شاہی لشکر نے پانی پت سے روانگی کی اور دہلی تک کسی جگہ قیام نہیں کیا۔ اکبر دہلی کے نظم و نسق میں مشغول تھا کہ سکندر شاہ نے پنجاب میں اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور اکبر کے نمائندے خضر خواجہ خاں پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں خضر خواجہ کو شکست ہوئی۔

اکبر پانی پت کی لڑائی کے بعد ابھی دہلی میں مقیم تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ خضر خواجہ کو شکست کھا کر لاہور چلا آیا ہے۔ اکبر نے یہ سنتے ہی پٹھانوں کی گوشائی کے لیے لاہور کی طرف کوچ کیا۔ جب وہ جالندھر پہنچا تو سکندر سواک کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ شاہی لشکر نے اس کا تعاقب کیا۔ سکندر بھاگتا پھر رہا تھا اور شاہی فوجیں اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔

جب امرایہ غار کرتے ہوئے سکندر کی فوج کے پاس پہنچے تو سکندر رکتھہ مانگوت میں قلعہ بند ہو گیا اور شاہی لشکر قلعے کے قریب پہنچ گیا۔ اس قلعے کو مرکز بنا کر درمیان میں لے لیا اور لوگ قلعہ گیری کے لوازم میں مشغول ہو گئے۔ اکبر کی فوجوں کو محاصرہ کیے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ دونوں طرف سے بہ کثرت آدی مارے جا چکے تھے اور زخمی ہوئے تھے۔

جب قلعے کی رسد اور ذخیرہ ختم ہو گیا تو سکندر شاہ اطاعت پر مجبور ہو گیا۔ اس نے پیغام بھیجا کہ کسی شاہی معتمد کو قلعے کے اندر بھیج دیا جائے تاکہ میں اس سے اظہارِ ممانعت کروں اور سچ کی شہادت ملے کر لوں۔ اکبر نے اٹک خان نامی ایک امیر

پریشان کن حالات میں حکومت کا وقار سخت گیری اور سزاؤں ہی سے قائم رہتا ہے۔ میں نے اس کے قتل میں ملک اور بادشاہت کی بھلائی دیکھی تھی۔

اکبر نے یہ سن کر بیرم خاں سے معاف کیا۔ "آپ کی مرضی اور آپ کا اختیار۔ اپنے دل میں کسی اندیشے کو نہ آنے دیں اور حاسدوں کی تکت چھٹی کی فکر نہ کریں۔ ہم آپ کو اپنا مہربان چچا سمجھتے ہیں۔ سلطنت ہماری ضرور ہے مگر اس میں اختیارات ہمارے نہیں آپ ہی کے ہیں۔"

یہ قصہ اسی جگہ ختم ہو گیا لیکن خان خانان کی اس خود مختار اندہ جرات نے دربار کے امیروں، مقریوں اور خاص طور سے ماہم آغا کے دل میں جو بادشاہ کی انا اور کھلائی تھی، حسد کا بیج بودیا۔ بیرم خاں کو اس کا خمیازہ بہت بعد میں جا کر بنگلہ پڑا۔ قتل کی اس سزا کے خاطر خواہ نتائج نکلے۔ ہندوستانی اور چغتائی امیر سہم گئے اور لشکر کا نظم و نسق ایک دم سے ٹھیک ہو گیا۔ بغاوت کے ارادے جہاں جہاں ہو رہے تھے، دم توڑ گئے۔ بیرم خاں کی اصلاح کے مطابق اکبر نے طے کر لیا کہ ہیملی بقال کے مقابلے پر نکلا جائے گا۔ اس نے خواجہ خضر خاں کو سکندر شاہ کے دلع کے لیے چھوڑا اور خود اپنے لشکر کو لے کر ہیملی کے مقابلے پر بڑھا۔

ہیمو جی دہلی کو فتح کرنے کے بعد ایک لاکھ سوار، ڈیڑھ ہزار باگھی لے کر پنجاب پر فوج کشی کی فکر میں تھا کہ اسے اکبر کے کوچ کی اطلاع ملی۔ اس نے جھٹ میں ہزار سواروں کا ایک ہر اول اکبری فوج کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ اکبر کا ہر اول بیرم خاں کی سپہ سالاری میں روانہ ہوا تھا۔ دونوں ہر اول فوجوں کا مقابلہ پانی پت کے میدان میں ہوا۔ ایک خونریز معرکہ کے بعد پٹھان شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہیملی کو اس شکست کی خبر ملی تو اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ دہلی میں راجا بکراجیت بنا بیٹھا تھا۔ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا لیکن طوفانِ بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ خود جنگ کے لیے نکلا۔ اس کی فوج کے آگے پانچ سو منتخب اور لڑا کا باگھی تھے۔ ان کے پیچھے توپ خانہ تھا۔ توپ خانے کے عقب میں جہاں تک نظر جاتی تھی زرہ پوش لشکریوں کا ٹھانیں مارتا سکندر تھا۔

دونوں فوجوں کا ٹکرائو تھا کہ میدان کا راز اس میں ہنگامہ حشر برپا ہو گیا۔ بہادر گھوڑے بڑھابڑھا کر ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔

ہیمو نے ان ہاتھیوں سے جو اس کے پاس تھے شاہی فوج پر حملہ کر دیا۔ متواتر حملوں سے آخر کار شاہی فوج میں

کو قلعے کے اندر بھیج دیا۔ جب اٹکھ خاں قلعے کے اندر پہنچا تو سکندر نہایت عاجزی سے پیش آیا۔

”میں نے چونکہ بہت گستاخی کی ہے لہذا میں اس قافلے میں ہوں کہ منہ دکھا سکوں۔ اگر حسب الحکم اس شرط کے ساتھ کہ کسی وقت بھی اطاعت سے باہر نہیں ہوں گا کچھ عرصے کے لیے بنگالہ چلا جاؤں اور اپنے لڑکے کو خدمت کے لیے روانہ کروں تو عین نوازش ہوگی۔“

اتکھ خاں نے سکندر شاہ کی معروضات بھیرم خاں کے گوش گزار کیں اور اس نے یہ معروضات بادشاہ کے حضور میں اس طرح پیش کیں کہ بادشاہ نے انہیں قبول کر لیا۔

سکندر شاہ نے اپنے لڑکے عبدالرحمن کو چند ہاتھی اور کچھ دوسرے تحائف دے کر اکبر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور بادشاہ کے آدمیوں کو قلعہ سپرد کر کے خود باہر نکل آیا اور بنگالہ کی طرف رخصت ہو گیا۔

ہیمول تو قتل ہو ہی چکا تھا اس کا آقا سلطان عادل شاہ بھی مارا گیا۔ سکندر شاہ نے جان بخشی کرائی اور بنگالہ چلا گیا۔ ہمایوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اکبر کے پہلے سال میں وہ تکمیل کو پہنچا۔ افغانوں کی حکومت ختم ہوئی، اکبر کی عظمت و دولت کا ستارہ جانب عروج کا مزن ہوا۔

بھیرم خاں کو وہ خان بابا کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اکبر کی تمام کامیابیاں بھیرم خاں کی مرہون منت تھیں۔ یہی وہ اسباب تھے جنہوں نے بھیرم خاں کے حاسد کثرت سے پیدا کر دیے۔ قدم قدم پر اس کی مخالفتیں کی جانے لگیں۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کوئی اس کے سامنے آکر اس کی مخالفت کرتا۔ اس لیے سازشوں نے زور باندھا۔ دونوں طرف غلط فہمیاں زور پکڑنے لگیں۔

یہ غلط فہمیاں اس حد تک پہنچیں کہ ایک مرتبہ بھیرم خاں نے بادشاہ کا دل صاف کرنے کے لیے قرآن کو بطور گواہ اپنے دو معتمد افسروں کے ساتھ خدمت میں بھیجا اور زبانی بھی پیغام دیا کہ جو بات حضور کے گوش گزار کی گئی ہے وہ قطعاً میرے دل میں نہیں ہے۔ اس کا مجھے کوئی خیال تک نہیں آیا ہے۔“

اس معذرت کے باوجود بادشاہ کو یقین نہیں آیا اور خاں خاناں کی معذرت قبول نہیں کی گئی بلکہ اس کا خط لانے والوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔

بھیرم خاں جیسے وفادار امیر کو بدخواہوں نے اس حال کو پہنچا دیا کہ اس کی رسوائی اور بدنامی کی خبریں پر لگا کر اڑنے لگیں اور اپنوں اور بیگانوں نے اس معاملے کو خوب اچھالا۔

بادشاہ کی نظریں پھریں تو دوست بھی دشمن بن بیٹھے اور خان خاناں کا اقبال مائل بڑوال ہو گیا۔

بھیرم خاں اب بھی اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بادشاہ کے دل کی کندورت کو دور کیا جائے۔ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس نے مالوہ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ دوسروں سے کوئی مدد نہیں لی۔ صرف اپنی فوج اور خرچ پر بادشاہ سے اجازت لے کر مالوہ پر حملہ کر دیا۔ بادشاہ کو بھیرم خاں کی بہادری پر اعتماد تھا اور امید کر رہا تھا کہ بھیرم خاں کو کامیابی نصیب ہوگی لیکن یہ مہم ناکام ہو گئی۔

دبے دبے لفظوں میں یہ خبریں مشہور ہو رہی تھیں کہ بھیرم خاں نے جان بوجھ کر اس مہم کو ناکام بنایا ہے۔

مالوہ کی ناکامی کے بعد بھیرم خاں نے ملک شرقی اور بنگالہ کی تسخیر کا عزم کیا لیکن امیروں کی مخالفتوں کے سبب، باوجود کامل سعی و جہد کے کوئی نتیجہ نہ نکلا بلکہ الٹا یہ بدنامی کھلے پڑی کہ بھیرم خاں جس مہم پر بھی جاتا ہے عداوت سرکار کے کام کو خراب کر دیتا ہے۔ خود بادشاہ کو یقین ہوئے لگا تھا کہ بھیرم خاں جان بوجھ کر کچھ کاموں کو خراب کر رہا ہے۔ بھیرم خاں کو بھی یقین ہو گیا کہ اس کے مخالف کانٹے بچھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ سازشیں اپنا کام دکھانے لگی ہیں۔ اس نے حج بیت اللہ کا عزم کر لیا اور بادشاہ سے اجازت طلب کی۔ اکبر بھی جیسے اس سے جان چھڑانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ بھیرم خاں کو عجب و غریب جواب لکھ بھیجا۔

”ہم نے ابتدا میں اپنی عمری اور سیر و شکار کے شوق اور ناتجربہ کاری کی بنا پر خان بابا کو تمام امور سلطنت سپرد کر دیے تھے۔ اب ہم رعیت اور سلطنت کے معاملات کو خود سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ تم نے حج کا احترام باندھ لیا ہے اس لیے اب تم کو ملتان دنیا سے دست کش ہو جانا چاہیے۔“

بھیرم خاں کو یہ پیغام ملا تو اس نے قہقہہ مچا کر امارت و جل جو سامان اس کے پاس تھا، بارگاہ شاہی میں بھیج دیا اور خود بیت اللہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

دشمنوں کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہر منزل پر اسے پریشان کرنے والے موجود تھے۔ دشمنوں نے سازش تیار کر لی تھی۔ یہ خبریں بھی پھیلا دی گئی تھیں کہ مخالفوں نے اس کو راستے ہی میں ہلاک کر دینے کی سازش کر رکھی ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس کے اکثر ہمراہی اس کی رفاقت ترک کر کے قافلے سے نکل گئے۔

دراصل بھیرم خاں کا مقام و مرتبہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ بعض امرا کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھلنے لگا تھا۔ بہت

سے مفسد یہ چاہتے تھے کہ اسے راستے سے ہٹا دیں۔ بادشاہ کی نگاہ بدلی تو مفسدوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔

وہ حج کو نکلا اور سازشیں سامنے آنے لگیں تو وہ فکر مند ہونے لگا۔ دارالخلافہ سے تیس کوس پر گیا تھا کہ حج کا ارادہ ترک کیا اور راستے سے لوٹ آیا۔ یہ بات اس کی مزید بدنامی کا سبب بنی کہ دیکھو، دنیا کی محبت میں حج بیت اللہ کا ارادہ منسوخ کر دیا۔

بادشاہ کی ناراضی اب کھل کر سامنے آنے لگی تھی۔ وہ لوگ جنہیں بھیرم خاں ناپسند کرتا تھا، دربار میں واپس بلائے جانے لگے۔ انہی میں بھیرم خاں کا ایک کٹر مخالف ملا علی محمد بھی تھا۔ اکبر نے بھیرم کی مراجعت کی خبر سن کر اسی علی محمد کو دوسرے امیروں کے ساتھ بھیرم کی سرکوبی کے لیے مامور کر دیا۔

بھیرم خاں دوبارہ حج بیت اللہ کا ارادہ کر چکا تھا لیکن جب اسے ملا علی محمد کی تعیناتی کی اطلاع ملی تو وہ اپنی جان و آبرو کی حفاظت کے لیے ہجرت فرام کر کے اور مقابلے کی تیاریاں کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ملا علی محمد نے اکبر کو (سرہند پہنچ کر) لکھا کہ بھیرم خاں بغاوت پر آمادہ ہے۔ حج کا سفر تو ایک بہانہ ہے۔ اس سفر کے بہانے وہ پہنچا کر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

اکبر کو یقین آ گیا کہ جسے وہ خان بابا کے لقب سے یاد کرتا رہا ہے وہ اس کے تاج و تخت پر قبضے کا خواہاں ہے۔ وہ اور بھی چراغ پا ہو گیا۔ اس نے علی محمد کو لکھا کہ بھیرم خاں کا سر کاٹ کر میرے قدموں میں ڈالنے کا اہتمام کرو۔

اکبر یہ احکام دے چکا تھا کہ بھیرم خاں کا خط پہنچا۔

”میرا خاندان تین پشتوں سے خانوادہ عالیہ کا خدمت گزار رہا ہے لیکن میری ان موردی دیرینہ خدمات کو حاسدوں اور دشمنوں نے اپنی سخن سازیوں سے پامال کر دیا ہے اور مجھے حضور والا کا نمک حرام ٹھہرا دیا ہے۔ لہذا میں چند رفیقوں کے ہمراہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ اسے میری بغاوت پر محمول نہ کیا جائے چونکہ میں نے حج کا ارادہ کر لیا ہے اس لیے خدمت والا میں حاضری کو اب میں کفر سمجھتا ہوں۔“

اگر حضور والا مجھے نمک حراموں کے ذیل میں رکھ کر واجب القتل سمجھتے ہیں تو میری ایک درخواست ہے کہ آپ کسی ایک اپنے بے نام و نشان غلام کو مقرر کر کے بھیج دیں کہ وہ بھیرم کا سر کاٹ کر تیرے پر چڑھا دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ متینہ فوج کی سرداری سے ملا

بھیرم کو جو میرا پروردہ نمک حرام اور برطرف کردہ ہے واپس بلا لیں اور اس کی جگہ کسی بھی دوسرے ملازم کا تقرر فرما دیں۔“

اس عرض داشت نے اکبر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے فوراً بھیرم کو واپس بلا لیا اور اس کی جگہ شمس الدین خاں کو لاہور پر حاکم مقرر کر کے روانہ کیا۔ شمس الدین خاں رخصت کی اجازت لینے حاضر ہوا تو خلوت دیکھ کر اکبر نے اس کے گوش گزار کر دیا۔

”اگر بھیرم خاں سے بغاوت یا نافرمانی ظاہر ہو تو اس کا سد باب تمہارے ذمے رہے گا۔“

بھیرم خاں مطمئن تھا کہ بادشاہ نے اس کی فریاد سنی اور ملا علی محمد کو جو اس کا دشمن خاص تھا واپس بلا لیا اور شمس الدین خاں کی تقریری عمل میں آگئی لیکن سیاہ بختی ایسی زوروں پر تھی کہ دوست کو دشمن بننے دیر نہیں لگ رہی تھی اور جو دشمن تھے وہ اپنا کام برابر دکھائے جا رہے تھے۔ شمس الدین خاں بھی دربار کے مقتدر لوگوں کے دباؤ میں آ گیا اور بھیرم خاں کے ساتھ پر خاش رکھنے لگا۔ آخر کار یہ نقشہ اس انجام پر پہنچی کہ بھیرم خاں کی جمعیت کا شمس الدین خاں کی فوج سے مقابلہ ہو گیا۔

بھیرم خاں کی دلاوری سے انکار کئے تھے۔ معمولی سے معرکے کے بعد اس نے شمس الدین خاں کی فوج کو بری طرح شکست سے دوچار کر دیا۔

اس شکست کی خبر جب اکبر تک پہنچی تو وہ خود لاہور کے ارادے سے روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھیرم خاں فتح یاب ہونے کے باوجود مزید مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بظاہر پسپا ہو کر کھسی جنگل کی طرف چلا گیا۔ اس جنگل کے ساتھ ہی پہاڑی سلسلہ تھا۔

شاہی فوج کو بہت تن میں داخل ہوئی تو وہاں کے سارے زمیندار بھیرم خاں کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بھیرم خاں زمینداروں کی طاقت سے بھی واقف تھا اور شاہی فوج سے بھی۔ اس کا تجربہ کہتا تھا کہ اطاعت کے سوا جو بھی صورت اختیار کی جائے گی وہ بال کا باعث ہوگی۔ اس نے ان زمینداروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

”میری خاطر آپ لوگ خود کو کیوں مصیبت میں ڈالتے ہیں؟“

بھیرم خاں نے اپنے دونوں ہاتھ بندھوائے اور امان طلب کرتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

بھیرم خاں نے روئے عجز زمین نیاز پر رکھ کر معافی کی



مددگار

کاشفِ زبیر

جب ہجوم میں چلتے چلتے اچانک تنہائی اپنے حصار میں لے لے تو یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گزب ضرور ہوتی ہے۔ بعض چہروں کے پیچھے اتنے چہرے ہوتے ہیں کہ اصل چہرہ دور کہیں رہ جاتا ہے۔ اس من موہنی صورت نے بھی جب اپنا اصل چہرہ دکھایا تو دیکھنے والوں کے دونگٹے کھڑے ہو گئے۔

خانیہ بیگم کی حیرت انگیز داستان

ایرک مورگن کو دنیا میں دو چیزوں سے شدید نفرت تھی۔ ایک برف سے اور دوسرے اپنے سوتیلے باپ سے لیکن بد قسمتی سے وہ تیرہ سال کی عمر میں انہیں بہت زیادہ دیکھ چکا تھا۔ وہ کینیڈا میں جنوب مغربی علاقے میں رہتے تھے۔ بوشر ایرک، اس کی ماں کی زندگی میں اس وقت آیا جب ایرک صرف تین سال کا تھا۔ بوشر ایک لکڑ مارا تھا اور روزگار کی تلاش میں اکثر سفر کرتا رہتا تھا۔ جب کسی ایک علاقے میں جنگل کٹائی کا کام ختم ہونے لگا تو وہ کسی دوسرے علاقے کی طرف نکل جاتا۔ ایرک نے ان دس سالوں میں کوئی نصف درجن چہروں پر وقت گزارا تھا لیکن اسے ہر جگہ برف اور اپنے سوتیلے باپ بوشر کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اس پورے خطے میں سال کے سات مہینے برف جمی رہتی تھی۔ چند دن پہلے وہ ایک چھوٹے سے قصبے، اسٹولائن میں منتقل ہوئے تھے۔ بوشر کو یہاں ایک ٹبر کینی میں ملازمت مل

درخواست کی۔ اکبر کو بھی اس کی دیرینہ خدمات یاد آئیں۔ باپ (ہمایوں) کا خیال آیا جس کو مصائب سے نکالنے والا یہی مرد میدان تھا جو اس وقت زمین پر سر رکھے ہوئے تھا اور معافی کا طلب گار تھا۔ اکبر نے مرام خسروانہ سے اس پر نوازش کی۔ خلعت خاص عنایت کی اور دو روز کے بعد حرمین شریفین جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ”ہمارے ذمے تمہارے موروثی حقوق ہیں۔ اگر تمہارا ارادہ دوبارہ ملازمت میں آنے کا ہے تو ہم کاپلی اور چندیری کی جاگیریں عطا کرتے ہیں۔“ اکبر بادشاہ نے بیرم خاں کو پیشکش کی۔ ”اور اگر حضور میں رہنا چاہو تو ہم کسی بھی وقت تمہاری طرف سے غفلت نہیں برتن گے اور تمہارے غم خوار ونگراں رہیں گے اور اگر تم بیت اللہ جانا چاہو تو تم کو عزت و آبرو کے ساتھ روانہ کر دیں گے۔“

بیرم خاں نے جواب دیا۔ ”انسان کی جو بڑی آرزو ہو سکتی ہے وہ فردوسِ مکالی (باہر) جنتِ آشیانی (ہمایوں) اور حضور والا (اکبر) کی رکاب میں بندے کو حاصل ہو چکی۔ اب تو میرے دل میں بس یہ مراد بھی کہ قدم بوسی کی تجدید کر کے اپنے تصور کو معاف کروالوں اور کعبۃ اللہ جانے کی اجازت حاصل کر لوں جو آپ فرما چکے۔“

”خان بابا، ہم آپ کو روکنے کے حق میں ضرور ہیں لیکن آپ کی خواہش کا احترام بھی ضروری ہے۔“ اکبر نے اسے پچاس ہزار روپے سفر خرچ کے لیے دیے اور سفر کے لوازمات مہیا کر کے اسے رخصت کیا۔ بیرم خاں نے اپنے متعلقین کے ہمراہ گجرات کا راستہ لیا اور چل پڑا۔ جب وہ یمن گجرات پہنچا تو یہاں اس نے چند روز قیام کیا۔ اس قیام کے دوران میں وہ اپنا اکثر وقت سیر و تفریح میں گزار رہا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ساتھیوں کے بغیر اکیلا ہی نکل جاتا۔ دور تک اور دیر تک گھومتا پھرتا رہتا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور کوئی ہتھیار بھی ساتھ نہیں تھا۔ وہ ایک تالاب کے پاس گیا جو یمن (گجرات) کے باہر واقع تھا۔

”بھائی اس تالاب کا نام کیا ہے؟“ بیرم خاں نے ایک آدمی سے پوچھا۔

بیرم خاں کی زبان میں ”سبس“ ہزار کو کہتے ہیں۔ اس تالاب کے گرد ایک ہزار بت خانے ہیں۔ اس لیے یہ اسی نام سے مشہور ہے۔“

ایک افغان باشندہ اسی وقت سے پوشیدہ طور پر اس کے ساتھ تھا جب سے بیرم خاں اپنی قیام گاہ سے روانہ ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک پتھر کے پیچھے بیٹھا بیرم خاں کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ بیرم خاں کی کشتی کنارے کی طرف آنے لگی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بیرم خاں کشتی سے اترا اور اپنی منزل کا رخ کیا۔ وہ افغان پتھر کے پیچھے سے نکلا اور بیرم خاں کے پیچھے ہولیا، اس نے بیرم خاں کو مخاطب کیا۔

”میرا خیال ہے آپ بیرم خاں خان خاں ہیں؟“

”تم نے بالکل صحیح پچھانا۔“

”آپ سے ملنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔“ یہ کہہ کر وہ افغان سامنے آیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے وقت خنجر نکالا اور بیرم خاں کے پیٹ میں اتار دیا۔ وہ اس وقت صرف زخمی ہوا تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر کچھ ملاح اس کی طرف دوڑ پڑے اور اسے اٹھا کر اس کے خیمے تک لائے جہاں بیرم خاں نے دم توڑ دیا۔

مرتے وقت بیرم خاں کی زبان پر یہ نکلے تھا۔ ”صد شکر کہ میں اپنے ولی نعمت کی راہ میں بیت اللہ کا سفر کرتے ہوئے شہید ہو رہا ہوں۔“

بیرم خاں کا چار سالہ بیٹا، بیوی سلیمہ سلطان بیگم اور دوسرے متعلقین احمد آباد لوٹ آئے۔ وہاں کے حاکم نے بد رفتگی حفاظت میں ان کو بادشاہ کے حضور پہنچا دیا۔ بیرم خاں کی موت کے ساتھ ہی اکبر کا عہد خود اختیاری شروع ہوا۔

بیرم خاں نے ہندوستان فتح کیا۔

ہمایوں نے قبضہ کیا۔

اکبر نے سلطنت قائم کی۔

☆☆☆

طبقاتِ اکبری (جلد دوم)۔ ترجمہ ابو بختاری، شمس شاہ سمری۔ کائنات کتب خانہ
قانون کی پابندی نامہ۔ ترجمہ مرشد اختر ندوی، منتخب المیاب، خافض خان

گئی تھی۔ اس نے پہلے دو بیڈروم کا ایک چھوٹا سا پارٹمنٹ لیا اور پھر ایرک اور لیانا کو لے آیا۔ اپریل کا آخری ہفتہ تھا اور یہاں ہر طرف برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لیانا نے سب سے پہلے ایرک کو مقامی اسکول میں داخل کرایا کیونکہ اسکول سیشن ابھی جاری تھا۔ یکساں اسکول سسٹم کی وجہ سے اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ مگر اسے اسکول زیادہ اچھا نہیں لگا کیونکہ بچے اسے تنگ کرتے تھے۔

ایرک بڑبڑلی نہیں تھا، بس اس کے اندر کسی کو جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ عادت اسے بوشر نے ڈالی تھی جو بچپن سے اس کے صبر اور ضبط کا امتحان لیتا آیا تھا۔ وہ ایک اذیت پسند اور انتہائی چالاک تھا۔ بوشر نے جان لیا تھا کہ ایرک کو برف سے نفرت ہے۔ وہ اسے جان بوجھ کر برف میں لے جاتا اور یہ ظاہر کھیلنے کے بہانے اسے گھنٹوں برف میں رکھتا۔ ایرک یہ بات سمجھتا تھا لیکن وہ بوشر کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ لیانا اس خوش فہمی کا شکار تھی کہ بوشر اس کے بیٹے سے کتنا پیار کرتا ہے اور اس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

نئی جگہ پر لوگوں سے گھلنے ملنے اور تعلقات بنانے کے لیے بوشر اور لیانا اکثر مقامی کلب اور مسٹر جس کے گھر جنے والی محفلوں میں شرکت کرنے جاتے تھے۔ جہاں سے ان کی واپسی رات گئے ہوئی تھی اور اس دوران میں ایرک کو گھر میں اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ وہ تنہا ہی پسند تھا لیکن اس کے باوجود گھر میں اکیلے رہنا اسے پسند نہیں تھا۔ برف کی وجہ سے وہ گھر سے باہر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس رات بھی بوشر اور لیانا باہر تھے۔ ایرک گھر میں اکیلا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ان کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا اور یہ قصبے کا وسطی حصہ تھا جہاں سے جمیل کچھ فاصلے پر بھی اور برج کے اوپر سے ٹرین گزرنے کا راستہ تھا۔ سامنے بڑا سا میدان تھا جس میں بچوں کے کھیلنے کے لیے جھولے وغیرہ لگے تھے۔ میدان کے پاس قطار میں اونچے اور سیدھے تھے والے درخت تھے۔ ایرک درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک اسے لگا جیسے ایک درخت سے کسی نے جھلانگ لگائی اور دوسرے درخت کے تنے سے چٹ گیا۔ اس کا انداز بندروں والا تھا۔ ایرک حیران ہوا، اسے معلوم تھا یہاں بندر نہیں پائے جاتے ہیں۔

”شاید یہ کوئی پرندہ ہے۔“ ایرک نے سوچا۔ اس کی نظرس مستقل ایسی درخت پر مرکوز رہی۔ لیکن اس چیز نے دوبارہ حرکت نہیں کی تھی۔ پھر اسے لگا جیسے وہ چیز سرعت سے درخت سے نیچے اترتی ہو اور پھر اسے درختوں کے درمیان کوئی انسان

بہت تیزی سے گھٹا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی تیز رفتاری حیران کن تھی۔ لہو میں وہ درختوں کے درمیان سے نکل کر کمراتوں کے درمیان غائب ہو گیا۔ ایرک نے باہر جا کر اسے دیکھنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس کے پچھلے اسکول میں چند بچے تھے جو اسے تنگ کرتے تھے۔ یہاں اسکول میں بھی اسے ایک ایسا ہی گروہ مل گیا تھا۔ گزشتہ دن چارلی اور اس کے دو ساتھیوں جارج اور نیلسن نے اس کا لچ پھین کر کھالیا تھا اور اس کا لچ بکس بھی توڑ دیا تھا۔ کھانے کو گرم رکھنے والا بچے بکس خاصا مہنگا تھا اور جب بوشر کو علم ہوا تو اس نے سزا کے طور پر ایرک کا جیب خرچ ایک ہفتے کے لیے بند کر دیا تھا۔ ایرک کو اب ایک ہفتے تک لچ کے بغیر اسکول جانا تھا۔ اگلے دن لیانا نے چپکے سے اس کی جیب میں ایک ڈالر ڈال دیا تا کہ وہ اسکول میں کچھ لے کر کھالے۔ وہ اسکول جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہاں بھی وہی کچھ ہے جس سے اسے شدید نفرت تھی۔

بھی بھی وہ سوچتا کہ ان لوگوں سے بدلہ لے جو اسے تنگ کرتے ہیں لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے بدلہ لینے کی کوشش کی تو اس کا انتقام بہت زیادہ ہو جائے گا۔ وہ اسکول پہنچا۔ لچ ٹائم میں وہ باہر بیچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بچے چیزیں کھانی رہے تھے۔ اس کے پاس صرف ایک ڈالر تھا لیکن اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اچانک اسے چارلی اور اس کے ساتھی اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ وہاں سے اٹھ جانا چاہتا تھا لیکن اٹھ نہ سکا۔ چارلی اس کے بالکل سامنے رکھا اور خاص انداز میں بولا۔

”ہیلو ایرک! آج لچ میں کچھ نہیں لائے؟“ ایرک اسے دیکھتا رہا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے جتا رہا ہے گزشتہ دن انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ چارلی نے کہا۔ ”آج تمہارے پاس لچ بکس نظر نہیں آ رہا لیکن تمہارے پاس یقیناً کچھ رقم ہوگی اس سے ہم کینٹین سے کچھ لے کر کھا سکیں گے۔“

اس سے پہلے ایرک انکار کرتا یا وہاں سے جاتا چارلی کے دونوں ساتھیوں نے اسے جکڑ لیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن ان کی گرفت بہت سخت تھی۔ چارلی نے آرام سے اس کی جیب سے ایک ڈالر نکال لیا اور مایوسی سے بولا۔ ”بس ایک ڈالر... خیر اس سے بھی کچھ نہ کچھ آجائے گا۔“ جارج اور نیلسن نے اسے چھوڑ دیا اور وہ تینوں قہقہے لگاتے وہاں سے چلے گئے۔ ایرک کی آنکھیں جل رہی تھیں مگر وہ خود کو روکنے سے روک رہا تھا۔ آس پاس جن بچوں نے

یہ تماشا دیکھا تھا وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایرک کو معلوم تھا کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ وہ گھبرا آیا تو لیانا نے اسے بتایا کہ اس نے بوشر سے سفارش کر کے اس کا جیب خرچ بحال کر دیا ہے اور اس کے لیے بچے بکس بھی آ گیا ہے اگرچہ یہ اتنا مہنگا والا نہیں ہے لیانا نے اس کی میز پر کھانے لگاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں تمہاری بے پردائی کی کچھ نہ کچھ سزا تو ملنی چاہیے۔“ ”سزا؟“ اس نے تہمتی سے سوچا۔ ”اس جرم کی جو اس نے کیا ہی نہیں ہے۔“

اس شام بھی لیانا اور بوشر ایک تقریب میں مدعو تھے۔ وہ شام ہوتے ہی تیار ہو کر گھر سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ایرک نے اپنی پڑھنے والی میز کی دراز میں چھپا چھوٹا سا خنجر نکالا۔ یہ خنجر ایک خوب صورت چیز ہے کے کور میں رکھا تھا اور اس کی پچھلی دھار یقیناً بہت تیز تھی۔ ایرک نے آج تک اس کی مدد سے کچھ نہیں کاٹا تھا۔ یہ خنجر اس کے باپ کے پاس تھا اور لیانا کے پاس رہ گیا تھا۔ ایک بار لیانا نے غیر ارادی طور پر ایرک کے سامنے اس کا ذکر کر دیا اور اس نے یہ خنجر چپکے سے نکال لیا۔ ایرک نے خنجر نکال کر جوتے اور گرم کپڑے پہنے اور اپارٹمنٹ سے نکل کر عمارت سے باہر آ گیا۔ سامنے میدان میں اب بھی برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ برف کھیلنے پر آمادہ نہیں تھی۔

سردی کی وجہ سے کوئی باہر نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ میدان کے پاس درختوں کی طرف بڑھا۔ ایک موٹے تنے والے درخت کے پاس آ کر اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں تھام کر اس کی نوک تنے پر ماری۔ نوک تنے میں گئی اس نے خنجر واپس کھینچا اور دوبارہ مارا، پھر بار بار اور اس کے بعد جنوبی انداز میں بار بار مارتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہوا، وہ وہاں اکیلا نہیں ہے، کوئی اس کے عقب میں موجود ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اینٹل آئرن سے بنے، بچوں کے لیے کھیلنے والے ڈھانچے کے اوپری حصے میں ایک لم عمارت دہلی سی لڑکی بیٹھی تھی اس نے اتنی شدید سردی میں ایک ہلکا سا سینئر اور معمولی سی پتلون پہن رکھی تھی۔ لڑکی نے ایرک سے پوچھا۔ ”تم یہ کیا کر رہے ہو؟“

”خنجر چلانے کی مشق۔“ اس نے جواب دیا اور خنجر نیام میں ڈال کر جیب میں رکھ لیا۔ لڑکی کھڑکی ہوئی اور سیرجی سے اترنے کے بجائے اچانک نیچے کو گئی وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں لڑکھرائی تھی۔ ایرک حیران ہوا اور یہ دیکھ کر وہ مزید حیران

رہ گیا کہ اس نے پیروں میں کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔

”تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟“

”مجھے سردی نہیں لگتی۔“ لڑکی اس کے پاس آگئی۔ ایرک نے اسے قریب سے دیکھا وہ چودہ برس کی گھلائی رنگت اور بہت دل کش نقوش کی مالک تھی۔ جسم چھریرا اور وزن کم تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سے حلقے تھے اور ہونٹ ہلکے عتابی ہو رہے تھے۔ اس نے ایرک سے پوچھا۔ ”تم کہاں رہتے ہو؟“

ایرک نے پلٹ کر اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”وہ میرا کمرہ ہے، تم کہاں رہتی ہو؟“

”تمہاری کھڑکی کے برابر والی کھڑکی میرے کمرے کی ہے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ایرک نے دیکھا کھڑکی کے شیشے پر بڑے سائز کی تصویر چسپی ہوئی تھی جس نے کھڑکی کو پوری طرح بند کر دیا تھا۔ ایرک نے دیکھا لڑکی کی بہت زیادہ سیاہ آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔ جانے کیوں اسے خوف سا محسوس ہوا اور وہ پلٹ کر عمارت کی طرف چل پڑا۔ جب وہ اندر داخل ہونے لگا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی میدان میں نہیں تھی۔ شاید وہ بھی جا چکی تھی۔ ایرک نے کپڑے بدلے، خنجر اپنی جگہ چھپایا اور سونے کے لیے بستر میں گھس گیا۔ اسے رہ رہ کر لڑکی کا خیال آ رہا تھا۔ رات گئے جب اس کے ماں باپ گھر آئے تب بھی وہ جاگ رہا تھا۔ وہ آپس میں کسی قدر بلند آواز میں بات کر رہے تھے۔ وہ چپکے سے بیڈ سے اتر آ اور دروازہ ڈر سا کھولا۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

”میرے خدا! بے چارے کا کیا حشر ہوا ہے۔ کل سے اس کی لاش جمیل میں پڑی ہوئی تھی۔“ بوشر بولا۔ ”شاید وہ زیادہ لی کر جمیل کی طرف چلا گیا ہوگا اور پاؤں پھسلنے سے جمیل میں گر گیا ہوگا۔“

لیانا اور بوشر کی باتوں سے ظاہر تھا کہ قصبے کا ایک دکان دار مسٹر کارمن، گزشتہ رات کسی وقت جمیل میں ٹکر کر جاں بحق ہو گیا تھا۔ ایرک کے لیے یہ خبر غیر متوقع تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ زیادہ دیر جاگتا۔ وہ واپس بستر کی طرف آیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح تیار ہو کر ناشتے کے لیے نیچے کچن میں آیا تو بوشر اخبار دیکھ رہا تھا جبکہ لیانا ناشتا تیار کرتے ہوئے لی وی پر خبریں بھی دیکھ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کارمن مرڈر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی تھی اور پولیس کے مطابق کارمن کی موت پانی میں ڈوبنے سے نہیں بلکہ شرگ کٹ جانے سے ہوئی تھی۔ اس کی گردن پر ایسے

شان تھے جیسے کسی نے باقاعدہ دانتوں سے کاٹ کر شہرگ کاٹی ہو۔ پولیس کے مطابق یہ کسی انسان کا کام ہے۔ دانتوں کے نشانات بتاتے تھے کہ قاتل کم عمر تھا۔ لیانا فکر مند ہوئی۔

”میرے خدا! یہاں کوئی ایسا درندہ صفت شخص موجود ہے۔“

”ممکن ہے وہ کوئی ویسٹرن ہو۔“ بوشر نے کہا۔ ”اس نے مسٹر کارمن کی گردن کاٹ کر اس کا خون پی لیا ہو۔“

لیانا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم سنجیدہ ہو؟“

”ہاں دنیا میں ویسٹرن ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کا خون پیتے ہیں لیکن وہ بہت چھپ کر رہتے ہیں۔“

”مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے یقین ہے اگر مسٹر کارمن کو کسی عام انسان نے نہیں مارا تو وہ یقیناً کوئی ویسٹرن ہے۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ماسٹر کارمن کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہو اور ممکن ہے جھگڑنے والے نے کارمن کی گردن پر کاٹ لیا ہو اور وہ زیادہ خون بہہ جانے سے مر گیا ہو پھر قاتل نے اس کی لاش جھیل میں پھینک دی ہو۔“

”تم بھول رہی ہو اگر مسٹر کارمن کا خون کہیں اور ہوتا تو اس کا خون ملنا چاہیے تھا لیکن خون نہیں ملا ہے۔ بہر حال ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

اس ٹکلی کے باوجود لیانا کی فکر کم نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”اگر وہ غیر ارادی قاتل ہے تب بھی بڑی خوفناک بات ہے۔“

”میرا خیال ہے پولیس جلد اسے گرفتار کر لے گی۔“ بوشر نے کہا اور اپنے ناٹھنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیانا ایرک کے سامنے ناشا رکھ رہی تھی۔ اس نے ایرک سے کہا۔

”تم باہر جانے میں احتیاط کیا کرو، خاص طور پر رات کے وقت باہر مت نکلا کرو۔“

”اوکے مام۔“ ایرک نے کہا۔ اس نے جلدی جلدی ناشا کیا پھر اس کا ہارن سٹائی دیا۔ اس نے جلدی سے بیگ اٹھایا۔ لیانا نے اسے پیار کیا۔ بوشر نے اس کے سر پر ہاتھ مارا، اگرچہ انداز شفقت والا تھا لیکن اس کے ہاتھ کی تختی ایرک نے سر پر محسوس کر لی تھی۔ لیانا نے اس کے لیے بیج جس تیار کر دیا تھا۔ ایرک باہر آیا تو اس کی نظر بے اختیار اپنے کمرے کے برابر والی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور اسے خیال آیا کہ یہ لڑکی اسکول نہیں جاتی، اس کی عمر اسکول جانے والی تھی۔ مگر گزشتہ تین ہفتے میں ایرک نے ایک بار بھی گھر سے اپنے علاقے کے اسکول میں نہیں دیکھا تھا۔ اس روز آسمان پر گہرے بادل تھے اور جب ایرک بس میں بیٹھا تو

اسے لگا جیسے لڑکی والی کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے، اگرچہ اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

اس شام لیانا اور بوشر گھر پر ہی تھے۔ کارمن کے قتل کی وجہ سے قصبے میں ہونے والی خفگیں ملتی کر دی گئی تھیں۔ لیانا اور بوشر نے چند ہفتوں میں یہاں خاصے دوست بنا لیے تھے جن کے ذریعے انہیں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ذہن کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کارمن قتل کیس میں مزید تفصیلات سامنے آئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی موت رات ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔

یہ سن کر ایرک کو وہ بندر نما چیز یاد آگئی جو ایک درخت سے دوسرے درخت پر گئی اور پھر اس سے اتر کر بھاگ گئی تھی۔ وہ جھیل کی طرف سے ہی آئی تھی۔ ایرک نے سوچا کہ ماں اور بوشر کو اس بارے میں بتائے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا کہیں اس پر مزید کوئی پابندی نہ لگ جائے۔ بوشر تو موقع کی تلاش میں رہتا کہ اسے کس طرح پابند کرے اور یہ کام وہ یہ ظاہر اس کی تربیت اور بھلائی کی آڑ میں کرتا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو درتک کھڑکی کے سامنے کھڑا میدان اور درختوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آج بھی اس چیز کی جھلک دکھائی دے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ تھک کر سونے کے لیے بستر پر چلا آیا۔

چارلی اور اس کے ساتھیوں سے اپنا بیچ جانے کے لیے وہ یہ کرنے لگا کہ جیسے ہی وقت ہوتا وہ اپنا بیچ کھالتا اور کس فوراً اپنے لاکر میں رکھ دیتا۔ اسے خوف تھا کہ چارلی نے اس کا یہ بس بھی توڑ دیا تو اس بار اسے سخت سزا ملے گی۔ چارلی اور اس کے ساتھیوں نے دو بار اسے گھیرا لیکن دونوں بار انہیں اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ دوسری بار میں چارلی نے اسے دھمکی دی۔

”تم مجھ سے چالاکی دکھا رہے ہو، تمہیں جلد اس کی سزا ملے گی۔“

چارلی اور اس کے ساتھی اسکول میں ایرک کو ایک حد سے زیادہ تشدد کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے ورنہ بات پر پھیل تک چلی جاتی۔ اس لیے چارلی سوائے دھمکی دینے کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت ایرک کا خیال تھا کہ یہ دھمکی ہی ہے۔ اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مئی کے تیسرے ہفتے میں برف پھٹنے لگی اور درختوں پر سنے پتے نظر آنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسکول کے بچوں کی شام میں سونگنگ کلاس شروع ہو گئی۔ یہ کلاسز قصبے کے جنازہ اور سونگنگ

پول میں ہو رہی تھیں۔ ایرک کو پانی سے خوف آتا تھا لیکن سونگنگ کلاس لینا لازمی تھا۔ وہ شام کو جاتا اور اس کی واپسی تک رات ہو جاتی تھی۔ اس شام وہ واپس آ رہا تھا کہ اس نے میدان میں اسی لڑکی کو دیکھا۔ وہ ایک جمولے پر دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھی جھول رہی تھی۔ ایرک ہچکچایا پھر اس کی طرف چلا آیا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو۔“ لڑکی بولی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایلی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”اور تمہارا؟“

”ایرک، تم کتنے سال کی ہو؟“

”چودہ سال۔“ ایلی نے کہا۔ ”شاید کم یا شاید زیادہ۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب میں بھی نہیں جانتی اور تم کتنے سال کے ہو؟“

”تیرہ سال سات مہینے اور بارہ دن۔“

ایلی نے اپنی سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے کم ہی چھوٹے ہو۔“

”تم کیا کرتی ہو؟“

”کچھ نہیں میں گھر میں ہوتی ہوں۔“

”ایکلی؟“

”نہیں میرے پاپا میرے ساتھ ہوتے ہیں۔“

ایرک نے اپنے برابر والے اپارٹمنٹ سے ایک بوڑھے اور گھنے آدمی کو آتے جاتے دیکھا تھا شاید اس کا نام ولسن تھا۔ ایلی نے تصدیق کی۔

”ہاں ولسن میرے ساتھ ہوتا ہے۔“

”تم اسکول جاتی ہو؟“

اس سوال پر ایلی خاموش رہی۔ ایرک سمجھ گیا وہ اس بات میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لمحے اس کے کمرے کی کھڑکی سے اسے لیانا نظر آئی۔ وہ اس کے کمرے میں چیزیں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ ایرک نے جلدی سے ایلی کو بائیں کہا۔ ”آگے بڑھ گیا۔“ جانے کیوں اسے خیال آیا کہ اسے ایلی نے ساتھ نظر نہیں آتا چاہیے۔ لیانا اور بوشر نے اس عمارت میں کسی سے تعلق نہیں رکھا تھا۔ البتہ قصبے میں انہوں نے بہت سے گھرانوں سے اچھے تعلقات بنا لیے تھے۔ ایک بار لیانا نے ایرک سے بھی کہا تھا کہ وہ قصبے کے اچھے گھرانوں سے لڑکیوں سے دوستی کرے۔ ایرک نے انکار کر دیا۔

”مجھے کسی سے دوستی نہیں کرنی۔“

لیانا نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“

”اس لیے کہ جب میں کسی سے دوستی کروں گا تو کچھ عرصے بعد اسے چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اس لیے میں کسی سے دوستی نہیں کرنا چاہتا۔“ ایرک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”لیکن اب تم بڑے ہو رہے ہو۔“ لیانا دفاعی انداز میں بولی وہ سمجھ گئی تھی کہ ایرک اسے اور بوشر کو الزام دے رہا ہے۔ بوشر کی نوکری کی وجہ سے وہ جگہیں بدلنے پر مجبور تھے۔ ”تمہیں اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔“

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایرک نے کہا اور کچن سے نکل گیا۔ انہیں یہاں آئے دوسرا مہینا شروع ہو گیا تھا اور اب تک ایرک کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے اس کی طرف بڑھے بھی تھے لیکن اس کا روکھا انداز دیکھ کر خود پیچھے ہٹ گئے۔ جس واحد ہستی سے اس نے کچھ دیر بات کی وہ ایلی تھی۔ ایرک کا خیال تھا کہ اس کی ماں نے اسے ایلی کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوا اور اپنا کواٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹا لٹا کر لیانا کمرے سے نکل آئی۔

”ایرک یہ لڑکی کون ہے؟“

”کون سی لڑکی مام؟“ وہ انجان بن گیا۔

”بہی، جس سے تم ابھی سامنے والے میدان میں بات کر رہے تھے۔“

”اوہ ایلی! امام وہ ایلی ہے ہمارے برابر والے اپارٹمنٹ میں اپنے پاپا کے ساتھ رہتی ہے۔“

”ولسن کی بیٹی۔“ لیانا نے بہت تعجب سے کہا۔ ”وہ تو بہت بوڑھا ہے اس کی عمر کم سے کم بھی ستر سال ہوگی، اس کی اتنی کم عمر بیٹی کہاں سے آگئی؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ ایرک اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”ویسے مام کیا بوڑھے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی ہے؟“

”ہوتی ہے لیکن یہ۔۔۔۔۔“ لیانا کہتے کہتے رک گئی۔ ”خیر چھوڑو، تم اس سے بات مت کیا کرو، وہ نچلے طبقے کی لڑکی ہے۔“

ایرک نے ماں کی بات سنی اور کوئی جواب دے بغیر کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا جیسے لیانا کی بات اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ البتہ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اگر وہ ایلی سے ملا اور اس کی ماں نے دیکھ لیا تو اس کا کیا رد عمل ہوگا؟ ایرک کے ماں باپ دولت مند اور مہذب

شان تھے جیسے کسی نے باقاعدہ دانتوں سے کاٹ کر شرگ کاٹی ہو۔ پولیس کے مطابق یہ کسی انسان کا کام ہے۔ دانتوں کے نشانات بتاتے تھے کہ قاتل کم عمر تھا۔ لیاٹا فکرمند ہوگئی۔

”میرے خدا! یہاں کوئی ایسا درندہ صفت شخص موجود ہے۔“

”ممکن ہے وہ کوئی دیہاتر ہو۔“ بوشرنے کہا۔ ”اس نے مسٹر کارمن کی گردن کاٹ کر اس کا خون پی لیا ہو۔“

لیانا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم سنجیدہ ہو؟“

”ہاں دنیا میں دیہاتر ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کا خون پیتے ہیں لیکن وہ بہت چھپ کر رہتے ہیں۔“

”مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے یقین ہے اگر مسٹر کارمن کو کسی عام انسان نے نہیں مارا تو وہ یقیناً کوئی دیہاتر ہے۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ماسٹر کارمن کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہو اور ممکن ہے جھگڑنے والے نے کارمن کی گردن پر کاٹ لیا ہو اور وہ زیادہ خون بہہ جانے سے مر گیا ہو پھر قاتل نے اس کی لاش جھیل میں پھینک دی ہو۔“

”تم بھولی رہی ہو اگر مسٹر کارمن کا خون کہیں اور ہوتا تو اس کا خون ملنا چاہیے تھا لیکن خون نہیں ملا ہے۔ بہر حال ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

اس تسلی کے باوجود لیانا کی فکر کم نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”اگر وہ غیر ارادی قاتل ہے تب بھی بڑی خوفناک بات ہے۔“

”میرا خیال ہے پولیس جلد اسے گرفتار کر لے گی۔“ بوشرنے کہا اور اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیانا ایرک کے سامنے ناشتہ کر رہی تھی۔ اس نے ایرک سے کہا۔

”تم باہر جانے میں احتیاط کیا کرو، خاص طور پر رات کے وقت باہر مت نکلا کرو۔“

”اوہ کے مام۔“ ایرک نے کہا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا پھر بس کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے بیگ اٹھایا۔ لیانا نے اسے پیار کیا۔ بوشرنے اس کے سر پر ہاتھ مارا، اگرچہ انداز شفقت والا تھا لیکن اس کے ہاتھ کی سختی ایرک نے سر پر محسوس کر لی تھی۔ لیانا نے اس کے لیے بچ کس تیار کر دیا تھا۔ ایرک باہر آیا تو اس کی نظر بے اختیار اپنے کمرے کے برابر والی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور اسے خیال آیا کہ یہ لڑکی اسکول نہیں جاتی، اس کی عمر اسکول جانے والی تھی۔ مگر گزشتہ تین ہفتے میں ایرک نے ایک بار بچکناس سے اپنے علاقے کے اکلوتے اسکول میں نہیں دیکھا تھا۔ اس روز آسمان پر گہرے بادل تھے اور جب ایرک بس میں بیٹھا تو

اسے لگا جیسے لڑکی وہی مرضی سے کوئی بھانپ رہا ہے، اگرچہ اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

اس شام لیانا اور بوشر گھر پر ہی تھے۔ کارمن کے قتل کی وجہ سے قصبے میں ہونے والی خفگیوں میں یہاں خاصے دوست بنا لیے تھے جن کے ذریعے انہیں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ڈنر کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کارمن قتل کیس میں مزید تفصیلات سامنے آئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی موت رات ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔

یہ سن کر ایرک کو وہ بندر نما چیز یاد آگئی جو ایک درخت سے دوسرے درخت پر گئی اور پھر اس سے اتر کر بھاگ گئی تھی۔ وہ جھیل کی طرف سے ہی آئی تھی۔ ایرک نے سوچا کہ ماں اور بوشر کو اس بارے میں بتائے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا کہیں اس پر مزید کوئی پابندی نلگ جائے۔ بوشر تو موقع کی تلاش میں رہتا کہ اسے کس طرح پابند کرے اور یہ کام وہ یہ ظاہر اس کی تربیت اور بھلائی کی آڑ میں کرتا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو درخت کھڑکی کے سامنے کھڑا میدان اور درختوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آج بھی اس چیز کی جھلک دکھائی دے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ تھک کر سونے کے لیے بستر پر چلا آیا۔

چارلی اور اس کے ساتھیوں سے اپنا بیچ بچانے کے لیے وہ یہ کرنے لگا کہ جیسے ہی وقفہ ہوتا وہ اپنا بیچ کھا لیتا اور کبس فوراً اپنے لاکر میں رکھ دیتا۔ اسے خوف تھا کہ چارلی نے اس کا یہ کبس بھی توڑ دیا تو اس بار اسے سخت سزا ملے گی۔ چارلی اور اس کے ساتھیوں نے دو بار اسے گھیرا لیکن دونوں بار انہیں اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ دوسری بار میں چارلی نے اسے دھمکی دی۔

”تم مجھ سے چالاکی دکھا رہے ہو، تمہیں جلد اس کی سزا ملے گی۔“

چارلی اور اس کے ساتھی اسکول میں ایرک کو ایک حد سے زیادہ تشدد کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے ورنہ بات پر پبلک تک چلی جاتی۔ اس لیے چارلی سوائے دھمکی دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ایرک کا خیال تھا کہ یہ دھمکی ہی ہے۔ اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مئی کے تیسرے ہفتے میں برف پھیلنے لگی اور درختوں پر سنے پتے نظر آنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسکول کے بچوں کی شام میں سونٹنگ کلاسز شروع ہو گئیں۔ یہ کلاسز قصبے کے جنازیم اور سونٹنگ

پول میں ہو رہی تھیں۔ ایرک کو پانی سے خوف آتا تھا لیکن سونٹنگ کلاس لینا لازمی تھا۔ وہ شام کو جاتا اور اس کی واپسی تک رات ہو جاتی تھی۔ اس شام وہ واپس آ رہا تھا کہ اس نے میدان میں اسی لڑکی کو دیکھا۔ وہ ایک جھولے پر دونوں ہاتھ لٹکا کر بیٹھی جھول رہی تھی۔ ایرک بچپن کا پھر اس کی طرف چلا آیا۔

”ہیلو۔“ لڑکی بولی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایلی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”اور تمہارا؟“

”ایرک، تم کتنے سال کی ہو؟“

”چودہ سال۔“ ایلی نے کہا۔ ”شاید کم یا شاید زیادہ۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب میں بھی نہیں جانتی اور تم کتنے سال کے ہو؟“

”تیرہ سال سات مہینے اور بارہ دن۔“

ایلی نے اپنی سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے کم ہی چھوٹے ہو۔“

”تم کیا کرتی ہو؟“

”کچھ نہیں میں گھر میں ہوتی ہوں۔“

”کیسی؟“

”نہیں میرے پاپا میرے ساتھ ہوتے ہیں۔“

ایرک نے اپنے برابر والے اپارٹمنٹ سے ایک کمرہ اور گنجے آدمی کو آتے جاتے دیکھا تھا شاید اس کا نام اس تھا۔ ایلی نے تعریف کی۔

”ہاں ولسن میرے ساتھ ہوتا ہے۔“

”تم اسکول جاتی ہو؟“

اس سوال پر ایلی خاموش رہی۔ ایرک سمجھ گیا وہ اس کے لیے بات نہیں کرتا چاہتی۔ اسی لمحے اس کے کمرے کی دروازے سے اسے لیاٹا نظر آئی۔ وہ اس کے کمرے میں چیزیں قریب سے رکھ رہی تھی۔ ایرک نے جلدی سے ایلی کو بائے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ جانے کیوں اسے خیال آیا کہ اسے ایلی کے ساتھ نظر نہیں آنا چاہیے۔ لیاٹا اور بوشرنے اس عمارت میں اس سے تعلق نہیں رکھا تھا۔ البتہ قصبے میں انہوں نے بہت سے گھرانوں سے ایچھے تعلقات بنا لیے تھے۔ ایک دن لیاٹا نے ایرک سے بھی کہا تھا کہ وہ قصبے کے اچھے گھرانوں سے لڑکوں سے دوستی کرے۔ ایرک نے انکار کر دیا۔

”مجھے کسی سے دوستی نہیں کرنی۔“

لیانا نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“

”اس لیے کہ جب میں کسی سے دوستی کروں گا تو کچھ عرصے بعد اسے چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اس لیے میں کسی سے دوستی نہیں کرنا چاہتا۔“ ایرک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”لیکن اب تم بڑے ہو رہے ہو۔“ لیاٹا دفاعی انداز میں بولی وہ سمجھ گئی تھی کہ ایرک اسے اور بوشر کو الزام دے رہا ہے۔ بوشر کی نوکری کی وجہ سے وہ جگہیں بدلنے پر مجبور تھے۔ ”تمہیں اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔“

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایرک نے کہا اور بچن سے نکل گیا۔ انہیں یہاں آنے دوسرا مہینا شروع ہو گیا تھا اور اب تک ایرک کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے اس کی طرف بڑھے بھی تھے لیکن اس کا روکھا انداز دیکھ کر خود پیچھے ہٹ گئے۔ جس واحد ہستی سے اس نے کچھ دیر بات کی وہ ایلی تھی۔ ایرک کا خیال تھا کہ اس کی ماں نے اسے ایلی کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوا اور اپنا کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹکا کر لیاٹا کمرے سے نکل آئی۔

”ایرک یہ لڑکی کون ہے؟“

”کون سی لڑکی مام؟“ وہ انجان بن گیا۔

”بچی جس سے تم ابھی سامنے والے میدان میں بات کر رہے تھے۔“

”اوہ ایلی امام وہ ایلی ہے ہمارے برابر والے اپارٹمنٹ میں اپنے پاپا کے ساتھ رہتی ہے۔“

”ولسن کی بیٹی۔“ لیاٹا نے بہت تعجب سے کہا۔ ”وہ تو بہت بوڑھا ہے اس کی عمر کم سے کم بھی ستر سال ہوگی، اس کی اتنی کم عمر بیٹی کہاں سے آگئی؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ ایرک اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”وہی مام کیا بوڑھے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی ہے؟“

”ہوتی ہے لیکن یہ۔۔۔۔۔“ لیاٹا کہتے کہتے رک گئی۔ ”خیر چھوڑو، تم اس سے بات مت کیا کرو، وہ نچلے طبقے کی لکھی ہے۔“

ایرک نے ماں کی بات سنی اور کوئی جواب دیے بغیر کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا جیسے لیانا کی بات اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ البتہ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اگر وہ ایلی سے ملا اور اس کی ماں نے دیکھ لیا تو اس کا کیا رد عمل ہوگا؟ ایرک کے ماں باپ دوست مند اور مہذب

زردہ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو لسن کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”تم جانتی ہو تم میرے لیے کیا ہو؟“
 ”ہاں اور میں تم پر عمل اعتماد کرتی ہوں۔“
 لسن کا چہرہ ذرا ہلکا ہوا۔ وہ اس سے شاید کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ مگر اس نے گہری سانس لی اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں شاید کل تک آؤں۔“
 ”کام کر کے آنا۔“ ایلی نے کہا۔ ”تم جانتے ہو میری خوراک کا وقت قریب ہے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔ لسن کے لیے سفر کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ گزشتہ ساٹھ سال سے سفر میں تھا۔ اس دوران میں اس نے کینیڈا اور شمالی امریکا کا بیشتر حصہ دیکھ لیا تھا لیکن کہیں بھی وہ سال بھر سے زیادہ نہیں رکا تھا۔ قصبے سے نکلنے کے بعد اس نے کار کا رخ نزدیکی شہر کی طرف کر دیا۔ یہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن پھر بھی اس قصبے کے مقابلے میں بڑا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہاں ہونے والی کسی واردات یا گمشدگی کا تعلق ان لوگوں سے نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ موقع اس نے ایک ہفتہ پہلے ہی تازہ لیا تھا۔ یہ آئس ہاکی کا چھوٹا سا اسٹیڈیم تھا۔ وہ دس بجے اسٹیڈیم کے پاس پہنچا تو وہاں کی روشنیاں بند کی جا رہی تھیں اور پرسکٹس کرنے والے نوجوان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ لسن شاور والے حصے میں آیا۔ اس نے ایک کونے والے شاور کا انتخاب کیا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سرنج نکال کر اس طرف بڑھا۔

ایک انیس یا بیس برس کا صحت مند نوجوان شاور لے رہا تھا۔ لسن نے عقب سے اس کی گردن میں سرنج اتار دی۔ اس نے تڑپ کر چلنے لگا لیکن دوا اتنی دیر میں کام کر چکی تھی۔ نوجوان بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ لسن نے شاور بند کیا اور اپنا سامان لے کر اسی حصے میں آ گیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ چند منٹ بعد شاور لینے والے باقی کھڑی چلے گئے تو اس نے بے ہوش نوجوان کو کھینچا اور ایک شوروم میں آیا۔ اس نے سب سے پہلے بیگ سے عیب نکال کر اس کے ہاتھ پیر اور منہ کا باندھا۔ اب وہ نہ مل سکتا تھا اور نہ اوزن کا لال سکتا تھا۔ لسن نے نوجوان کے پیر میں رسی باندھ کر اسے چھت سے لگے کڈے سے الٹا لٹکا دیا۔ اس کام میں اسے بہت زیادہ محنت کرنا پڑی تھی اور اس کا سانس بھول گیا تھا۔ پھر اس نے نوجوان کے سر کے نیچے ایک بڑا لیکن رکھا اور اس میں بڑے منہ والی کیف لٹائی۔ یہ کیف نوجوان کے سر کے مین نیچے تھی۔ لسن نے اپنے انتظام سے

چڑھاؤں کا۔ مجھے برف سے بھی نفرت ہے میں جنوب کی طرف جاؤں گا جہاں سال میں صرف چار مہینے برف پڑتی ہے اور سبزہ بالکل نہیں مرجھاتا۔“ ایرک نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں برف پسند ہے؟“
 ”مجھے موسم سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ غصہ سے بڑے انداز میں بولی۔
 ”تم عجیب سی ہو۔“ ایرک نے کہا۔ ”میرے ساتھ کھوئے چلو؟“

ایلی نے کچھ سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”لیکن میں صرف شام اور رات کو نکلتی ہوں۔“
 ”میں تمہیں کل شام لے چلوں گا۔“ ایرک نے کہا اور اٹھ گیا۔ ”اب میں جاؤں گا مجھے اسکول کا کام کرنا ہے۔“
 ایرک کے جانے کے بعد ایلی نے دیکھا اس کا ٹیم وٹن پڑا رہ گیا تھا۔ ایلی نے ٹیم اٹھا لیا، اس نے دیکھا اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے لسن دیکھ رہا ہے۔ وہ اٹھ کر اندر چلی آئی۔ لسن نے کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا بیگ بھی تیار تھا وہ کام سے جا رہا تھا۔ اس نے ایلی کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم کسی لڑکے سے ملو۔“
 ”کیا سچ ہے اور کیا غلط ہے یہ میں سمجھ جاتی ہوں۔“ ایلی کا لہجہ سرد اور کسی قدر تحملاً تھا، جیسے اپنے باپ سے نہیں بلکہ کسی ماتحت سے بات کر رہی ہو۔ اس کی بات سن کر لسن فدا یا نہ انداز میں مسکرایا تھا۔

”ہاں میں بھول جاتا ہوں کہ تم بہتر جانتی ہو مگر تمہاری ماں سے مجھے بہت مشکل پیش آتی ہے۔ اب میں بوز عا ہو گیا ہوں اور پہلے کی طرح شقت والے کام نہیں کر سکتا۔“
 ایلی نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے اس بات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہو۔ لسن نے زور دے کر کہا۔ ”میرے لیے تمہارا تحفظ سب سے اہم ہے۔“
 ”میں اپنا تحفظ خود کر سکتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”نہیں اس معاملے میں تم نا تجربہ کار ہو۔ ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ اپنی شناخت چھپا کر رکھنا ہے۔ کیونکہ اگر لوگوں کو ایک بار پتا چل گیا کہ تم کون ہو تو وہ...“ لسن مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھا لیا اور لسن کے طرف بڑھا۔ دروازے پر رک کر اس نے ایلی کی طرف دیکھا۔

”اب تم مجھے بتائے بغیر ایسا کوئی کام نہیں کرو گی۔ تم جانتی ہو کہ میں نے وہ کام کتنی مشکل سے کیا تھا۔“
 ایلی لسن کے پاس آئی اور اس کے بوز عا بھریں

اس بارے میں نہیں بتایا اسے معلوم تھا کہ بوش اس معاملے میں بھی اس کا کوئی قصور تلاش کر لے گا اور اسے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوگا۔ لیکن ابھی شوبہ کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گی۔ اس کے پیروں میں نیل پڑ گئے تھے لیکن کوئی زخم نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ بات چیت میں کامیاب رہا تھا۔
 اگلے دن وہ سوئنگ کلاس لینے نہیں گیا تھا۔ اس کے پیروں میں ابھی تک تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ میدان میں آ گیا۔ لیانا اور بوش ایک تقریب کے لیے سر شام ہی روانہ ہو گئے تھے اس لیے ان کو پتا نہیں چلا۔ وہ بیچ پر بیٹھا ٹیم کھیل رہا تھا کہ اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، اس نے دیکھے بغیر جان لیا کہ وہ ایلی ہے۔ وہ بیچ پر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”اس نے تمہیں کیوں مارا تھا؟“ ایلی نے سرگوشی میں کہا۔
 ”میں نہیں جانتا۔“
 ”تم نے اسے کیوں نہیں مارا؟“
 ایرک نے اس بار ایلی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایرک سہم گیا۔ ”میں اسے نہیں مار سکتا۔“
 ”اب تم اسے مارو گے۔“ ایلی نے سرسراتی آواز میں کہا۔

ایرک انکار کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا لیکن ایلی کی آنکھوں میں جانے کیا تھا وہ انکار نہیں کر سکا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”میں اسے ماروں گا۔“
 ایلی کی آنکھوں کی سرخی دور ہو گئی اور اس میں نرمی آ گئی تھی وہ مسکرائی۔ ”تم اچھے لڑکے ہو۔“
 ”تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟“
 ”میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔“ ایلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں تمہارے سوا کسی سے نہیں ملتی۔“

”گھر میں صرف تم اور مسٹر لسن ہوتے ہو؟“
 ”ہاں اور تمہارے گھر میں کتنے لوگ ہیں؟“
 ”میں، میری ماں، لیانا اور بوش۔“
 ”بوش؟“ ایلی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”میرا سوتلا باپ ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے بتا دیا۔
 ”تم اسے چھوڑ دو گے؟“
 ”ہاں جیسے ہی میں اٹھارہ سال کا ہوں گا اسے چھوڑ کر

لوگوں سے تعلق رکھنا پسند کرتے تھے۔ جبکہ ایلی اپنے حیلے سے واقعی نچلے طبقے کی نظر آتی تھی۔ ایرک حیران تھا کہ وہ اتنے عام سے کپڑے کیوں پہنتی تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں فیشن اور میک اپ کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ جبکہ ایلی کے بال تک بے ترتیبی سے کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اس میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ شام کو بوش آیا تو لیانا نے اسے ایلی اور لسن کے بارے میں بتایا۔ اس نے ایرک کو بلا لیا۔
 ”برخوردار یہ کیا چکر ہے کیا تم اس لڑکی سے دوستی کرنا چاہتے ہو؟“

”نہیں۔“ ایرک نے سہم کر کہا۔ ”میں نے بس کچھ دیر اس سے بات کی تھی۔“
 ”اب اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ بوش نے سختی سے کہا۔ ”مجھے اس کا باپ مشکوک لگتا ہے سارا دن گھر میں گھس رہا ہے اور بہت کم کہیں باہر جاتا ہے۔“
 اگلے دن وہ سوئنگ کلاس سے واپس آ رہا تھا تو ٹرین کے اوپر ہیڈ کے نیچے سے گزرتے ہوئے سامنے سے چارلی آتا دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے پلٹا لیکن پیچھے چارج اور فلپن کو موجود پا کر رک گیا۔ اس کے فرار کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔ چارلی اس کے قریب رکا۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔ ”اے ایرک! میں نے کیا کہا تھا، تمہیں تمہاری چالاکی کی سزا ضرور ملے گی۔ اب وقت آ گیا ہے۔“

چارلی اور نیکسن نے اسے دونوں ہاتھوں سے قابو کر لیا۔ جانے کیوں چارلی کو سامنے پا کر وہ بے دم سا ہو جاتا اور شدید خواہش کے باوجود کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ چارلی نے اپنے کوٹ سے ایک بید کی چھڑی نکالی۔ اس نے چھڑی ایرک کے چہرے کے سامنے لہرائی اور بولا۔ ”اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟۔۔۔ تمہیں پتا ہے جب یہ لگتی ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے؟“

چارلی نے یہ کہتے ہی چھڑی گھما کر اس کے پیروں پر ماری، ضبط کے باوجود اس کی کراہ نکل مئی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے ہونٹ سختی سے سچھ لیے تھے۔ چارلی پوری قوت سے اس کے پیروں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے سن کر دس چھریاں ماریں اور پھر ہاتھ روک لیا۔ ”میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

چارلی اور نیکسن نے اسے چھوڑا تو وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے پیروں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ جس وقت وہ خود کو کھینٹے ہوئے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں جن میں سرخی چمک رہی تھی۔ اس نے لیانا اور بوش

مطمئن ہو کر چاقو نکالا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ یہاں کا کارڈ تھا اور اسے دروازہ اندر سے بند دیکھ کر شاید شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے روشنی دروازے کے شیشے سے اندر ڈالی تو بس نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ گاڑی نے اٹنے لگے نو جوان کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ دوسرے گاڑی کو کال بھی کر رہا تھا۔

ولسن نے گہری سانس لی اور اٹنے لگے ہوئے نو جوان کو دیکھا جو ہوش میں آ رہا تھا۔ اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے چاقو رکھ دیا اور اپنے بیگ سے ایک بوتل نکالی جس میں زرد رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ بوتل لے کر اسٹور روم کے ایک کونے میں آیا اور ایک ریک کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا۔ اب اسٹور روم کے دروازے پر ضرریں لگ رہی تھیں دوسرے گاڑی آگئے تھے اور وہ دروازہ توڑ رہے تھے۔ جیسے ہی دروازہ ٹوٹا اس نے بوتل کھولی اور اسے سر سے بلند کرتے ہوئے اپنے اوپر اٹھل لیا اور پھر چانک اسٹور روم میں ایک تیز چٹخ کوچ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ایرک اہلی کا منتظر تھا۔ وہ سچ پر بیٹھا تھا اور اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اہلی کب آئی۔ وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ چکی تھی۔ ایرک نے دیکھا اس کا چہرہ سفید اور ستا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد طے بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ ایرک کھڑا ہو گیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

اہلی خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ آج بھی اس نے سوچ کھر درا لیکن موسم کے لحاظ سے تاکافی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوتے یا چپل نہیں تھیں۔ ایرک اسے ایک اسٹور تک لایا۔ اس نے اندر جا کر دو کینڈی چاکلیٹ میں۔ وہ واپس آیا تو دو بلیاں اہلی پر غرار رہی تھیں۔ ایرک نے ان کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اہلی اصل میں اسٹور میں لگے ٹی وی کو دیکھنے شیشے کے پاس چلی آئی تھی۔ ٹی وی میں نزدیکی شہر کے آکس ہائی اسٹڈیم سے سننے والے زخمی شخص کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ تیز اب سے جھلس کر ناقابل شناخت ہو گیا تھا اور پولیس اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایرک کو دیکھ کر وہ جلدی سے ٹی وی سے دور چلی گئی تھی اور اس دوران میں ان دو آوارہ لیجوں نے پھر اس پر غرانا شروع کر دیا تھا۔ ایرک نے ایک کینڈی چاکلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ اہلی نے انکار میں ہلایا۔ "میں نہیں کھا سکتی۔"

"پلیز حالو۔" ایرک نے اصرار کیا تو اس نے کینڈی چاکلیٹ لے لی اور اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹا لیکن جیسے ہی ٹکڑا اس کے حلق سے نیچے گیا اس نے پیٹ پکڑ لیا اور پھر وہ نزدیکی گلی کی طرف بھاگی۔ جب ایرک وہاں پہنچا تو وہ اہلی کر رہی تھی۔ اس نے جو کھایا تھا وہ سب باہر آ گیا تھا۔ اہلی نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"میں نے کہا تھا میں نہیں کھا سکتی۔"

اس کی حالت دیکھ کر ایرک نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "سوری میں نے تمہیں مجبور کیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولی۔ "اب مجھے جانا ہوگا۔"

"کہاں اور اتنی جلدی؟" ایرک نے تاب ہو گیا تھا۔

"ہاں مجھے جانا ہے۔" اہلی نے کہا اور گلی کے سرے کی طرف چل پڑی۔ وہ ایرک سے پہلے نکل گئی اور چند سیکنڈ بعد ایرک سڑک پر آیا تو اسے اہلی کہیں نظر نہیں آئی وہ چند سیکنڈ میں غائب ہو چکی تھی۔ ایرک کچھ دیر حیران پریشان کھڑا رہا پھر گھر کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

شہر کے مرکزی اسپتال کے ریسپشن پر ایک نو جوان اور دل کش نرس موجود تھی اور کمپیوٹر پر کام کر رہی تھی۔ داخلی دروازہ سامنے ہی تھا۔ ایک بار گھنٹی بجی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کافتز کے دوسری طرف ایک مہسن لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا لباس معمولی اور چہرہ مٹا ہوا تھا۔ نرس نے پوچھا۔ "میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"میرے پاپا یہاں داخل ہیں۔"

"کس شعبے میں ہیں اور انہیں کیو ہوا ہے؟"

"اصل میں انہیں پولیس لائی ہے ان کا چہرہ جھلس گیا ہے۔"

"اوہ۔" نرس نے ہمدردی سے کہا۔ "وہ ساتویں فلور پر موجود ہے کیا تم اسے دیکھنا چاہو گی؟"

"نہیں۔" لڑکی نے جواب دیا اور پلٹ کر چلی گئی۔ نرس نے دیکھا اس کے پاؤں ننگے تھے۔ اسے خیال آیا کہ پولیس اس زخمی کے لواحقین کو تلاش کر رہی ہے۔ وہ کافتز سے نکل کر لڑکی کے پیچھے آئی لیکن جب تک وہ دروازے سے باہر آئی تو اسپتال کے سامنے وسیع پارکنگ میں لڑکی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اتنی ہی دیر میں وہ غائب ہو چکی تھی۔ حیران نرس واپس اندر گئی تو نرس کی نصیحت پر موجود ایک سیالیا بہت تیزی سے دوبار پر چڑھتے ہوئے اوپر جا رہا تھا۔

☆☆☆

ایرک ناشتے کی میز پر تھا اور لپانا حسب معمول ٹی وی پر خبریں دیکھ رہی تھی۔ خبر ایک زخمی کے بارے میں تھی۔ ٹریشیہ رات سنی نے اسپتال کی ساتویں منزل پر اس کے سرے میں تھیں کہ راناٹوں سے اس کی شرگ کاٹ دی۔۔۔ تھی۔ یہ بات یہ تھی کہ اس کے بستر پر بہت معمولی سا خون ٹرا تھا۔ نرس شفٹ میں استقبالیہ پر موجود نرس نے ایک لڑکی کے بارے میں بتایا جس نے نامعلوم زخمی کو اپنا باپ بتایا تھا اور پھر وہ اسے دیکھ بغیر چلی گئی۔ نرس نے اس کا ہاتھ بٹایا تو ایرک ساکت رہ گیا۔ اس کا منہ کی طرف مچھ سے جاتا تھا رک گیا تھا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ بوشر غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔

"کیا بات ہے پر غور دار! رک کیوں گئے؟" بوشر نے پوچھا تو وہ چونک گیا اس نے جلدی سے بیچ منہ میں رکھ لیا۔ اپنے تاثرات چھپانے کے لیے وہ پیالے پر جھک گیا۔ اس دوران میں اسکول بس نے پارک دیا تو وہ بیگ اٹھا کر باہر کی طرف اپکا اس نے سینا اور بوشر کو بائے بھی نہیں کہا۔ لیانا نے حیرت سے بوشر کی طرف دیکھا تو اس نے سر دھچکے میں کہا۔

"یہ روز بروز بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے اسے سبق دینا پڑے گا۔"

لیانا کا بپ تھی۔ ایک بار بوشر نے ایرک کو ہیلت سے رٹھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "میں اس سے سمجھا لوں گی۔ ابھی بچہ ہے۔"

"تم نے غور نہیں کیا وہ ٹی وی میں خبر سنتے ہوئے کات رہا تھا۔" بوشر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ بچہ نہیں ہے۔ سب چودہ سال کا ہونے والا ہے۔"

لیانا نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"تم نے یوز کا ستر کا بتایا ہوا حلیہ غور سے سنا؟"

"کس کا حلیہ؟"

"اس تڑکی کا جو اپنے پاپا سے ملنے آئی تھی۔" بوشر نے کہا اور کچن سے چلا گیا۔ لیانا بوشر کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

باہر مکر ایرک نے ایک نظر اہلی کے کمرے کی بند کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایرک نے کبھی اسے کھلے نہیں دیکھا تھا۔ اس میں بچہ وہ موضوع شہر میں ہونے والا تھا۔ ایرک نے خیال میں یہ بچہ پارک کا کام تھا۔ جس نے زخمی کو دیکھا اس کا خون کی لپٹ تھا۔ ایرک نے زخمی کو ٹی وی دیکھا۔ اس کا چہرہ اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا لیکن اب اسے

اسپتال لایا گیا تھا تو اس نے اپنا خامس لباس پہن رکھا تھا۔ اسکول سے واپسی پر ایرک نے اپنے گھر کے بجائے اہلی کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ واپس ہو کر واپس جا رہا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ اہلی کھڑی تھی۔ کھل کے مقابلے میں آج اس کا رنگ گھٹا ہوا اور آنکھوں کے حلقے کم ہو گئے تھے۔ چہرہ اتنا مٹا ہوا نہیں تھا۔ ایرک اندر آ گیا۔ وہ غور سے اہلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بٹایا پوچھا۔

"کل اسپتال میں مرنے والا ولسن تھا؟"

اہلی نے سر ہلایا۔ "ہاں۔"

"کسی نے اس کی شرگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا۔"

ایرک نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ اہلی خاموش رہی۔ ایرک نے بات جاری رکھی۔ "اسپتال کی نرس نے ایک لڑکی کا حلیہ بتایا ہے۔ جو بالکل تمہارے حلیے سے ملتا ہے۔"

اہلی خاموش رہی تو ایرک نے اس کے شانے تمام کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ "چپ کیوں ہو یو لو؟"

اہلی نے کہا۔ "اس نے پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

"وہ تمہارا باپ تھا؟"

اہلی نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اہلی نے کہا اور دھکی نظر آنے لگی۔ "وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔"

ایرک نے اس کا دھکے محسوس کیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ "وہ تمہارا پاپا ہے فریڈ تھا؟"

"بہت پہلے... جب وہ جوان تھا۔"

ایرک پیچھے ہوا۔ "اگلی قلم کتنے سال کی ہو؟"

"میں چودہ سال کی ہوں۔" اس نے جواب دیا اور پھر بولی۔ "میں ایک نامعلوم وقت سے چودہ سال کی ہوں۔"

ایرک اگلا سوال پوچھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اس نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ "اگلی تم میاں ہو؟"

اہلی چپ رہی۔ ایرک نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے کہا۔ "میں نہیں جانتی کہ میاں کیا ہوتا ہے لیکن میں خون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اگر میرے میں ایک بار مجھے خون نہ ملے تو میں مرنے لگتی ہوں لیکن مرنے پھر بھی نہیں ہوں۔ میری خوراک صرف خون سے ہے میں سمجھا اور نہیں کھا سکتی۔"

"تم نے کوئی نام نہان کران کا خون پیا ہے؟" ایرک کی آواز نے لگی۔ "ہے نا؟"

”بہت سارے لوگوں کا۔“ ایلی نے سرکوشی میں کہا۔ ”مجھے ان کی تعداد بھی یاد نہیں ہے۔ لیکن میرے لیے خون لانا تھا لیکن کبھی نہیں لایا تا تو۔۔۔۔۔“

”تو تم کسی کو مار کر اس کا خون پی جاتی تھیں؟“ ایرک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اچانک اسے تھپڑ مارا۔ ایلی نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ایرک پلٹ کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ عیلمری کے سر سے پر بوش کھڑا اس کی ٹھرائی کر رہا تھا۔ اس نے ایرک کو ایلی کے فلیٹ سے نکلنے دیکھ لیا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے بیگ ایک طرف پھینکا اور بستر پر گر گیا۔ وہ ایلی سے نفرت کرنا چاہتا تھا۔ اس دن وہ تمام وقت گھر میں رہا تھا۔ رات وہ سو رہا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے یونہی پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو اسے کھڑکی کے جھجے پر ایلی بیٹھی دکھائی دی۔ ایرک اسے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم اندر کیوں نہیں آ جاتیں؟“

”تم اجازت دو تو میں آ جاتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ایرک اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آیا۔ اس نے پت کھولا۔ ”اگر میں اجازت نہ دوں تو تم پھر بھی آ جاؤ گی؟“

ایلی خاموش رہی۔ ایرک نے چنگی بجا کر یوں اشارہ کیا جیسے کسی جانور کو بلارہا ہو۔ وہ پیچھے ہٹا تو ایلی اندر آ گئی تھی۔ اس نے ایرک کے عقارت آمیز انداز کو محسوس تو کیا لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ایرک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اگر میں تمہیں منع کروں اور تم سے برا سلوک کروں تو تم مجھے بھی مار دو گی۔۔۔۔۔ ہے نا! میرا بھی خون پی جاؤ گی؟“

ایلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔“

”جھوٹ، تمہیں صرف لوگوں کو قتل کرنے اور ان کا خون پینے سے محبت ہے۔“ ایرک نے نفرت سے کہا تو پکلی بار ایلی کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نظر آئے۔ ایرک نے دیکھا اچانک ہی اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ پھر یہ خون اس کے کانوں، آنکھوں اور مساموں سے بہتا دکھائی دیا۔ ایرک کو لگا جیسے وہ اسے بتا رہی ہو کہ وہ اس کا خون نہیں پی سکتی بلکہ اس کے لیے اپنا خون بہا سکتی ہے۔

”نہیں۔“ وہ بے قرار ہو کر ایلی کو گلے کے لیے آگے بڑھا۔ ”ایسا مت کرو پلیز۔“

ایلی کے جسم سے لرزش جیسے ختم ہوئی تھی۔ وہ مسکرا نے لگی۔ ”پتھر دیر میں ایرک نے اس سے پوچھا۔“ تم مجھ سے دوستی کرو گی؟“

”میں تمہاری دوست ہی ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

”نہیں ایسے نہیں۔“ ایرک نے کہا اور میز کی دراز سے اپنا چاقو نکالا اس کی دھار سے اپنی پٹیلی پر ہلکا سا رگ کا لگا یا تو خون چھلک آیا۔ اس نے پٹیلی ایلی کی طرف بڑھائی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اس کی آنکھیں یک دم سرخ ہو گئیں۔ وہ بدلتے ہوئے انداز میں بولی۔

”نہیں دور رہو۔“

”پلیز۔“ ایرک نے ہاتھ آگے کیا تو وہ تیزی سے مڑی اور کسی پرندے کے مانند کھڑکی سے باہر نکل گئی۔ جب تک ایرک نے آکر نیچے جھانکا وہ غائب ہو چکی تھی۔ وہ مسکرایا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔ اگلے دن اسکول انتظامیہ بیچوں کو جھیل کے کنارے لے جا رہی تھی جہاں وہ مختلف کھیل کھیلتے۔ یہ اسکول والوں کی طرف سے بہار کا استقبال تھا۔ ایرک صبح تیار ہوا۔ اسکول کی بس آئی تو اس نے ماں کو پیار کیا اور بوش کو نظر انداز کر کے باہر نکل گیا۔ بوش نے لیا تا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”دیکھا تم نے۔۔۔۔۔ اسے سبق سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔“

”وہ اب بڑا ہو گیا ہے اور ہم اسے بچوں کی طرح نہیں مار سکتے۔“

”وہ کتاب بڑا ہو جائے مجھ سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ ان دنوں کس جگہ میں ہے۔“ بوش نے زہر لے انداز میں کہا اور اٹھ کر کچن سے چلا گیا۔

ایرک بس سے اترتا تو سامنے جھیل کا پانی لہریں لے رہا تھا۔ برف پکھل چکی تھی اور جھیل کے کنارے سبز گھاس ہوا کے جھوکوں سے ڈھری ہوئی جا رہی تھی۔ سامنے جنگل تھا جس کے ایک طرف قصبہ کا حصہ لگتا تھا۔ جنگل اور جھیل کے درمیان۔۔۔ چھوٹا سا میدان تھا۔ بچے اور ان کے گروپ نیچر ڈاسی میدان میں جھیل گئے تھے۔ ایرک جھیل کی طرف آیا اور پانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کی نظر پانی میں تیرتی ایک ڈنڈی کی طرف گئی۔ اس نے ذرا آگے جھک کر ڈنڈی اٹھالی اور میدان کی طرف گیا۔

چارلی، جارج اور نیلسن ایک درخت کے پیچھے چھپ کر سگریٹ نوشی کر رہے تھے۔ وہ ایرک کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے ایرک کو دیکھا تو چارلی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”بس بزدل کے بارے میں بات کر رہے تھے وہ آ گیا ہے۔“ یہ کہہ کر چارلی ایرک کی طرف بڑھا اور اس کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”کیا خیال ہے دوست آج ہمیں پر تمہاری ٹھوڑی اور پٹائی نہ لگائی جائے؟“

”آج تم میری پٹائی نہیں لگا سکو گے۔“ ایرک نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“ چارلی مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

”کیونکہ آج میں تمہاری پٹائی لگاؤں گا۔“ ایرک نے کہا اور عقب سے ہاتھ سامنے لاکر چارلی کے سر پر ڈنڈی ماری۔ پانی میں جھجک جانے سے لکڑی کا وزن خاصا تھا اور ضرب چارلی کے کان پر لگی اور خون بہہ نکلا۔ چارلی چند لمحے تو بے ہوشی کی کیفیت میں کھڑا رہا پھر چوٹ کھائے کتے کی طرح چلانے لگا۔ چند لمحوں میں وہاں نیچر ڈاسی اسکول کے دوسرے بچے جمع ہو گئے۔ ان میں سے اکثر چارلی کو اس طرح روتے چلاتے دیکھ کر بہت محفوظ ہوئے تھے۔ نیچر ڈاسی صورت حال جاننے میں چند لمحے لگے اور وہ ایرک اور چارلی دونوں کو لے گئے۔ ایک گھنٹے بعد اسکول میں ایرک کی جی جی پر پریل کے سامنے ہوئی جس نے اسے سخت تنبیہ کی اور پھر اس کے گھر فون کر دیا۔

☆☆☆

ایرک بستر میں دیکھا بوش کی غضبناک آواز سن رہا تھا۔ وہ ایرک کو سزا دینے کا اعلان کر رہا تھا اور لیا تا اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی۔ ایرک نے چونک کر دیکھا تو ایلی تھی۔ ایرک نے کھڑکی کھولی۔ وہ اندر آئی اور ایرک کو گلے لگ لیا۔ ”تم نے بہت اچھا کام کیا۔“

”تم نے دیکھا تھا؟“ ایرک نے پوچھا۔

”نہیں میں دن میں باہر نہیں نکل سکتی لیکن میں نے ٹی وی پر اس بارے میں سنا ہے۔“

ایرک فکر مند ہو گیا۔ ”تم کب تک اکیلی رہو گی، کیا کوئی دلسن کے بارے میں معلوم کر نے نہیں آیا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ اور میں نہیں جانتی کہ کب تک رہوں گی؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”یہ فلیٹ تمہارا ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔ ویسے دلسن کوئی جگہ خریدتا نہیں تھا ہمیشہ کراسے کی جگہ پر رہے ہیں۔“

باہر سے آتی آوازیوں سے لگ رہا تھا کہ بوش کا غیظ و غضب بڑھتا جا رہا تھا اور وہ کسی وقت بھی ایرک کے کمرے میں اپنی چیز کے کی بلت سمیت آ جاتا۔ ایلی نے سنا یہ آنکھوں سے ایرک کو دیکھا۔ ”اگر اس نے تمہیں ہاتھ لگایا تو میں اسے مار دوں گی۔“

ایرک گھبرا گیا۔ ”تم ایسا نہیں کرو گی۔“

”وہ آنے والا ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“ وہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔

”کہاں؟“۔۔۔۔۔ اسے رکو۔“ ایرک بولا لیکن اس نے کھڑکی کھولی اور ایرک سے کہا۔

”مجھے عقب سے مضبوطی سے پکڑ لو۔“

ایرک بوش کی آواز سن رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ایلی کو یہاں دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا اور اگر ایلی کو غصہ آ گیا تو بوش کی خیر نہیں ہوگی۔ مجبوراً اس نے عقب سے ایلی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ ایلی نے کہا۔ ”اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

جب ایرک کے حواس بحال ہوئے تو وہ ایلی کے کمرے میں تھا۔ اسے بس اتنا محسوس ہوا جیسے وہ ہوا کے تیز جھونکے سے گزرا ہوا اور اگلے لمحے وہ یہاں تھا۔ ایرک حیران تھا۔ ایلی کا وزن مشکل سے ساتھ پونڈ تھا اور وہ کم سے کم بھی نوے پونڈ زکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے نہ جانے کیسے اٹھا کر یہاں تک لے آئی۔ اس نے ایلی سے کہا۔ ”تم نے یہ کیسے کیا؟“

”میں بہت سارے ایسے کام آرام سے کر سکتی ہوں جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ وہ بولی۔

ایرک کو بوش کی فکر تھی۔ اگر وہ اسے کمرے میں نہ پاتا تو اور غضبناک ہو جاتا۔ جانے وہ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا؟ رات آٹھ بجے کے بعد اس پر گھر سے باہر جانے کی پابندی تھی۔ وہ صرف اسی صورت میں گھر سے باہر جاسکتا تھا جب لیا تا اور بوش گھر پر نہ ہوں تاکہ انہیں پتا نہ چل سکے۔ ایلی اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں اس شخص سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ایرک نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے بوش سے نفرت ہے لیکن میں اس سے ڈرتا بھی ہوں وہ مجھے بہت بے دردی سے مارتا ہے۔“

”تم میرے ساتھ رہ جاؤ۔“ ایلی نے اس سے کہا۔

ایرک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تمہارے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں ابھی چودہ سال کا نہیں ہوا اور اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد میں اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہوں۔“

”اگر تم رقم کی بات کر رہے ہو تو اس کی ہمارے پاس کی نہیں ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

اس فلیٹ میں فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ لاؤنج میں صرف ایک صوفہ کم بینڈ پر تھا۔ جس پر دلسن بیٹھا تھا۔ پولیس نے اسے نامعلوم اور ادارت قرار دے کر دفن دیا تھا کیونکہ انہیں سے بھی اس کی شناخت سامنے نہیں آئی تھی۔ دوسرے کمرے

میں فریج نہیں تھا لیکن اس میں لکڑی کا ایک بڑا سا بسک تھا اور اس کے علاوہ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے ڈبے اور بسک بکھرے ہوئے تھے۔ ایلی نے ایک ڈبا کھولا تو وہ ڈالرز سے بھرا ہوا تھا۔ ایرک حیران رہ گیا۔ اس نے ایلی سے پوچھا۔

”تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟“
ایلی خاموش رہی پھر اس نے دوسرا ڈبا کھولا تو اس میں سکے بھرے تھے یہ سب سونے کے تھے۔ کسی بسک میں چاندی کے ڈالرز بھرے تھے اور کسی میں چھوٹے موٹے ہیرے موتی اور اسی طرح کی قیمتی اشیائیں۔ ایرک نے پھر سوال کیا۔ ”یہ سب تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“
ایلی نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہ مت پوچھو۔“
ایرک سمجھ گیا۔ ”تم لوگوں نے آج تک جتنے لوگوں کو ہلاک کیا ہے یہ سب ان سے حاصل کیا ہے؟“

ایلی خاموش رہی۔ ایرک نے اگلا سوال کیا۔ ”وہ سن تمہارے ساتھ رہنے والا پہلا مرد تھا؟“
”نہیں... ساتواں مرد تھا۔“
”باقی چھ کہاں گئے؟“

”بوڑھے ہو کر مر گئے۔“ وین نے خود مرنے کی فرمائش کی تھی۔ ایک اور نے خودکشی کر لی تھی باقی بوڑھے ہو کر فطری موت مرے تھے۔“

”تم کہاں کی رہنے والی ہو؟“
ایلی نے گہری سانس لی۔ ”میں نہیں جانتی کہ میں کہاں کی رہنے والی ہوں لیکن مجھے یاد ہے، وہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس میں زیادہ تر کاشت کار رہتے تھے اور کچھ لوگ دوسرے کام کرتے تھے۔ ہم دوسری آبادیوں سے کئے ہوئے تھے۔ پھر ہمارے گاؤں پر بلائیں نازل ہونے لگیں۔ لوگ غائب ہو جاتے اور کچھ دن بعد ان کی لاشیں ملتی تھیں۔ کوئی ان کا خون ہی کران کو مار دیتا تھا۔ لوگ ڈر گئے، کوئی گاؤں سے باہر نہیں جاتا تھا کیونکہ جو بھی شام کے بعد گاؤں سے باہر جاتا وہ اس بلا کا شکار ہو جاتا۔ بچوں کو سختی سے منع تھا وہ گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔“

لیکن ایک دن میں اور میری بہن کھیلے ہوئے جنگل کی طرف چلے گئے اور ہمیں وہیں رات ہو گئی۔ جب ہم گھر کی طرف آنے لگے تو رات بھول گئے۔ ہم رو رہے تھے اور مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن گاؤں سے دور آنے کی وجہ سے کوئی ہماری آواز نہیں سن پا رہا تھا۔ ہاں اس بلا نے ہماری آواز سن لی۔ درختوں کے درمیان سے ایک تاریک مایا نکل کر ہم پر چھپنا اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ میں اس کی صورت نہیں

دیکھ سکی تھی کیونکہ اس نے میری گردن میں دانت گاڑ دیے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بلا میری شرگ کاٹ دیتی۔ میری بہن نے ہمت کر کے عقب سے اسے لکڑی ماری۔ اس نے مجھے چھوڑ کر میری بہن کو پکڑ لیا اور اسے لے کر درختوں کے درمیان غائب ہو گئی۔ میری گردن سے خون نکل رہا تھا۔ میں نے اپنی قمیض سے پٹی پھاڑ کر زخم پر باندھی اور گرتی پڑتی گاؤں کی طرف جانے لگی۔ جانے کیسے مجھے راستہ مل گیا اور میں گاؤں پہنچ گئی۔

میرے گھر والوں کو سر شام ہی پتا چل گیا تھا کہ ہم دونوں ہمیں غائب ہیں لیکن ڈر کی وجہ سے کوئی ہماری تلاش میں نکلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے زخمی دیکھ کر گاؤں والے ڈر گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں ڈرے تھے لیکن کوئی میرے پاس آنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر گاؤں والوں نے میرے باپ سے کہا کہ وہ مجھے مار دیں۔ میرے باپ نے انکار کیا تو گاؤں والوں نے ہمارے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی۔ مجبوراً میرے باپ نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ مجھے مار دے گا۔ وہ مجھے گاؤں سے باہر لایا اور مجھ سے کہا۔

”ایلی میں مجبور ہوں میں تمہیں ان لوگوں سے نہیں بچا سکتا، اس لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔ اب تم بھاگ جاؤ اور کہیں دور چلی جاؤ تاکہ میں گاؤں والوں کو کچھ سکون کے میں نے تمہیں مار کر دفن کر دیا ہے۔“

ایک چودہ سال کی لڑکی کے لیے یہ سب بہت خوفناک تھا۔ میں بھی گاؤں سے باہر نہیں گئی تھی اور نہ مجھے باہر کی دنیا کا علم تھا۔ جان بچانے کے لیے مجھے وہاں سے جانا تھا۔ اس وقت میں دیکھا کرتھیں تھی لیکن ستر کے دوران میں جب اگلے دن سورج نکلا تو اس کی روشنی میرے سینے کا قاتل برداشت ثابت ہوئی اور مجھے ایک سائے دار جگہ پر چھپنا پڑا۔ رات میں مجھے سکون ملا تھا۔ صبح کے قریب مجھے ایک قافلہ مل گیا اور میں اس کی ایک گاڑی میں گھاس میں چھپ کر لیٹ گئی۔ پھر میں ایک شہر پہنچی اور اس کے بعد سے میں مختلف جگہوں پر گھومتی رہی۔ مجھے لوگ ملتے رہے جو میری حفاظت کرتے تھے اور ساری عمر میرے ساتھ رہے۔ وہ بوڑھے ہو کر مر جاتے تھے اور میں ویسی کی ویسی ہی رہتی۔ میں آج بھی ویسے ہی ہوں جیسے کئی سو سال پہلے تھی۔ جتنا نہیں مجھے موت آنے کی بھی یاد نہیں۔

ایرک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تم فکر مت کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“
اس نے فوراً سے ایرک کو لپٹ لیا۔ ”خیر میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”ہاں!“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“
ایلی مسکرائے لگی۔ ایرک کو حیرت ہوئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنی اچھی لگ رہی تھی۔ ایرک کو معلوم تھا کہ بوشر اور اس کی ماں اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ لیانا پریشان ہوئی بین بوشر اب پرچ و تاب کھا رہا ہو گا لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اپنی اور اس کی محبت کی خاطر وہ ہر مشکل برداشت کرتا تھا۔ ہر سزا جھیل سکتا تھا مگر جو ہوا وہ ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ایرک سہم گیا۔
ایلی نے اس سے کہا۔

”تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے آؤ میرے ساتھ۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر لیانا اور بوشر موجود تھے۔ ایرک ایلی کے پیچھے تھا اسے دیکھتے ہی بوشر نے سختی خیز نظروں سے لیانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں نے کہا تھا ان کہ یہ یہیں موجود ہو گا۔“
”ایرک۔“ لیانا نے سخت لہجے میں کہا۔ ”باہر... میں نے تم سے کیا کہا تھا؟“

ایرک سر جھکائے ایلی کے برابر سے گزر کر باہر آ گیا۔ ایلی بوشر کو گھور رہی تھی۔ یک دم اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے سرگوشی نما لہجے میں بوشر سے کہا۔ ”تم ایرک کو پکڑ نہیں کہو گے۔“

اس کے تاثرات اور لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ بوشر خوف زدہ ہو گیا اور پلٹ کر اپنے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ لیانا بھی ڈر گئی اس نے ایرک کا ہاتھ تھامنا اور آگے بڑھ کر اسے ایرک نے مڑ کر دیکھا ایلی اسے دیکھ رہی تھی اور اس نے اشارے سے اسے مطمئن رہنے کو کہا۔ فلیٹ میں آتے ہی اس پر برس پڑی۔ ”ایرک تم نے نہایت غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ تم بیڈ روم میں ہوا اور تم اس کے گھر میں تھے۔ تم کب گھر سے نکلے؟“

ایرک نے سکون کا سانس لیا وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ دروازے سے باہر گیا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”جب تم دونوں بیڈ روم میں تھے۔ مجھے بوشر سے ڈر لگ رہا تھا اس لیے میں باہر چلا گیا۔“

”ایرک آئندہ تم اس لڑکی سے نہیں ملو گے۔ وہ ٹھیک نہیں ہے۔“
”ماترہ اچھی لڑکی ہے۔“ ایرک نے اسی انداز میں کہا۔ ”آپ اس سے بارے میں پوچھیں باقی ہیں۔“

لیانا اسے سمجھاتی رہی اور وہ خاموشی سے سنا رہا۔ بوشر فلیٹ میں آنے کے بعد بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ ایرک نے اطمینان محسوس کیا کہ اب اس کی جان چھوٹ گئی ہے لیکن جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں آیا پیچھے سے بوشر بھی آ گیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ایرک سہم گیا۔ بوشر نہایت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم اپنی ماں کو بیوقوف بنا سکتے ہو لیکن مجھے نہیں بنا سکتے۔ لیانا نہیں جانتی کہ ایلی کون ہے لیکن میں اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کون ہے؟“

”میں نہیں سمجھا تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ایرک نے معصومیت سے کہا۔

بوشر اس کے قریب آیا اور ذرا جھک کر بولا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ایلی لڑکی نہیں ہے۔ لیکن شہر میں مر گیا ہے اور یہ اب ایلی ہے۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت ہے اس لیے وہ تمہیں پھانس رہی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

ایرک ذرا پیچھے ہو گیا اور کسی قدر سرکش لہجے میں بولا۔ ”میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہا۔“

بوشر اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”جلد سمجھ جاؤ گے جب میں اسے ناکر دوں گا۔“

ایرک نے بے یقینی سے اپنے سوتیلے باپ کو دیکھا۔ ”تم اسے قتل کرنے کی بات کر رہے ہو؟“

”قتل انسان کو کیا جاتا ہے۔ کسی جانور کو نہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو وہ انسان نہیں ہے۔“ بوشر نے کہا اور جھٹکنے سے مڑ کر کمرے سے چلا گیا۔ اگلے دن ایرک اسکول جانے کے لیے نکلا لیکن وہ اسکول بس میں سوار نہیں ہوا۔ اس کے فلیٹ سے اسکول بس نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے اسے اطمینان تھا کہ اس کی ماں یا بوشر اسے بس میں سوار ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ عمارت کے کونے پر کھڑا بچوں کو اس میں سوار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی اسکول بس حرکت میں آئی وہ واپس عمارت میں آیا لیکن سامنے والے زینوں کے بجائے اس نے عقبی زینوں کا رخ کیا۔ وہاں سے اسے کوئی تیسری منزل کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنی فلیٹ والی گیلیری میں آ کر پہلے اس نے سُن گئی۔ اسے خوف تھا کہ کہیں بوشر یا اس کی ماں مین اس وقت نہ نکل آئیں۔ جب وہ ایلی کے فلیٹ کا دروازہ ہجرا رہا ہو۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ ایلی کے فلیٹ تک آیا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ دستک دینے والا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

سامنے ایلی موجود تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں کے گرد طے نمایاں ہو رہے تھے۔ ایرک ایک بار پہلے بھی اس کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا۔ جب وہ اس کے ساتھ باہر گئی تھی اور ایرک نے اسے ہموک سمجھ کر چاکلیٹ کھائی تھی۔ ایرک اندر آگیا۔ اس نے پوچھا۔
”تم ہموکی ہو؟“

ایلی نے سر ہلایا۔ ”مجھے سینے میں ایک بار ضرورت ہوتی ہے اور مہینا ہو چکا ہے۔“
”اگر تمہیں تمہاری خوراک نہ ملے تو تم کیسا محسوس کرتی ہو؟“ ایرک نے بھی خون کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا۔
”میں کمزور ہو جاتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پھر میرا دل چاہتا ہے بروقت سوتی رہوں۔“
”تم کہاں سوتی ہو؟“

ایلی اسے فلیٹ کے ایک واش روم میں لائی اور وہاں موجود ہاتھ دھو کر دکھایا۔ جس میں ایک تکیہ اور چھوٹا سا کھل بھی تھا۔ کھڑکی کے شیشے پر یہاں بھی ایک بڑا سا پوسٹر چپکا ہوا تھا جو دھوپ کو اندر آنے سے روکتا تھا۔ فلیٹ کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں یہاں سردی بے پناہ تھی۔ ایرک نے پوچھا۔
”تم اتنی سردی میں سو جاتی ہو؟“
”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے سردی یا گرمی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ایرک کو اس پر ترس آنے لگا۔
”تمہیں خوراک کی ضرورت ہے؟“

”ہاں لیکن وزن نہیں ہے وہی نیچے خوراک لا کر دیتا تھا۔“ ایلی نب کے کنارے بیٹھ گئی۔

ایرک کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ”تم... میرا خون لے سکتی ہو۔“
ایلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایرک! تم دنیا میں واحد انسان ہو جس کو میں ذرا سی تکلیف بھی نہیں دے سکتی۔ اس کے مقابلے میں میرے لیے مرجانا آسان ہے۔“
”لیکن میں بھی تمہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا۔“ ایرک نے کہا۔

”کیا تم میرے لیے خون لے سکتے ہو؟“
ایرک نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ہاں میں تمہارے لیے خون لاؤں گا اب تم آرام کرو۔“
ایرک نے اسے نب میں لٹا کر اسے کھل اوڑھایا پھر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ”میں ضرور اداؤں گا۔“
ایلی سوئی گئی۔ ایرک باہر آیا۔ اس نے فلیٹ سے

دروازے کو ایسے ہی بند کر دیا اور باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خون کہاں سے لائے؟ وہ باہر نکل آیا۔ کسی دوسرے انسان کو مار کر اس کا خون حاصل کرنا ایرک کے بس سے باہر تھا۔ وہ ایک طریقے سے خون حاصل کر سکتا تھا۔ وہ ایک اسٹور پر آیا اور اس نے وہاں سے ایک خالی بوتل اور زخموں پر چپکانے والی میڈیکلینڈ پٹی حاصل کی۔ اسے لے کر وہ تھمیل کے کنارے پارک میں آگیا۔ آج دن خوشگوار تھا اور تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اس لیے تھمیل کے کنارے آنے والوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اسے ایک گوشہ عافیت تلاش کرنے میں خاصی دقت ہوئی۔ چند درختوں کے درمیان اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے بوتل اور چاقو نکالا اور بوتل کا منہ کھول کر چاقو سے اپنی انگلی میں کٹ لگا لیا۔ تکلیف سے اس کی سسکی نکلی تھی۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے اپنا خون بوتل میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ خون بہنے کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ وہ مزید سست ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی مشکل سے بوتل ایک انچ بھری تھی کہ خون رک گیا۔ اسے انگلی میں زخم پر دوبارہ چکا لگانا پڑا۔ اس نے کوئی نصف درجن بار چرے لگا کر مشکل سے نصف بوتل بھری تھی۔ اتنا خون نکلنے پر اس کا اپنا سر جھکانے لگا تھا۔ اس نے ڈھکن مضبوطی سے بند کر کے بوتل بیگ میں رکھ لی۔ پھر لڑکھواتے قدموں سے قصبے کی طرف چل پڑا۔ اس نے راستے میں ایک دکان سے رک کر پانی پیا تو اس کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی تھی۔ زخم کو بار بار گہرا کرنے سے خون مسلسل ریس رہا تھا اور اس نے جو پانی چپکا کر وہ تر ہو چکی تھی۔ اس نے اسے اتار کر پینک دیا اور دوسری پانی چپکا کر۔ وہ مرکزی سڑک کے بجائے قطعی گلیوں سے ہوتا ہوا اپنے فلیٹ کی عمارت تک آیا اور پھر قطعی سڑکیوں سے اوپر آیا۔ اس نے گیلری سے جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ پوسٹر کام پر چپکا ہوگا۔ وہ ایلی کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے پہنچا تو خشک گلیاں۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ دے قدموں اندر آیا لیکن لاؤنج والے حصے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے کمرے میں جھانکا تو اسے واش روم کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہ آگے آیا اور اسے نب کے سامنے پوسٹر نظر آگیا۔ پوسٹر کے ہاتھ میں ایک چھوٹا چاقو تھا۔ ایلی کھل اوڑھے سو رہی تھی۔ ایرک نے اپنا چاقو نکال لیا اور دے قدموں آگے آنے لگا۔ اسے خوف تھا کہ پوسٹر نہیں پلٹ کر نہ دیکھ لے۔ وہ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پوسٹر نے چاقووں کا ہاتھ نیچے ایلی کی طرف کیا ہوا تھا مگر اس کا انداز جارحانہ نہیں بلکہ دفاعی تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ کھڑکی پر تھا۔

ایرک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن جب اس نے کھڑکی سے چپکا پوسٹر اتارنا شروع کیا تو ایرک سمجھ گیا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے چلا کر کہا۔ ”نہیں۔“
پوسٹر چونکا اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔ اسی لمحے ایلی جاگ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے غراتی آواز نکالی اور اچھل کر نب سے باہر نکل آئی۔ ایرک لڑکھوا کر واش روم سے باہر آگیا۔ ایلی پوسٹر کی کمر پر سوار ہو گئی تھی اور دونوں ہاتھ اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیے۔ پوسٹر اسے اتار پھینکنے کے لیے کھوٹا تو ایلی کے پاؤں دروازے سے ٹکرائے اور دروازہ بند ہو گیا۔ ایرک اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔ اندر سے ایلی کی غرات نہیں اور پوسٹر کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ پھر ایلی کی غراتیں رک گئیں اور صرف پوسٹر کی چیخیں سنائی دی رہی تھیں۔ اندر سے چیزیں گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں پھر پوسٹر کی چیخیں اور دوسری آوازیں رک گئیں صرف ایک آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کتابانی میں زبان ڈال کر پانی پی رہا ہو۔ ایرک کو نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر کھڑا ہی طرح کر رہا تھا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں سے بھاگ جائے۔

اندر سے آنے والی تمام آوازیں ختم ہو گئیں پھر دروازہ کھلا اور ایلی باہر آئی۔ اس کے منہ پر خون لگا ہوا تھا اور آنکھیں بھی خونیں ہو رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایرک کے بدن پر غاری لڑھ بڑھ گیا تھا۔ ایلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں کی سرخی ختم ہو گئی اور خون سے رنگے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ آگے بڑھ کر ایرک کے گلے سے بگم گئی۔ ”شکر یہ تم میرے لیے خوراک لے آئے۔“
ایرک پر سکون ہونے لگا جب اس کا لڑھ ختم ہو گیا تو ایلی پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ایک کپڑے سے اپنا منہ صاف کر لیا تھا۔ ایرک نے ہلکے پھلکے ہوئے پوسٹر کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ مر چکا ہے؟“

ایلی نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔“
ایرک پریشان ہو گیا۔ ”پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔“
”پولیس مجھے نہیں چڑ سکتی لیکن پریشان کر سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

ایرک مزید پریشان ہو گیا۔ ”یہاں سے جانا ہوگا؟“
”ہاں اب تم یہاں کیسے رہ سکتے ہو۔ اس کے بارے میں کیا جواب دو گے؟“ ایلی نے کھلے دروازے سے اندر پانی پوسٹر کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”ایرک ہمیں یہاں نہ بھاجا ہوگا۔“
”لیکن کہاں؟“

”جنوب کی طرف۔“ ایلی نے شاید پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ ”جہاں تمہیں برف نہیں ملے گی اور نہ ہی کوئی بوشر جیسا شخص ہوگا۔“

”بوشر مر گیا ہے۔“ ایرک نے غیر ارادی طور پر کہا۔
”ہاں لیکن تمہاری ماں تو زندہ اور جوان ہے وہ پھر کسی سے شادی کر سکتی ہے اور وہ شخص بھی بوشر ہی ہوگا۔“
ایرک سوچتا رہا، پھر اس نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

☆☆☆

ایک سال بعد:

ایرک نے بس سے اترنے کے بعد ایلی کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف تیز دھوپ تھی لیکن ایلی سر سے پاؤں تک ایسے لباس میں رُو پوش تھی کہ اس کے جسم کا ذرا سا حصہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بازو وہ خوف زدہ تھی اس نے ہنسنا کر ایرک سے کہا۔ ”پلیز جلدی سے کسی ایسی جگہ چلو جہاں دھوپ نہ ہو۔“

ایک سال میں ایرک کا قد لمبا ہو گیا تھا اور جسم بھر گیا تھا۔ اب وہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا۔ اس نے اعتماد سے ایلی سے کہا۔ ”فکر مت کرو کچھ دیر میں ہم محفوظ جگہ پر ہوں گے۔“

وہ گزشتہ ایک سال سے سفر میں تھے کیونکہ ابھی وہ ایرک کی کم عمری کی وجہ سے کہیں ٹھکانا بنا کر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک دو سال بعد وہ ایسا کر سکتے تھے۔ انہوں نے جنوب کی طرف سفر کیا اور گھومتے گھماتے امریکا پہنچ گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی کاغذ نہیں تھا لیکن انہیں کسی نے روکا بھی نہیں تھا۔ ایلی کی خوراک کا مسئلہ یہاں جان بچائے جانے والے۔ برعکاسوں نے حل کر دیا تھا۔ ایلی کو کچھ کروہ خود پیچھے آتے تھے اور پھر وہ موقع دیکھ کر انہیں قابو کر لیتی۔ وہ خوش تھی کیونکہ اس کے سابق ساتھیوں کے مقابلے میں ایرک کم عمر ہونے کے باوجود ذہین تھا اور اس نے دن میں ایلی کے باہر نکلنے کا مسئلہ بھی حل کر دیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے شہر پہنچے تھے اور کسی ہوٹل کی تلاش میں جا رہے تھے کہ ایک لفظ کا شخص ان کے پیچھے آنے لگا۔ ایلی نے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے ایرک سے کہا۔

”ایک آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔“
ایرک مسکرانے لگا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے تمہیں آخری بار خوراک لے لے ایک مہینا ہونے والا ہے۔“
ایلی بھی مسکرانے لگی۔ ”ہاں یہ اچھی بات ہے۔“



کشکول

انوار صدیقی

تیسری قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں پوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ ساز یوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔



”کیسے کہتا صاحب؟“ لیاقت نے بے بسی سے کہا۔ ”اگر کسی سے کہتا تو وہ بھی مجھے دیوانہ یا پاگل ہی سمجھتا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر مجھے یقین ہے لیکن۔۔۔“ سراج نے پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”تم ان نشانات کے بارے میں اپنی زبان بندی رکھنا ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

لیاقت نے بڑی مصحوبیت سے اقرار کر لیا پھر کسمسا کر پوچھا۔ ”صاحب، اس خاتون کا کیا بنا؟ کیا اس کے دشمن اسے اغوا کر کے لے گئے؟“

”نہیں۔۔۔“ سراج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”وہ خاتون اسپتال میں داخل ہے۔ پولیس نے ان دو افراد کو گرفتار کر لیا ہے جو خاتون کو اغوا کرنا چاہتے تھے لیکن۔۔۔ تم اس سلسلے میں کسی اور سے کچھ مت کہنا۔“

”صاحب۔۔۔ ایک بات بولو؟“ لیاقت حسین کے لہجے میں انکساری تھی۔

”بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”صاحب۔۔۔ میں آپ کا اور اس گھر کا غلام ہوں پھر آپ لوگوں کے بارے میں سنی اور کے سامنے زبان کس طرح کھول سکتا ہوں؟ میں تک حرام نہیں ہوں صاحب۔“

”پریشان مت ہو لیاقت۔“ سراج نے اس کے جواب اور اس کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی اپنات کا اظہار کیا۔ ”میں بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔“

”خدا آپ کو خوش رکھے صاحب۔“ لیاقت حسین نے دل سے دعا دی پھر۔۔۔ سراج کے جانے کے بعد بھی اس دیوانے کے بارے میں غور کرتا رہا جو اسے پراسرار صلاحیت سے نواز کر کہیں اور نکل گیا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ شبنم کو متعلقہ سب انسپکٹر کے آنے سے پیشتر ہی میڈم روبی سے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے اسے دروازے پر روکنا ضرور تھا لیکن ریڈ کراس کے محلے کے جوئیر ڈاکٹر کی سفارش پر اسے اجازت مل گئی۔ یہ وہی وقت تھا کہ جب سب انسپکٹر کو اچانک ایس پی آغا منظور نے فوری طور پر طلب کر لیا تھا۔

میڈم روبی اس وقت اپنے بستر پر لیٹی گزر رہے ہوئے حادثے کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اپنے مرحوم شوہر کی موت کے بارے میں اس نے پہلی بار افضل خان کو اصلیت سے آگاہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ افضل خان، شیخ حامد کے سب

سے قریب ہے، اسی لیے اس نے افضل کی شخصیت میں دلچسپی لینی شروع کی تھی اور بالآخر ایک جوا کھیلنے کا ارادہ کر کے اس کے پارٹنر شٹ بھی چلی گئی تھی، اسے علم تھا کہ ان دونوں شیخ حامد ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ ہر چند کہ افضل خان نے کوئی حتمی جواب نہیں دیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ روبی کی پرکشش آفر سے انکار کرنے کے بارے میں بھی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔

افضل خان کے پارٹنر شٹ سے نکلنے ہی اچانک دو آدمیوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک فرشتہ صفت انسان نے اچانک اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسے بچا لیا تھا۔ وہ نوجوان سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل جانے کی خاطر اپنی کار کی سٹ لپکھی لیکن اس کے بائیں بازو میں جیسے کسی نے ناقابل برداشت قسم کی آگ بھردی تھی، اس نے خود کو سنبالنے کی کوشش کی مگر بے ہوش ہو گئی۔ پھر اس کی بے ہوشی ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق پورے سترہ گھنٹے گزر جانے کے بعد ختم ہوئی تھی اور۔۔۔ اب وہ بڑی سنجیدگی سے کچھ سوالوں کا جواب تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ کون لوگ تھے جو اسے اغوا کرنا چاہتے تھے؟ کیا ان کا تعلق بھی شیخ حامد سے تھا یا وہ اسے سوئی آسانی سمجھ کر تاوان حاصل کرنے کی غرض سے اغوا کی تاک میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے؟ کیا اس واردات میں افضل خان پر بھی شبہ کیا جاسکتا تھا؟ اور وہ خدا کا نیک بندہ کون تھا جس نے جان پر فیکل کرا سے بچانے کی کوشش کی تھی؟ وہ زندہ بھی تھا یا

موتوں نے اسے راستے کی دیوار سمجھ کر ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا تھا؟ وہ انہی خیالات میں گم تھی جب اس نے ایک خاتون کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا، چہرہ کچھ شامسا تھا لیکن وہ پہلے باقاعدہ اس سے بھی نہیں ملی تھی۔

”ذہن پر زور نہ دیں۔“ شبنم نے بڑے دوستانہ انداز میں اس کے قریب جا کر کہا۔ ”میں یہاں ایک ڈاکٹر سے ملنے آئی تھی، آپ کے حادثے کی خبر سنی تو خیریت دریافت کرنے آئی۔“

”میرا خیال ہے کہ۔۔۔ میں تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں؟“ میڈم روبی نے مدہم مگر متحرم آواز میں کہا۔

”ضرور دیکھا ہوگا۔“ شبنم مسکرائی۔ ”ایک دو بار کسی سبیلی ممبر کے ساتھ میں بھی ریڈو کلب آ چکی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”خدا کا شکر ہے کہ آپ بے ہوش میں آ گئیں۔“ شبنم نے بڑی اپنات کا اظہار کیا۔ ”باہر پولیس کا پیرہ ہے لیکن میں

ایک وقت کا رڈ آف کی وجہ سے آپ تک آ گئی۔۔۔ اب اجازت چاہوں گی۔“

”جانتی ہوں۔“ میڈم روبی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنے تعارف تو کرایا ہی نہیں۔“

”میرا نام شبنم ہے۔“

”ایسا نام ہے۔“ دیکھتے ہی کمر کی کرتی ہوئی۔

”ایک ہی شخصیت یعنی میں میں لیون آپ ریڈ ہوں۔“

”جی نہیں۔“ شبنم نے حوالے پر میڈم روبی نے چونک کر کہا۔ ”ایسا نام ہے اس سبکی کا؟“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو شاید اس کا نام سن کر زیادہ خوش نہ ہوگی۔“ شبنم نے بڑی ذہنی طور سے ہنسیا کر کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”میں شیخ حامد کی بیٹی کے ہیڈ آفس میں ملازم ہوں۔“

”آئی۔ سی۔“ میڈم روبی شیخ حامد کا نام سن کر کسمسائی پھر اس نے شبنم کو ملوثی نظروں سے دیکھا۔ ”تم نے یہ کیسے انداز لگا کر تمہاری بیٹی کا نام سن کر مجھے خوشی نہیں ہوگی؟“

”جی الحان میں جلدی میں ہوں اس لیے صرف اتنا عرض کر رہی ہوں کہ ہم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے۔“

”میں بھی نہیں۔“ میڈم روبی کے ذہن کو شبنم کا جواب سن کر جو ذہنی جھجکا، وہ قدرتی امر تھا۔

”میں وقت میں آپ کے پاس ایک مختصر سی درخواست لے کر آئی ہوں۔“ شبنم نے کمرے میں چاروں طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا۔ ”آپ کو جس لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی ان کا مقصد شاید تاوان حاصل کرنا ہو لیکن افضل خان بہت گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی درخواست ہے کہ اگر آپ اس سے ملاقات اور اس کے پارٹنر شٹ میں جانے کا ذکر کسی طرح اپنے بیان میں شامل نہ کریں تو وہ آپ کا شکر گزار ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“ روبی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”میں اس کا نام خود بھی درمیان میں لانا پسند نہیں کروں گی۔“

”بہت بہت شکر ہے۔“

”کیا تم میرے اسپتال سے ریٹیز ہونے کے بعد دوبارہ کسی وقت مل سکتی ہو؟“

”آپ کو اس وقت جو شخص ہو رہا ہے، میں اسے کچھ سنی۔“ شبنم بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ ”میں یقیناً کوشش کریں گی کہ کوئی مناسب موقع نکال کر آپ سے کم از کم ایک ملاقات کر لوں۔ چلتے چلتے یہ ضرور عرض کروں گی کہ میں نے یہ سب کچھ سوچ کر ہی حاصل کی ہے۔ یہ

بھی جانتی ہوں کہ اگر دشمن کو میری حقیقت یا اصلیت کا علم ہو گیا تو وہ مجھے کسی پاؤں کے نیچے آئی چھوٹی سمجھ کر چل ڈالنے میں ایک پلی کی بھی تاخیر نہیں کرے گا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ایک بات یہ بھی سمجھنا کہ مارنے والے کے حق میں بچانے والا زیادہ طاقت رکھتا ہے۔“

”میں اب اجازت چاہوں گی۔“ شبنم ہاتھ مارنے کے بعد جانے کے لیے چلی تو روبی نے تیزی سے کہا۔

”مجھے ایک اہم بات اور معلوم کرنی ہے۔“

”پوچھیے۔“ اگر میرے علم میں ہوئی تو بتانے سے گریز نہیں کروں گی۔“

”ٹھیکس۔۔۔“ اتم نے اخبارات میں میرے حادثے کی تفصیل ضرور پڑھی ہوگی۔ ایک نامعلوم شخص نے جو سادہ سے لباس میں تھا، حیرت انگیز طور پر رہتا ہونے کے باوجود مجھے اغوا کرنے والوں کے شکلیں سے پہچان لیا تھا، وہ کون تھا؟“

”اخبارات میں صرف علاقہ پولیس اور سب انسپکٹر کے علاوہ کسی اور کا کوئی ذکر نہیں ہے۔“ شبنم نے جواب دیا۔

”وہاں سادہ لباس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہو گا بھی تو اخبارات میں اس کا ذکر نہیں ہے۔“

”کسی لاش کی اطلاع بھی نہیں شائع ہوئی؟“

”جی نہیں۔۔۔“

”اوکے۔“ میڈم روبی نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔ ”اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ اسپتال کے جمبیلوں سے نجات ملنے کے بعد میں تمہاری ملاقات کا انتظار بڑی شدت سے کروں گی۔“

شبنم نے دوبارہ وعدہ کیا پھر وہ خاموشی سے نکلتی چلی گئی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ کسی بہانے میڈم روبی سے ذاتی طور پر بھی ملی تھی، اس خوشی کے پشت پر اس کی زندگی کا ایک راز تھا جس نے اسے اپنے بدترین دشمن کے دفتر میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ روبی کی طرح وہ بھی کسی اپنے کے لیے شیخ حامد سے پرانا حساب کتاب چکنا کرنے کے لیے بے حد مضطرب تھی۔

☆☆☆

اخبار نے علاقہ سب انسپکٹر کے حوالے سے میڈم روبی کے بارے میں جو مزید خبر شائع کی تھی، اس میں یہی لکھا تھا کہ میڈم روبی جو ایک کروڑ پتی بیوہ ہے، پوش علاقے کے فلک نور پارٹمنٹس میں اپنی ایک سبیلی سے ملنے لگی تھی، پتھر یا ایک گھنٹہ تک وہ اپنی سبیلی کے پارٹنر شٹ میں رہی۔ واپسی

نہیں وہ اپنی کار میں بیٹھے جاری تھی جب اسے دو افراد نے اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس کی کھنچی پارٹی نے اسے بروقت بچا لیا۔ پولیس کو اپنے بیان میں اس نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اس کا کوئی دشمن نہیں ہے جس پر وہ شبہ کا اظہار کر سکے۔ اس کا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ کسی پیشہ ور گروہ نے اسے تاوان کی خاطر اغوا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ آخر میں یہ بھی درج تھا کہ میڈم روٹی نے متعلقہ سب انسپکٹر کو اپنی جیب خاص سے بیس ہزار بطور انعام دیے ہیں اور آئی جی سے اس کی ترقی کی سفارش بھی کی ہے۔ جن دو افراد کو پولیس نے گرفتار کیا تھا انہوں نے عدالت کے دروہو اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ اس سے پیشتر بھی وہ ایک بار چھ ماہ قید باشتت کی سزا بھگت چکے ہیں۔

افضل خان نے پوری تفصیل پڑھنے کے بعد سکون کا سانس لیا۔ میڈم روٹی نے اس کے اپارٹمنٹ یا اس سے ملاقات کے سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ شبتم نے گزشتہ روز اسے میڈم سے اپنی ملاقات کے بارے میں جو تفصیل بتائی تھی وہ غلط نہیں تھی، افضل خان نے شبتم کی اس مہربانی کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے دیکھا تھا کہ وہ بھی افضل خان کو پسند کرتی تھی۔ دلی زبان میں اور اشاروں کنایوں میں اس کا اظہار بھی کر چکی تھی لیکن افضل خان نے ابھی تک اس طرح کا قدم اٹھانے سے محض اس لیے گریز کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ خود بھی اسے پسند کرتا تھا مگر جب اس کے اچانک نازل ہونے والے عتاب سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا۔ بہر حال، اخبار تفصیل سے پڑھنے کے بعد اس نے سکون کا گہرا سانس لیا تھا لیکن اس کا یہ اطمینان دوسری صبح دفتر پہنچتے ہی ختم ہو گیا۔ وہ وقت پر دفتر پہنچا تھا، اس کے سیٹ پر بیٹھنے کے آدھے گھنٹے بعد چراسی نے اسے بگ باس کی آمد کی اطلاع دی پھر پندرہ بیس منٹ میں اس کی طبی کا حکم بھی آ گیا۔

حسب معمول اس وقت بھی شیخ حامد اپنے مخصوص ساؤنڈ پروف کمرے میں موجود تھا۔ اس کے توراچھے نظر نہیں آ رہے تھے، افضل خان کے سلام کا جواب بھی اس نے اشارے سے دیا، پھر اسی کے اشارے پر وہ سامنے والی خالی نشست پر بیٹھ گیا۔

شیخ حامد کچھ دیر خاموش بیٹھا سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو میز کے شیشے پر دباتا تھا تا رہا پھر اس نے افضل خان سے بات لکھ میں دریافت کیا۔ "میری غیر موجودگی کے درمیان کوئی خاص رپورٹ؟"

"بانی سب ٹھیک رہا ہیں۔"

"میڈم روٹی کے اغوا کی تفصیل میں سن بھی چکا ہوں اور اس کی تفصیلات اخبار میں بھی دیکھ چکا ہوں۔" شیخ حامد نے اس کا جملہ کاٹ کر بدستور خشک انداز میں کہا۔ "اخبار میں جس اپارٹمنٹ کا ذکر ہے وہ شاید تمہارے اپارٹمنٹ کے بہت قریب ہے۔"

"نہیں باس۔" افضل خان نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

"میڈم روٹی کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"وہ ایک کروڑ پتی بیوہ ہے۔۔۔۔۔ اس کے شوہر کا انتقال کئی بیرون ملک ہوا تھا، شوہر کی زندگی میں وہ ایک مکمل گھریلو عورت تھی لیکن اس کے بعد اصر غالباً ایک یا دو بڑے ماہ سے وہ بالکل ماؤرن انداز میں منظر عام پر آئی ہے۔ فائبر اسٹار ہوٹلوں کے ٹیکویٹ ہالز اور کئی وی آئی پی ٹائپ کلبوں کی ممبر بھی ہے۔"

"تمہاری اس بے کوئی ذاتی واقفیت۔۔۔۔۔؟" شیخ حامد کی عقاب نظر اس بدستور افضل خان کے چہرے پر مرکوز تھی۔ "ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی۔" افضل خان نے سنبھل کر جواب دیا۔ "وہ میرے لیول سے خاصی اونچی چیز ہے، مردوں سے زیادہ گھٹنا مٹا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم بھی ریٹیو کلب کے باقاعدہ ممبر ہو اور وہاں کے شیجر سے تمہاری خاصی بے تکلفی بھی ہے۔"

"نہیں باس، لیکن۔۔۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم روٹی سے دوستی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔" شیخ حامد کا لہجہ حکمانہ تھا۔ "جس حد تک بھی جاسکو، میری طرف سے اس کی پوری اجازت ہے۔"

"او۔ کے باس۔" افضل خان نے کسمسا کسم آواز میں کہا۔

"تم نے میرے اس نئے حکم کی کوئی وجہ نہیں پوچھی؟"

"میرا کام آپ کے حکم کی پیروی کرنا ہے۔" افضل خان نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔ "میں نے وجہ سننے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔"

"اچھا کیا تم نے۔" شیخ حامد ہلکی بار مسکرایا۔ "میں آئندہ بھی تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ کسی بات کو کریدنے کی کوشش کرو لیکن۔۔۔۔۔ میڈم روٹی کے بارے میں تم کو یہ ضرور بتانا پسند کروں گا کہ وہ بھی میرے مخالف گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔"

"اسی صورت میں تو اسے راستے سے۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ شیخ حامد کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ بھری۔ "تاہم کا بچن چل دیئے کے بجائے اسے بین کی لے پر پڑنے ہوئے دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے، تم مجھے اپنے دماغ کی بات۔"

"افضل خان نے بھی زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔ "افضل خان نے بھی زیر لب مسکرا کر کہا۔ "ابن تمہاری بیک میٹنگ اسٹف جو اس ناگن کی تحریریں پیش کرتا ہے۔"

"کام تو بھاری سے کرتا۔۔۔۔۔" شیخ حامد ایک لخت لہجہ پر غیور ہو گیا۔ "میں میڈم روٹی کے سلسلے میں تمہاری تاہم کی کوئی وجہ نہیں سنوں گا۔"

"ایسا بھی نہیں ہوگا باس۔۔۔۔۔"

"میرے پاس ایک اطلاع اور بھی ہے۔۔۔۔۔"

"وہ کیا باس؟" افضل خان نے دریافت کیا۔

"وجہ کی ناگن کا سبب کون تھا؟ اس کا نام جانتے ہو؟"

"وہ۔۔۔۔۔ سیٹھ عثمان کا ملازم لیاقت حسین تھا جو اب وہاں ڈرائیوری کے فرائض۔۔۔۔۔"

"میڈم کے سلسلے میں اخبارات میں جو تفصیل آئی ہے یہ منسل نہیں ہے۔" شیخ حامد نے افضل خان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اس رات میرے خبر کی اطلاع۔۔۔۔۔" ایسی ہی ایسی بی سراج بھی کہیں قریب ہی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ بصورت ناگن کی نقل و حرکت دارج کر رہا تھا، اس نے اپنا لیاقت حسین بھی تھا۔ شیخ حامد ایک لمبے کو خاموش رہا۔ "اسی بہت کی وجہ سے خوبصورت ناگن ہمارے پاس آئے آتے رہ گئی۔"

"یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔" افضل خان نے جواب دیا۔ "جب باس سے جملے کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔"

"جس نے میڈم روٹی کی گھرائی کر رہا تھا؟"

"مجھے معلوم ہو جاتا ہے لیکن اب لیاقت حسین پر بھی خبر نہیں۔" شیخ حامد نے کسی زنجی رنگ کی طرح مل کھا کر تھمر دیا۔ "وہ کہاں رہتا ہے؟ اس کے ساتھ اور کتنے نمک حلال۔۔۔۔۔" اس وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے؟ کس وقت جاتا ہے؟ کتنے دیرانی تفصیل درکار ہے۔ جو شخص دوبارہ میرا راستہ کاٹتا ہے۔ میں سے زیادہ دونوں برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں باس لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنی بات سن لیں۔"

"شیخ حامد نے تیز اچانک ہی

خطرناک ہو گئے۔ "جتنا حکم دیا جائے صرف اسی پر عمل کیا کرو۔۔۔۔۔ میں نے تم سے کوئی مشورہ طلب نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ تاؤ گیت لاسٹ۔۔۔۔۔"

"سوری سر۔۔۔۔۔" افضل خان نے سبے انداز میں کہا پھر تیزی سے اٹھ کر کسی ہاتھ کے کی طرح دم ہلاتے ہوئے خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

گل خان، زرینہ اور فرحین کو لاری اڈے سے پہنچانے کے بعد لیاقت حسین ٹھیک ساڑھے دس بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ اس نے بیس کے ٹکٹ اور بیس دو روز پہلے ہی بک کرالے تھے۔ ایک دن پہلے اندر کی پرانی ملازمہ اور گارڈ کو بھی مطلع کر دیا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ آئے گا۔ اسے فرحین کے چلے جانے کی خوشی بھی تھی اور اپنی تہائی کا احساس بھی۔ وہ چاہتا تھا کہ طرح فرحین کو جن خوابوں نے پریشان کر رکھا تھا وہ ان سے کچھ دور ہو جائے اور مینیڈر بڑھ مینیڈر گھروالوں سے بھی مل آئے۔ یہ بھی جانتا تھا کہ فرحین اور گل خان کی غیر موجودگی میں اس کا وقت گزارنا مشکل ہو جائے گا۔

فرحین کی خواہش تھی کہ لیاقت حسین کی ماں کے لیے جمع کی ہوئی رقم بھی ساتھ لے جائے لیکن لیاقت حسین نے اسے سمجھا بھجا کر وہ رقم ایک روز پہلے ہی مٹی آرڈر کر دی تھی، اس نے اپنے گھر والوں کو بھی فرحین کی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی، اس لیے کہ فرحین کو اچانک دیکھ کر گھر والوں کو جو خوشی ہوئی، اسے وہ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوٹی پر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے پرانی ملازمہ کو اطلاع دی پھر حسب معمول کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد چائے غفور کے پاس آ گیا۔ اس نے ایک روز قبل ہی گل خان کے توسط سے جوان مالی کا انتظام کر لیا تھا۔ راؤنڈ لیتے وقت اس نے نئے ملازم رب نواز کو کام میں بھی مصروف دیکھا تھا۔

"اب طبیعت کیسی ہے غفور بابا۔۔۔۔۔؟"

"اوپر والے کا کرم اور تیری مہربانی سے پتر، ڈاکٹر کی دوا کی سے آرام بھی ملا اور۔۔۔۔۔ غفور نے لیاقت کو شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو نے نئے مالی رب نواز کو رکھ کر میرا کام بھی ہلکا کر دیا ہے۔ رب تیرا بھلا کرے۔"

"بھروسے کا آدمی ہے بابا۔۔۔۔۔ میں نے ٹھونک بجا کر اطمینان کر لیا تھا، میرے دوست کا واقعہ کار بھی ہے۔"

"اپنا کام بھی چنی طرح جانتا ہے پتر۔ غفور نے

کہا۔ ”سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے پردوں سے محبت بھی ہے۔“

لیاقت حسین کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اندر سے بلاوا آگیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب گھر کی دیکھ بھال کرنے والی بیگم صاحبہ نے اسے طلب کیا تھا۔ وہ کوئی کے دروازے پر پہنچا تو وہاں ایک ملازمہ اس کی منتظر تھی، اسے اندر بلا دیا گیا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر کی خاتون تھری تھیں۔ لیاقت حسین نے ان پر نظر پڑتے ہی سلام کرنے کے ساتھ ساتھ نظریں بھی ہٹا کر لیں۔ مکمل نظر میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ نیک دل اور بردبار خاتون تھیں۔

”سنا ہے تم آج دو گھنٹے ٹیٹ آئے ہو؟“

”جی ہاں، میں نے نکل.....“

”مجھے علم ہو چکا ہے کہ تم نے بیوی کو اس کے گھر بھیجا ہے۔“ خاتون نے مذہب لہجہ میں کہا۔ ”کیا تمہارے گھر میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟“

”جی نہیں.....“ لیاقت نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ”اور تو کوئی بھی نہیں ہے۔“

”میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔“ خاتون نے جواب کے ساتھ ایک حکم بھی سنا دیا۔ ”آج سے دونوں وقت کا کھانا اور ناشتہ ادھر کو ہی پر ہی کرو گے۔ میں کسی قسم کا انکار نہیں سنوں گی، کل راحیلہ اور عثمان کا فون آیا تھا، ان دونوں کا بھی یہی حکم ہے۔“

”آپ لوگوں کا حکم سرائے آتھوں پر۔“ لیاقت حسین نے بڑی عقیدت سے جواب دیا۔ ”اب میں وقت پر آؤں گا لیکن رات کو ذرا دیر سے جانا کروں گا۔“

”یہ تمہاری مرضی ہے لیاقت حسین۔“ اس بار بے حد اہمیت اور پیار بھر سے لہجے میں کہا گیا۔ ”عثمان اور راحیلہ بھی تمہیں ملازم نہیں، بلکہ گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے ہیں اور بھی کسی قسم کی ضرورت ہو تو کسی تکلف سے کام نہ لینا۔ مجھے خوشی ہوگی۔“

”بڑی مہربانی بیگم صاحبہ۔“ لیاقت نے کہا پھر سڑام کر کے نظریں جھکائے جھکائے واپس آگیا۔ نئی بیگم صاحبہ نے اس سے جس محبت اور اہمیت کا اظہار کیا تھا وہ بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔

اس روز اس نے دوپہر کا کھانا بوڑھے مالی غفور کے ساتھ اسی کے کمرے میں کھایا۔ کھانا ختم کر کے وہ گھر کے باہر چکر لگانے نکلا، گیٹ سے نکلے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گل خان کو گھر کے سامنے دیکھ کر اس کے ذہن میں بے

شمار سو سے سرائے کے گل خان ہی اسے دیکھ کر لیے لیے قدم اٹھا کر قریب آگیا۔

”کیا بات ہے گل خان؟“ لیاقت نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”کیونکہ لوگ گئی نہیں۔“

”لیاقت..... میرے بار۔“ گل خان جھنجھکی

آواز میں بولا۔ ”بس روانہ ہونے سے پندرہ منٹ پہلے ہم بہت پورا کرنے ذرا ادھر گیا واپس آیا تو پتا چلا کہ کچھ نقاب پوش ایک لینڈ کروزر جیپا بڑی کی گاڑی میں بیٹھ کر آیا۔ جب وہ باہر نکلے تو ان کی تعداد چار تھی، سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ..... وہ تیری فرجن اور اپنی زرینڈ کو بردستی گھسیٹ کر لے گئے۔ کنڈیکٹر نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو اسے بھی رائفلوں کے بت مار کر پیچھے گرا دیا..... مسافروں میں سے بھی کوئی مدد کے لیے سامنے نہیں آیا۔ جانے وہ کون خدا کی خوار تھے؟“

لیاقت حسین کو زمین اپنے قدموں سے سرکٹی محسوس ہوئی۔ اس کا چہرہ غصے سے تپ کر سرخ ہونے لگا۔

☆☆☆

غصے کی شدت سے لیاقت حسین کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ گل خان نے زرینڈ اور فرجن کے انوکھے تجربہ کار ایک لمبے کو اسے بالکل گنگ کر دیا تھا، اس کے اندر طوفان ٹھانیں مار رہا تھا، اس شہر میں اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی، اتنا دولت مند بھی تھا نہیں کہ وہ معمولی تاوان کی ادائیگی ہی کر سکتا پھر ان دونوں کو کیوں انوکھا کیا؟ کسی نے انوکھا کیا؟ اس کے ذہن میں مختلف خیالات ابھر رہے تھے جب گل خان کی آواز اس کے کانوں سے گھرائی۔ ”کیا سوچ رہے ہو لیاقت، ہمیں فوری طور پر اس معاملے کی رپورٹ تھانے میں درج کرانی چاہیے۔“

”نہیں..... ہم کو سب سے پہلے سراج صاحب سے بات کرنی ہوگی لیکن..... کسی نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟“

”کدھر سے کرتا.....“ گل نے جھلا کر جواب دیا۔

”ان فزیر کے بچوں نے نمبر پلیٹ کے اوپر سیاہ جڑے کا گور ڈال رکھا تھا۔ ان کے چہرے بھی نقاب میں چھپے ہوئے تھے، خدا جانے وہ دونوں کس حال میں ہوگا.....“

”تمہاری ادھر کسی سے کوئی پرانی دشمنی تو نہیں چل رہی تھی؟“

”نہیں۔“

”نہیں۔“ ان کو ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟

”یہیں تو سوچنے کی بات ہے۔“ گل خان نے ہاتھ مسختے ہوئے جواب دیا۔ ”گاڑی میں اور بھی لڑکیاں اور مرد بھی موجود تھیں لیکن میرا دل بونٹا ہے کہ وہ کسی کے شہرے پر سرفہماری آبرو کا جنازہ اٹھانے آئے تھے۔ نہ ان خاندانوں کا بڑا عرق کرے۔“

لیاقت حسین کے ذہن میں بھی قسم قسم کے شبہات ابھرتے تھے۔ وہ وقت ضائع نہیں کرتا چاہتا تھا اس لیے گل خان کو ساتھ لے کر دوبارہ بس اڈے پر پہنچ گیا۔ رات تک وہ وہاں دکانداروں، ٹھیلے والوں، منگ گھر والوں اور امری بیویوں میں کام کرنے والے لوگوں سے اس بارے میں پوچھتے رہے لیکن کس سے بھی کوئی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ وہاں سے واپس ہو کر وہ سراج کے دفتر پہنچ گیا۔ یہیں اس وقت وہاں صرف ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ وہ لیاقت کو ایک دوبارہ دیکھ چکا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔ ”صاحب کا ڈیوٹی تو شام چھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔“

”بھروسہ..... اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟“ لیاقت نے پوچھا۔

سپاہی نے تھوڑی جھل و جھٹ کے بعد اسے گھر کا پتا بتا دیا۔ گل خان نے رشتہ نہیں چھوڑا تھا، وہ اس کا واقف کار بھی تھا اور قریب ہی بستی میں رہتا تھا۔ لیاقت اس کے ساتھ بیٹھ کر سراج کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ان ہی اس کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے بڑے شہر میں وہاں گل خان کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے۔

رات کے تقریباً نو بجے گیارہ بجے سراج نے لیاقت حسین اور گل خان کو دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ لیاقت حسین نے ایک ہی سانس میں اسے ساری کہانی سنا ڈالی پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”کچھ کرو صاحب..... ورنہ ہم دونوں برادری میں کسی کو مرنے دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔“

سراج ان دونوں کے ساتھ لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ کر فوری طور پر وہ کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، تاہم وہ لیاقت حسین کی سٹی ہوئی کہانی پر غور کرتا رہا پھر اس کے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا، جو لوگ بیٹہ کر مر رہیں چوری تیاری سے آئے تھے۔ ان کی پشت پر دی، بابا تھا بھی ضرور ہوگا۔ وحید ذرا بیورو کی غداری اگر کام آجاتی تو بیٹہ عثمان کی موت بھی ممکن لیکن لیاقت نے بروقت اپنے توجہ بننا پر ناگزیریم کی اطلاع دے کر بھرموں کی مہم پر اس پر اس ڈال دی تھی۔ اس کے بعد میڈم دینی نے

کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک دی پی VP منگوائیں فون نمبر 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (دھڑ)
(دیکھ یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

اغوا کی ناکامی میں بھی لیاقت حسین نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ممکن ہے ان دنوں ناکامیوں کی وجہ سے کسی دشمن نے لیاقت حسین کو وقتی طور پر ایک وارنٹک دینے کی خاطر فراموش اور زربند کو اغوا کر لیا ہو۔ زربند ساتھ ہی اس لیے وہ بھی پھینٹ میں آگئی۔

سراج کا ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے کی خاطر تانے بانے بنا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ وحید کی غداری کی پشت پر شیخ حامد اور افضل خان کا ہاتھ شامل تھا، اسی لیے اس نے وقتی طور پر سینٹ عثمان اور دراجیلہ کو دو مینیجے کے لیے بیرون ملک بھیج دیا تھا، ڈی آئی جی کراچی کو اعتماد میں لے کر اس نے شیخ حامد کو زربند کرنے کا خطرہ بھی مول لے لیا تھا لیکن میڈم ربوہ کی کے اغوا سے شیخ حامد کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ ایک نکتہ سراج کے ذہن میں ایک نئے شعبے نے سر اُبھارا۔ ہو سکتا ہے کہ میڈم ربوہ کے اغوا میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے شیخ حامد کا ہاتھ شامل ہو، اسے بھی ایسے وقت اغوا کیا جا رہا تھا جب خود شیخ حامد ملک سے باہر تھا۔ اس نئے خیال نے سراج کو اور بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

”ہمارے لیے کیا حکم ہے صاحب۔“ لیاقت نے سراج کی طویل خاموشی سے ٹھک آ کر دہی زبان میں پوچھا۔ ”میں تمہارے ہی معاملے پر غور کر رہا تھا۔“ سراج نے بے حد تنجید کی سے جواب دیا۔ ”جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو تمہاری اور مکمل خان کی بیوی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ انہیں لے گئے ہیں وہ تم سے کسی وقت رابطہ کرنے کی کوشش بھی کریں۔ اگر ایسا ہو تو ان سے سنہیل کر بات کرنا، خود کو قابو ہی میں رکھنا ورنہ بات پھر بڑھ بھی سکتی ہے۔“

”صاحب۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے ہاتھ جوڑ کر نرمیت کی۔ ”اگر آپ کو کسی پبلیڈ پر شبہ ہے تو مجھے بتا دو۔ میں فرحمن اور زربند بہن کی خاطر موت سے بھی گمراہے کو تیار ہوں۔“ ”پریشان مت ہو۔“ سراج نے اسے سمجھایا۔ ”جو لوگ لینڈ کرورز میں بیٹھ کر آئے تھے ان کے ہاتھ بھی بہت نیچے ہیں۔ تم ان کے قریب بھی نہیں جاسکو گے۔“

”لیکن ان غذائی خواروں کا ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ اس بار گل خان نے سوال کیا۔ ”میرے کہنے پر صرف چوبیس گھنٹے مہر سے کام لو۔“ سراج نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اس کے بعد میں تمہارے ساتھ شریک ہونے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔“

”سراج صاحب، آپ مجھے خالی“ لیاقت نے

پہلو بدل کر کچھ کہنا چاہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔۔“ سراج لیاقت کا ہاتھ تمام کر ایک طرف لے گیا۔ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”جن لوگوں نے تمہارا سے صاحب کی گاڑی میں دھمکے برفٹ کر لیا تھا۔ مجھے یہ ان ہی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔“ پھر اس نے میڈم ربوہ کے حوالے سے بھی دہی زبان میں کہا۔ ”تم نے جس طرح اس خاتون کو اغوا ہونے سے بچایا وہ تمہیں بھی یاد نہیں رہا۔“ سراج سانس لینے کے بعد بولا۔ ”تم کوئی خاص بات زبان تک نہیں لانا چاہتے تو میں ہمارا بھی نہیں کروں گا لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔۔۔۔۔ جو کچھ ہوا کیا وہ تمہارے لیے کسی بچے سے کم ہے؟“

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہو صاحب وہ میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن آپ یقین کرو کہ میں اس دن گاڑی سے نیچے نہیں اترتا تھا۔“ لیاقت نے بے حد تنجید کی سے جواب دیا۔ لیکن ان باتوں کا فرحمن اور زربند کے اغوا سے کیا تعلق تھا؟ یہ بات اس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔

”مجھے تمہاری بات کا یقین ہے لیکن تم میری خاطر صرف چوبیس گھنٹے خاموش رہو۔ کسی سے کچھ نہ کہنا۔ اس دوران اگر کوئی تم سے کسی ذریعے سے رابطہ کرے تو مجھے فوری اطلاع دینا۔ میں جس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اگر وہ درست ہو تو پھر میں چوبیس گھنٹے کے بعد ہی کروں گا جو تم کہو گے لیکن اس وقت تک تمہارا گرمی دیکھنا تمہاری بیوی اور زربند دونوں کے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔۔۔ جو آپ کا حکم لیکن میرے اندر جو آگے بھڑک رہی ہے وہ میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔“ لیاقت حسین کی آواز زندہ گئی۔ سراج نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”فکر مت کرو۔“ فرحمن اور زربند میرے لیے بھی اتنی ہی قابل احترام ہیں جتنی تم دونوں کے لیے لیکن میں نے جو مدت مقرر کر دی ہے اس کے دوران کوئی جلد بازی نہ کر بیٹھنا۔ میں تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہوں گی، ان کی عزت پر کوئی ہاتھ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کر سگے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو صاحب ورنہ ہم اپنی عزت کی خاطر کسی قربانی دینے سے منہ نہیں موڑے گا۔“

لیاقت سے پوچھا بھی تھا۔ ”پلیس ڈال آ فیئر تم کو علیحدہ لے جا کر کیا بات کر رہا تھا۔۔۔۔۔“ ”یہ نہیں گھنٹے تک دل پر پتھر رکھ لو گل خان۔“ لیاقت حسین نے ہنست چہاتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں کے دل پر ایک ہی دھبہ اٹھانے کا ہے، جس نے بھی ہماری عزت اور آبرو بچا تھا ڈالو۔ جب بھی بے نقاب ہو گا میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، بعد میں پچاس کی کا پچھتاہی برداشت کر لوں گا۔“

”مگر تمہارے سراج صاحب نے۔۔۔۔۔“ ”وہ تجربہ کار آفیسر ہے۔“ لیاقت نے گل خان کو مطمئن کرنے کی خاطر جواب دیا۔ ”اس کی مدد کے بغیر ہم اپنا خون جلانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔“

گل خان نے پھر کوئی سوال نہیں کیا لیکن وہ لیاقت حسین کی بات سے پوری طرح مطمئن بھی نہیں ہوا۔

☆ ☆ ☆

افضل خان اس وقت شعلے سے نوشی میں مصروف تھا۔ شیخ حامد کا ایک اور نیا معاملہ نٹانے کے بعد وہ ٹھیک آٹھ بجے اپنے آپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔ نیم گرم پانی سے نہا لینے کے بعد اس کی دان بھری ٹھکن دور ہو گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا بالائی وی دیکھ رہا تھا، ایک چمک خمر ہو جاتا تو دوسرا تیار رہتا لیکن اس تمام مشغولیت کے باوجود اس کا ذہن اس وقت بھی ہلکے ہلکے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیاقت حسین۔۔۔۔۔ بارے میں اس نے تمام معلومات حاصل کر کے اپنے سے ملنے والی ہدایت کے مطابق لیاقت حسین کی بیوی کے انوائس سسٹم میں اس افراڈ کی نیم تفصیل دی تھی جن کو محض غیر قانونی سرگرمیوں کی خاطر پالا جا رہا تھا۔ شیخ حامد کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔۔۔۔۔ ”جو شخص دو بار میرا دست کاٹ جائے میں اسے زیادہ دنوں برداشت کرنے کا۔۔۔۔۔“

افضل خان کو اس بات کا علم تھا کہ لیاقت حسین نے ہی اپنے دشمن کی گاڑی میں نصب شدہ ناٹم بم کا کنویج نکال کر سینٹرل ڈسٹریکٹ کو مت کا قہقہہ بننے سے بچا لیا تھا لیکن یہ بات اس نے مہر میں نہیں تھی کہ لیاقت حسین نے میڈم ربوہ کی کے اغوا میں نہایت اعلیٰ طور پر بروقت ناکام بنا دیا تھا۔ اس اطلاع کے ساتھ ہلکے ہلکے ایک اہم بات اور آگے تھی۔ ”لیاقت حسین نے اپنی بات ایک ناگن ہمارے چار سہ میں آتے ہوئے کہی تھی۔“ ناگن نے حوالے سے اس نے میڈم ربوہ کی کا

ناگن نے ہاتھ سے اشارے سے بتا دینے سے بچا لیا تھا۔

تھا کہ ”ناگن کا بچن کچل دینے کے بجائے اسے تین کی لے پر تپتے ہوئے دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے۔“ اس کے بعد ہلکے ہلکے اس نے اسے میڈم کو محبت کے جال میں چانس کر کے گزر جانے کی اجازت بھی دے دی تھی اور۔۔۔۔۔ ہلکے ہلکے اس کی وہ باتیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں کہ اسی نے میڈم ربوہ کی شوہر کو کسی بزنس ڈیلنگ کے سبب اپنے راستے سے ہٹا دیا ہوگا۔

افضل خان کا ذہن ان باتوں کے ساتھ ساتھ ربوہ کے بارے میں بھی سوچنے لگا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے شوہر کا انتقام لینے کی خاطر اسے جو پیشکش کی تھی وہ بھی خود اسی کی طرح حسین بھی اب زیادہ پرکشش بن گئی تھی اس لیے کہ ہلکے ہلکے اس نے ربوہ کی کے ساتھ ٹھکنے لے اور اسے بے آبرو کر کے ایسی تصاویر حاصل کرنے کا اشارہ دیا تھا جس کے بعد ربوہ بھی باعزت عورت بھی اس کے اشاروں پر تپنے کے لیے مجبور ہو جاتی۔ افضل خان کے تصور میں ربوہ کی کا حسین اور گدا ز جسم ابھرا تو اس کے ہونٹوں پر شرابی مسکراہٹ پھیل گئی۔ گلاس خالی کرنے کے بعد وہ دوسرا پیگ تیار کر رہا تھا جب قریب رکے فون کی ٹھنکی بجی۔ افضل خان نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”کام خیر خوبی سے انجام پا گیا جناب۔“ دوسری طرف سے کسی نے سرسرا تے لہجے میں کہا۔ ”ہم نے انہیں لاری اڈے سے دبوچ لیا، لیکن گیبوں کے ساتھ ایک گھنٹہ بھی پس گیا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔“ افضل خان نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ اکٹلی نہیں تھی جناب، اس کے ساتھ اس کی ایک سہیلی اور اس کا سرور بھی تھا۔“ دوسری جانب سے بے پروائی سے جواب ملا۔ ”اس نے ہمارے اناروائے کو بچانے کی کوشش کی تو ہم نے اسے بھی اچک لیا۔“ کندہ بیٹرنے ہیرو بننے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے چار سہ بت مار کر اس کی ساری تنہاں بھی نکال دی۔“

”کہاں رکھا ہے دونوں کو۔۔۔۔۔؟“ ”وہیں جہاں ایسی خوبصورت تکیوں رکھی جاتی ہیں۔“ نمبر تھری۔۔۔۔۔ انڈر رائٹر، ویسے دونوں ہی تروتازہ دل ہیں۔ کیا آپ کی طرف سے اجازت ہے؟“ ”خیر مجھے بڑے بازاری انداز میں کہے گئے۔“

”نہیں۔“ افضل خان نے ٹھیک لہجے میں کہا۔ ”اس۔۔۔۔۔ اشارے کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کا مطلب

صرف موت ہوتا ہے۔ درود کا موت۔

”چار پانی کیا جائے۔“

”وہی جو سب کو مٹا ہے، ویسے بگ باس انہیں زیادہ دن نہیں رکھے گا۔“

”پھر۔“

”اپنے کام سے کام رکھو۔ اور پر سے جو آؤ رٹے گا وہ بھی تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔ کوئی غلطی بھول رہی نہ رہا۔“ افضل خان نے جملہ احوال چھوڑ کر ان کا ہاتھ دی۔ پھر اس نے سب سے پہلے بگ باس کو فریمن اور زرینہ کے قابو میں آ جانے کی اطلاع دی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دو چار لمبے لمبے گھونٹ لیے پھر کچھ سوچ کر روٹی کے گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسے اطلاع مل گئی تھی کہ روٹی کو کچھ ہی اسپتال سے دو چار کر دیا گیا تھا۔ تین چار گھنٹوں کے بعد کسی خاتون نے کالی ریسیو کی۔

”ہیلو۔“

”مجھے میڈم سے بات کرنی ہے۔“

”وہ اس وقت آرام کر رہی ہیں۔“ فون اٹھانے والی

نے جواب دیا۔

”میں افضل خان بول رہا ہوں۔“ اس نے غصے انداز میں کہا۔ ”تم میڈم کو میرا نام بتا دو۔ اٹ از ارجسٹ۔“

”ہیلو۔“ ایک منٹ بعد روٹی کی آواز سنائی دی۔

”اس وقت کیسے کال کر لیا۔“

”اسپتال آنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا لیکن آپ کی طرف سے فکر مند ضرور تھا۔“ افضل خان نے بڑے پیار سے کہا۔ ”آپ بھولنے والی چیز بھی نہیں ہیں۔“

”لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو۔ ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ رکی تکلف۔“

”یاد آ گیا۔۔۔ سواری۔۔۔ اب بتاؤ کہ تم کیسی ہو؟“

افضل خان نے پچھڑا ہوا ہی بے تکلفی سے کہا۔ ”میں اس وقت تمہارے حادثے کی منٹوں خبر کو دیک ڈاگ کے لیے لمبے گھونٹوں کے ذریعے بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”گلد۔۔۔ ویسے تم نے میری آفر پر کہاں تک غور کیا؟“

”دوسری جانب سے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا گیا۔“

”فون پر یہ بات مناسب نہیں ہوئی۔“

”میں جانتی ہوں۔ چلو پرستیج ہی میں بتا دو۔“

”فی الحال اسی فیصلہ۔“

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔“ دوسری جانب سے محبت

بھرا انداز اختیار کیا۔ یہ باتیں میں بیٹھ کر چار منٹ میں صرف وقت اوگے؟“

”یہ آپ پر منحصر ہے۔“ افضل خان نے گلاس خالی کر کے لہراتے ہوئے بڑی سلی آواز میں کہا۔

”ایڈوائس۔“

”غلط سمجھیں، میں تمہارے صحت مند ہونے پر باقاعدہ سلی بریٹ کرنا چاہتا ہوں۔“

”سواری۔۔۔ میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ ویسے بھی لوگوں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا اور گھٹنا ملنا مجھے پسند نہیں ہے۔“ روٹی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے تمہاری ماؤرن دنیا میں کیوں قدم رکھا ہے؟ تم جان چکے ہو۔“

”او۔۔۔ کے۔“ افضل خان نے چار ڈالنے میں دیر نہیں کی۔ بڑی اچانکیت سے بولا۔ ”یہ جشن صحت مخصوص ہوگا۔ بالکل ایکس کلیو سب (Exclusive) صرف تم اور میں۔ میرے اپارٹمنٹ میں۔“

”تھوڑی سی ترمیم کر لو۔“ روٹی نے بھی بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ”تمہارے اپارٹمنٹ کی شرط منظور نہیں۔ ایک بار آکر جو بھگت چکی ہوں اسے دوبارہ آؤر ڈائن کر سکتی۔ ایسا کرتی ہوں کہ تاریخ اور کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا رینج میں کروں گی باقی سلی بریٹ تمہاری جیب پر منحصر ہے۔“

”او۔۔۔ کے۔“ مجھے تمہاری یہ شرط بھی پسند ہے۔“

”یہ شرط نہیں، صرف تجویر بھی۔“ اس بار صاف گوئی سے کہا گیا۔ ”شرط یہ ہوگی کہ تم یا باور کی ملاقاتوں پر اصرار نہیں کرو گے اور۔۔۔ باقی میں فیصد پر بھی اپنی آمدنی ظاہر کر دو گے۔“

”او کے ڈارنگ۔۔۔“ افضل خان نے بڑی جسارت سے اسے ڈارنگ کہا۔ ”ڈن، مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔“ ”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے جیسے ہی مجھے صحت مند سمجھ کر چلنے پھرنے کی اجازت دی، سب سے پہلے تمہیں اس کی اطلاع دوں گی۔“

”ٹھیکس۔۔۔ ویسے اب زخم کیسا ہے؟“

”کس زخم کی بات کر رہے ہو تم۔۔۔ پھر روٹی کے جواب میں کبک بھی، شاید اس سوال کے ذریعے وہ اسے یہ باور کرائے چاہتی تھی کہ جب تک اس کے مرحوم شوہر کا قاتل زندہ ہے اس کی روح پر لگاؤ زخم بھی تازہ رہے گا۔“

”ڈونٹ وری سویت ڈارٹ۔۔۔“ افضل خان نے دل میں خوش ہوتے ہوئے اسے لفظوں میں تسلی دینے کی خاطر کہا۔ ”بات جب ہنڈرڈ پرسنٹ ڈن ہو جائے گی تو

جب سے ہمارے زخم ایک ایک کر کے بھر چکے ہیں گے،۔۔۔“

”بائی افضل۔۔۔“ دوسری جانب سے بھی افضل خان کا نام لیا۔ ”میں نے لیے چار کا اظہار کیا گیا۔“

”جب جب از ہنڈرڈ پرسنٹ کرکٹ (Correct)۔“ افضل خان نے ریسیور کر پڈل پر رکھتے ہوئے ایک ٹیبلٹ سٹرابٹ ہونٹوں پر کھیر کر مٹی خیر انداز میں چا۔۔۔“ اس کا سر پھرنے کے بجائے اس کا سپرے کی ٹین پر ترانے میں اٹھا، لیکن بار بار اور بے بسی میں دھس کر رہنا۔۔۔“ افضل خان نے اپنی کامیابی کا تصور کر کے تیسرا پیگ حق سے نیچے اتار کر اسے اپارٹمنٹ میں اپنی تہائی کا احساس دلانے لگا، روٹی سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد وہ تڑپ میں آ گیا تھا۔ شباب کے بنا شراب اس وقت اسے بے چین کر رہی تھی، اس نے گھڑی کی سمت نظر ڈالی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے، اس کے ذہن میں اپنی تہائی دور کرنے کی خاطر کئی نام ابھرے لیکن دروازے پر ابھرنے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ حسب معمول وہ اپنا آؤٹریک۔ بیوالور لے کر اٹھا۔ دروازے کے قریب جا کر ٹیبلٹ آئی کے ذریعے باہر دیکھا تو ریخو ملک کی مایا اسکرٹ اور ٹنگ ہاؤز میں باہر راہداری میں کھڑی تھی۔ وہ استعمال شدہ قبرست میں درج تھی لیکن اس وقت افضل خان کو لٹے کی حالت میں وہ بھی کوئی حور نظر آئی۔

افضل خان نے دروازہ کھولا تو ماریا کے لباس اور جسم سے اٹھتی مہک نے اسے دیوانہ کر دیا۔ اپنا آؤٹریک ریوالور سونے کی طرف اچھالی کر اس نے لات مار کر دروازہ بند کیا پھر ماریا کو اپنی کشادہ ہانپوں میں سمیٹ لیا۔

”م۔۔۔ میں ابھی تمہاری ہی طرف کلب آنے کا سوچ رہا تھا۔“ اس نے ماریا سے جھوٹ بولا۔

”آج تم بھی مجھے بہت یاد آ رہے تھے ڈیر، اس لیے میں کلب سے اٹھ کر سیدھی تمہاری طرف آ گئی۔“

پھر افضل خان اور بے باک ماریا دروغ گوئی کرتے ہوئے شرافت کے تمام لہجے اتار کر ایک دوسرے پر سبوتا لے جانے کی کوشش میں حد سے گزرتے۔ لیکن بھی ٹوٹن میں دھس کر نہ لگے۔

☆☆☆

راج کی چوبیس گھنٹوں والی شرط نے لیاقت حسین کی فانی کو مجبور کر دیا تھا۔ ویسے بھی شہر میں ہزاروں کی

تعداد میں اس قسم کی گاڑیاں تھیں جس میں فریمن اور زرینہ کو اغوا کیا گیا تھا۔ سراج کے گھر سے واپسی کے بعد بھی گل خان اور لیاقت حسین سر جوڑے بیٹھے اس دشمن کے بارے میں غور کرتے رہے، سراج کی وجہ سے لیاقت حسین کی پھر بھی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی لیکن گل خان رہ رہ کر سچ و تاب کھارہا تھا، اس دشمن سے انتقام کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ اپنی مادی زبان میں اغوا کرنے والوں کو مغالطات بنا رہا تھا۔ ”کیوں اپنی زبان گندی کرتا ہے گل خان؟“ لیاقت نے کہا۔ ”خدا سے دعا مالک کہ وہ ساتھ خیریت سے واپس آجائیں۔“

”تم کیا بات کر رہا ہے لیاقت حسین؟ اگر ان کو ساتھ خیریت کے آتا ہوتا تو وہ خنزیر کے تخم پس اڈے پر اس طرح میکڑوں آدمیوں کے سامنے سے زرینہ اور فریمن بہن کو نہ لے جاتے اور۔۔۔ لوگوں کا خون بھی اتنا سفید ہو گیا ہے کہ کوئی مدد کو سامنے نہیں آیا۔“

”کیسے آتا۔۔۔؟“ لیاقت حسین نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”ان کے پاس تمہارے کہنے کے مطابق چار چار انگلیں تھیں، جو بھی سامنے آتا وہ اسے فوراً بھون دیتے۔ تم عام آدمیوں کی بات کرتا ہے، ایسے موقعوں پر تو پولیس والے بھی اصرار پھر پھر ہو جاتے ہیں، مجرم فرار ہو جائے تو سیدناں کر مر د بچوں کی طرح سامنے آ جاتے ہیں، دو چار سونے مرغوں کو پکڑتے ہیں پھر جیب گرم کر کے انہیں بھی چھوڑ دیتے ہیں۔“

”خدا جانے وہ دونوں کس حال میں ہوں گی؟“ گل خان نے ہنست چہاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے بسی نمایاں تھی۔

”دعا کرو ان دونوں کی عزت محفوظ رہے۔ ایک بار وہ مل جائیں تو پھر ہم دشمنوں کا کھوج لگا کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔“

رات دو بجے تک گل خان، لیاقت کے مکان پر بیٹھا رہا پھر تھک کر اپنے گھر چلا گیا۔ لیاقت حسین چار پانی پر لیٹ کر سراج کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ زرینہ مفت میں فریمن کے ساتھ لیپے میں آگئی ورنہ وہ صرف فریمن کو اٹھانے آئے ہوں گے۔ ان کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں اور دراصل والے ذیت شامل تھے تو وہ خود بھی بڑے لوگ ہوں گے۔ سراج نے کہا تھا کہ وہ اغوا کی جانے والی عورتوں کو بے عزت نہیں کریں گے۔ جلدی ہی کہیں زندہ یا مرد چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ حرکت صرف اسے و حکمی دینے کے لیے کی گئی تھی۔ سراج نے، سے ہر گز سے سیدھ



Pakistan's Favourite Tomato Ketchup!

عثمان کی جان بچانے کا حوالہ بھی دیا تھا۔ جن لوگوں نے وحید ذرا نیور کا ایمان خرید کر غداری پر اکسایا تھا، اسے پولیس سے بچانے کی خاطر ملک سے باہر بھیجا تھا، وہی لیاقت کے دشمن بھی بن گئے لیکن وہ چاہتے تو لیاقت حسین کو جان سے مار کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر سکتے تھے لیکن فرحین نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟

لیاقت حسین کو معلوم تھا کہ سیو عثمان کو مرنے میں اس کے دوست نما دشمن برٹش میں شیخ حامد کا ہاتھ تھا لیکن میڈم رونی والی بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ذاتی طور پر اسے کبھی یاد تھا کہ وہ گاڑی سے نیچے نہیں اترتا تھا، سراج نے اسے یہی حکم دیا تھا۔ وہ اس کے کمرے کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا مگر سراج کا کہنا تھا کہ اس نے گاڑی سے اتر کر ان بد معاشوں سے لڑی کو چھڑا لیا تھا۔ لیاقت حسین اسے دہانے سے ملاقات کا کرشمہ سمجھ رہا تھا مگر ناپائیدار بزرگ کی تاکید کے بعد وہ اس سلسلے میں زبان نہ کھولنے کا عہد کر چکا تھا۔

رات گئے تک وہ چار پائی پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدلتا رہا مگر فرحین کی یاد اسے کسی گرد و پیش میں لینے دے رہی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح فرحین سے دشمنی کا بدلہ لینے والوں کے بارے میں عقلی گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ جب قبرستان کی جانب بھٹنے والی کھڑکی سے کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی، وہ آواز سراج کی تھی جسے لیاقت حسین ہزاروں میں پہچان سکتا تھا، وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آگیا، سامنے سراج ساہو لباس میں کھڑا تھا۔

”صاحب۔۔۔ آپ؟“ لیاقت نے تعجب سے پوچھا۔

”مکمل خان تو نہیں ہے اندر؟“

”نہیں صاحب۔۔۔ وہ ابھی آدھے گھنٹے پہلے اپنے گھر گیا ہے۔ دشمنوں کا کوئی سراغ صاحب؟“ لیاقت حسین نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

”میں اسی سلسلے میں نہیں ساتھ لینے آیا ہوں۔ خاموشی سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاؤ جہاں سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہے، مکمل خان کو ساتھ لائے گی حفاظت نہ کرنا۔“

”ابھی آپ صاحب۔۔۔“

سراج کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا تو لیاقت حسین جلدی لباس تبدیل کر کے باہر نکلا، دروازے کو باہر سے کڑی لگائی پھر تیزی سے جگہ جگہ کی گلیاں طے کرتے ہوئے باہر سڑک پر آگیا جہاں سراج سیاہ رنگ کی کار میں موجود تھا۔ لیاقت خاموشی سے دروازہ کھول کر انکی نشست پر اس نے برابر ہی بیٹھ لیا۔ سراج نے گاڑی چلائے ہوئے پوچھا۔

”تم نے اپنا ہتھیار ساتھ لے لیا ہے؟“

”وہ آپ کا تحفہ ہے صاحب، میں جب بھی گھر سے باہر نکلتا ہوں وہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔“

”مجھے ایک سراغ ملا ہے کہ انھوں نے مارنے والوں نے تمہاری عورتوں کو کہاں رکھا ہے۔“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں نے ساہو لباس میں اپنے ساتھیوں کو ادھر پہلے سے روانہ کر دیا ہے تاکہ مجرم کسی اور طرف نہ نکل سکیں۔“

”خدا کرے آپ کی اطلاع درست ہو صاحب۔“

”ایک بات دھیان سے سنو لیاقت حسین، تم وہاں کسی سے انھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اگر تمہاری عورتیں مل جائیں تو انھیں خاموشی سے لے کر نکل چلیں گے۔ گھر پہنچنے سے پہلے اپنی عورتوں سے بھی کوئی بات نہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے صاحب، ہماری عورتیں اگر عزت سے مل گئیں تو ابھی ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔“

”مکمل شیخ تم ڈیوٹی پر جانے سے پہلے گیارہ بجے مجھ سے آفس میں ملو گے۔ اس کے بعد میں ہی انھوں کو لے کر گاڑی کے خلاف کسی قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کروں گا۔“

لیاقت حسین نے اس بار بھی سراج کی بات مان لی۔

”بہر آپ کے کسی حکم سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کریں گے صاحب۔“

راتے میں سراج اس کو مختلف تعادیر کے بارے میں انجینئر سے آگاہ کرتا رہا۔ تقریباً چالیس منٹ بعد سراج کی گاڑی صنعتی علاقے کے ایک ایسے جھے میں جا کر رکی جہاں مختلف کمپنیوں کے گودام بنے ہوئے تھے۔ سراج تھوڑی دیر تک گاڑی میں بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے لیاقت کو ایک گودام کی طرف دور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس گودام کے صدر دروازے پر سرخ بڑے دائرے کے اندر تین کا ہندسہ لکھا ہوگا۔ تم پشت کی طرف سے اندر جاؤ۔ اندر پہنچ کر بائیں ہاتھ پر ایک آفس ہوگا۔ اس آفس کے واش روم کے اندر کے ایک خفیہ راستہ نیچے تھانے میں جاتا ہے، میری اطلاع کے مطابق۔۔۔ تمہاری عورتوں کو وہیں رکھا گیا ہے۔“

”مجھے نیچے جانے کا راستہ کدھر ہے گا؟“ لیاقت حسین نے بڑی مستعدی سے سوال کیا، وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

”خفیہ راستہ کے اندر جاؤ، وہاں رکھی ہے تمہیں اسے بتا دو گا۔ پشت پر ایک مائل ایک ہوگا۔ اسے ایک طرف سے چکا دو گے پھر اسے ایک طرف جھکا دو گے۔ اندر ایک

پیش من ہوگا، تم اسے دہانا تو بیچے جانے کا راستہ بھی دانش روم میں خود بخود کھل جائے گا لیکن ایک بار پھر غور سے سن لو تم وہاں کسی بھی صورت میں کسی کو جان سے مارنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ چپ چاپ اپنی عورتوں کو لے کر نکل آنا۔ باقی فیصلے کل ہوں گے۔“

”اور اگر کسی نے مجھے زبردستی روکنے کی کوشش کی تو۔۔۔؟“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں میدان صاف ملے گا۔ شاید وہ اس قابل ہی نہ ہوں کہ تمہارا راستہ روک سکیں۔“ سراج نے ساٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں ادھر گاڑی میں ہی تمہارا انتظار کروں گا۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین مشینی انداز میں دروازہ کھول کر گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ اس کی نظروں میں عقابی چمک موجود تھی، گاڑی سے اتر کر وہ اس گودام کی طرف بڑھنے لگا جس کی طرف سراج نے اشارہ کیا تھا، گیٹ کے قریب پہنچ کر اسے وہ سرخ رنگ کا گول دائرہ بھی نظر آ گیا جس کے درمیان تین لکھا تھا، گیٹ پر ایک مسیح کارڈ بھی تھا جس نے لیاقت حسین کو ایک نظر دیکھا پھر گشت لگانے میں مصروف ہو گیا۔ لیاقت لیے لیے قدم اٹھا تا گودام کی پشت پر آ گیا جہاں قد آدم دیوار تھی، ایک گیٹ بھی تھا جو اندر سے بند تھا، ایک لمبے گولیاقت نے صورت حال کا جائزہ لیا پھر اس نے گیٹ سے دور جا کر دیوار پھلانگ کر اندر جانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک دو بار کوشش کے بعد وہ دیوار کے آخری حصے کو تھام کر کسی نہ کسی طرح زور لگا کر اوپر پہنچ گیا، دور دور تک سناٹا تھا اس لیے وہ آہستہ سے دوسری طرف لنگ کر زمین پر آ گیا، زمین پر قدم جمانے کے بعد اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا، پھر بھی اس نے نیپے سے پتھول نکال کر اسے لوڈ کیا اور اس کے دستے پر گرفت مضبوط کر کے سیاہ رنگ کے اس لیے چوڑے گیٹ کی جانب پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگا جو چھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ اس سے چپک کر کھڑا اندر کی سن گن لیتا رہا پھر بجوں کے بل اندر داخل ہو گیا۔ ایک مدم بلب چھت سے لٹکا ٹھٹھا رہا تھا، لیاقت کے قدم اس آفس کی جانب بڑھنے لگے جوشیشے کا بنا ہوا تھا لیکن اس وقت خالی نظر آ رہا تھا۔ اسی آفس میں وہ الماری بھی موجود تھی جس کی بابت سراج نے اسے بتادیا تھا۔ لیاقت حسین نے الماری کو چھیڑنے سے پیشتر ایک نظر دانش روم میں جھانکا جو خالی پڑا تھا۔ دانش روم کی دیواروں پر ٹائٹل

لگے تھے، بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرش ماربل کا بنا ہوا تھا۔ لیاقت حسین نے باہر آکر الماری کو زور لگا کر ایک طرف ہٹایا تو اس کے پیچھے دیوار پر ایک سبز رنگ کا ٹائل لگا ہوا تھا۔ دھڑکنے والے دل سے اس نے ٹائل کے ایک کونے پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے دوسرے کونے پر اسی مل کود رہا تو کسی سبکی کی لگام کے تحت وہ دیوار سے ابھر کر ایک طرف ٹھٹھکنے لگا پھر وہ پیش من بھی سامنے آ گیا۔ سراج کی ہدایت پر مل کرتے ہوئے لیاقت حسین نے پیش من کو دبا دیا تو ملکی ہی گھر گھر اہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ پستول پر گرفت جھکا کر وہ دانش روم میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے کی دیوار کا پانچ۔۔۔۔۔ بائیں تین فٹ کا حصہ اندر کی طرف دب کر ایک طرف چلا گیا تھا۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچا پھر اس نے خدا کا نام لے کر ان سبز جھول پر بجوں کے بل نیچے اترنا شروع کیا۔ دس سبز حیاں ملے کرنے کے بعد اس نے زمین کے چار بائیں چار حصے پر قدم رکھا تھا تو بائیں جانب کی دیوار کا حصہ بھی دروازے کی صورت میں سلائیڈ ہو کر کھل گیا، اندر چھ روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی، لیاقت حسین نے دروازے سے گزر کر اندر دیکھا تو چونکا اٹھا، چار بے کفر دہانے فرش پر مد ہوش پڑے تھے، ان کے ساتھ ہی ایک غیر ملکی لڑکی بھی اسی عالم میں تھی۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور گلاس نظر آرہے تھے، شاید وہ زیادہ پینے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے، لڑکی کا نیم مریاں جسم دیکھ کر یہی اندازہ ہوا ہاتھ ان چاروں نے اس تباہ لڑکی کو درد مندوں کی طرح ہلکے جگہ سے جھنجھوڑا تھا۔

لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، اس نے قدم آگے بڑھایا تو سیدھے ہاتھ پر ایک اور دروازہ نظر آیا۔ اس نے لپک کر اسے کھولا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اندر فرش پر فرمین اور زریں رنگ قریب قریب پڑی تھیں، ان کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ لیاقت نے قریب جا کر دیکھا، دونوں کی سانسیں چل رہی تھیں لیکن ان کے لباس سے اندازہ ہوا ہاتھ کا انخا کرنے والوں نے شاید انہیں قابو کرنے کے لیے کوئی خواب آور دوا ضرور پلا دی تھی لیکن ان کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ لیاقت کے لیے اکیلے ان دونوں کو باہر لے جانا ممکن نہیں تھا، اسے جلدی بھی تھی اس لیے کہ باہر جو بد معاش بے ہوش پڑے تھے ان کے قریب ہی ان کی راتھیں بھی پڑی تھیں۔ کوئی ایک بھی ہوش میں آجاتا تھا لیاقت کے لیے زندگی یا موت کا فیصلہ گاڑی پر ہو جاتا۔

اس نے جھک کر فرمین کا بازو تھام کر دو تین بار دبا دیا تو اس نے نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون ہے۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ کس۔۔۔۔۔ سونے۔۔۔۔۔“

”میں لیاقت ہوں جان جگر، ہوش میں آؤ۔۔۔۔۔ ہمیں یہاں سے بہت لمبے وقت میں اٹھنا ہے ورنہ میں بھی مارا جاؤں گا۔“

لیاقت کی آواز دو تین بار سن کر فرمین جھومتے ہوئے تھوڑے نیچے۔۔۔۔۔

”تم۔۔۔۔۔ تم یہاں۔۔۔۔۔ کیسے آگیا۔۔۔۔۔؟“ اس نے بدستور غصہ کے عالم میں پوچھا۔

”بھت کرو لیاقت کا جان۔۔۔۔۔“ اس نے فرمین کے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں زریں کو بھی سنبھالنا ہوگا۔“

”ہم۔۔۔۔۔ ادھر کیسے۔۔۔۔۔ آگیا۔۔۔۔۔؟“ فرمین نے بہ مشکل جملہ مکمل کیا۔

لیاقت حسین کے لیے ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو اسے پانی کا بھرا ہوا ایک جگہ اور کچھ نظر آ گیا، اس نے چومیں پانی بھر کر وہ تین زوردار چپ فرمین کے چہرے پر مارے تو وہ ہوش میں آگئی۔

”ات سے آنکھیں پٹ پٹا تے ہوئے ہوئی۔“ وہ۔۔۔۔۔ لوگ اندر غرق ہو گئے۔ جو ہم کو ادھر اٹھا لیا تھا۔“

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد پانی کے چھینٹوں سے زریں بھی نیم بیدار ہوئی تو لیاقت کی مشکل کچھ آسان ہو گئی، ان نے فرمین کو ہاتھ تھام کر اٹھایا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ زریں کو فرمین نے سنبھالا۔ وہ تینوں باہر آئے تو فرمین نے بے ہوش پڑے آدمیوں کی طرف تھوک کر کہا۔

”میں تھے وہ ماں کے قصص جو۔۔۔۔۔ ہم کو ادھر لائے تھے۔۔۔۔۔ ان سب کو گولی مار دو۔“

”پہلے تھوڑی سی کچل کر گھر چھوڑ دوں پھر ان چاروں کو بھی جہنم رسید کرنا نہیں چھوڑوں گا۔“

گرتے پڑتے وہ کسی نہ کسی طرح باہر آگیا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ فرمین اور زریں کو دیوار پر کس طرح پڑھائے گا لیکن گودام سے باہر نکل کر اسے وہ فحشی دروازہ بھی نظر آ گیا جو غائب عام ورکر کے لیے بنایا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے دروازے کو صرف اندر سے ہولٹ کیا گیا تھا۔

لیاقت حسین باہر نکلا تو سراج سامنے ہی گاڑی سے کھڑا تھا۔

لیاقت نے دونوں عورتوں کو پھیلی سیٹ پر کرسی مخرج بٹھا کر اندر۔۔۔۔۔ اندر پھر اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہی سراج نے

گاڑی کو تیز رفتاری سے چلا کر شروع کیا، راستے بھران کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ گھر کے قریب گلی کے کونے پر پہنچ کر اس نے سراج سے بڑی عاجزی سے کہا۔

”صاحب۔۔۔۔۔ آپ کا یہ احسان لیاقت بھی نہیں بھولے گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جلدی کرو، مجھے ابھی اور بہت سے معاملے بھی نمٹانے ہیں۔“

لیاقت، فرمین اور زریں کو لے کر گلی میں داخل ہوا جو بالکل سناٹا پڑی تھی، وہ گل خان کے گھر کے سامنے سے گزر کر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ پانچ منٹ بعد فرمین بھی زریں کو اس کے مکان کے اندر چھوڑ کر واپس آگئی۔ اس پر اب بھی غصہ کی طاری تھی، چار بائیں پر لیاقت کے برابر لیٹ کر وہ بھی اس طرح بے سندھ ہوئی کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ لیاقت پہلے ہی بے سندھ خند میں خراٹے لے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر صبح ہی صبح چار اشتہاری مجرموں اور ایک کلب کی کال گرل کی لاش پائے جانے سے ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ ایس بی علاقہ آغا منظور کے علاوہ ایس ایچ او بھی پولیس والوں کی نیم کے ہمراہ صبح آٹھ بجے سے ضروری قانونی کارروائی میں مصروف تھے۔ ڈی ایس بی سراج کو کال کر کے دیا گیا، ان پانچ۔۔۔۔۔ شوں کو دیکھ کر وہ بھی پریٹان ہو گیا تھا۔ جائے وقوعہ پر ایس بی پولیس کے علاوہ منکر پرنس لینے والا ملک بھی موجود تھا۔ اخباری نمائندے بھی فوٹو گرافرز کے ساتھ موجود تھے، لوگوں کے جھوم کی وجہ سے ٹریفک پولیس نے آنے جانے والی گاڑیوں کو متبادل راستوں کی طرف موڑنا شروع کر دیا۔

سراج کے آتے ہی ایس بی آغا منظور سے ایک طرف لے گیا، اس کے چہرے پر بھی تشویش اور انکھن کے ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے۔ ”یہ لاشیں کب دریافت ہوئیں۔۔۔۔۔؟“ سراج نے تفصیل معلوم کرنے کی خاطر پوچھا۔

”ہمارے لیے جو پریٹنیاں کھڑی کی گئی ہیں وہ کسی سوچی سمجھی اسکیم سے متعلق نظر آتی ہیں۔“ آغا منظور نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”چاروں اشتہاری مجرم ہیں، ان میں سے دو کے لیے حکومت کی طرف سے انعام کا اعلان بھی کیا گیا لیکن ان حرام زادوں کی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی اور اب ان کی لاشوں کا اس طرح سرعام پایا جانا ہماری نیندیں بھی حرام کر سکتا ہے۔ ان کے جسموں کو گولیوں سے چھتی کرتے کے بعد یہاں پھینکا گیا ہے، جگہ کال محل کو نقص دلانے کے مقام پر ایک گولی مار کر زندگی سے نبٹ دلائی گئی ہے۔“

”میں آپ سے متفق ہوں سر، لیکن ایسا کون شخص کر سکتا ہے؟“

”جو بھی ہو لیکن... اب وہ شاید اپنا دماغی توازن یقیناً کھو بیٹھا ہے جس کا علاج ضروری ہے۔“

سراج نے فوراً ہی کوئی دوسرا سوال نہیں کیا، ایس پی کے جیسے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اصل مجرم کا نام ضرور کھلبار رہا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟ سراج صرف سوچ کر رہ گیا۔

”میں فی الحال آفس چار ہا ہوں، ادھر بھی اوپر والوں کے فون کھڑکھڑا رہے ہوں گے۔“ ایس پی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنی نگرانی میں ساری کارروائی مکمل کر کے پانچوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیتے ہیں گے۔“

”رائٹ سر... لیکن کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسا نام ہے جس کے بارے میں ان لاشوں سے متعلق...“

”سوری... اس وقت کچھ بھی کہنا قفل از وقت ہو گا۔“ ایس پی آغا منظور نے کسی مصلحت کے پیش نظر رازداری سے کام لیا پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو کچھ رپورٹروں نے سراج کو کھیر لیا۔

”جناب... آپ ان لاشوں کے سلسلے میں کچھ عرض کریں گے؟“

”آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ابھی پہنچے ہوں۔“ سراج نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ”آپ حضرات تو اپنی معلومات کے مطابق خبریں شائع کر دیں گے، ہمیں اس کا نمائندہ جھگڑنا پڑے گا۔“

”ہم جو کچھ تمہیں گے وہ ان پانچوں کی تصویر کے ساتھ ہی شائع ہو گا۔“ دوسرے رپورٹر نے بھرپور طنز کیا۔ ”چاروں مرد اشتہاری ملزم تھے، لڑکی بھی بدکار تھی۔ اس کے علاوہ یہ لاشیں آسمان سے تو گرنے لگی ہوں گی، اس کی پشت پر بھی بڑے بڑے لوگوں کا ہاتھ ضرور شامل ہو گا جو صبح الٹا ہو کر ایسی مصروف سڑک کے درمیان پھینک گئے ہیں۔ یہ دیدہ دیریں نہیں تو اور کیا ہے؟“

”آپ درست فرما رہے ہیں لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور عمل تفتیش کے بغیر میں کچھ بھی کہنے سے معذور ہوں۔“ سراج نے غصے کے بجائے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر لاشوں کے قریب آگیا جہاں پولیس کی بھاری نفری نے چاروں طرف گھیرا آؤٹ رکھا تھا۔ ساڑھے گیارہ تک رات کو جب سے حادثہ پر توجہ پڑا پھر ملاقاتیں انجی اڈی گھرائی میں ایشن کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے سے بعد ہی وہ

بڑی مشکل سے اخباری نمائندوں کو ہالتے ہوئے سوا بارہ بجے آفس پہنچا۔ لیاقت حسین وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے لیاقت، تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“ سراج نے اعصابی ٹھنکن دور کرنے کی خاطر ہاتھوں کو دونوں اطراف پھیرا کر ایک خاص انداز میں ورزش کی پھر گزری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”صاحب... وہ... وہ دونوں رات کو کسی وقت گھر آگئی ہیں؟“ لیاقت نے کچھ عجیب انداز سے کہا۔ ”تم کیا اپنی بیوی اور اس کی سبیلی کی بات کر رہے ہو؟“ سراج نے چونک کر سوال کیا۔

”جی ہاں صاحب...“ لیاقت نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”وہ فرحین بولتی ہے کہ رات، میں کسی گودام کے تہ خانے سے انہیں بچا کر لایا ہوں جبکہ میں تو رات بھر گھر پر ہی تھا۔“

سراج دوبارہ چونکا پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے لیاقت حسین کے سلسلے میں میڈم روٹی کو انوار کرنے والوں سے بچانے کی بات یاد آگئی۔ اس وقت بھی لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے اس سچائی کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر کچھ ویسے ہی تاثرات نظر آ رہے تھے۔ لیاقت حسین جو باتیں کر رہا تھا انہیں وہ مافوق الفطرت واقعات کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

”تمہاری بیوی نے اور کیا بتایا ہے؟“ سراج نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”جی کہ اسے اور زینہ کو چار لوگ لاری اڈے سے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ انہیں شہر سے دور کسی تہ خانے میں رکھا گیا تھا جہاں چار بد معاش نقاب میں چہرہ چھپائے اور رائفیں لیے ساتھ ساتھ تھے۔“ لیاقت نے فرحین کی سنائی ہوئی تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی میں بٹھانے کے بعد ان دونوں کی آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اس لیے وہ کوئی راستہ نہیں جانتیں۔ آنکھوں کی پٹیاں تہ خانے والے کمرے میں لے جانے کے بعد کھول دی گئی تھیں۔ صرف ان کے ہاتھوں کو خالوں نے پیچھے باندھ دیا تھا۔ وہاں ایک آوارہ لڑکی بھی پیسنے سے موجود تھی، شراب

کباب کا، اور بھی چلاتا تھا، فرحین اور زینہ نے شور مچانے کے لیے آوازیں نکالیں تو انہیں زبردستی پانی میں کوئی بے ہوشی کی دوا مار پلا دی گئی تھی۔ فرحین اور زینہ کا بیان ہے کہ میں نے ان دونوں وہاں سے نکال کر صبح پہنچایا تھا اور

لیاقت کچھ کہتے کہتے رکتے رہ گیا۔ ”اور کیا... تم خاموش کیوں ہو گئے؟“

”صاحب... وہ بولتی ہے کہ آپ ہی ہم سب کو اپنی گاڑی میں گھر کے نکلنے کے لیے بلوائے تھے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے فرحین کی سنائی ہوئی پوری کہانی دہرا دی۔

”اور...“ سراج نے دیدہ وادست سکرا کر بڑے تحمل سے کہا۔ ”دیکھو لیاقت حسین... جو کچھ تم یا تمہاری بیوی کہہ رہی ہے ممکن ہے وہ اپنی جگہ غلط نہ ہو مگر تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔“

”آپ حکم دے صاحب... لیاقت آپ پر جان قربان کرنے کو بھی تیار ہے۔“ ”مجھے سوچ کر بتاؤ... کیا کوئی روحانی قوت تمہارے علم میں ہے جو جہاڑی مدد کرتی ہو...؟“

”روحانی قوت...“ لیاقت حسین نے ڈیڑھا بزرگ کو زبان بند کرکے کا جو قول دیا تھا، وہ اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ ”کیا بات ہے۔ تم چپ کیوں ہو؟“ سراج نے اسے متوتری نظروں سے دیکھا۔

”صاحب... جب ہم اپنے شہر سے چلا تھا اس وقت ہماری ماں نے ایک عادی تھی کہ اوپر والا ہر قدم پر غیب سے میری مدد کرے۔“ اس نے اصل باتوں کو دہرانے کے بجائے معصومیت سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ایک ماں کی دعا مجھے لگتی ہو۔ اوپر والا تو مالک کل ہے صاحب۔ کوئی بات بھی اس کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے...“ سراج نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”ماں کی دعا میں اولاد کے لیے بڑی بابرکت ہوتی ہیں۔ تمہیں ایک بات کا اب خیال رکھنا ہو گا۔“

”وہ کیا صاحب...“ ”جو کچھ تمہاری گھر والی کہہ رہی ہے اسے مان لو۔“ ”صبر کیو سے اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہو ورنہ تاشی جاتی رہے گی، میں نے بزرگوں سے یہی سنا ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب... اب میں ایسا ہی کروں گا۔“ ”ایک بات تمہیں اور بتا دوں لیکن اس سلسلے میں بھی سخت زبان بند رہی رکھنا۔“ سراج نے پہلو بدل کر کچھ سوچتے ہوئے رکتے ہوئے کہا۔ ”جن چار آدمیوں کا ذکر تمہاری بیوی نے کیا ہے

... تمہاری جرم تھے جن کی لاشیں آج صبح ایک معروف سڑک پر پائی گئی تھیں۔ کل تک ان کی تصویریں بھی اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔ یہی بیوی کو بد تصویر دکھا کر مذہم بنا کر مار دیا۔“

حضرت عمار بن یاسرؓ کی شیطان سے جنگ

حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کربلا اور انصاف سے جنگ کی ہے۔ پوچھا (جن سے) کس طرح جنگ کی؟ فرمایا ایک جنگ میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے چنانچہ ہم ایک منزل پر آئے اور میں نے اپنا مشکیزہ اور ڈول پانی کے لیے اٹھایا تو... آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”تمہارے سامنے پانی کے پاس کوئی (شخص) آئے گا وہ تمہیں پانی لینے سے منع کرے گا تم اس سے خبردار رہنا۔“

چنانچہ جب میں کنوئیں کی منڈ پر پہنچا تو ایک کالا سیاہ انتہائی بد صورت شخص نظر آیا اس نے کہا اللہ کی قسم تم آج کنوئیں سے پانی کا ایک ڈول بھی نہیں لے سکتے۔ اس طرح سے ہماری بھڑپ ہو گئی اور میں نے اس کو چٹ کر دیا پھر ایک پتھر اٹھایا اور اس کی ناک اور منہ توڑ دے پھر اپنا مشکیزہ بھرا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گیا۔

آپ ﷺ نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں روکنے کے لیے تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟“ میں نے عرض کیا۔ ”جی ہاں۔“ اور پھر آپ ﷺ کو سارا واقعہ سنا دیا۔

آپ ﷺ نے پوچھا۔ ”جانتے ہو وہ کون تھا؟“ میں نے عرض کیا۔ ”نہیں۔“ آپ نے فرمایا۔ ”وہ شیطان تھا۔“

ایک روایت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ ہم ہمارے ملے اور ان کو کہا۔ ”ابو الیقظان، تم تو شیطان پر غالب آگئے۔“

حضور ﷺ نے (اس کے متعلق) ایسے ارشاد فرمایا ہے۔ ”شیطان عمار کے اور پانی کے درمیان کانٹے جھنکی کی شکل میں رکاوٹ ڈال رہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے عمار کو غالب کر دیا۔“ حضرت عمارؓ نے فرمایا۔ ”مگر مجھے معلوم ہو جا تا کہ وہ شیطان ہے تو میں اس کو قتل کر دیتا، اگر اس سے سخت بد بو نہ آتی ہو تو میں اس کی ناک ضرور کاٹ دیتا۔“

علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب ”تاریخ جناب“ میں شیطان کے بارے میں ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ایک روز حضرت عمارؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ایک شخص کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس نے اس کے

”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔۔۔“
”ایک خوش خبری میرے پاس بھی ہے تمہارے لیے۔“ سراج نے کہا۔ ”تمہارے صاحب اور مجھ صاحب ایک ہفتے بعد واپس آ رہے ہیں۔“

نیاقت حسین نے خوشی کا اظہار کیا، پھر سراج سے دو چار باتیں کرنے کے بعد کام پر چلا گیا۔ اس کے ساتھ دو بار جو حیرت انگیز واقعات رونما ہو چکے تھے وہ اس نے ذہن میں اشتعال پیدا کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا بات ہے کہ جو کارنامے وہ کر گزرتا ہے اس کا پتا دوسروں کو چل جاتا ہے لیکن وہ خود بے خبر رہتا ہے؟ یہ بات خود اس کے لیے بھی ایک معما بن گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن شائع ہونے والے اخباروں نے مصروف شاہراہ پر پائی جانے والی پانچوں ناشوں کی تصویریں کے ساتھ، پولیس کے خلاف ملک مریج لگا کر جو خبریں پہلے صفحات پر نمایاں طور پر شائع کی تھیں اس نے نہ صرف پورے شہر میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا بلکہ مرکزی حکومت کے متعلقہ ذمہ داروں نے بھی صوبائی پولیس کے آئی جی، ڈی آئی جی اور پولیس افسروں سے سختی سے باز پرس شروع کر دی تھی۔ سراج صبح سے دفتر میں بیٹھ مستقبل ایس پی آغا منظور سے رابطے میں تھا، اسی کے مشورے کی روشنی میں وہ فون کالز کا جواب بھی دے رہا تھا۔ تقریباً بارہ بجے آغا منظور کا فون پھر موصول ہوا، غالباً اس کی قوتِ برداشت اعلیٰ حکام کی سرزنش سن کر جواب دے چکی تھی۔

”مسٹر سراج۔“ اس نے بے انتہا جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی فون کا ریسپونڈ کر ایک طرف ڈال دیں۔ اٹ از نو ٹو مچ (It is too much)، جو حکام مجرموں کے لنگوٹیاں ہیں اس وقت وہ بھی اس طرح باز پرس کر رہے ہیں جیسے ان سے زیادہ معصوم اور فرض شناس کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ نان سنس۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے فون انکج کر دیں تاکہ سکون کے ساتھ کچھ سوچ سکیں، میں نے ڈی آئی جی صاحب سے بھی بات کر لی ہے۔“

”سر۔۔۔۔۔ کیا آپ مجھے بھی بتائیں گے کہ وہ کون لوگ ہیں جو مجرموں کو بے نقاب کرنے کے بجائے ہم پر غرا رہے ہیں؟“

”ہم اور آپ ان کی گردوغبار نہیں پہنچ سکتے، اس لیے ان کے نام لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دیت از آل۔“

دوسری جانب سے بھلا کر کال منقطع کر دی گئی۔ سراج نے

ایس پی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نہ صرف فون کا ریسپونڈ پر رکھ دیا بلکہ اپنے ڈیوٹی کانسٹیبل کو بھی بلا کر تاکید کر دی کہ جو بھی ملتا چاہے اس سے کہہ دے کہ وہ کسی افسر سے مصروف گفتگو ہے۔

سنتری کے جانے کے بعد سراج نے بھی ذہنی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے۔ ان باتوں کے سلسلے میں اسے بہر حال کچھ نہ کچھ قانونی کارروائی تو کرنی تھی۔ سوچوں کے زائوے اس کے ذہن میں پھیلے تو اسے گزشتہ روز ایس پی کا کہا ہوا ایک جملہ بھی یاد آ گیا۔ ”ہمارے لیے جو پریشانیوں کھڑی کی گئی ہیں وہ کسی سوچنے والی شخصیت سے متعلق نظر آتی ہیں۔“ اس نے اس جملے کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ۔۔۔۔۔ ”اب وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے جس کا علاج ضروری ہے۔“ سراج نے ان جملوں کی وضاحت چاہی تو جواب میں یہی کہا گیا۔ ”سوری۔۔۔۔۔ اس وقت کچھ کہنا قفل از وقت ہوگا۔“

ایس پی آغا منظور کے جملوں سے یہی لگتا تھا کہ وہ کسی مخصوص شخص پر شبہ ضرور کر رہا ہے۔ سراج نے ابھی ہوئی کڑیاں تلاش کرنے کی خاطر ذہن پر زور دیا تو اسے میڈیم روٹی کے انگوٹے کے سلسلے میں اپنے ایس پی کا کہا ہوا ایک اور جملہ یاد آ گیا۔ اس وقت بھی اس نے سراج کی ایک بات کو ماننے کی خاطر گول مول جواب دیا تھا۔ ”سوری، میں اس وقت زبان کھولنے سے قاصر ہوں، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے میڈیم کے سلسلے میں باقاعدہ پلاننگ کرنے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہوگا۔“

ایس پی کے جملے سراج کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے، اسی حوالے سے اچانک اس کے ذہن میں شیخ حامد کا خیال ابھرا جس نے ایس پی کو باقاعدہ خرید رکھا تھا، اس کے اس خیال کی تصدیق دہی زبان میں ڈی آئی جی کی کراٹر عظیم احمد نے بھی کی تھی۔ سراج یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا ایس پی آغا منظور بھی میڈیم روٹی کے طبق گارڈوں میں سے ہے، نہ ہوتا تو وہ سراج کو اپنے دفتر بلا کر اسے روٹی کی خفیہ طور پر نگرانی کرنے کی ہدایت بھی نہ دیتا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر سراج نے شیخ حامد کو ٹھونکا بھی ضروری سمجھا، خود شیخ حامد نے سراج کو ایک لاکھ روپے میں خریدنے کے بعد کہا تھا۔ ”ایک بار واقفیت ہوگئی ہے تو اب آتے جاتے رہے گا۔“

سراج نے کافی غور و خوض کے بعد ریسپونڈ دیا اور شیخ

نہ بانہہ ڈال کر کہنے لگا۔ وہ پوری طرح متاثر ہو کر بیٹھ گیا

تھا، اسے شبہ تھا کہ شیخ حامد کے نمبروں پر کی جانے والی کالیں ”بپ“ بھی ہوتی ہوں گی جسے بعد میں بطور بلیک میسنگ کے استعمال کیا جاتا ہوگا۔

”بپ۔۔۔۔۔ شیخ فہم حامد گروپ آف کمپینز۔“ دوسری جانب سے نیلی فون آپریٹر کی مقررہ آواز ابھری تو سراج کو اس کی آواز کچھ آشنا لگی۔ اس نے خود کو بے پردہ ظاہر کرتے ہوئے تنبیہ کی کہ دریافت کیا۔

”آپ شاید نیلی فون آپریٹر بول رہی ہیں؟“
”ہیں پلیز۔۔۔۔۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“
”شیخ حامد سے کال ملا دیں۔“ سراج نے قدرے دہشت آواز میں کہا۔

”اے آئی نو پور گڈنیم پلیز (کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں)“ اس بار بھی مہذب لہجے میں سوال کیا گیا۔

”سراج۔۔۔۔۔“ سراج نے مختصر نام بتایا۔
”آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟“ شیخ کے لہجے کا جس محسوس کر کے سراج کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ اسے پوری طرح یاد آ گیا کہ شیخ نامی آپریٹر کی آواز اس نے پہلے۔۔۔۔۔ کب اور کس موقع پر سنی تھی۔

”آپ مسٹر حامد کو صرف اتنا بتا دیں جو میں نے کہا ہے۔“ سراج نے دیدہ و دانستہ لہجے والا انداز اختیار کیا۔
”میں کوئی مزید حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”دن منٹ پلیز۔“ اس بار شیخ نے روایتی جواب دیا۔ ”میں چیک کر کے آپ کو جواب دیتی ہوں۔“

سراج کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسی آواز نے میڈیم روٹی کے انگوٹے کے سلسلے میں اسے کسی پبلک فون بوتھ سے فون کر کے کہا تھا۔ ”کچھ لوگ میڈیم کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔“ سراج کے وضاحت کرنے پر اس نے جواب دیا تھا کہ۔۔۔۔۔ ”ابھی میں اپنا نام ظاہر نہیں کر سکتی۔ اس وقت میں آپ کو جو کیو وے رہی ہوں اس کو ذہن میں محفوظ رکھیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کے لیے کارآمد ثابت ہو۔“

اس کے ساتھ ہی پبلک فون کا حوالہ دے کر لائن منقطع کر دی گئی تھی۔ سراج کے ذہن میں کچھ کڑیاں آپس میں گڈنڈ ہو رہی تھیں جب شیخ نامی آواز دوبارہ ابھری۔

”بات کر سیں پلیز۔۔۔۔۔“ اس نے جواب دے کر لائن شیخ حامد سے ملا دی تھی۔

”نیلی ڈی ایس پی صاحب۔“ جیسے ہی آپ۔۔۔۔۔ شیخ

حامد نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”بہت دنوں بعد آپ سے

”ایک بار پہلے ہی آنے کا ارادہ کیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ آپ تین چار روز کے بیرون ملک کے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔“

”بزنس میں آئے دن ادھر ادھر آتا جاتا تو لگتا ہی رہتا ہے۔ آپ سنا کریں، اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟“

”آپ کو ایک مکان فطرے کے تحت حفظ ماتقدم کے طور پر فون کرنے کی جسارت کی ہے۔“ سراج نے جان بوجھ کر انکساری سے کہا۔ ”آج کا اخبار تو آپ نے دیکھا ہوگا؟“
”ہاں۔۔۔۔۔ ایک سرسری نظر ڈالی تو قحطی لیکن مجرم اور کیڑے کوڑے تو آئے دن ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔“
شیخ حامد نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔ ”آپ کو کیا تشویش لاحق ہے؟“

”اوپر سے سخت باز پرس ہو رہی ہے سر۔۔۔۔۔“ سراج نے پوری طرح کیل کانٹنے سے لیس ہو کر درخواست کی۔
”بہت سے پولیس آفیسروں کی اکٹھا پچھاڑ اور دور دراز علاقوں میں تباہی لے کر خبریں بھی مل رہی ہیں۔ آپ کو اسی وجہ سے کال کیا ہے کہ۔۔۔۔۔“

”ڈونٹ وری مسٹر سراج، بڑے یقین سے جواب دیا گیا۔“ ہم جس کو ایک بار دوست کہہ دیں تو اس کا خیال بھی ضرور رکھتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ کیا ہوگا آپ اس کا ٹم نہ کریں لیکن آپ کا تامل نہیں ہوگا۔“

”بہت بہت شکریہ شیخ صاحب۔“ سراج نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کی اس نوازش کو بھی یاد رکھوں گا۔“

”تو جی نہیں مسٹر سراج۔ دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔“ اس جملے کی اداسی کے ساتھ ہی لائن کاٹ دی گئی۔

سراج نے ریسپونڈ پھر میز پر رکھ دیا اور بے چینی سے اٹھ کر اپنے دفتر میں ٹھٹھکے لگا۔ جو کڑیاں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں وہ صرف اور صرف شیخ حامد کو مشکوک ثابت کر رہی تھیں لیکن وہ اب بھی اس پر ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ افضل خان کے ساتھ شیخ نامی شیخ حامد گروپ آف کمپینز میں کام کرتا اس کے لیے زیادہ حیرت انگیز نہیں تھا، مگر جو بات اسے بار بار کھٹک رہی تھی، وہ شیخ نامی سراج کو فون کال کر کے میڈیم روٹی کے سلسلے میں یہ بتاتا تھا کہ۔۔۔۔۔ ”کچھ لوگ میڈیم روٹی کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔“ یہ جملہ اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ خود شیخ نامی شیخ حامد کے خلاف زبان کھولنے کی کوشش کی گئی۔ ”کیا وہ بھی کسی خاص مقصد کی وجہ سے وہاں کام کر رہی تھی؟ وہ مقصد کیا تھا؟“

سراج نے اس بات پر غور کیا۔

www.paksociety.com



عمیرہ احمد عکس
عکس در عکس پہلے سلسلہ زندگی کے
پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
مسائل حیات متعلق مختلف زاویہ
نظر لیا جائے کر سنا ایک پرت شرانوں

عالیہ بخاری **خوشبو کا سفر**
محبت اور جنت میں سب بچھ جائے کھجے سے
دیوانوں کا جہاز سے اترنا والی پیم اور نرزی

راحت وفا **ایک تھی نیان**
انسانی ذہن کی تھیں کئی کھنکھول کیفیات اور
حساسات کے گروہ جو متا سسے وارنا ول

رضوانہ برنس اور سدرۃ المنتہی
کے دانش و خوب صورت جذباتوں میں افسانہ ناول

ناہید سلطانی اختر، لبنی عروج،
تحسین اختر، بشری نثار، تریا انجم،
عروسہ وحید، شمیم فضل حلق
اور دیگر صفحات کی دلچسپ اور دل آویز تحریریں

ایک اور افسانہ کے تھیلے
کیا آپ نے اس ناول کو پڑھا ہے؟
نہیں، تو اسے پڑھ لیں

فرسین سے مرکزی حکومت کی جانب سے شدید باز پرس ہو رہی تھی۔ عوامی نمائندے بھی احتجاج کر رہے تھے۔ انہیں قتل کی نئی نئی شیخ حامد کے علم پر اپنے خاص آدمیوں سے رات بیکانہ گواہ کیا تھا جس روز کسی نہ کسی طرح فرسین کو رہا کر دیا گیا۔ فرسین نے نکل گئی تھیں، کال گرائی و اس لیے کہ وہ ایک بڑے بڑے عدالت میں زبان بھی کھول سکتی تھی۔

پھر جانے کتنے عرصے کے خطرناک تیور دیکھ کر افضل خان بھی حیران رہا تھا۔
"اس کی یہ ہے کہ وہ دونوں کس طرح وہاں سے نکلے؟" شیخ حامد نے لڑی پر بیٹھ کر میز پر دونوں ہاتھ پڑاتے ہوئے افضل خان کو شدید غصے کے عالم میں گھورا۔
"نہیں وہ ہوش کی دوا پلا دی گئی تھی۔ ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے، یہ بات تم نے بھی سمجھ لی تھی پھر ان کو بیہوش کی حالت میں لیا جن بیچوت اٹھا کر لے گئے تھے؟"

"سر۔۔۔ افضل خان نے بھلیں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے ان چاروں نے ہی بتایا تھا۔"
"وہ کسے؟" شیخ حامد دانت کچکاتے ہوئے بولا۔
"انہیں مجھ سے ملے تھے۔ وہ کال گرائی وہاں کہاں سے نازل ہوئی ان چاروں نے بے تحاشائی کی ہوگی اور پھر بار بار اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ لگاتے ہوئے بعد خود بھی مردوں کی طرح اٹھنے لگے۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن اس کا جواب تو وہ خود دے سکتے ہیں۔"
"نہیں آپ۔۔۔ شیخ حامد سنی کے دل چلا کر بولے۔
"تم نے سوچا کہ میں اس قسم کے جواب سننے کا عادی نہیں ہوں؟ یہ تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟۔۔۔ ذمے داری تمہاری کتنی کمزور ہے اور جا کر صورت حال کا جائزہ لے کر اپنا فیصلہ کر سکتے تھے۔ کیا میں غصہ کر رہا ہوں؟"

"نہیں، میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔"
"تو شیخ حامد غرا۔ "آئی ڈونٹ۔۔۔ ٹیپ سبلی ٹو۔۔۔" شیخ حامد نے صرف دم ہلاتے ہوئے کتے پند کیس میں ان کی منہوں میں آنکھیں ڈال کر میری باتوں کا جواب دیا۔

"نہیں۔۔۔ اس نے بٹ بات کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اس قسم کی بات نہ کر لی تھی۔"
"نہیں اس کی پروا نہیں ہے کہ یا تمہیں پکار رہا ہوں۔۔۔" شیخ حامد نے دوبارہ اس کی باتوں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اپنی بات نہ دینی چاہی تھی۔"

پیش نظر وہ اپنے حضور حضور و ماضی کے درمیان میں نہیں ہے۔
"آپ کا اندازہ درست ہے سر۔ اس کے علاوہ ہمارے اس میں صاحب میڈمر وئی کی وجہ سے بھی فخر و شہرت کا شکار ہیں۔"
"کیسا مضرب؟" دوسری جانب سے حیرت کا اظہار ہوا۔ "یہ میڈمر وئی کا نام درمیان میں کہاں سے آگیا؟" سراج نے جواب میں میڈمر وئی کے انوائ کی کہانی سناتے ہوئے کہا۔ "مجھے خاص طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ میں میڈمر کو پروکیشن دینے کا خیال رکھوں۔"
"اس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی؟"

"جی سر۔۔۔ دراصل اس کی صاحب دوبارہ اپنا گھر آباد کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں کسی قسم کی فکر بھی نہیں رہے گی۔"
"ونڈرفل۔۔۔" ڈی آئی جی نے بے تکلفی سے کہا۔
"گویا شاہی کے ساتھ ساتھ وہ میڈمر کی کروڑوں کی جائداد پر بھی نظر جمائے ہوئے ہے۔"

"نہیں انویسٹی ہے سر، لیکن دیکھ رہے ہیں کہ وہ کیا آسانی سے ہمارے مطلوبہ مقصود سے دشمنی افروز کر سکتا ہے؟"
"ہو سکتا ہے اس لیے کہ جو جرائم پیشہ ہوں وہ کسی نہ کسی طرح ایڈمنٹ کر لیتے ہیں، ان کے درمیان دوبارہ بھی بیعت پرستی ہے۔ یہی جرائم پیشہ لوگ اکثر اپنی ذاتی رنجشوں کے سبب ہمارے لیے کارآمد بھی ثابت ہوتے ہیں، مجھے یقین ہے وہ تمام جرائم پر ہمارے کام آئے گا۔"

"ابھی تک اس نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔"
"ڈونٹ وری۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ آپ کو ایک بار اپنے لیے کارآمد سمجھ لینے کے بعد دوبارہ پھر کسی نہ کسی مقصد کی خاطر ضرور کال کرے گا۔ اس کے بانی۔"
دوسری جانب سے فون منقطع ہو گیا۔ سراج ڈی آئی جی کی کئی پہلی بات پر غور کرنے لگا۔

شیخ حامد اس وقت اپنے آفس میں کسی بھوکے درندے کی طرح ادھر سے ادھر ٹپ رہا تھا، چہرے کے تاثرات سے عیاں تھا کہ سخت غصے اور اشتعال کی حالت سے دوچار ہے۔ ایک کرسی پر افضل خان بھی دم مار رہے ہیں۔ "جل و جلان تو۔۔۔" شیخ حامد نے کہا۔ "کاؤنٹیل پر جا رہا تھا۔"

پانچ آفیس، چوٹیل سے نکلے گئے یہ مرد راجی تھے۔ بدلتے آئے ان کی سرانیاں کارہ تھیں۔

انہی کی اطلاع کے بعد سراج کے لیے ان کی حفاظت کا مسئلہ بھی بے حد اہم تھا۔ اگلے دن ہونے والی پریس کانفرنس کے سلسلے میں ایس پی آغا منظور نے جو خاموشی اختیار رکھنے کی بات کی تھی وہ بھی سراج کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ ایس پی روز اول سے ڈی آئی جی کی کراہٹ کو پسند نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے میڈمر کی دانت داری تھی، مگر سراج نے شیخ حامد کو ٹیپ کرنے کے سلسلے میں بھی صرف اور صرف میڈمر کی شخصیت پر غور کیا تھا۔ ایس پی کی خاموش رہنے کی تاکید سے اسے ضمنی کسی شہسور بھی تھی۔

وہ خاصی دیر تک ذہنی طور پر کسی ایسے درمیانی راستے کے بارے میں غور کرتا رہا جو اس کی ذاتی پوزیشن کو بھی تحفظ فراہم کر سکے اور متوقع خطرات سے قانونی حیثیت میں بھی عہدہ برآ ہونے میں کام آ سکے۔

گھر پہنچ کر رات کے کھانے کے بعد بھی وہ درجش معاملات پر غور و فکر کرتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس نے ڈی آئی جی کی کراہٹ کے ان لفظوں پر کال کیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے خود میڈمر احمد نے کال دیکھ لی۔ سراج نے چند لمحوں کے بعد اسے فرسین اور زینہ کی بازیابی کی تمام روداد و پوری تفصیلات سنوائی۔

"گنڈ۔۔۔" دوسری جانب سراج کو سراہتے ہوئے کہا گیا۔ "گویا ہم دونوں نے جو انداز سے فکر کیے تھے وہ بالآخر درست ثابت ہوئے۔"

"میرا ایمان ہے کہ کہ انہیں اگر اپنے فرائض میں کسی غفلت سے کام نہ لے لے تو اس کے نتائج بھی بہتر ہی نکلتے ہیں۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔"
"سر۔۔۔" سراج نے عقدرے چٹکایا کر کہا۔ "آپ سے ایک ذاتی درخواست اور کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو۔۔۔" دوسری جانب سے بے تکلفی اور بزرگانہ شفقت کا اظہار کیا گیا۔
"سر۔۔۔ آپ اگر ایک دوپہر میرے آفس میں صاحب کی موجودگی میں مجھ سے اپنی فحشی کا اظہار کر دیں تو بڑی فائز ہوگی۔"

"خیریت۔۔۔؟"
"مجھے کل کی کانفرنس میں خاموش رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ سراج نے وہی زبان میں وجہ بتادی۔
"نہیں جی۔۔۔" میڈمر احمد نے اس پر بھی بے تکلفی سے کہا۔ "میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ بھی چاروں آفیسوں کے جس منظر میں نظر آئے وہ ان کی شخصیت کو بوجھ بنائے۔"

سر سراتے لہجے میں پوچھا۔ ”میڈم روٹی کے مسئلے.... میں تم نے کیا تیر مارا ہے؟“

”آپ جو چاہتے ہیں سر، وہ تین چار روز میں ہو جائے گا۔“

”گند اب یہ زیادہ اہم ہے، تصویریں میرے قبضے میں ہوں گی تو کل وہ ڈرنی ڈاگ بھی میرے سامنے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکے گا۔“

باس کا اشارہ کسی کی طرف تھا؟ افضل خان نے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

”ایک خاص انفارمیشن اور بھی ہے تمہارے لیے۔“

شیخ حامد نے کہا۔ ”عثمان اور اس کی بیوی ایک ہفتے کے اندر آنے والے ہیں۔“

”مجھے آپ کا حکم یاد ہے سر۔“ افضل خان نے مستعدی سے جواب دیا۔

”جو کچھ ایک بار ہو گیا اسے ریپٹ نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے افضل خان کو خطرناک نظروں سے گھورا، اس بار تم کو بھی شکار کے ساتھ اس وقت تک موجود رہنا ہوگا جب تک میں اجازت نہ دوں۔“

”اوکے، سر۔“

”موجودہ کے گارڈ نے بھی ان چاروں.... کے بارے میں کچھ نہ پتہ تو بتایا ہوگا؟“

”اس کا یہی کہنا ہے کہ وہ چاروں، دونوں عورتوں کے ساتھ عقبی راستے سے اندر گئے تھے، اس کی اطلاع انہوں نے گارڈ کو بھی دی تھی۔“ افضل خان نے کسمسا کر کہا۔ ”سر، اگر آپ کی اجازت ہو تو میں لیاقت کی بیوی کو دوبارہ....“

”نہیں....“ شیخ حامد نے تیزی سے کہا۔ ”ابھی اس کو دوبارہ چھیڑنا مناسب نہیں ہوگا، ممکن ہے کہ ان کی خفیہ طور پر گمرانی کی جارہی ہو لیکن لیاقت حسین....“

”آپ اشارہ کریں تو اسے اوپر پہنچا دیا جائے۔“

”فی الحال کسی کو چھیڑنا مناسب نہیں ہے مگر.... میں لیاقت حسین کو زیادہ دنوں برداشت بھی نہیں کر سکتا۔“

افضل خان خاموش ہوا تو شیخ حامد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”ڈی آئی جی کراٹز کی گمرانی ضروری ہے، مجھے یہ اطلاع ملتی رہنی چاہیے کہ وہ کیا تیر مارنے کی کوشش کر رہا ہے؟“

”سر۔“ افضل خان منہیل کر بولا۔ ”وہ کسی قیمت پر اپنے والی چیز نہیں ہے ورنہ....“

”میں جانتا ہوں اور میری اطلاع ہے۔“ یہ سن کر جیسا دوں کہ میں ایسے ایماندار اور فرض شناس افسروں کی قدر بھی کرتا ہوں۔ ایک حد تک ان کا خیال بھی رکھتا ہوں۔ ہاں، اگر میں نے اس کی تفتیش کا رخ کسی خاص طرف دیکھا تو فائل کسی اور کے نام بھی کر اسکتا ہوں۔ صرف ایک فون کال کافی ہوگی۔“

شیخ حامد رفتہ رفتہ نارمل ہو رہا تھا اس نے افضل خان نے دہی زبان میں میڈم روٹی کے دشمن صحت منانے والی بات بھی پوری تفصیل سے بتادی، خاص طور پر اس شرط کا ذکر بھی کر دیا کہ وہ کسی ہوٹل کا انتخاب خود کرے گی۔

”ڈونٹ وری.... وہ جس ہوٹل کا انتخاب کرے تم مجھے بتا دینا۔ وہاں بھی تمہیں اپنے اپارٹمنٹ جتنی سہولتیں دلوانا میرے بائیس ہاتھ کا کھیل ہوگا لیکن.... میں کوئی ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔“

”ایسا ہی ہوگا باس۔“

”ناؤ گمٹ لاسٹ....“ شیخ حامد نے حسب معمول اپنی زبان میں جانے کو کہا تو افضل خان خاموشی سے اٹھا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے تیزی سے اس آفس سے باہر نکل گیا جہاں داخل ہوتے ہوئے اب اس کی روح بھی لرز اٹھتی تھی۔ وہ اتنا ملوث ہو چکا تھا کہ اب اسے چھکارے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

میڈم روٹی اس وقت سونے کا ارادہ کر رہی تھی جب اس کی خاص ملازمہ نے سامنے آکر کہا۔

”شبیم نامی ایک لڑکی باہر کھڑی آپ سے ملنے کی ضد کر رہی ہے، میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن....“

”اس وقت میڈم کے آرام کا وقت ہے۔“ کمرے میں موجود نرس نے ملازمہ سے کہا۔ ”بڑے ڈاکٹر نے جو نام تجیل دیا ہے اس پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔“

”پلیز نرس....“ میڈم روٹی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہاری فرض شناسی سے بہت خوش ہوں لیکن اس وقت جو تو کی مجھ سے ملنے آئی ہے، میں اسے کسی قیمت پر نال نہیں سکتی۔“

”لیکن ڈاکٹر....“

”میں تمہیں تفصیل نہیں سمجھا سکتی لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت میں ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہیں کر سکتی۔“

میڈم کا فیصلہ کن جواب سن کر نرس مجبوراً خاموشی جوئی۔ ملازمہ نے پوچھا۔

”میرے لیے کیا حکم ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی کسی قریبی ہفتے میں کام کرنے والی ملازمہ لگتی ہے۔“

”تم اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ اور اس بات کا خاص خیال رہے کہ جب تک وہ لڑکی میرے کمرے میں نہ آئے تاہم دو روز سے اس بات کی گمرانی کرو کہ.... کوئی تیسرا ذمہ سے کمرے کے قریب نہ آئے۔ وہ لڑکی میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے یہاں آنے کا ذکر بھی کسی دوسرے کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔“

نرس نے میڈم روٹی کے چہرے پر اچانک نمودار ہونے والی گہری سنجیدگی دیکھی تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میڈم تھوڑا سا بستر پر اوپر کھٹک کر نیم دراز ہو گئی۔ دو ٹیکوں کا سہارا لے کر.... اس نے اپنے آرام کا بھی خیال رکھا تھا۔ شبیم کو کسی نے ملاقات کی دعوت دی تھی لیکن اتنی رات گئے۔ اس نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی، رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شبیم کمرے میں داخل ہوئی تو میڈم روٹی کو ایک لمحے کے لیے تعجب ہوا پھر وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر سکی۔ ”شبیم نے اپنے چہرے کی خوبصورتی دور کرنے کے لیے جو میک اپ کیا تھا اور لباس زیب تن کر رکھا تھا اس سے بظاہر اب یہی لگتا تھا کہ وہ گھریلو ملازمہ ہے جس کے بائیس لگاں پر زلم کا ایک گہرا نشان بھی نظر آ رہا تھا جو بھر جانے کے بعد بھی بد نما دکھائی دیتا تھا۔

اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ملازمہ نے دروازہ اندر کر بند کیا پھر پچھلے دروازے سے نکل کر باہر چلی گئی۔ میڈم نے اسے ایک بار پھر جی کی کید کی تھی وہ کسی کی فتنہ برداشت نہیں کرے گی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے شبیم کی طرف دیکھا تو اس نے بڑی مصحوبیت سے کہا۔

”نیم صبح جی۔ میرا بچہ ادھر گاؤں میں پھا رہا ہے، اگر آپ ہمارے صاحب کو فون کر کے سفارش کر دیں تو وہ مجھے بچلے دیں گے، میرا گاؤں جانا بہت ضروری ہے۔“

”فائن۔“ میڈم نے اسے تانگتی نظروں سے دیکھا۔ ”سوال کیا۔“ کیا تمہیں اداکاری کا شوق رہ چکا ہے۔“

”جی ہاں، ارادہ آواز نکالنے کے بعد تم نے آواز پر بھی آواز دیا ہے۔“

”شبیم نے اس بار اپنی اس آواز

میں کہا پھر کرسی گھسیٹ کر میڈم کے بستر کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”جب شکاری کتے ہر طرف گھوم رہے ہوں تو پھر احتیاط تو کرنی پڑتی ہے۔“

”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔“ میڈم نے بڑی اہمیت سے کہا۔

”آپ نے گھر آنے کا اصرار نہ کیا ہوتا تو بھی میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر آپ سے ایک بار ملنے کی کوشش ضرور کرتی۔“ شبیم نے ایک نکتہ سنجیدگی اختیار کر لی۔

”ایسی کیا بات ہے جو تم مجھے اتنی اہمیت دے رہی ہو....؟“

”سوری.... آپ شاید بھول رہی ہیں کہ میں نے اسپتال میں کہا تھا کہ شاید میرا اور آپ کا دشمن ایک ہی ہے۔“

میڈم روٹی جواب سن کر کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی۔

”تم نے اس بات کا یقین کیسے کر لیا کہ میرا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے؟“

”آپ کے اس سنجیدہ سوال کے جواب میں ایک بات میں بھی پوچھنے کا حق رہتی ہوں۔“ شبیم نے کسمسا کر کہا۔ ”جس مذہب خاتون نے پیرس کی تفریح گاہوں میں کبھی بغیر حجاب کے جانا پسند نہ کیا ہو۔ وہ شہر کے انتقال کے سال بھر بعد اس قدر ماؤرن کیوں بن گئی؟.... اور، اسے افضل خان جیسے خطرناک شخص کے اپارٹمنٹ میں تنہا جانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟“

میڈم روٹی اس طرح چونگی جیسے اسے پھونے ڈنک مار دیا ہو، شبیم کو سنجیدگی سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”تم میرے بارے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی ہو، میری پیرس کی زندگی کے بارے میں تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟“

آپ کے دونوں سوال کا ایک ہی جواب ہے۔“ شبیم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”ہم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے۔ نہ ہوتا تو میں جن پر کھیل کر کسی آدم خور درندے کے اتنے قریب جانے کی بھی بھول کر بھی غلطی نہ کرتی۔“

”لیکن....“ میڈم نے کچھ کہنا چاہا۔

”آپ نے میرے کہنے پر افضل خان کے اپارٹمنٹ میں جانے کی حقیقت کو بھی اپنے پولیس کو دیے جانے والے بیان میں بدل دیا تھا۔“ شبیم نے اس کی بات کو کات کر کہا۔

”کوئی نہ کوئی تو وہ ضرور ہوگی؟“

”تم نے ابھی تک میرے سب سے اہم سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میڈم نے کسمسا کر اپنی بات دہرائی۔ ”تمہیں میری جاس کی باتوں کا علم کس طرح ہوا؟“

جہانگیر بکس

معروف انگریزی ادبیات کی کتاب
معروف انگریزی ادبیات کی کتاب



575/-

499/-

انگریزی ادبیات کی کتاب
انگریزی ادبیات کی کتاب

دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو



اردو لغت
(جامع ترین)
مفرد و قدیم الفاظ، مرکبات
تھاورات، ضرب الامثال اور
فنی اصطلاحات کا مستند ترین لغت

350/- انسان اور دنیا

انسانی زندگی کی ساری باتیں
انسانی زندگی کی ساری باتیں

180/- پاکستان سے تعلق رکھنے والے

پاکستانیوں کی زندگی کی ساری باتیں

350/- آخری چٹان

آخری چٹان کی ساری باتیں
آخری چٹان کی ساری باتیں

150/- سوسائٹی

سوسائٹی کی ساری باتیں
سوسائٹی کی ساری باتیں

240/- سفید چتر

سفید چتر کی ساری باتیں
سفید چتر کی ساری باتیں

350/- شاپن

شاپن کی ساری باتیں
شاپن کی ساری باتیں

350/- منظم طرز

منظم طرز کی ساری باتیں
منظم طرز کی ساری باتیں

450/- خاک اور خون

خاک اور خون کی ساری باتیں
خاک اور خون کی ساری باتیں

350/- گیسٹ اور آگ

گیسٹ اور آگ کی ساری باتیں
گیسٹ اور آگ کی ساری باتیں

425/- قافلہ گار

قافلہ گار کی ساری باتیں
قافلہ گار کی ساری باتیں

350/- محمد بن قاسم

محمد بن قاسم کی ساری باتیں
محمد بن قاسم کی ساری باتیں

199/- پورن کے باقی

پورن کے باقی کی ساری باتیں
پورن کے باقی کی ساری باتیں

490/- اور تو کواٹھرت گئی

اور تو کواٹھرت گئی کی ساری باتیں
اور تو کواٹھرت گئی کی ساری باتیں

380/- کشمیر کا قافلہ

کشمیر کا قافلہ کی ساری باتیں
کشمیر کا قافلہ کی ساری باتیں

250/- داستانِ مجاہد

داستانِ مجاہد کی ساری باتیں
داستانِ مجاہد کی ساری باتیں

400/- پردہ کی درخت

پردہ کی درخت کی ساری باتیں
پردہ کی درخت کی ساری باتیں

350/- یوسف بن تاشفین

یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں
یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں

350/- آخری معرکہ

آخری معرکہ کی ساری باتیں
آخری معرکہ کی ساری باتیں

150/- ثقافت کی تلاش

ثقافت کی تلاش کی ساری باتیں
ثقافت کی تلاش کی ساری باتیں

475/- قیصر و کسریٰ

قیصر و کسریٰ کی ساری باتیں
قیصر و کسریٰ کی ساری باتیں

350/- یوسف بن تاشفین

یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں
یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں

350/- یوسف بن تاشفین

یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں
یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں

350/- یوسف بن تاشفین

یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں
یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں

350/- یوسف بن تاشفین

یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں
یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں

350/- یوسف بن تاشفین

یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں
یوسف بن تاشفین کی ساری باتیں

بے اختیار آنسو چھلکے لپٹیں۔ میڈم اس نے دس کا غبار چھٹ جانے کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے اپنے دس کی دھڑکیاں بھی تیز ہو رہی تھیں۔ یہ سن لینے کے بعد انجلا کو دوبارہ اپنا نام تبدیل کرنا پڑا اور وہ شبنم کی ماں تھی، اس کا تیس بھی بڑھنے لگا۔

تین چار منٹ تک شبنم کی سسکیاں ابھرتی رہیں پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سرد آہ بھر کر کہا۔ "میرے باپ نے انجلا سے شادی کی یہی ایک شرط رکھی تھی کہ وہ مسلمان ہو جائے، اس نے اپنے پیار کی خاطر وہ شرط قبول کر لی۔ وہ بڑے گھرانے کے ایک جاگیردار کی اکلوتی راج کمار تھی، بات بچپن تو جاگیر کے تمام ہندو، پنڈت اور پجاری میرے باپ کے دشمن بن گئے لیکن میری ماں نے دوراندیشی سے کام لیا، اس نے اپنے گھر والوں کو دوا کا نام دیا کہ کچھ حاسدوں نے غلط خبر اڑا دی ہے۔ جاگیردار نے فوری طور پر پنڈتوں سے مہورت نکلو کر اس کا رشتہ اپنے برابر والوں میں کر دیا، میری ماں خاموش رہی، خاموشی سے اپنے حصے کی دولت اور قیمتی زیورات جمع کرتی رہی پھر مرنے سے پہلے جسے تین رات پہلے وہ خاموشی سے اپنا سب دھن دولت سمیٹ کر انرپورٹ پہنچ گئی جہاں اس سے محبت کرنے والا پہلے سے موجود تھا۔ میرا باپ بھی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کے پاس بھی دولت کی فراوانی تھی۔ دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی دوسرے ملک میں جا کر زندگی بسر کریں گے۔" شبنم نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "میرے ماں باپ کو کسی واقعہ کار نے یہ مشورہ دیا تھا کہ لندن یا امریکا جانے کے بجائے فرانس کی طرف نکل جائیں۔ انہوں نے دوست کا مشورہ قبول کر لیا۔ شادی کے تین سال بعد میں بد نصیب اس دنیا میں آ گئی، میرے والدین بہت خوش تھے۔ دو سال بعد میرے والد ہمیں لے کر سویٹزر لینڈ آ گئے، انہوں نے فرانس جا کر جو کاروبار اختیار کیا وہ خوش قسمتی سے بے حد کامیاب رہا، والد صاحب نے ایک دو کمرے کا خوبصورت اپارٹمنٹ بیس میں بھی خرید لیا تھا، ان کا ارادہ تھا کہ میرے باپ کو بوجھنے کے بعد سوئزر لینڈ سے بیس شفٹ ہو جائیں گے اور شبنم سے بہت دور پرسکون زندگی گزاریں گے لیکن... قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔"

شبنم سانس لینے کے لیے دس کی بھر سہ آہ بھر کر اپنی کہانی کا درد بھرا افسانہ سنانے لگی۔
"اس وقت میری عمر سات سال تھی، میں سوئزر لینڈ

ایک لمحے کے لیے بیڈروم میں خاموشی خاری رہی پھر شبنم نے دس کی زبان میں کہا۔
"کیا آپ کو پیرس کے کسی فیشن شو میں انجلا نامی کوئی ماڈل پسند آتی تھی جسے آپ نے بطور خاص اس کی خوبصورتی پر فائس پر انعام بھی دیا تھا؟"
میڈم کی نظروں میں تجسس بھاگنے لگا، کچھ توقف سے بولی۔

"ہاں... مجھے وہ خوبصورت ہندوستانی ماڈل یاد ہے جس نے فیشن ماڈلنگ میں بہت ساری ماڈلز کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن تم انجلا کو کس طرح جانتی ہو؟"
"اس طرح کہ اسے اپنے شوہر کی دردناک موت کے بعد انجلا کا نام دوسری بار اختیار کرنا پڑا تھا۔" شبنم نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ "شاید اس لیے کہ وہ اگر دوبارہ انجم آرا کا نام اختیار رکھتی تو پھر اس کے اپنے بھی اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔ شاید اس کا انجام بھی اپنے شوہر کی موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتا۔"
میڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور حیرت سے شبنم کو دیکھتی رہی۔

"انجلا خوبصورت جسم کی مالک تھی شاید اسی لیے بہت جلد باپ ماڈل میں شمار ہونے لگی۔ دنیا میں ماڈلز کی زندگی بڑے فحاش بات سے بھر پوری ہے۔ اس کے چاہنے والے اس کو قریب سے ایک نظر دیکھنے کے لیے ترستے ہیں لیکن انجلا... وہ بد نصیب عورت ہر پینے کی رات اپنے بستر پر بھی چادر کی طرح روندی جاتی تھی۔ اس کے عوض اسے پوریا اس کے جسمانی حسن کو سہارنے والے خوبصورت تہلوں کے بجائے گندی گندی فحش گالیوں سے نوازتے تھے۔ وہ اس طرح بھیجی ہوئی جاتی تھی جس طرح شیر کے شکار کو اس کا پیٹ بھر جانے کے بعد کڑ گئے بھی بے دردی سے نوچتے کھوسٹے ہیں۔ جنگل میں صرف شیر، چیتوں اور لکڑ بھوس کا قانون چلتا ہے، مردار احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔" شبنم کی آواز رنہ رنہ گئی۔ "جب جسم اور روح کا رشتہ ٹوٹ جائے تو پھر مرد سے پر کیا کرتی ہے؟ اس کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہوتا۔ اس کی زبان بند ہوتی ہے، صرف روح آہ و بکا کرتی ہے جسے انسان کے کان سننے کی قوت نہیں رکھتے۔"
"تم تم انجلا کو کس طرح جانتی ہو۔؟" میڈم نے حیرت سے پوچھا۔

"میں انجلا کو نہیں... صرف انجم آرا کو جانتی ہوں جو میری معصوم ماں تھی۔" شبنم کی خوبصورت آنکھیں

کے ایک ایسے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں امیر کبیر لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کا شخص خواب دیکھا کرتے ہیں۔ میرے والد کو کاروباری سلسلے میں آس پاس کے مکوں کا سفر کرنا پڑتا تھا، اس لیے انہوں نے میرے لیے اسکول کے قریب ہی ایک بورڈنگ ہاؤس میں میرا بندہ بست کر دیا تھا۔ بیرون ملک کی غیر آلود فضا میں میری ماں کا حسن روز بروز نکھرنا جا رہا تھا، ایک بار کسی بے تکلف دوست نے مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر میری ماں بیرون ملک جاکر شوقیہ طور پر ہی ماڈلنگ شروع کر دے تو دو چار شو کے بعد ہی ٹاپ ماڈل میں شمار ہونے لگے گی۔ ایک ایک شو میں ہزاروں یورو کماسکتی ہے، میرے والدین نے اس مشورے کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔ انجلا سے انجم آراجنے کے بعد میری ماں نے اسلامی تعلیم میں بھی خاص دسترس حاصل کر لی تھی، وہ باہر نکلتی تو ہمیشہ حجاب کا استعمال کرتی جس کے سبب اس کے قدرتی حسن اور رنگ و روپ میں اور نکھار آ جاتا تھا، ایک بار میں نے اپنے والد کو ماں سے کہتے سنا تھا۔ ”انجم، تم تو شادی کے بعد دس گیارہ سال بڑی لگنے کے بجائے اور زیادہ کسن اور حسین ہوئی جا رہی ہو۔“ میں اس جملے کو سن کر وہاں سے ہٹ گئی تھی، ماں نے کیا جواب دیا، میں نے سننے کی کوشش نہیں کی لیکن میرے باپ نے جو کہا وہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔“

شبیم نے ایک لمحے رک کر درد بھری آواز میں اپنی کہانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”ان دنوں میرے والد میری ماں کے ساتھ لندن میں ایک کاروباری سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں ایک فائینو اسٹار ہوٹل میں پورا وی آئی پی سوٹ بک کرا رکھا تھا۔ وہ سفر میرے والد کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ جہاں انہیں ایک دوسرے بڑے اوز عیاش سرمایہ دار نے میری ماں کے سامنے اس کے وی آئی پی سوٹ میں مار دیا تھا، مارنے سے پہلے اس بے غیرت قاتل نے میرے والد کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بے بس کر دیا تھا۔ دو کمینہ میری ماں کو اس کے شوہر کے سامنے پرہیز کر کے اس کی شرافت کی دھجیاں اڑاتا رہا، اس کے دو نقاب پوش بد معاش بھی کمرے میں سائلنسر لگے بیٹھ کر اپنے کھڑے تھے۔ وہ حرامزادے بھی میری ماں کی عزت لٹنے کا تماشا دیکھتے رہے پھر انہوں نے اپنے حرامزادے، ملک کے اشارے پر میرے باپ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ میری ماں پر سکتے طاری ہو گئی، اس رات دونوں نقاب پوش بھی میری ماں کو شکاری کی طرح بھینٹوڑتے رہے۔ ان کے جانے سے پیشتر ان کا باس دوبارہ کمرے میں آیا۔ اس نے

سکراتے ہوئے میری ماں کے نیم بہت جسم پر وہ تصاویریں ڈال دیں جو نقاب پوشوں کے ساتھ اتاری گئی تھیں۔ یہ بھی حکم دیا گیا کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کا انجام بھی مرنے والے سے مختلف نہیں ہوگا۔ پھر وہ چلے گئے۔“ شبیم کی سسکیاں دوبارہ ابھرنے لگیں، میڈم اس کو دیکھتی رہی جب شبیم کے آنسو تھے تو اس نے پوچھا۔

”کیا اس بے غیرت کا نام بھی شیخ حامد تھا۔“ اس کے لہجے میں دنیا جہاں کی نفرتیں اور انتقامی جذبے بھل رہے تھے۔

”آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”پھر؟۔۔۔۔۔ تمہاری ماں نے کیا کیا؟۔۔۔۔۔؟“

”اسے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں چھوڑا گیا تھا۔“ شبیم نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ”اس نے میرے والد کی موت کو قتل ہی ظاہر کیا۔۔۔۔۔ کسی کا نام زبان پر نہیں لائی۔ پولیس والوں کو اس نے مفروضہ قاتلوں کے حلیے بھی غلط بتائے۔ ایک ماہ تک اسے لندن ہی میں رکنا پڑا، پولیس کی جانب سے کھینچ لسنے کے بعد وہ پہلی فزائیت سے سوسٹری لینڈ پہنچی۔ اس نے وہاں کے مکان کو فروخت کر دیا پھر وہ بیرون ملک دوبارہ انجلا بن گئی۔ کسی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد ہی اس نے اپنا نام غلط کرنے اور وقت گزارنے کی خاطر فیشن ماڈلنگ شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹاپ ماڈل میں شمار ہونے لگی۔ لوگ اسے خوش قسمت سمجھتے رہے۔ اس کے اندر کا زخم کوئی نہ دیکھ سکا۔ خود مجھے بھی ماں نے ہر اس موقع پر دے لے کر کوشش کی جب میں نے اس سے دوبارہ انجلا بننے کا سبب پوچھا۔ باپ کی قتل کی خبر میں اخبار اور ٹی وی پر بھی سن چکی تھی لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں آ سکا کہ میرا باپ جو پھر پیچ و پھڑ سے مردوں کی طرح مقابلہ کرنے کا عادی تھا۔ اسے قتل کیوں اور کس وجہ سے کیا گیا؟ پھر جب میری عمر بارہ سال ہوئی تو ایک روز۔۔۔۔۔ مجھے کال کی اور تمام اصلیتوں سے آگاہ کیا۔ اس نے رورور کر بھی کہا کہ وہ دہندہ بیرون ملک میں بھی اس کو کھٹولنے کی طرح استعمال کرتا رہا۔ اس روز اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اپنے باپ کے قاتل سے انتقام ضرور لوں جسے غالباً میرے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ میرے لیے میری ماں کی زندگی کی آخری کال تھی۔ اس لیے کہ دو روز بعد مجھے فی وی اور اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا کہ جیس کی پولیس نے میری ماں کو اس کے اپارٹمنٹ سے مردہ حالت میں خود اسی کی لٹا لٹا کر پڑا دیا تھا۔ شاید یہ جاننے کے بعد اس نے

پتہ میں کو خود اپنی موت کی اطلاع دی تھی۔ لاش کے قریب ہی ماں نے۔۔۔۔۔ میری زندگی کے تحفظ کی خاطر ایک تحریر بھی چھپی ہوئی تھی جس میں لکھا تھا۔ ”میں زندگی کے ہنگاموں سے غلبہ آور خود اپنی مرضی سے زہر کھا رہی ہوں، میری موت میں کسی کو ملوث نہ سمجھا جائے۔“

”غلط بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ میڈم نے ہونٹ چبائے۔ وہ تیزی سے کہا۔ ”میں ممکن ہے ہمارے مشترکہ دشمن نے اسے خود اسی نے اور تحریر لکھنے پر مجبور کیا ہو۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔۔۔۔۔“ شبیم نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ماں کی موت کے بعد میں نے بیرون ملک جانے کی غلطی نہیں کی، میں بینک سے رقم نکالنے کی تو فیصلہ نے مجھے بتایا کہ میرے اکاؤنٹ میں کسی انجمن نامی خاتون نے میں لاکھ یورو کا پیسہ آرڈر جمع کرایا تھا۔ میں وہ تمام رقم لے کر۔۔۔۔۔ سوسٹری لینڈ کو خیر باد کہہ کر فوری طور پر برلن چلی گئی۔ میرے پاس دوست کی گئی نہیں تھی۔ میں پانچ سال تک کسی مفروضہ مجرم کی طرح اپنے ٹھکانے شہروں شہروں بدلتی رہی پھر یہاں آ گئی اور خاصی دشواریوں کے بعد بالآخر اس ماں کے دفتر میں بحیثیت نیٹ فون آپریٹر کی آسانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جو میرے باپ اور میری ماں دونوں کو ڈس چکا ہے۔ اب مجھے اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے۔“

”آئی سی۔۔۔۔۔“ میڈم نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ”تم نے اس کی کمپنی میں ملازمت کیوں حاصل کی؟“

”اس شکاری کے افضل خان کی وجہ سے جو میرے والدین کے قاتل سے سب سے نزدیک رہتا ہے۔“ شبیم نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں اجازت چاہوں گی۔ جاتے جاتے یہ بھی مشورہ دوں گی کہ آپ بھی افضل خان سے محتاط رہیں۔ شیخ حامد کے ایک اشارے پر وہ خود آپ کو بھی قتل کر دینے کی حد تک جا سکتا ہے، وہ کچھ لگے اس کی آمد سب پھنسے ہوئے لیکن وہی ایک ایسا شخص ہے جو ہم سے دشمن کو سب سے آسانی سے ٹھکانے بھی لگا سکتا ہے۔“

شبیم کے جانے کے بعد اس رات میڈم بھی نہیں سوئی، نرس نے اسے نیند کا انجکشن بھی دیا لیکن وہ بھی زیادہ سو نہ سکتی تھی، والدین اس کے سوتے جاتے جاتے ذہن پر ایک

”افضل خان کے لیے میڈم رات کو جلد از جلد نرس

کرنے اور اسے بلیک میل کرنے کی خاطر کمرے کی خفیہ حالت میں اس کی شرمٹاک، جیاسوز اور نقش تصویریں حاصل کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا، شیخ حامد نے اسے یہ کام جلد از جلد نمائندہ کے حکم دیا تھا۔ ذاتی طور پر بھی وہ میڈم کا امیر تھا اور اس کی وصل کی لذتوں سے سرشار ہونے کے لیے بے چین تھا۔

تین روز سے وہ برابر اس کی خیریت دریافت کرنے اور جشن صحت منانے کے لیے اپنی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا، لیکن اسے کسی نہ کسی بہانے ٹالا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرحین اور زریہ کے ہاتھ میں آکر پراسرار طور پر نکل جانے کے سبب بگ باس کا غصہ عروج پر تھا، پانچ لاشوں کی کہانی نے اخبار کی زینت بن کر اس کے غصے کی شدت کو اور بھڑکا دیا تھا۔

اس وقت بھی بگ باس کی فرمائش کو جلد از جلد پورا کرنے کی خاطر وہ اپنے ذہن میں مختلف منصوبے بنا رہا تھا، لیاقت حسین نے درمیان میں آکر اگر میڈم روٹی کے انگوٹوں کا کام نہ بنایا ہوتا تو شاید یہ درد سہی بھی اس کے سر سے نکل جاتی۔ ہر چند کہ بگ باس نے کل کر اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ میڈم کو انگوٹا کرانے میں اسی کی کوشش کو دخل تھا لیکن افضل خان اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ ہوا کا رخ نہ بھانپ سکتا۔ بہر حال شبیم کی وجہ سے میڈم نے اس کے اپارٹمنٹ والی بات گوئی کر دی تھی ورنہ شاید حامد کا فعدہ حد سے ترز جاتا۔ میڈم کے سلسلے میں ایک الجھن یہ بھی درپیش تھی کہ وہ ذہنی ہونے کے بعد زیر علاج تھی، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو شاید افضل خان اسے ریٹو کلب یا کسی اور جگہ آتے جاتے وقت راستے سے بھی انگوٹا کر وہ سب کچھ کر گزرتا جو شیخ حامد کے علاوہ اس کی اپنی ولی خواہش بھی تھی لیکن موجودہ صورت میں وہ میڈم کو اس کی کوشش سے انگوٹا کرانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ مختلف راستوں پر غور کرنے میں مصروف تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ افضل خان نے نفرت سے فون سیٹ کو گھورا جس نے اس کی حیثیت کو ذمہ دار کیا تھا۔

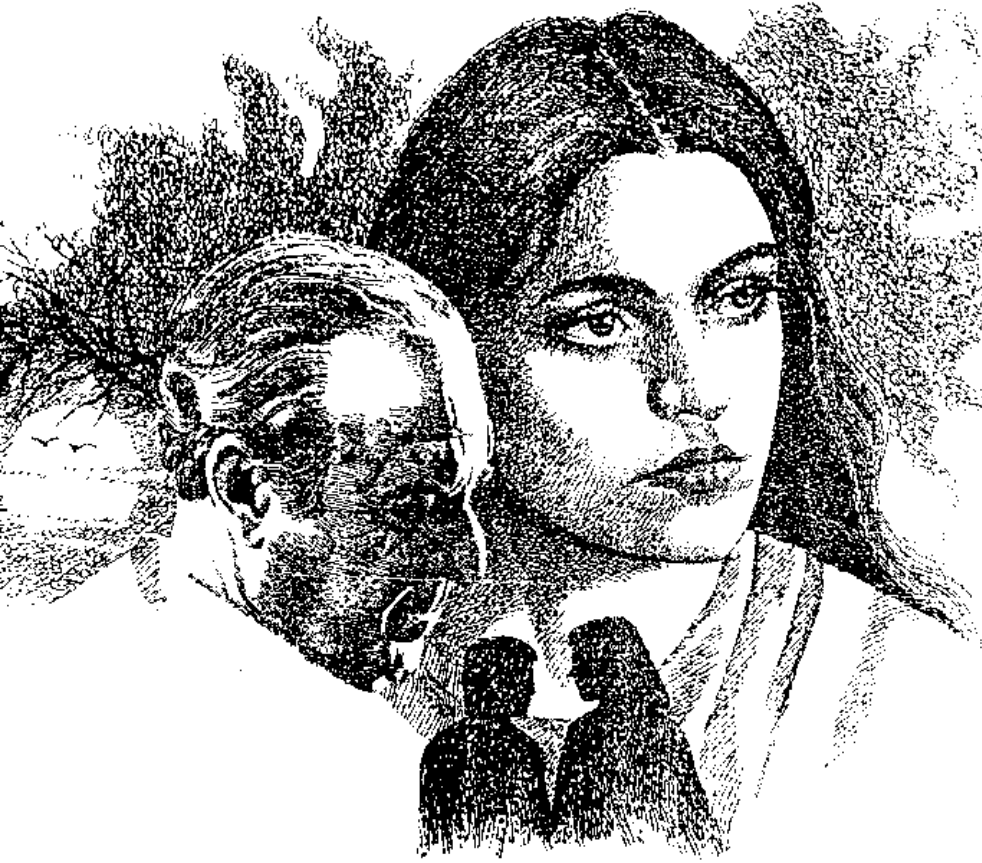
”ہیلو۔۔۔۔۔“ اس نے ریسپورڈ اٹھا کر سرد لہجے میں کہا۔

”افضل خان آن لائن۔۔۔۔۔“

”کیا بات ہے مائی ڈیئر۔۔۔۔۔ تم اس وقت کچھ الجھے ہوئے لگتے ہو؟“ دوسری جانب سے میڈم روٹی کی آواز سن کر اس کی ساری جھلاہٹ کا فور ہو گئی۔

”تمہارے ہی بارے میں غور کر رہا تھا۔“ اس نے یکدم اپنا لہجہ تبدیل کر لیا۔

<http://www.digestpk.com>



زادِ راہ

شخصیات

جب چاندی جیسی صورت اور سونے جیسی عمر آپ کی دسترس سے نکل کر محض خواب و خیال میں ڈھل جائے اور پھر... ایک طویل مدت کے بعد دامن خالی رہ جانے کا احساس جاگے تو انسان کس قدر بے بسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے، اس کا اندازہ دلوں میں مچھکی لیتی اس تحریر کو پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔

ماضی کی خوشگوار یادوں میں تم ایک سے عاشق کا فسانہ

شب بے شب کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بجے
تھے۔ ہم یہ دم وقتی شام کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ نیم
سختی پر اترنے والے پرندوں کا شور بڑھ گیا تھا مگر یہ
شہر نہیں لگ رہا تھا۔

پرندے اسے ہمیشہ سے پسند تھے اور ان کی موسیقی
ریز چکار۔ بچپن میں لمبل، مینا اور کبوتر بڑے شوق سے پانا
کرتا تھا۔ اب لڑکپن نہیں تھا، مگر پرندوں سے آغوش کی دلچسپی
ابھی تک برقرار تھی۔ اس دلچسپی اور لگاؤ کا سبب کیا تھا؟ اس پر

موقع ملے گا۔ وہ اپنی پیاس بجھانے کے بعد فحش تصویروں
کے دو سیٹ تیار کرنے کا منصوبہ بھی بنا چکا تھا۔ ایک اپنے لیے
تاکہ روٹی بک باس کے علاوہ اس کی بانسری کی لے پر بھی
ناچنے پر مجبور رہے۔ اور...

ٹھیک اسی وقت ڈی ایس بی سراج گھر جانے کی
تیار کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے منہ بنا کر
ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو... سراج اسپیکنگ۔“

”لیاقت بول رہا ہوں۔“ دوسری جانب سے لیاقت
حسین کی آواز ابھری۔ ”ایک بار میں نے میڈم روٹی کی
عزت بجا کر نیکی کمائی تھی، اس وقت یہ ڈسے داری آپ کو
سوئپ رہا ہوں۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔“

”تم کہاں سے بول رہے ہو؟“ سراج کو لیاقت حسین
کا انداز گفتگو کچھ بدلا بدلا سا لگا، جیسے وہ خواب کی حالت میں
زبردستی بول رہا ہو۔

”سراج کل ہوئی، کمر انمبر چار سو آٹھ میں افضل خان
نے دھوکے سے میڈم کو شراب میں بے ہوشی کی دوا پلا دی
ہے۔ بیہ سنت بعد وہ بے ہوشی کی حالت سے دو چار ہو جائے
گی پھر افضل خان شیخ حامد کے حکم پر نہ صرف اس کے ساتھ
منہ کالا کرے گا بلکہ اس کی فحش اور بے ہودہ تصاویر بنا کر
زندگی بھر اس کی پاکیزگی کو پامال کرتا رہے گا۔ یہ کام میں
آپ کو سوئپ رہا ہوں۔ وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک
ایسی نیکی کر گزریں جس کا ثواب آپ کو دنیا میں بھی ملے گا اور
آخرت میں بھی۔“

”لیکن تمہیں یہ اطلاعات کہاں...“

”خدا حافظ! مختصر جواب کے بعد لائن کاٹ دی گئی۔
سراج بوکھلا کر رہ گیا لیکن پھر اسے لیاقت حسین کی
پچھلے دو موقعوں پر کبھی جانے والی عجب اور حیرت انگیز باتیں
یاد آئیں تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ اس
نے اسی وقت ایک انسپکٹر کو فون کر کے فوری طور پر تاج محل
ہوٹل پہنچنے کے آرڈر جاری کیے پھر خود بھی بڑی جگت میں اپنی
کار میں بیچ کر تیز رفتاری سے تاج محل ہوٹل کی طرف روانہ
ہو گیا۔ اس کے ذہن میں لیاقت حسین کی شخصیت کا وہ
پراسرار پہلو اجاگر ہو رہا تھا جس کی ابھی تک وہ کوئی توجیہ
تلاش نہیں کر سکا تھا۔

اس یو اس آر اور نچر آئینہ سلسلے کے مزید

واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

محض ایک پیگ پینے کے بعد اسے اپنے ذہن پر بھاری پن
بڑھتا کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ ایسی صورت میں کہ جب اس
نے ہوٹل کی سیل بھی خود اپنے ہاتھ سے توڑی تھی، پیگ بھی خود
ہی تیار کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک پیگ سے اسے بھی اتنا شمار
نہیں ہوا تھا۔

”کس سوچ میں تم ہو گئیں سوئٹ ہارٹ۔“ افضل
خان نے دوبارہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر ہلکے
سے دباتے ہوئے پوچھا۔ ویسے وہ یہ دیکھ کر اندر ہی اندر خوش
ہو رہا تھا کہ سیل بند ہوٹل کے اندر جس بے ہوشی کی دوا کی
ملاوٹ کی گئی تھی وہ اپنا اثر دکھانا شروع کر چکی تھی۔

”کچھ بھی نہیں...“ روٹی نے خود کو سنبھالتے ہوئے
مسکرا کر کہا۔ ”یہ سوچ رہی تھی کہ تم نے میری خاطر کتنا اہتمام
کر ڈالا ہے۔“

دروازے پر دستک ہوئی تو افضل خان اٹھ کر
دوسرے صوفے پر چلا گیا پھر اس کے ”کم ان“ کہنے پر ڈنر
لا کر دوسری کھڑکی کے قریب جی ٹیبل پر سرود کر دیا گیا۔ ہوٹل
کے کارندوں کے جانے کے بعد افضل خان نے اپنے اور
روٹی کے لیے الگ بوتلوں سے دو پیگ تیار کیے تو روٹی نے
کہا۔

”میرا خیال ہے کہ فی الحال میرے لیے ایک پیگ ہی
کافی تھا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈیزر۔“ افضل خان نے مسکرا کر
اس کی طرف دیکھا۔ ”کھانے کے دوران میں چھوٹے
چھوٹے گھونٹ لیتے رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ کم آن
ڈیزر، آج میری خوشی کی خاطر میری درخواست قبول کر لو۔
آئندہ میں مجبور نہیں کروں گا۔“

روٹی نے مسکراتے پر اکتفا کیا لیکن اس نے طے کر لیا
تھا کہ وہ بہت احتیاط سے کام لے گی۔ اس کے ذہن پر طاری
ہونے والی ہلکی مگر پھول پھول سی غنودگی بھی اسے سنبھل کر
قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس
غنودگی کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔

کھانے کی میز پر بیٹھ کر اس نے احتیاط سے کھانا
شروع کیا، افضل خان ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی
دے رہا تھا، بار بار روٹی کو ایک چھوٹا گھونٹ لینے پر اکسارہا
تھا۔ ویسے اس کا تجربہ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ بے
ہوشی کی دوا جس مقدار میں روٹی کے جسم میں پہنچ گئی تھی وہ
اگلے پندرہ منٹ کے اندر اندر اسے بالکل ہی سن کر دے گی
جس کے بعد اسے اس ناگن کا سارا زہر کشید کرنے کا پورا پورا

<http://www.digestpk.com>

کرنے ہی والا تھا۔ نوکری مل گئی ہے۔ اگلے ہفتے مجھے جانا ہوگا۔ اتنا کہہ کر وہ بے صبری انداز میں ہنس پڑا۔

”ہنسے کیوں؟“ سلطانہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس کی ہنسی میں چھپا کرب کچھ اور نمایاں ہو گیا۔ ملازمت کا پروانہ ملا تھا تو یونہی خود بخود ایک خیال آیا تھا کہ وہاں جاؤں گا، ایک اچھا سا گھر بناؤں گا اور پھر۔۔۔ اس نے رک کر شکستہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھا۔

”اور پھر ہم دونوں اس میں رہیں گے۔ کتنی احسان بات ہے۔ ہے نا؟“

سلطانہ کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ نے دم توڑا۔

چند لمحے بعد سلطانہ نے کہا۔ ”وہاں رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے؟“

”ابھی نہیں۔ لیکن ہو جائے گا۔“

سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لی، مغموم نظروں سے اسے دیکھا۔ ”شہاب! سورج ڈوب رہا ہے۔“

”ہاں۔“

”ابھی ٹھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔“

”ہاں۔“ شہاب کے سینے میں کوئی شے جھجھک کر ٹوٹ گئی۔ ”ہاں، بہت گہرا اندھیرا ہو جائے گا۔ پھر پتا نہیں کب اجالا ہو۔ ہو بھی کہ نہ ہو۔“

سلطانہ کے ہونٹ لرزے۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر چپ ہو گئی۔ وہ بھی چپ رہا۔ حالانکہ ان کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا اور جی بھی چاہتا تھا کہ ڈھیر ساری باتیں کر لیں۔ دل کی حسرت نکال لیں کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ کچھ دیر بعد وہ پھڑپھڑ جائیں گے، اپنے اپنے راستوں پر چلے جائیں گے۔ اس کے بعد کیا ہو، کون جانتا ہے۔ پھر ملاقات ہو نہ ہو۔ ہو سکتا ہے، پھر بھی سامنا ہو اور عمر گزر جائے۔ تو پھر کیوں نہ ان چند لمحوں کو جو انہیں ملے ہیں، امر کر لیں۔ مگر باوجود خواہش کے کچھ نہ کہہ سکے۔ اپنی اپنی ردا کے دکھ میں لپٹے چپ چاپ کھڑے رہے اور ڈوبے سورج کو یوں دیکھتے رہے جیسے سورج نہیں، وہ خود ڈوب رہے ہوں۔

یہ ایک سلطانہ نے کہا۔ ”اچھا شہاب! میں چلتی ہوں۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”اچھا۔“ اس نے شکستہ آواز میں کہا۔

سلطانہ سیزھوں کی جانب بڑھی۔ ابھی چند قدم ہی چلتی تھی کہ وہ اس نے کہا۔

”سلطانہ!“

وہ رک کر گھومی۔ ”کہو۔۔۔“

”بس چند لمحوں کی کھڑی رہو۔“ اس نے کرب میں ڈوبی آواز میں کہا۔

”اچھا۔۔۔“

وہ چند قدم کے فاصلے پر سامنے کھڑی تھی۔ کاسی رنگ کے شلوار سوٹ میں لمبوس۔ ڈوبے سورج کی تاریکی کرنوں نے اس کے گرد ایک بالہ بنا دیا تھا۔ اس ہالے کے درمیان وہ آکاش سے اتنی کسی اپسرا کی طرح نظر آتی تھی۔ بلور کی طرح سنور اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ترشے ہوئے نین نقشب، پتھریوں جیسے ہونٹ اور گہرے سیاہ بال۔ شہاب اسے دیکھتا رہا۔ اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے، تمام موجودات و مظاہر سے بے خبر ہو کر یوں دیکھتا رہا جیسے اس منظر کو اپنے دل میں اتار لیتا چاہتا ہو، اپنی روح میں جذب کر لیتا چاہتا ہو۔ لمحے ایک ایک کر کے گزرے لیکن وہ چند لمحے بے حد افسوس تھے۔ اس کی زندگی کا حاصل۔ اب یہی لمحے اس کا زادراہ ہیں، اس کی میساکھی کہ انہی کے سہارے اسے اپنی زندگی گزار رہی ہے۔

وہ چند لمحے بے آواز گزر گئے تو اس نے معافی کہا۔

”اب جاؤ۔“

سلطانہ افسردگی سے مسکرائی، آگے بڑھی، مگر زینے کے پاس پہنچ کر پھر رک گئی۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”اپنا خیال رکھنا۔“

☆ ☆ ☆

اگلے ہفتے اس نے اس شہر کو خیر باد کہہ دیا جہاں زندگی کے ان گنت شب و روز گزرے تھے۔ پہلے گاؤں جا کر والدین سے ملا، پھر نین سوہیل و دروابع اس چھوٹے شہر کا رخ کیا جہاں ملازمت ملی تھی۔ نیا شہر، نئے لوگ اور نیا ماحول۔ ابتدا میں اسے بڑی وحشت ہوئی۔ تنہائی اور بے گھر ہونے کا احساس گہرے رہتا تھا مگر بتدریج اس نے اس نئے ماحول کو قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ ایک معمول بھی بن گیا۔ دفتر، گھر۔ چند ایک دوست بن گئے اور وقت بہت سست روی سے ہی سہی گزرنے لگا۔

اکبری باجی سے رابطہ تھا۔ ان کے خط سے معلوم ہوا کہ سلطانہ کی شادی ہو گئی ہے۔ پھر یہ اعلان بھی ملی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سوئٹن چلی گئی ہے۔

چند ماہ بعد اس کی اپنی شادی بھی ہو گئی۔ اس کی بیوی

فاسی تعلیم یافتہ تھی۔ رنگ روپ بھی اچھا تھا اور گھر گھر ہستی بھی جانتی تھی۔ مگر دونوں کے درمیان منافست، ہم آہنگی اور قربت پیدا نہ ہو سکی۔ کچھ تو اس بنا پر کہ اس کی بیوی شاکرہ کا بہنوئی تھا جس میں خود پسندی کا پہلو نمایاں تھا۔ بنیادی سوچ پر اس میں خود اپنے آپ سے محبت کرنے کی خور زیادہ تھی اور جو اس سبب بھی کہ وہ خود اپنے آپ کو شاکرہ کی جانب محبت کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ سلطانہ چلی گئی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ مگر وہ شام اس کے تصور میں زندہ بھی، آخری اجابت کی شام۔ اداس، پرسکوت شام۔ ڈوبتا ہوا سورج اور تاریکی رنوں کے ہالے میں گھری ہوئی سلطانہ اور اس کے بوسے نکلے ہوئے آخری الفاظ ”اپنا خیال رکھنا“ کو ان گنت شب و روز گزر چکے تھے مگر وہ منظر جوں کا توں اس کے تصور میں زندہ تھا۔ اس پر وقت کی گرد نہیں جی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ دہانتا بھی نہیں تھا کہ وہ منظر بائیس کے سیاہ خانوں میں گم ہو جائے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی آس، کوئی خوشی حتیٰ کہ کوئی شکوہ بھی نہیں۔ رلے دوسے کے بس وہ ایک منظر ہی تو تھا اس کے پاس۔ اس کی کل پونجی، اس کی متاع حیات، اس کا زادراہ کہ اس کے سہارے اسے اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ چنانچہ وہ ہر حال میں اس شام کو اپنے احساس، اپنے تصور میں زندہ رکھتا چاہتا تھا۔

نہیں وہ ایک عظیم یافتہ اور باشعور آدمی تھا۔ زندگی کی قیمتوں کو، خواہ وہ سچ ہوں یا شیریں، قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اپنی اخلاقی ذمہ داری کو پہچانتا تھا۔ چنانچہ باوصف اس کے کہ اس کے دل میں شاکرہ کے لیے کوئی محبت نہیں تھی، اس نے اسے شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے خفیف سا اشارہ بھی نہیں دیا کہ اس کے دل کے بگڑنے میں کسی اور کی تصویر آویزاں ہے۔ اپنی ذمہ داریاں نبھانے اور اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کی مگر کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ فاصلہ بڑھتا گیا۔ دھیرے دھیرے دونوں نے اپنے لیے الگ الگ ایک غیر مرئی دنیا تخلیق کر لی اور اس میں گم ہو گئے۔ ایک ہی جھپٹ کے نیچے رہتے تھے مگر اس طرح گویا دونوں کے درمیان ٹھنڈی رکی شرمائی ہو۔ نہ وہ شاکرہ کے معاملات میں دخل دیتا تھا اور نہ شاکرہ اس کی مصروفیات میں مغل ہوئی۔ اکثر وہ اپنے میکے چلے جاتی۔ اتنی ہی وگزار کر واپس آتی لیکن اسے کوئی شکایت نہ تھی۔

وقت کی اٹھویں میں شب و روز کی تسبیح گردش کرتی تھی۔ مینے، سان۔ دھیرے دھیرے بہت کچھ بدل

سادگی

ایک سردار ٹی وی خریدنے گیا۔ دکاندار نے ایک ٹی وی دکھایا۔

”سر، یہ لے لیں اس کا ریسیٹنگ کے کوئے سے سی پیٹل پکڑ لیتا ہے۔“ کچھ دنوں بعد سردار ٹی وی واپس کرنے آ گیا۔

دکاندار نے کہا۔ ”سر، کیا خرابی ہے؟“

سردار نے کہا۔ ”خرابی تو کوئی نہیں ہے بس ہندو بار بار گیس کی کٹڑ پر جائے تو اچھا نہیں لگتا۔“

☆☆☆☆☆

لاعلاج

ڈاکٹر۔ ”آپ کے شوہر ٹھیک ہو سکتے ہیں اگر آپ ان کا خیال رکھیں، فیشن نہ دیں، ٹرائی نہ کریں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔“

شوہر۔ ”ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

بیوی۔ ”لاعلاج ہو تم۔“

☆☆☆☆☆

گیا۔ چہرے، مزاج، قدریں۔ زندگی جو اس کے بچپن میں ایک نرم روئندی کی طرح بہتی تھی، اب ایک تیز اور سرکش آبشار کے مانند بھاگنے لگی۔ وہ زندگی اور وقت کے ساتھ نہیں چل سکا بلکہ پیچھے رہ گیا۔ اتنا پیچھے کہ اس لمحے سے آگے بڑھ ہی نہیں سکا۔ جب اس نے آخری بار سلطانہ کو شام کے تاریکی دھندلکے میں دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک اسی لمحے میں زندہ تھا۔ سلطانہ سامنے کھڑی تھی اور وہ اپنے آپ سے غافل ہو کر سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور شام رفتہ رفتہ ڈوب رہی تھی۔

مگر اسے کوئی ملال نہیں تھا۔ نہ پچھتاوا اور نہ ہی کوئی شکوہ۔ جو کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے، ٹھیک ہے۔ شکایت کیوں اور کس سے؟ ایک زندگی ہی تو گزار رہی ہے، گزر جائے گی۔ چنانچہ وہ زیست کرتا رہا۔ سلطانہ کے بارے میں کبھی کوئی اطلاع مل جاتی تھی، کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ معلوم ہوا کہ کئی سال سویڈن میں گزارنے کے بعد اس کے شوہر کا تادمہ پہلے ناروے اور پھر افریقہ کے کسی ملک میں ہو گیا تھا۔ وہاں سے پھر وہ انگلینڈ آئی اور چند سال وہاں خدمات انجام دینے کے بعد اس کے شوہر نے کچھ وجوہ کی بنا پر ملازمت چھوڑ دی اور انگلینڈ میں مستقل انکنت اختیار کر لی۔ اس کے بعد اطلاع

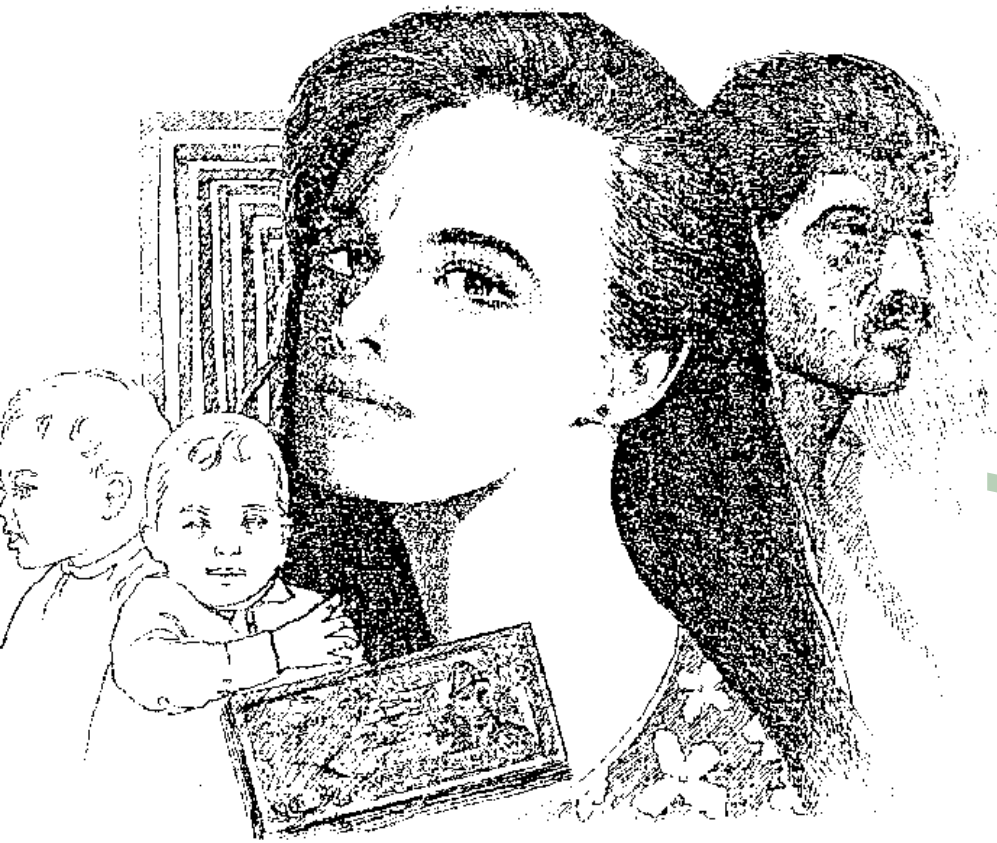
ملنے کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا۔
پچیس سال گزر گئے۔ ان گزرے ماہ و سال نے اپنا خراج وصول کیا۔ وہ جو بھی بڑا وجہ، صحت مند اور زندگی سے بھرپور تھا، دیر سے دیر سے خود اپنا سایہ بن گیا۔ کوئی مستعمل ہوئے، بالوں میں چاندی اتر آئی۔ عمر نے ساتھ کے دروازے پر دستک دی تو انحطاط اور بھی بڑھا۔ حتیٰ کہ اسے چلنے پھرنے کے لیے بھی کبھی چھڑی کے سہارے کی ضرورت بھی پڑنے لگی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ زندگی جیسی بھی گزری، بری نہیں گزری۔ گو اسے سب کچھ نہیں ملا۔ پھر بھی جو کچھ ملا کچھ ایسا کم بھی نہ تھا مگر اطمینان کے باوجود پچھلے کچھ برسوں سے ایک خواہش، ایک آرزو اس کے دل میں سر ابھارنے لگی تھی۔ سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ کس شہر میں رہتی تھی؟ اس کے بچے کیسے ہیں؟ جب بھی سلطانہ کا خیال آتا، دل میں ایک حسرت سراٹھانے لگتی۔ برسوں پہلے کا وہ منظر آنکھوں میں منعکس ہو جاتا اور اس کی آواز کانوں میں گونجتی۔
”اپنا خیال رکھنا۔“

وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے مگر یہ سچ ہے کہ اس کے دل میں سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش نے جنم لیا تھا اور بالکل اسی طرح جنم لیا تھا جیسے اونچے پہاڑوں کے درمیان چھپی گہری گھاٹیوں میں خود رو گھاس خود بخود اگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے۔ بالکل غیر محسوس طور پر اس کی یہ آرزو بھی جتنے جتنے بڑھتی اور شدید ہوتی گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی۔ آخر کیوں؟ لیکن وہ سمجھ نہ پاتا۔ شاید سبب یہ ہو کہ زندگی کی شام سر پر تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس احساس نے کہ اب غروب میں شاید کچھ وقت نہیں ہے، اس کے من میں اس قہقہے کو ابھارا تھا کہ وہ ایک بار پھر سلطانہ کو دیکھ لے۔ ایک بار اور اس کی میٹھی آواز سن لے، پھر اسے اطمینان ہو جائے گا۔ دل کی حسرت نکل جائے گی اور اسے محرومی کا احساس نہیں رہے گا مگر یہ سوچ کر بھی کبھی اسے ہچکچاتا اور ملال ہوتا کہ اس حسرت کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ سلطانہ بہت دور انگلستان میں بیٹھی ہے۔ اپنے گھر بار میں مگن ہے۔ عرصے سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر اس صورت میں اس سے ملاقات کا کیا امکان ہے؟ نہیں، اب یہ ممکن نہیں۔ شاید یہ حسرت اصرار ہی رہے گی اور سورج غروب ہو جائے گا۔ تاہم جب وہ اپنے دل کو ٹھونکتا تو محسوس کرتا کہ اگر سلطانہ سے پھر کبھی سامنا نہ ہو تو اسے قسمت سے کچھ ایسی زیادہ شکایت نہ ہوگی۔ اس کے لیے اتنا اطمینان کافی ہے کہ سلطانہ

جہاں بھی ہے، تو اسے پورا پورا ملے گا۔
لیکن جب اکبری باجی نے کیا کہا کہ سلطانہ سے ملے گئے؟ تو اس کے پیروں تلے سے گویا زمین سرک گئی۔ اسے اپنے پرانے شہر میں اتفاقاً یہ طور پر ایک کام پر مگن تھا چنانچہ اسے تین سو میل کا سفر کرنا پڑا۔ اس بار اس کی آرزو برسوں بعد ہوئی تھی اور یہ دیکھ کر اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ شہر کافی حد تک بدل گیا تھا۔ ان گنت نئی نئی عمارتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ پبلک پارک جو پہلے بہت خوبصورت اور وسیع تھا، نصف سے زیادہ غائب ہو گیا تھا۔ گندکی بہت زیادہ مگنی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر جہازیں بہت زیادہ تھیں اور شور اتنا تھا کہ کان پر ڈی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح چند دن گزارے اور مسلسل ان بچے دنوں کو یاد کیا جب یہ شہر بہت خوبصورت صاف ستھرا اور پرسکون ہوا کرتا تھا۔ لیکن گئے دنوں نے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ نہ صرف انسانوں سے بلکہ آبادیوں سے بھی۔ اب انسانوں کے پاس محبت اور محرومی نہیں رہی تھی اور آباؤ بایاں سکون اور تحفظ کی ضمانت سے محروم ہو گئی تھیں۔ شام کی گاڑی سے اس کی واپسی تھی۔ صبح وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کباب، سمو سے اور اس کا پسندیدہ مین کا کھانا۔ ابھی چائے پی لی رہا تھا کہ معا اکبری باجی نے کہا۔
”شہاب! سلطانہ سے ملو گے؟“
لیکن اسے یوں لگا جیسے زمین پیروں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔ ہاتھ اس بری طرح کانپا کہ چائے چھلک گئی۔ اس نے غلٹ سے پیالی میز پر رکھی اور شہاب کو اکبری باجی کو دیکھ۔
”سلطانہ سے؟“
”ہاں۔۔۔۔۔“
”مگر وہ۔۔۔۔۔“
”آج کل وہ یہیں ہے۔ عزیزوں سے ملنے آتی ہے۔ اب شاید دو چار دن میں واپس جانے والی ہے۔“
”مگر اسے کیا علم کہ میں یہاں ہوں؟“
”میں نے بتایا تھا۔ پرسوں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“
شہاب چند لمحے چپ بیٹھا رہا اور بے یقینی سے اکبری باجی کو دیکھتا رہا پھر اس نے پیالی اٹھائی اور چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ دل کی شوریدہ سرد دھڑکنوں اور اعصابی انتشار پر قابو پانے کے لیے اسے چند منٹ کی مہلت درکار تھی۔ بات منظر کے اس نے سُریت جلائی۔ ایک کس لیا، پھر زور سے

سانس لے کر بولا۔
”ٹھیک تو ہے وہ۔۔۔۔۔؟“
”ہاں۔۔۔۔۔“
چند ثانیے چپ رہ کر اس نے کہا۔ ”اب تو کافی عمر ہوئی ہوئی اس کی۔“
اکبری باجی زور سے منہیں۔ ”لو۔۔۔۔۔ کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم بھی۔۔۔۔۔ برسوں تزر گئے۔ تم بوڑھے ہو گئے، یہ سب کچھ پر بھی لکیریں پڑ گئیں۔ تو کیا، ابھی تک جوانی رہی ہے؟“
وہ جھنجھپ کر مسکرایا۔ ”ہاں خیر، یہ تو ہے۔ پینتیس چھتیس برس تو ہو گئے اسے باہر لگے ہوئے۔“
”مگر باجی! میں تو آج شام کی ٹرین سے واپس جا رہا ہوں۔“
”تو کیا ہوا؟ جانے سے پہلے چند منٹ کے لیے مل لو۔“
”لیکن کیا یہ مناسب ہوگا؟“
”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ ممکن ہے وہ پسند نہ کرے۔“
”ارے نہیں۔“ اکبری باجی مسکرا کر کہنے لگیں۔ ”میں نے تمہارا ذکر کیا تو درحقیقت تمہارے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ تمہاری خیریت پوچھتی رہی۔ جب میں نے ذکر کیا کہ تم ایک دو دن میں واپس جانے والے ہو تو اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔“
”اچھا۔۔۔۔۔“ اس کے دل کی دھڑکن دفعتاً بڑھ گئی۔
”میں نے کیا خواہش ظاہر کی؟“
”ہاں۔۔۔۔۔ کہنے لگی، میں چند دن میں واپس چلی جاؤں گی۔ پھر یوں جانے کبھی ایسا اتفاق ہو نہ ہو۔ لہذا چند منٹ کے لیے مل لوں۔ خیریت پوچھ لوں۔ پھر کہنے لگی کہ ایک نظر شہاب کو دیکھنے کے لیے بہت جی چاہتا ہے۔“ اکبری باجی ریس، پھر بولیں۔ ”میں نے آج شام کو اسے چائے پر بلایا ہے۔ تم بھی آ جاؤ اور چند منٹ کے لیے ملاقات کر لیتا۔“
وہ حیرت اور بے یقینی کے حصار میں گھرا بیٹھا تھا۔ سنا نہ تے ایک بار پھر ملاقات ہو سکتی ہے۔ ایک بار پھر وہ اس کی سن مٹوئی صورت دیکھ سکتا ہے اور اس کی آواز کی جھڑپ سن سکتا ہے۔ خدا یا، یہ کیسا عجیب اتفاق ہے؟ اس نے اس سے اس کی اور اضطرابی حالت میں آنکھیں بند کر لیں۔ پچیس سال بعد وہ منظر سامنے آ گیا جو اس کی زندگی کی کل جمع پونجی تھا۔ جس کے سہارے اس نے عمر بھر

کا سفر طے کیا تھا۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ سلطانہ سامنے طہری ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ پورا منظر، اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ۔ سلطانہ کا سراپا، اس کا خوبصورت چہرہ، اس کی متور آنکھیں اور۔۔۔۔۔ اس نے اضطرابی حالت میں ایک اور سُریت جلائی۔
”تم نے جواب نہیں دیا۔“ اکبری باجی نے پوچھا۔
”خیر، یہ تو ٹھیک ہے کہ چند منٹ کے لیے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ آخر کار اس نے کہا۔ ”میں آ جاؤں گا۔“
مگر جب وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اطلاع دی کہ سلطانہ سات بجے تک آئے گی۔ اس نے کہا کہ وہ اوپر چھت پر جا رہا ہے۔ جب سلطانہ آئے گی تو نیچے آ جائے گا۔ چھت پر پہنچا تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ برسوں پہلے اسی چھت پر وہ سلطانہ سے آخری بار ملا تھا۔ گو چھت وہی تھی مگر اب چند تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ ارد گرد کی بلند عمارتیں مٹی کی تھیں۔ مٹی میں استادہ نیم کا درخت بڑھ کر اب چھت سے بھی اوپر نکل گیا تھا اور اس کی گھنی شاخوں نے نصف چھت کو ڈھانپ لیا تھا۔ ایک اور تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ اکبری باجی نے چھت پر ایک کمر بنوا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر حیرت اور تاسف سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ یہ تبدیلیاں اسے اچھی نہیں لگی تھیں۔ ایک خلش اور پچھتاوے نے دل میں چنگلی لی تھی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی کوئی عزیز بٹھے اس سے چھین لی گئی ہو۔ مگر ازم ایک شے تو ضرور چھین گئی تھی۔ ڈوبتا ہوا سورج جیسے نیم کی گھنی شاخوں نے اب مغربی افق میں چھپا لیا تھا۔
اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بجنے میں کچھ ہی دیر رہی تھی۔ وہ۔۔۔۔۔ حائل کھڑا ہوا اور اضطرابی انداز میں چھت پر پہنچنے لگا۔ اس خیال نے کہ کچھ ہی دیر میں سلطانہ آنے والی ہے، اس کے دل میں بیچلاؤ اور تذبذب کی کیفیت پیدا کر دی گئی۔ ابھی سلطانہ آئے گی تو کیسا لگے گا؟ کبھی محسوس ہوگا؟ سلطانہ کیا کہے گی؟ وہ کیا کہے گا؟ اس نے چشم تصور سے اس لمحے کو دیکھنے کی کوشش کی جب وہ ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ سلطانہ اور وہ۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کے روبرو۔ تقریباً پچیس سال بعد۔ خدا یا، کیا ہوگا؟ دو لمحہ قیامت سے کہو نہ ہوگا۔
اس نے میزاری سے چند قدم اٹھائے۔ پھر بکا ایک دیر سے سے ہٹا۔ مدہ ہو گئی۔ ارے بھی اس میں اس قدر عجیب بات کی کیا بات ہے؟ وہ کوئی نو جوان لڑکا لڑکی تو ہوا ہی



پرایا مال

منظر امیال

معاشرے میں یہ رویہ بیت عام ہے کہ... ”رام رام چینا، پرایا مال اپنا...“
سنگریہ پرایا مال پر ایک کوراں نہیں آتا... کچھ لوگ بدپنمی کا شکار
ہو جاتے ہیں... انہیں بھی کچھ ایسی ہی مشکل درپیش تھی اور پھر...
ایک روز جب انہوں نے رام رام چینا کی مالا توڑ ڈالی تو مشکل آسان
ہو گئی۔

مرد قربان کے بندوں میں سے ایک پر غلوں جو کہہ سکتی تھا

اظہر اور اس کی بیوی تنہا کے درمیان ایک معاہدہ
سے پڑ گیا تھا۔
معاہدہ یہ تھا کہ خاندان کے کسی بچے کو گود نہیں لیا
جائے۔ چاہے وہ خاندان ستیم کا ہو یا ظہیر کا کیونکہ خاندان
دو بچے کے باوجود ہی گلی گلی کھڑا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ باہر سے بچہ کہاں سے لایا جائے؟
ایسے بارے تو تھے لیکن ان کی شرائط بہت لمبی
تھیں۔ ہزار قسم کی قانونی پیچیدگیاں۔ اب

وہ ایک عالم وحشت میں کمرے سے باہر آیا اور شش
ونچ کے عالم میں سوچنے لگا، کیا کرے؟ سلطانہ کو دیکھے گا تو
اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ سلطانہ جو پچیس سال سے
اس کے تصور میں رہتی ہے، اس کی اپنی ہے۔ جبکہ یہ سلطانہ
پرانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس پرانی سلطانہ کو دیکھے تو اس
کی اپنی سلطانہ مر جائے۔ ہاں، یقیناً وہ مر جائے گی۔ کیا وہ
اس کی موت کو برداشت کر سکے گا؟ کیا اس صدمے کو جھیل
سکے گا؟ نہیں، بہت مشکل ہے یہ۔ کڑا امتحان ہے۔ وہ اس
سلطانہ کو کفن میں نہیں لپیٹ سکتا۔ وہ اسے زندہ رکھے گا کہ اس
ایک جوان سال، دلکش اور حیات افروز شہیدہ، کے سہارے
ہی تو اس نے شب و روز کا دکھ بھرا سفر طے کیا ہے۔ وہ شہیدہ
اس کا کل سرمایہ ہے، اس کی بیساکھی ہے، اس کا زادہ۔ اگر
وہ شہیدہ مر گئی تو زندگی کے باقی دن کیسے گزارے گا؟
تو پھر کیا کرے؟

کیا اپنا زادہ اہل جائے دے؟

اس نے بیڑی سے گھڑی دیکھی۔ سات بج رہے
تھے۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ ٹکٹ سے بیڑیاں طے کیں،
نیچے آیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھری باجی محن میں
بیٹھی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے کہا۔
”ارے شاہ! کہاں جا رہے ہو؟... سلطانہ تو بس
اب آئی رہی ہوگی۔“

”باجی! میرے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ لے کر ابھی
آتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔
تیز قدموں سے گلی طے کی، سڑک پر پہنچ کر دائیں
جانب مڑا اور ٹکٹ کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت
سات بج کر چند منٹ ہو چکے تھے۔ کوئی سو سو سو قدم چل کر وہ
خود بخود دروازے کی طرف پر مڑ کر دیکھا۔ گلی کے سامنے
ایک کار آ کر رکھی تھی اور اس میں سے ایک عورت جو گہری
رنگ کی شال اوڑھے تھی، اتر رہی تھی۔ ایک جوان عورت اور
ایک بچہ پہلے ہی کار سے اتر چکے تھے۔ اس نے ہونٹوں پر
زبان پھیری اور ذرا غور سے دیکھا۔ فاصلہ بھی تھا اور شام کا
گہرا دھند لگا بھی، اس بنا پر پہچاننے سے قاصر تھا۔ تاہم اسے
چہن کی حد تک شبہ ہوا کہ شال والی عورت سلطانہ ہی ہو سکتی
ہے۔ وہ چند لمحوں میں صدمہ اور حسرت آمیز نظروں سے انہیں دیکھتا
رہا۔ حتیٰ کہ وہ گلی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔
اس نے ایک طویل سانس لی اور شکست قدموں سے
آگے بڑھ گیا۔

96

ہیں۔ دونوں سنجیدہ اور با شعور انسان ہیں اور چند منٹ کے
لیے ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں تو پھر پریشانی کیسی؟
نہیں، اسے اتنا مضطرب نہیں ہوتا چاہیے۔ اس نے ہونٹوں
پر زبان پھیری اور سر کو بولے سے جھٹکا۔ نہیں، ایسا کچھ نہیں
ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھے گا اور اطمینان سے گفتگو
کرے گا۔ سلطانہ کی خیریت پوچھے گا اور اس کے بچوں کا
حال، لندن کی باتیں۔ لندن میں اس کا گھر کیسا ہے؟ وہاں
اس کی دلچسپیاں اور مصروفیات کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ وہ
ہولے سے مسکرایا۔ یوں جیسے اسے اطمینان کا احساس ہوا
ہو۔

ٹہلے ٹہلے معاہدہ رک گیا۔ سامنے کمرے کا دروازہ تھا
جو کھلا ہوا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک بڑا آئینہ نصب تھا۔ وہ بے
خیالی میں آگے بڑھا، کمرے میں گیا۔ ہاتھ بڑھا کرتی جلائی
اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ تب یلغخت اس کا دل
ڈوب سا گیا۔

آئینے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی کے سر پر مٹتی
کے بال تھے۔ کچھ سلیٹی، کچھ سفید۔ ایک بوڑھا بے رونق چہرہ
تھا جس پر ان گنت گہری پر چھائیاں تھیں۔ حسرتوں اور
محرومیوں کا مرثیہ۔ یہ آدمی وہ نہیں تھا جس نے پچیس سال قبل
ایسی ہی ایک شام میں، اسی چھت پر سلطانہ سے آخری
ملاقات کی تھی۔ وہ آدمی تو بڑا وجہ تھا۔ دراز قد اور توانا،
زندگی سے بھرپور۔ اس آدمی کے چہرے پر بڑی بڑی روشن
آنکھیں تھیں اور گھنے سیاہ بال اور دھنکی ہوئی رنگت۔ وہ آدمی
کہاں گیا؟ ماضی کی قبر میں کہیں دفن ہو گیا اور یہ آدمی جو آئینے
میں کھڑا ہے، یہ تو اس کی پر چھائیں بھی نہیں۔ خدایا، یہ کیا
ہوا...؟ وہ حیرت اور صدمے کے حصار میں گھرا ہوا آئینے
میں اپنے آپ کو دیکھتا رہا اور اس کا دل دھیرے دھیرے
ڈوبتا گیا۔ آنکھوں کے سامنے وہ منظر ابھر آیا جب آخری بار
سلطانہ سے ملا تھا۔ اس کا شاداب اور منور چہرہ اس کے سیاہ
بال اور سر سے تراشا ہوا اس کا سراپا، جیسے کوئی دیوی ہو۔
جوان سال، پُر جمال، پُر شکوہ۔ کیا وہ اب بھی ویسی
ہوگی...؟ اس نے سم کر اپنے چہرے کو دیکھا اور وہشت
سے اس کا دل کانپ گیا۔ نہیں، شاید وہ ویسی نہیں ہوگی۔ جب
وہ خود اپنا سایہ تن گیا ہے تو وقت نے اس سے بھی اپنا خراج
ضرور وصول کیا ہوگا۔ بہاریں رخصت ہو چکی ہوں گی۔
تو بریں ماند پڑی ہوں گی۔ شاید اس کے چہرے پر بھی
لکیریں ہوں۔ شاید اس نے بھی چشمہ لگا رکھا ہو۔ اس نے
آئینے میں سلطانہ کو دیکھنے کی کوشش کی اور اسے مزید ڈرانا۔

کون ان بکھیزوں میں پڑے۔ اسی لیے انہوں نے اخبار میں اشتہار دے دیا۔

اشتہار کے جواب میں ایک صاحب تشریف لائے۔ ادھیڑ عمر کے، معقول صورت۔ "تو آپ دونوں کو کسی بچے کی ضرورت ہے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔" اظہر نے جواب دیا۔

"بلڈ گروپ کیا ہے آپ دونوں کا؟"

"بلڈ گروپ! بلڈ گروپ سے آپ کو کیا لینا؟"

"بھئی بات یہ ہے کہ بچہ نجیب الطرفین ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایرے غیرے گھر میں پرورش پائے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ ہماری رگوں میں بھی خالص خون دوڑ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ان صاحب نے گردن ہلادی۔ "اب یہ فرمائیں کہ اس کی شادی کس خاندان میں کریں گے؟"

"شادی!؟" تنسیم نے چونک کر پوچھا۔ "ابھی سے کہاں شادی ہونے لگی۔"

"ماشا اللہ بچیس سال کا ہو چکا ہے۔ شادی کی یہی عمر تو ہوتی ہے۔"

"دیکھیں جناب۔ ہم نے بچے کے لیے اشتہار دیا ہے۔ ہمیں کسی جوان مرد کی پرورش نہیں کرنی۔" اظہر نے وضاحت کی۔

"صد ہو گئی۔ بچے کے اشتہار کے جواب میں آپ ایک جوان لڑکے کو ہمارے گھر بھیج رہے ہیں۔" تنسیم ناراضی سے بولی۔

وہ صاحب برا مان گئے تھے۔ "دیکھیں صاحب۔ والدین کے لیے ان کا بیٹا بچہ ہی ہوتا ہے۔ چاہے اب کی عمر کچھ بھی ہو۔ ہم اسے بچہ ہی سمجھتے ہیں۔"

"آپ سمجھتے ہوں گے، ہم نہیں سمجھ سکتے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ ہمیں نومولود بچے کی ضرورت ہے۔" اظہر نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

وہ صاحب برا بھلا کہتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

دوسرے دن ایک اور آدمی آیا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اور بچے کے طور پر ایک شیر خوار اس کی گود میں تھا۔

"ہم تو بس اس بچے کو آپ کے حوالے کرنے آئے ہیں۔" اس مرد نے کہا۔ "یہاں اچھی دیکھ بھال ہو جائے گی۔" اظہر نے اسے گود میں لے لیا۔

"چلو یہ تو اچھی سوچ ہے۔" اظہر نے کہا۔

"لیکن ہماری ایک شرط ہے جی۔" وہ عورت جلدی سے بولی۔ "اور وہ شرط یہ ہے کہ ہم بھی اس کے ساتھ ہی رہیں گے۔"

"کیا کہا۔۔۔ تم دونوں ساتھ رہو گے؟"

"ہاں تو کیا ہوا، ہمارا خاندان کوئی زیادہ بڑا نہیں ہے۔" مرد نے کہا۔ "میرے ماں باپ، میری بیوی کے ماں باپ اور ہم دو۔۔۔ بس۔"

"تنسیم غصے سے بے حال ہو گئی تھی۔" دیکھو۔ ہم نے پورے محلے کے لیے اشتہار نہیں دیا ہے۔ ہمیں صرف بچے کی ضرورت ہے۔"

"تو پھر کون اپنی اولاد کو اس طرح غیروں کے حوالے کر دے گا؟" عورت نے کہا۔ "ہم تو اپنے چاند کو ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر رکھو اس کو اپنے ساتھ اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" تنسیم نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "ہم کوئی بچہ Adopt نہیں کر سکیں گے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ کوئی نہ کوئی مناسب بچہ ضرور مل جائے گا۔" اظہر نے تسلی دی۔

پھر پورے محلے کوئی نہیں آیا لیکن ایک دن ایک معقول صورت عورت آئی تھی۔ وہ بڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ بچہ اسی کا ہے اور وہ اسے کسی کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔

"لیکن کیوں۔ کیا تم اس کی پرورش نہیں کر سکتیں۔" اظہر نے پوچھا۔

"کو تو کوئی ہوں لیکن اس وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔" اس نے بتایا۔ "میرے شوہر پر بہت قرض چڑھ گیا ہے جسے اتارنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ جی تو یہ چاہتی ہو کہ اس کے بدلے تمہیں معاوضہ دیا جائے۔"

"ہاں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "آپ اس سے ہماری مجبوری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔"

"کتنے پیسوں کی ضرورت ہے تمہیں؟"

"صرف دو لاکھ۔" عورت نے بتایا۔

اظہر اور تنسیم کے لیے دو لاکھ کی رقم کوئی اتنی بڑی نہیں تھی۔ ٹھیک ہے۔ اظہر نے اس کی دعا کی اور اظہر نے کہا۔ "اب

تم اس بچے اور اپنے شوہر کو یہاں لے آنا۔ یہ کام باقاعدہ تمہارے پڑھت کے ساتھ ہوگا کیونکہ یہ اولاد کا معاملہ ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔ ہم کل ہی آ جا رہے ہیں۔"

دوسری شام وہ دونوں بچے کو لے کر آ گئے تھے۔ بہت کچھ سنیں۔ خوبصورت سا بچہ تھا۔ تنسیم اسے دیکھتے ہی نہال ہوئی تھی۔ "ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ بہت پیارا ہے۔ ہم اسے اپنے سے بے نیاز ہیں۔"

"دیکھو۔ تم اپنی اولاد ہمارے حوالے تو کر رہے ہو لیکن تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا ہوگا۔" اظہر نے اس کے شوہر سے کہا۔

"جی جناب! ہم کم طرف نہیں ہیں۔ ہم اسی طرف زندگی بھر نہیں آئیں گے۔ اب یہ آپ کا ہو گیا۔"

"تو پھر چلو۔ کورٹ میں چل کر کاغذی کارروائی کر لیتے ہیں۔"

"کورٹ کی کیا ضرورت ہے جناب! اس آدمی نے کہا۔" جب ایک دفعہ کہہ دیا سو کہہ دیا۔ آپ چاہیں تو آپ کے امینان کے لیے میں یہیں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔"

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔" تنسیم نے کہا۔ "ہمیں تم دونوں پر اعتماد دیا ہو گیا ہے۔"

اظہر نے کاغذات تیار کر رکھے تھے جس پر ان دونوں نے دستخط کیے اور دو لاکھ لے کر چلے گئے۔ جاتے وقت وہ عورت بلیک بنک کر روتی رہی تھی۔ پھر اس کا شوہر اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

ان بچے نے ان کی زندگی میں خوشیاں بھر دی تھیں۔ گول مول سا جس کی مٹی بھی بہت خوبصورت تھی۔ اظہر اس کے لیے دیکھ بھال ساری شاپنگ کر لیا تھا۔

ان کی خوشی دوسرے دن اس وقت ختم ہو گئی۔ جب بچہ ڈب پڑا۔ والدین کے ساتھ ان کے گھر آ گئے۔ اظہر اور تنسیم حیران رہ گئے تھے۔ "اوسے سلامتی دو۔" ایک پوچس "اوسے نہ کہہ۔"

"کس بات کی سلامتی؟" اظہر نے پوچھا۔

"یہاں سے بچے چوری کر رہے ہو اور پوچھتے ہو کس بات کی سلامتی؟"

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ میں ایک آدمی ہوں۔ میں کب کب چور ہونے لگاؤں گا؟"

"اپنا اپنا مال سے چرا گیا ہے ہمارا ہمارا اطلاع دے۔" اظہر نے تنسیم سے کہا۔

"ہمارے پاس ایک بچہ ہے اور اسے اسے

باقاعدہ Adopt کیا ہے۔"

"کہاں سے Adopt کر لیا؟"

تنسیم بچے کو اندر سے لے آئی تھی۔ اس بچے کو دیکھتے ہی وہ عورت چلا اٹھی تھی۔ "ہاں ہاں۔ یہی ہے میرا لعل۔ میرے جگر کا لکڑا۔"

ان دونوں میاں بیوی کی پوزیشن بہت خراب ہو گئی تھی۔ اظہر نے وہ کاغذات دکھائے جو اس آدمی نے دستخط کر کے دیے تھے۔ "یہ دیکھیں۔ ان دونوں نے باقاعدہ سائن کر کے اپنی خوشی سے یہ بچہ ہمارے حوالے کیا ہے۔"

"پھر ایک بات اور بھی ہے۔" تنسیم نے کہا۔ "آپ لوگ خود سوچیں۔ اگر ہمیں یہی حرکت کرنی ہوتی تو ہم اخبارات میں بچے کے لیے اشتہارات کیوں دیتے؟"

تنسیم کی یہ بات معقول قرار پائی تھی۔ پھر دونوں میاں بیوی شریف اور معزز دکھائی دے رہے تھے۔ محلے والوں نے بھی ان کی شرافت کی گواہی دی تھی اس لیے ان کی جان بچ گئی۔

وہ لوگ بچے کو لے کر چلے گئے۔

اظہر اور تنسیم کو بہت زبردست سبق ملا تھا۔ دو لاکھ روپے بھی لے کر اور بے عزتی الگ ہوئی۔ محلے والے بھی عجیب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ہاں بھی اب کیا کہتی ہو؟" اظہر نے تنسیم سے پوچھا۔ "بچہ چاہیے۔"

"نہیں، اب نہیں چاہیے۔" تنسیم نے اپنے کان پکڑ لیے۔ "اچھا خاصا سبق مل چکا ہے۔"

"تو پھر۔ بغیر بچے کے کیسے گزار ہوگی؟"

"جس طرح اب تک ہوتی آئی ہے۔" تنسیم نے کہا۔ "اویسے میرے ذہن میں ایک راستہ ہے۔"

"اب بھی کوئی راستہ ہے؟"

"ہاں اور وہ یہ ہے کہ یہاں ایسے کئی ادارے ہیں جو بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔"

"تم یہ چاہتی ہو کہ ہم وہاں سے کسی کو لے آئیں؟"

"نہیں، لاؤں نہیں۔ اسے وہیں رکھیں۔ بس اس کے خرابات برداشت کرتے رہیں اور اگر لانا بھی دوا تو بھی کبھی باہر لے آئیں اور بچے میں ایک دن اس کو دیکھ کر کہیں گے۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" اظہر نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ "میں نے بھی ایسے اداروں کے بارے میں سن رکھا ہے۔ وہ چار دن ٹھہر جائیں گے کسی معقول ادارے کو پناہ دے دیں۔ پھر وہاں سے چلیں گے۔"

ایک ہفتے کے بعد دونوں ایک ادارے کے دفتر میں تھے۔ اس ادارے کی بہت شہرت تھی۔ اس کا خیبر ایک اذیتز عمر یا تو فی سائنس تھا جو، ان دونوں کی یہ خواہش سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ ”واہ جناب۔ یہ تو کار خیر ہے۔ ارے آپ ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا چل رہی ہے ورنہ کب کی ٹھکانے لگ جائے۔“

”ہمیں کسی بچے کو adopt کرنا ہے۔“ اظہر نے کہا۔ ”جو بالکل بے سہارا ہو۔“

”ضرور ضرور۔ یہ بہت ثواب کا کام ہے۔“

”لیکن ہم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے بلکہ وہ یہیں رہے گا۔“ تنسیم نے کہا۔

”چلیں جیسی آپ کی مرضی۔“ خیبر نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”پھر آپ کو اس کے پورے اخراجات ادا کرنے ہوں گے، وہ بھی ہر ماہ پابندی کے ساتھ۔“

”جی ہاں۔ ہم یہی سوچ کر آئے ہیں۔“ اظہر نے کہا۔

”آپ ہمیں اس کے اخراجات بتا دیں۔ اس کی تعلیم، ٹیوشن، کپڑے، خوراک۔ اس کے اپنے چھوٹے موٹے اخراجات۔ مگر اس کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے اور اسے کبھی کوئی پرالہم نہیں ہونی چاہیے۔“ تنسیم نے بات مکمل کی۔

خیبر نے کچھ دیر حساب کتاب کرنے کے بعد ایک بجٹ ان کے سامنے رکھ دیا۔ ”آٹھ ہزار روپے ماہانہ۔“

”آٹھ ہزار!“ اظہر کچھ حیران ہو گیا تھا۔ ”یہ رقم زیادہ نہیں ہے؟“

”اس کی پرورش بھی تو اسی انداز کی ہوگی۔“ خیبر نے کہا۔

”چلیں ٹھیک ہے۔ لیکن آپ وہ بچہ تو دکھادیں بلکہ ہم خود select کر لیں گے۔“

”نہیں جناب۔ آپ کو select کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ یہاں جتنے بچے ہیں۔ وہ تقریباً سب کے سب گولے جاکچے ہیں۔ صرف دو بچے رہ گئے ہیں۔ ایک ابھی ایک سال کا ہے جبکہ دوسرا پانچ چھ سال کا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دہرا والا آپ دونوں کے لیے مناسب رہے گا۔“

”آپ اس سے ملواتو دیں۔“

”آج نہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے گا۔“ خیبر نے

بتایا۔ ”آج کچھ بچے چنگ کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہے۔“

”اوکے۔ تو ہم کل آجائیں گے۔“

دوسرے دن وہ بچے خیبر کے کمرے میں موجود تھا۔ اظہر اور تنسیم اسے دیکھنے ہی پھرک اٹھے تھے۔ وہ چھ سات سال کا بہت کیوٹ سا بچہ تھا جو مصمم نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ ہے وہ بچہ۔“ خیبر نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

”ہم نے اس کا نام عمران رکھا ہے۔ بیٹے سلام کرو۔“

بچے نے بہت ہی پیار بھرے انداز میں دونوں کو سلام کیا تھا۔ اظہر نے تو باقاعدہ اسے سینے سے لگالیا تھا۔ ”بس جناب۔ یہ بچہ ہمارا ہوا۔“ اس نے خیبر سے کہا۔ ”اب اس کے سارے اخراجات ہمارے ذمے۔“

”مبارک ہو۔ لیکن آپ اسے مینیج میں صرف ایک بار اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“ خیبر نے بتایا۔ ”وہ بھی ہمارا ادارہ پوری طرح چھان بین کر کے اس کی اجازت دے گا کیونکہ یہ بچے ہماری بہت بڑی ذمہ داری ہیں۔ ہمیں اوپر والے کو اپنا منہ دکھانا ہے۔“

”جی ہاں۔ ایسا ضرور ہونا چاہیے۔“ تنسیم نے کہا۔

”آپ لوگ اچھی طرح اطمینان کر لیں۔“

”ہاں آپ جائیں تو ہفتے میں ایک بار اس سے آکر مل سکتے ہیں۔“ خیبر نے شرائط بتائیں۔ ”اور وہ بھی صرف دو گھنٹوں کے لیے اور ایک خاص دن آپ کو مقرر کرنا ہوگا۔“

”جناب۔ آپ کی اس قسم کی برشرط ہمیں منظور ہے۔“ اظہر نے کہا۔ ”آپ بس کاغذی تیاری مکمل کریں۔“

کاغذی تیاری کے طور پر ایک فارم پر ان دونوں سے دستخط کروائے گئے۔ اس کے بعد عمران ایک طرح سے ان دونوں کا بچہ ہو گیا۔

اظہر نے اسی وقت اس کے دو مینیج کے اخراجات ایک ساتھ ادا کر دیے تھے۔

دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔

”کاش ہم عمران کو اپنے ساتھ ہی رکھ سکتے۔“ تنسیم نے کہا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس ادارے کے اپنے اصول ہیں۔“ اظہر نے بتایا۔ ”لیکن جب وہ کالج میں ہوگا تو پھر ہمارے پاس آ سکتا ہے۔“

”ہم اسے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوانے کی کوشش کریں گے۔“

”جی۔“

”ہاں۔ ہمارے اختیار میں جو کچھ بھی ہوگا۔ ہم اس کے لیے کرتے رہیں گے۔“

ایک بات بتائیں۔ کیا ہم عمران کے لیے تحفے لے سکتے ہیں؟“

”ہاں۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“ اظہر نے کہا۔

”میں ہی اس کے لیے شاپنگ کر لیں گے۔“

دوسرے دن انہوں نے مارکیٹ جا کر اچھی خاصی شاپنگ کر لی تھی۔ قیمتی کپڑے، کپڑے، جوتے، کپڑے، کپڑے، کپڑے اور نہ جانے کیا کیا۔

زندگی میں پہلی بار انہیں ایسی شاپنگ کرتے ہوئے خوش محسوس ہو رہی تھی۔ خریدے جانے والی ہر چیز میں انہوں نے اپنا اپنا پیار سونپ کر رکھ دیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد دونوں لدے پھندے ادارے میں پہنچ گئے تھے۔ خیبر نے عمران کو پہلے سے بٹھا رکھا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر دوڑتا ہوا ان سے آکر کرپٹ گیا۔

اظہر اور تنسیم دونوں نے جی بھر کر اسے پیار کیا تھا۔ عمران اپنے لیے لائی ہوئی چیزیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی خوشی دیکھ کر ان دونوں کو ایسا لگا جیسے وہ بچہ اسی کے لیے جیتے رہے ہوں۔

”دیکھتے زور نے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔“

بہت ڈھیر سا پیار اور دعائیں دے کر وہ واپس آ گئے تھے۔

باآزادہ دن آ گیا جب انہیں عمران کو اپنے گھر لانا تھا۔ اس بچے کے لیے ایک کمرے کو خوب اچھی طرح سادہ یا تھا۔ طرح طرح کے کھلونے اور وہیو گیمز۔ اس سے پہلے انہوں نے یہ پروگرام بنالیا تھا کہ وہ عمران کو لے کر پہلے کسی پارک میں جائیں گے پھر کسی ایجنے سے ہوئی میں ڈر ہوگا۔

رات کو اسے کہانیاں سنائی جائیں گی۔ دن کے وقت پھر ساحل پر جائیں گے اور جب شام ہوگی تو اسے ادارے کو واپس کر دیا جائے۔ بس اتنی ہی دیر کی اجازت ملی تھی لیکن ان کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔

عمران ان کے ساتھ آ گیا۔

پروگرام کے مطابق وہ پہلے اسے پارک لے گئے جہاں اس نے خوب انجوائے کیا۔ اس کی ہنسی دیکھ دیکھ تنسیم خوش ہوئے جاری تھی۔ ”نہ جانے اس بے چارے کو اس حد تک شہ کو موقع بھی ملا ہوگا یا نہیں؟“

”کہاں سے ملے گا موقع۔“ اظہر نے کہا۔ ”اس کے ساتھ ان میں تم ہی کیا۔“

”لیکن اب بہت کچھ ہے۔ ہم اس کی زندگی میں رنگ بھریں گے۔“

وہ پارک میں بہت دیر تک رہے تھے۔ پھر جب مغرب ہوئی تھی تو اس کے بعد ایک ہوٹل میں آ گئے۔ بہت خوبصورت اور بڑا ہوٹل تھا۔

ان کا ارادہ تھا کہ وہ ہر بار عمران کو مختلف ہوٹلز میں لے جایا کریں گے۔ وہ بھی ان کے ساتھ بہت خوش تھا۔

ہوٹل ہی میں ان کی ملاقات اظہر جاد سے ہوئی۔ وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ کھانا کھانے آیا ہوا تھا۔ اظہر اور اظہر ایک دوسرے کے پرانے دوست تھے۔ دونوں بہت گرم جوش سے ملے تھے۔ ”بھئی ہم تو اپنے بیٹے کو ڈر کے لیے لے کر آئے ہیں۔“ اظہر نے عمران کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا بیٹا!“ اظہر نے حیرت سے عمران کی طرف دیکھا۔ ”اس کو تو میں جانتا ہوں۔ اس کا نام عمران ہے۔“

”ہاں۔ عمران ہی ہے لیکن۔۔۔۔۔“

”ارے بھئی۔ ہمارے ایک جاننے والے ہیں ابراہ صاحب، جو بچوں کی دیکھ بھال کے ایک ادارے کے خیبر ہیں۔ یہ ان ہی کا تو بیٹا ہے۔“

”کیا!“ اظہر اور تنسیم دونوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔

”یہ۔۔۔ یہ ان کا بیٹا ہے؟“

”ہاں بھئی۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ آدمی اس بچے کو بے سہارا بنا کر جانے کتنوں کے حوالے کر چکا ہے۔ تم لوگ بھی شاید اسی چکر میں اسے اٹھا کر لے آئے ہو۔ کیوں؟“

اظہر اور تنسیم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے عمران کو اتنی رات اس ادارے میں پہنچا دیا تھا۔ جب انہوں نے خیبر کو ڈانٹنا شروع کیا تو اس نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ ”ہاں، یہ میرا ہی بیٹا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ اتفاق ہے کہ آپ کے سامنے پہلے ہی دن اس کی پول کھل گئی ورنہ بعض فیملیئر تو ایسی ہیں جو کئی کئی برسوں سے اس کے خربچے اٹھا رہی ہیں۔“

وہ دونوں خیبر کو لعنت ملامت کرتے ہوئے واپس آ گئے تھے۔

اب جب انہیں بچے کی خواہش ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو سلی دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پرایا مال ہمیشہ پرایا ہی ہوتا ہے۔ ہم چھوٹی کر لیں، کسی اور کے بچے کو اپنا نہیں بنا سکتے، کبھی نہیں۔

109

108

109

108

109

108

109

108

109

108

109

108

اقبال جرم

ملک مندر حیات

جیسے عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے اسی طرح خون ناحق بھی پکان پکان کر اپنے قاتل کی نشاندہی کرتا ہے۔ خواہ کتنی ہی رازداری برتی جائے مگر جستجو کے آگے کوئی راز، راز نہیں رہتا۔ پوشیاری کے باوجود مجرم سے کوئی نہ کوئی خطا ضرور سوزد ہو جاتی ہے۔ خطا ہو اور سزا نہ ملے۔ یہ سب قدرت کے قانون میں شامل نہیں۔ اور جب قانون کے رکھوالے ملک صغیر حیات جیسے مخلص افسران ہوں تو انصاف ملنے کی امید آخر دم تک قائم رہتی ہے۔

ظہری سے واقعات کرتے والے ایک بے گنہگار کی کہانی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انتہائی بزدل اور کمزور قوت ارادی کے مالک انسان خودکشی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس نظریے کے حامل ہیں کہ اپنی جان لینا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بڑے دل گردے اور آہنی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خودکشی بہادری کا علم بردار ایک جرأت مند اقدام ہے۔

آپ ان دونوں نظریات اور ان کے حامل افراد کو اپنے ذہن میں رکھیں اور میں آپ کو اصل واقعے کی طرف لے چلتا ہوں۔ وہ ماہ جولائی کے آخری ایام تھے۔ ساون کے مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ برسات کے موسم نے ہوا، فضا، ماحول اور دھرتی۔۔۔ ہر شے کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ ایک صبح جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ قلعہ معصوم شاہ سے دو ہندے کوئی بری خبر لے کر آئے ہیں۔

قلعہ معصوم شاہ ایک متوسط سا گاؤں تھا۔ جہاں بہ مشکل دو سو گھرا آباد ہوں گے۔ انھوں کا محتاط اندازہ کوئی آٹھ سو کے قریب لگایا جاسکتا تھا۔ یہ گاؤں میرے تھانے سے لگ بھگ دو میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔

میں نے اطلاع دینے والے کا ٹھیکل سے پوچھا۔ طیف اور۔۔۔ جی خیر گاؤں کی جغرافیہ یا تاریخ بھی ہے نا۔۔۔ ملک صاحب ان ہندوں نے مجھے بتایا ہے کہ ادر

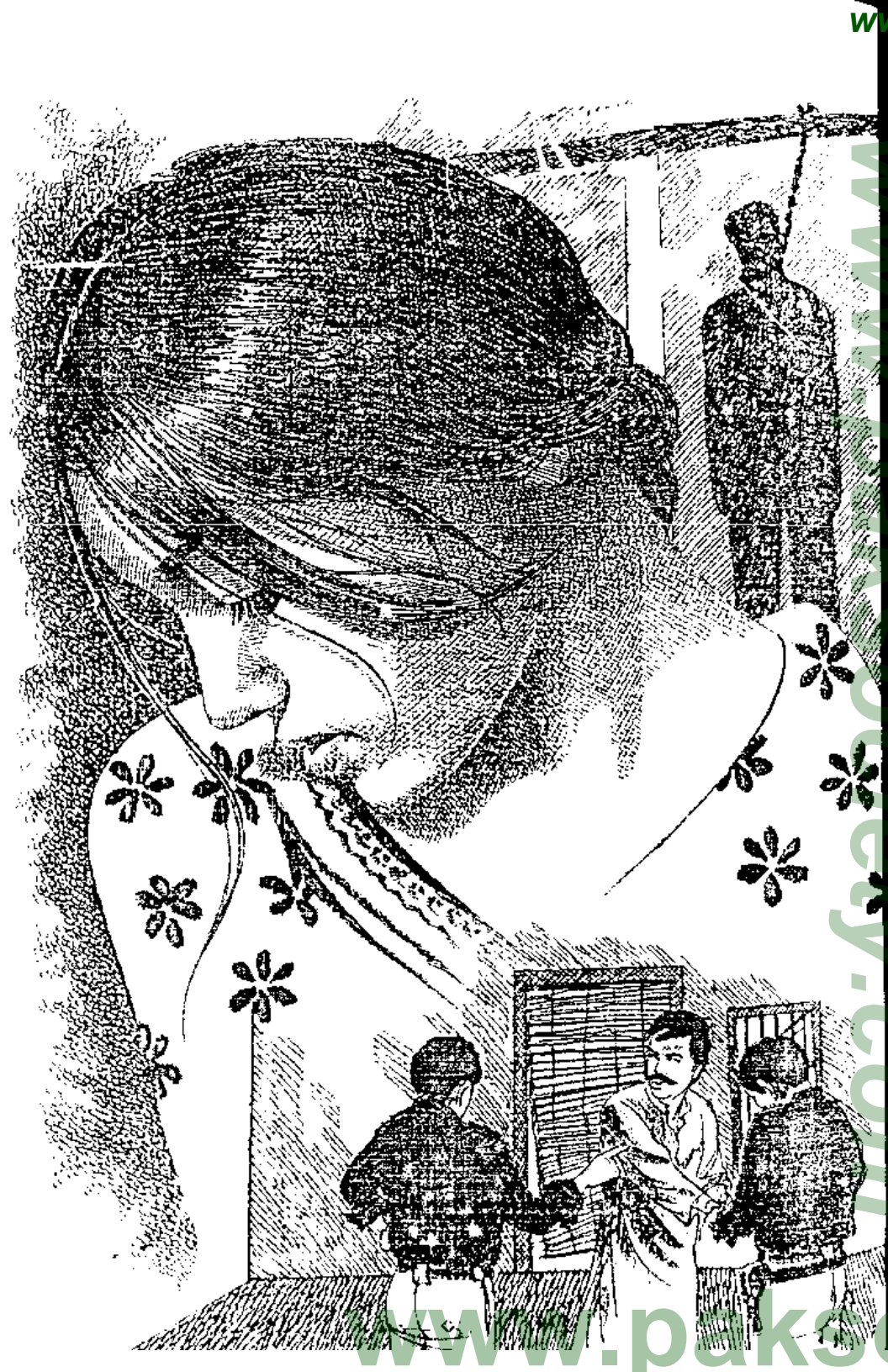
قلعہ میں ایک نوجوان نے خودکشی کر لی ہے۔" کا ٹھیکل وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔

میں چونک اٹھا اور اعظمراری لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ان دونوں ہندوں کو تم میرے پاس بھیج دو۔" وہ صحت کے بعد وہ دونوں میرے سامنے حاضر تھے۔ وہ وضع قطع، بول چال اور صورت شکل سے عام دیہاتی نظر آتے تھے۔ میں نے ان کے نام دریافت کیے اور پوچھنے کے لیے کہا۔ ان میں سے ایک معراج دین اور دوسرا رحمت علی تھا۔ وہ دونوں بیٹھے تھے تو میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بھی، کس نے خودکشی کی ہے ادر۔۔۔؟"

"جناب اس گرو کا نام ہے ادر جندرا۔۔۔!" معراج دین نے بتایا۔

"جندرا۔۔۔!" میں نے زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔ "اس جوان نے اپنے نام کے ساتھ جندرا کیوں لگا رکھا تھا۔۔۔؟"

جندرا بے معنی تالا۔۔۔ مقامی دیہاتی زبان میں تالے کو جندرا کہا جاتا ہے۔ رحمت علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "تم نے وار صاحب اب ہر گڈی کا پڑا ہی پھرتے ہو جندرا تھا، خصوصاً اس کی بیکڑ بڑی مشہور تھی۔ وہ یا



اگست 2011ء

اللہ رکھا کا گھر قلعہ معصوم شاہ کے مغربی حصے میں واقع تھا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان تھا لہذا گھر کا محکمہ خاصا کشادہ اور سبز و شاداب تھا۔ سرسبز و شاداب ان معنوں میں کہ وہاں پھلوں اور دیگر سایہ دار درختوں نے بہار بلا رکھی تھی۔ آم، جاسن، امرود اور شہتوت کے درختوں کے علاوہ مٹی (شیشم) اور پتھل کا بھی ایک ایک درخت موجود تھا۔

اللہ رکھا ایک چھوٹا سا شکار تھا لہذا محکمہ کے ایک کونے میں بل اور پچا لیاں وغیرہ بھی رکھی نظر آ رہی تھیں۔ محکمہ ہی کی ایک دیوار کے ساتھ دو بھینسیں اور تین بکریاں بھی کھڑیوں پر بندھی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ پانچ ایکڑ زمین کا مالک تھا اور گزر بسر کھیتی باڑی ہی کی روئے منت تھی۔ اس کام میں طاہر چندرا اس کا بھرپور ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس کے گھر کا سوٹ اپ بالکل ویسا ہی تھا جیسا پھولے زمیندار گھرانوں کا ہوتا ہے۔

میں اللہ رکھا کی معیت میں اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ باقاعدہ بارش کا سلسلہ ترک گیا تھا تاہم ہلکی پھوار پڑ رہی تھی جو وقفے وقفے سے بوند باندی میں بدل جاتی تھی۔ ساون کی جھڑی کا اپنا ایک الگ مزہ ہے جس میں انسان کے اندر اور باہر کا موسم مکمل طور پر بیگ کر رہ جاتا ہے۔

اللہ رکھا کی پوی کا نام کلثوم تھا۔ وہ ایک دلی تپتی اور دراز قامت عورت تھی۔ کلثوم کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ ان کی پھوٹی ہنی کا نام عابدہ تھا جس کی عمر دس سال تھی۔ اللہ رکھا اس کی بیوی اور بیٹی تینوں طاہر چندرا کی الگ الگ موت پر دل گرفتہ اور ملول تھے۔ بوند باندی کے باعث محکمہ میں بیٹھنا ممکن نہیں تھا لہذا اللہ رکھا مجھے برآمدے میں لے آیا۔ مکان کے چپٹے حصے میں پہلو پہ پہلو دو کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے آگے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک برآمدہ تھا جہاں تین چار چائیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ انکی میں سے ایک چار پائی پر اللہ رکھا نے مجھے بٹھا یا پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”کلثوم! تمہارے دار صاحب کے لیے کوئی چائے پانی کا بندوبست کرو۔“

”اس شخص کی زندگی ضرورت ہے اور نہ ہی یہ ایسا موقع ہے کہ میری خاطر تواضع کی جائے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر دونوں انداز میں منع کر دیا۔ ”تم لوگ مجھے ظہر کے ذرے میں نہ پھرتا کہتے ہو وہ بتاؤ۔ یہی تمہاری سب سے بڑی خدمت ہوگی۔“

”جناب! ظہر سے آدھیں بیٹھ لی مار دیا ہے۔“

کلثوم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”کچھ کچھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ وہ تو بالکل خوش باش اور ٹھیک ٹھاک تھا۔“

”خوش باش اور ٹھیک ٹھاک انسان کبھی خود کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کلثوم۔“ میں نے کھیر لیجھ میں کہا۔ ”کوئی تو ایسی وجہ ہوگی جس نے اسے اس کام کے لیے مجبور کیا؟“

”پتا نہیں جناب۔“ وہ روٹا ہوا آواز میں بولی۔

”اللہ ہی جانے، اس کے دل میں کیا تھا۔۔۔۔۔۔“

”اللہ تمہارا بھلا کرے کلثوم!“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں بھی یہی جانتا چاہتا ہوں، آپ لوگوں کے بیٹے کے دل اور دماغ میں کیا تھا۔۔۔۔۔۔“

”دل اور دماغ کی باتیں تو سوہنا رب ہی جانتا ہے تمہارے دار صاحب۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”اس نے ہم سے تو کبھی اپنا دکھ بیان نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ ہم نے ہمیشہ اسے ہنستے مسکراتے اور خوش ہی دیکھا ہے۔“

”کلثوم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے تمہارے دار صاحب!“ اللہ رکھا تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس کے سینے میں کوئی ایسا غم بھی چھپ ہوگا جو اسے اپنی جان لینے پر مجبور کر دے گا۔“

”مجھے آپ تینوں سے گہری ہمدردی ہے۔“ میں نے باری باری اللہ رکھا، کلثوم اور عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں لیکن۔۔۔۔۔۔“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں اخذ کیا۔

”لیکن۔۔۔۔۔۔ ایک تمہارے دار ہونے کے ناتے مجھے اس بات کا پتا لگا تا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل تھے جن کے ہاتھوں مجبور ہونے کے بعد آپ کے بیٹے نے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کیا اور۔۔۔۔۔۔ میرا یہ مقصد آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔“

”ہم تو ہر تعاون کے لیے تیار ہیں۔“ اللہ رکھا نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”آپ حکم کریں جناب۔“

میں نے ان دونوں کے انداز میں ان سے سوال و جواب شروع کر دیے۔ اعلیٰ فائس نے بد مذہبوں سے انھار کیا تھا۔ وہ بڑی نامور تھی اور شرافت کے ساتھ اندر کرے میں چلی گئی تھی۔ بد مذہبوں میں اس کی وجہ یہ رہی ہوگی۔ یہ ایک

نئی عمر ہوتی ہے جس میں انسان کا شعور پوری طرح بیدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بچی کا وہاں سے بہت جانا ہی ٹھیک تھا۔

”اللہ رکھا!“ میں نے طاہر چندرا کے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ کھیتی باڑی کے کام میں طاہر چندرا ہاتھ بٹاتا کرتا تھا۔“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”جناب! وہ بہت ہی فرماں بردار اور کھیتی لڑاکا تھا۔ میرا تو نہیں نام ہی تھا ورنہ کھیتی باڑی کا زیادہ تر کام تو وہی کرتا تھا۔“

”پتا نہیں، کس دشمن کی نظر کھا گئی میرے بچے کو۔۔۔۔۔۔“

”کلثوم نے دل گیر آواز میں کہا۔ ”تمہارے تو کتنا سوہنا گہرو جوان۔“

میں نے روئے سخن کلثوم کی جانب موڑا اور روروی میں پوچھنا۔ ”کیا ظاہر کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی تھی؟“

”نہیں جناب، وہ تو یاروں کا یار تھا۔“ اللہ رکھا نے بتایا۔ ”بزرگوں کا احترام کرنے والا اور بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنے والا۔۔۔۔۔۔“

”میرے پتر میں ذرا سا بھی غرور نہیں تھا تمہارے دار صاحب!“ اللہ رکھا کی بات کو کلثوم نے آگے بڑھایا۔ ”پر سے قلعے میں اور آس پاس کے گاؤں میں طاہر چندرا بھرتیا اور ہنرمند کھڈی کا کوئی کھلاڑی نہیں تھا لیکن جال ہے، اس نے بھی اس بات پر غمخیز کیا ہو۔“

میں نے کلثوم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دشمن کے حوالے سے اس لیے پوچھا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی دشمن کی نظر کا ذکر کیا تھا۔۔۔۔۔۔“

”وہ تو جناب میں نے ظاہر کی جوانی، بخت اور کھڈی میں مہارت کی وجہ سے کہا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”ظاہر نے بڑے مشکل مقابلے بھی جیت کر دکھائے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ کھڈی کے معاملے میں وہ قلعے کی آبرو تھا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”جہاں جیت کی خوشی میں وہ ستوں کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں وہیں ہارنے والوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، کسی بد مذہب نے اسے بڑی نظر سے دیکھا ہو اس دشمن کی بیٹی بڑی نظر میرے ظاہر کو کھا گئی۔“

”کلثوم جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ ایک دشمنی ماں کے دل کی آواز تھی۔ ایک ایسی ماں جس کا جوان جہاں بنا موت کے جہنم میں گیا ہو وہاں ایک دل گرفتہ ماں کے جذبات کو پہنچ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات ابھی طرح میری سمجھ میں آئی تھی۔“

تھی کہ اس نے طاہر چندرا کی موت کے حوالے سے کسی ”دشمن“ کا ذکر کیوں کیا تھا لیکن میرے ذہن کا سواں ابھی تک جوں کا توں کھڑا تھا۔ طاہر چندرا اپنی جان بیٹے پر کیوں مجبور ہوا؟

میں دوبارہ اللہ رکھا کی جانب متوجہ ہوا اور کہا۔ ”اللہ رکھا! میں نے اسپتال بھجوانے سے پہلے تمہارے بیٹے کی لاش کا معائنہ کیا تھا اور میرے انداز کے مطابق اس کی موت آدھی رات کے آس پاس واقع ہوئی ہے۔ کیا پچھلی رات طاہر گھر میں موجود نہیں تھا؟“

”جناب! یہی تو حیرت کی بات ہے۔“ اللہ رکھا آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”کل شام سے پہلے طاہر ٹھیک ٹھاک کھیتوں سے واپس آیا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق بھینسیوں اور بکریوں کو چارا وغیرہ ڈالا پھر ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو گیا۔ ہم چاروں نے ایک ساتھ رات کا کھانا کھا یا پھر سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔۔۔۔۔۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، دو چار گہری سانس لے کر اپنے ٹھنکے کو درست کیا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”صبح جب میری آنکھ کھلی تو ظاہر کا بستر خالی تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ مساند میرے گھر سے نکل جایا کرتا تھا۔ علی الصبح دوڑنگا اور مختلف قسم کی ورزشیں کرنا اس کے معمول میں شامل تھا۔ وہ کھڈی کے لیے ہمیشہ خود کو نڈھالتا تھا۔ جہاں روزانہ صبح ہی صبح ورزش کے لیے جاتا اس کی عادت تھی، وہیں وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے واپس بھی آ جاتا کرتا تھا۔ ہم ایک ساتھ مل کر ناشا وغیرہ کرتے پھر میں اور طاہر کھیتوں کی طرف نکل جاتے اور دو دنوں ماں بیٹیاں گھر میں رہتی تھیں لیکن آج صبح سارا معمول بگڑ کر رہ گیا۔“ وہ بولتے بولتے خاموش ہوا۔ ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو صاف کیا پھر بھرا لئی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہم ناشتے پر اس کا انتظار کرتے رہے۔ وہ نہیں آیا۔۔۔۔۔۔ اس کی موت کی خبر آئی۔۔۔۔۔۔“

وہ بڑے دل گرفتہ لمحات تھے۔ ایک باپ مجھے اپنے جوان بیٹے کی موت کے بارے میں بتا رہا تھا اور اس بیان کے دوران میں اس کی آنکھیں بار بار جھلک آتی تھیں۔ میں نے اسے دُشرب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کی حالت مستحکم ہوئی اور وہ بات کرنے کے قابل ہوا تو میں نے پوچھا۔

”تمہیں طاہر کی موت کے بارے میں کس نے بتایا تھا؟“

118 اکتوبر 2011ء

کی مرضی ہو، وہ اس میں ٹھس جائے.....؟“

”ایسی بات نہیں ہے جناب!“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ہمیشہ اس کمرے کو بند کمرے کے آتا ہوں۔ باقاعدہ دروازے کو کنڈی لگانے کے بعد اس پر تالا بھی چڑھاتا ہوں۔ میں نے کمرے کی ایک دیوار میں آہنی سلاخوں والی کھڑکی بھی بنوا رکھی ہے تاکہ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے ہوا کی آمد و رفت نہ رہے اور وہاں بندھے ہوئے گدھوں کی زندگی کے لیے کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔ بغیر پٹ کی سلاخوں والی وہ کھڑکی آپ نے بھی دیکھی ہوگی۔“

”ہاں، دیکھی ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ”منظور حسین! کیا پچھلی رات بھی تم نے اس کمرے کے دروازے پر کنڈی تالا وغیرہ لگایا تھا؟“

”جی ہاں، بالکل لگایا تھا۔“ اس نے پُر وثوق انداز میں جواب دیا۔

”میں جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جب تم آج صبح اس کمرے کی طرف گئے تو وہاں کی صورت حال کیا تھی؟“

”جناب! مجھے بھی وہ دروازہ کھلا ہوا ہی ملا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”ملا وغیرہ غائب تھا۔ میں سمجھتا ہوں، طاہر جنڈرا نے دروازے کا تالا توڑ کر میں پھینک دیا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس نے خودکشی والی کارروائی کی ہوگی۔“

”ہوں۔“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”اگر سب کچھ ویسے ہی پیش آیا ہو جیسا تم بیان کر رہے ہو تو پھر یہ بات بھی یقینی ہے کہ ظاہر چندرا نے بہت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ واردات کی ہے۔ اس نے چند روز پہلے تمہارے معمولات اور کمرے کا بیرونی و اندرونی جائزہ لیا ہو گا۔“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کیا۔

”کیا پچھلے دنوں تم نے اسے اپنے کمرے کے آس پاس منڈانے دیکھا تھا؟“

”آپ کی بات دل کو کھینچتی ہے تمہیں ادا صاحب!“ وہ سر کو اٹھاتی جنٹھ دیتے ہوئے سمیرا انداز میں بولا۔ ”اس نے یقیناً ایسا ہی کیا ہوگا لیکن میں نے اسے اپنے کمرے کے آس پاس چکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“

”تم نے جس ٹیوب ویل کا ذکر کیا ہے منظور حسین۔!“ ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔

”وہ کس کی ملکیت ہے؟“

”جواب! قلعہ معصوم شاہ کے سب سے بڑے

زمیندار کا نام ہے برکت باجوہ ... جس لوگ انہیں
 "چودھری صاحب" بھی کہتے ہیں۔ وہ وضاحت کرتے
 ہوئے بولا۔ "یہ نیوہ ویل باجوہ صاحب نے اپنے ڈیرے
 پر لگا رکھا ہے اور انہی کی ملکیت ہے۔ اس کے پانی سے وہ
 اپنی زمین کو سیراب کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو پانی بیچتے
 بھی ہیں۔"

ذیر اور ثیوب ویل برکت باجوه کی ملکیت تھا اور تیل والے خالی اور بھرے ڈرم اسی ثیوب ویل والے کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ طاہر چند راوہ ڈرم اسی وڈیرے سے لے کر آیا ہو، چرا کر یا باگ کر، اس کا فیصلہ ڈیرے پر موجود لوگوں کے بیان کے بعد ہی کیا جاسکتا تھا۔ اسی سوچ کے تناظر میں، میں نے منظور کہہاں سے پوچھا۔

”تم نے جس ڈیرے کا ذکر کیا ہے وہاں برکت باجود
نے اپنے بندے بھی رکھے ہوں گے؟“
”جی ہاں، وہاں باجود صاحب کے دو بندے رہتے
ہیں جو ڈیرے کا نظام اور نیوب ویل کے معاملات دیکھتے
ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ان میں سے ایک کا نام امتیاز
اور دوسرے کا ریحان ہے۔ باجود صاحب کا بیٹا بھی اکثر
ادھر ڈیرے پر ہی نظر آتا ہے۔“
”کیا نام ہے، باجود کے بیٹے کا؟“ میں نے سرسری
لہجے میں پوچھا۔

”ضیا..... ضیا باجوہ!“ منظور کھارنے بتایا۔ ”ضیا بھی کبڈی میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔“

”کیا طاہر چندرا سے بھی زیادہ مہارت؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

میں آج صبح سے ظاہر چند را کا ذکر سن رہا تھا۔ کہڈی کے حوائے سے ہر شخص نے اس کی تعریف کی تھی لہذا میں نے بریکسٹل ترکہ رُیا کے بارے میں بھی پوچھ لیا تھا۔ منظور کہہاں نے جواب دیا۔

”نہیں جناب... ظاہر جندر تو ظاہر جندر تھا۔۔۔“
 کبڈی کے میدان میں کوئی اس کے برابر تو کیا، تانی بھی نہیں
 ہو سکتا۔ قلعہ معصوم شاہ میں جندر اچھا پھر تیرا اور صاف ستھرا
 کبڈی کا کھلاڑی کوئی اور بھی پیدا نہیں ہوا۔۔۔“

میں مزید دس پندرہ منٹ تک منظور کہہ رہا تھا۔ اب میرا ارادہ ٹیوب ویل والے فیر سے کی طرف ہانکے گا تھا۔ منظور نے غلوں میں نیت سے پیشکش بھی کی کہ وہ میرے ساتھ جاتا ہے لیکن

میں نے یہ سوچتے ہوئے منع کر دیا کہ اس کا پانچ، ساڑھے پانچ سال کا بیٹا بخار میں تپ رہا ہے۔ اسے میری راہنمائی کرنے کے بجائے اپنے بیٹے کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ اس لمحہ میں ایک ہی برکت باجوہ تھا، ایک ہی ذریعہ اور ایک ہی نبیب وہی تھا۔ اس محبوب وہی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے قطعاً کسی راہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔

بارش تقریباً رک چکی تھی لیکن آسمان کا بنا ہوا منہ اس بات کا نماز تھا کہ کسی بھی وقت یہ رکنے والا سلسلہ دوبارہ شروع ہو سکتا ہے اور وہ بھی بڑے دھواں دھار اور خطرناک انداز میں۔۔۔!

میں منظور کہار کے گھر سے نکل کر کھیتوں میں سے جوتے ہوئے ٹیوب ویل کی جانب بڑھ رہا تھا کہ مجھے اپنے اعقاب کا احساس ہوا۔ جب سے میں قلعہ معصوم شاہ میں تھا، یہ احساس پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ ہوا تھا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی مگر اس بار یہ احساس قوی تھا لہذا میں نے ایک رک کر اپنے عقب میں دیکھا۔

مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شخص میرے پیچھے آ رہا تھا۔ مجھے اچانک رکستے دیکھ کر وہ بھی ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ میں نے ٹوٹنے والی نظروں سے اس شخص کے چہرے کا جائزہ لیا اور وہ ہنسنا مجھے اس بات کے واضح آثار نظر آئے جیسے میں نے اس کی چوری کلائی ہو۔ وہ بندہ خاصا الجھ کر رہ گیا تھا۔

دو عام سی محل صورت کا نالک ایک دیہاتی تھا۔ دراز قامت، گورا چٹا اور کانچی کا مضبوط۔ میں نے اس کی عمر کا تخمینہ بیس کے قریب لگایا۔ اس کو ٹھنکتے دیکھ کر میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون ہو تم اور..... میں تعاقب کیوں کر رہے ہو؟“
 ”نن..... نہیں..... وہ گڑبڑ اٹھ گیا۔“ ایسی..... تو کوئی
 بات..... نہیں جی.....“ پھر وہ ایک ساتھ اپنی پیشانی کی طرف
 سے جاتے ہوئے قدرے سنبھل کر بولا۔

”وعلیکم السلام!“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔
مفروضی طور پر میرے ذہن نے اس کے بارے میں یہ
فہم حاصل کر لیا۔

نمبر ایک ... وہ خالص چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ نمبر دو ... وہ مجھے تھانے دار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ نمبر تین ... اس نے مجھ پر سب کی آڑ میں میرے سوا کسی کو جواب دیا۔

گول کر دیے تھے اور... نمبر چار... وہ باقاعدہ کسی خاص مقصد سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں تو پھر کسی بات ہے؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تم تعاقب تو میری کر رہے ہو۔“

”وہ جی... آپ اسے اتفاق سمجھ لیں۔“ وہ بڑی خوبصورتی سے صورت حال کو سنہالتے ہوئے بولا۔ ”میں تو ادھر ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔“

”ڈیرے“ کے ذکر پر میں چونک اٹھا اور اسے کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تم برکت باجوہ کے ڈیرے کی بات کر رہے ہو جہاں ٹیوب ویل بھی لگا ہوا ہے؟“

”جی جی ہاں.....“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”جی، میں تو ڈیرے پر ہی ہوتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں باجوہ صاحب کا ملازم ہوں جناب.....!“

میرے ذہن میں منظور کھار کی بات تازہ ہو گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ برکت باجوہ نے ڈیرے کا نظم چلانے کے لیے دو ملازم رکھے ہوئے تھے اور باجوہ کا اکلوتا بیٹا ضیا بھی اکثر و بیشتر ڈیرے پر ہی پایا جاتا تھا۔ منظور کھار نے مجھے ان ملازمین کے نام بھی بتائے تھے۔

”تم ریحان ہو یا امتیاز.....؟“ میں نے اپنے سامنے کھڑے دروازے قامت شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا نام اختیار ہے جناب۔“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تنکے لگا۔ ”آپ کو میرا نام کیسے پتا چلا جی.....؟“

”صرف نام ہی نہیں، مجھے تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”آؤ ادھر ڈیرے پر ہی چل کر بات کرتے ہیں۔“

”کیا آپ ابھی ڈیرے کی طرف جا رہے تھے؟“
اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

میں نے اثبات میں گرون ہلانے پر اکتفا کیا۔
ہم دونوں ہاتھیں گرتے ہوئے ڈیرے کی طرف
بڑھنے لگے۔ اس مختصر سے ساتھ میں، میں نے امتیاز کا
بھرپور اثر و پرک ڈالا۔ مجھے پتا چلا کہ ظاہر چندرا نے خودکشی
والی واردات میں جو تین والدہ ازم استعمال کیا تھا وہ ڈیرے
جی سے نہ جایا گیا تھا۔ پچھلی رات بارش کے سبب امتیاز اور
ریحان کو ڈیرے کے ایک کمرے کے گھیر سوتا پڑا تھا اور
خطے سے بہانی ٹیٹ کھلا رہ گیا تھا۔ ٹیوبہ ٹیلے والے

ہومیو اور دیسی جڑی بوٹیوں کے حیرت انگیز نسخہ جات

موٹاپے

ایک ماہ 30 پاؤنڈ وزن کم 6 گرام

انٹیکو کوئی نئے نسخہ نہیں ہے۔ اس نسخہ میں ایسی جڑی بوٹیاں ہیں جن کا استعمال ہمارے ملک کے لوگوں سے ہزاروں سالوں سے کیا جا رہا ہے۔ اس نسخہ کو ہومیو اور دیسی جڑی بوٹیوں کے حیرت انگیز نسخہ جات میں شامل کیا گیا ہے۔



موٹاپا
ایڈیل سلمنگ کورس

گائیڈڈ علاج

بغیر لیزر



ایک ماہ میں نیم کے
تیرہ سو روپی فالتو
بالوں کا ایک سو روپی
مستقل علاج

برسٹ آپ
ایڈیل ہومیو کورس

ایڈیل ہانت گرو
فزیو تھراپی
فزیو تھراپی

پاکستان ہومیو تھراپی کلینک
چوہدری ناوید پلازہ چوک چوہدری
فون: +92-42-37470123
+92-42-37470128
E-mail: pkhhc@hotmail.com
Website: www.pkhhc.com

کمرے سے باہر اس شخص کو گھسیٹ کر لے آئے۔ گیسٹ سے اندر داخل ہوں تو مذکورہ کمرہ سیدھے ہاتھ پر پڑتا تھا۔ اختیار نے مجھے بتایا کہ اسے اور ریحان کو بالکل پتا نہیں چلا کہ طاہر جندرا کب چلے گا۔ ڈیرے پر آیا اور کب وہ ڈیرم چڑا کر لے گیا۔ وہ ڈیرم چونکہ خالی تھا اور فی الحال استعمال میں نہیں آ رہا تھا لہذا سچ بھی ان کا اس طرف دھیان نہیں گیا۔ پھر جب طاہر جندرا کی خودکشی کی خبر عام ہوئی اور لوگوں نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں یہ المناک واقعہ پیش آیا تھا تو پتا چلا کہ مذکورہ ڈیرم برکت باجوہ کے ڈیرے سے تعلق رکھتا تھا۔ اختیار ہی کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ برکت باجوہ کا بیٹا ضیا باجوہ اس وقت ڈیرے ہی پر موجود تھا۔

ہم بات چیت کرتے ہوئے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ وہ ایک روایتی قسم کا ڈیرا تھا۔ ٹیوب ویل والے کمرے کے علاوہ کچھ چھوٹے چھوٹے کے حامل تین مزید کمرے بھی وہاں موجود تھے جن میں سے ایک کمرے میں جانوروں کا خشک چارا اسٹاک کیا گیا تھا۔ دوسرے کمرے میں مختلف نوعیت کے آلات کھیتی باڑی اور زراعت کا دیگر سامان بھرا ہوا تھا جبکہ تیسرا کمرہ دونوں ملازمین نے اپنے اپنے بیٹھنے اور رہنے کے لیے سیٹ کر رکھا تھا۔ ڈیرے کے وسیع و عریض محکم میں مال مویشی بھی نظر آ رہے تھے اور چند دراز قامت درخت بھی ایستادہ تھے۔

برکت باجوہ کے بیٹے کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک وجہہ و کلکیل اور خوب رو جوان تھا تاہم قد میں تھوڑی مار لگنا تھا۔ اس کی رنگت گندمی اور جسم کئی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔ اس نے خاصی صحت مند موچیں پال رکھی تھیں جن کا اسٹاکل رستم زمان گا مایلو ان سے ملا جلتا تھا۔ ریحان ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رستم زمان کا ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رستم زمان کا ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رستم زمان کا ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رستم زمان کا ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

کمرے سے باہر اس شخص کو گھسیٹ کر لے آئے۔ گیسٹ سے اندر داخل ہوں تو مذکورہ کمرہ سیدھے ہاتھ پر پڑتا تھا۔ اختیار نے مجھے بتایا کہ اسے اور ریحان کو بالکل پتا نہیں چلا کہ طاہر جندرا کب چلے گا۔ ڈیرے پر آیا اور کب وہ ڈیرم چڑا کر لے گیا۔ وہ ڈیرم چونکہ خالی تھا اور فی الحال استعمال میں نہیں آ رہا تھا لہذا سچ بھی ان کا اس طرف دھیان نہیں گیا۔ پھر جب طاہر جندرا کی خودکشی کی خبر عام ہوئی اور لوگوں نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں یہ المناک واقعہ پیش آیا تھا تو پتا چلا کہ مذکورہ ڈیرم برکت باجوہ کے ڈیرے سے تعلق رکھتا تھا۔ اختیار ہی کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ برکت باجوہ کا بیٹا ضیا باجوہ اس وقت ڈیرے ہی پر موجود تھا۔

ہم بات چیت کرتے ہوئے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ وہ ایک روایتی قسم کا ڈیرا تھا۔ ٹیوب ویل والے کمرے کے علاوہ کچھ چھوٹے چھوٹے کے حامل تین مزید کمرے بھی وہاں موجود تھے جن میں سے ایک کمرے میں جانوروں کا خشک چارا اسٹاک کیا گیا تھا۔ دوسرے کمرے میں مختلف نوعیت کے آلات کھیتی باڑی اور زراعت کا دیگر سامان بھرا ہوا تھا جبکہ تیسرا کمرہ دونوں ملازمین نے اپنے اپنے بیٹھنے اور رہنے کے لیے سیٹ کر رکھا تھا۔ ڈیرے کے وسیع و عریض محکم میں مال مویشی بھی نظر آ رہے تھے اور چند دراز قامت درخت بھی ایستادہ تھے۔

برکت باجوہ کے بیٹے کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک وجہہ و کلکیل اور خوب رو جوان تھا تاہم قد میں تھوڑی مار لگنا تھا۔ اس کی رنگت گندمی اور جسم کئی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔ اس نے خاصی صحت مند موچیں پال رکھی تھیں جن کا اسٹاکل رستم زمان گا مایلو ان سے ملا جلتا تھا۔ ریحان ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رستم زمان کا ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رستم زمان کا ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رستم زمان کا ایک پست قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں اختیار کا بھرپور اندر دیکھ کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے اختیار نے دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اسی وقت امتیاز سامان خورد و نوش سے بھی نرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور ہمیں اپنی گفتگو کو خاموشی بنیادوں پر روکنا پڑا۔

ضیا باجوہ نے اپنے ملازم سے پوچھا۔ ”امتیاز! باہر کا موسم کیسا ہے؟“

”بہت خوشگوار ہے باجوہ صاحب“ اس نے بتایا۔ ”بارش کافی دیر سے رکی ہوئی ہے اور ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی ہے۔ آسمان پر بادل بھی چھائے ہوئے ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ باجوہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم ہمارے بیٹھے کے لیے باہر بندوبست کرو، کمرے کے اندر تو جس طور ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں اور باجوہ ڈیرے کے صحن میں، ایک دوسرے کے آسنے سانسے چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ امتیاز نے ہمارے درمیان ایک چھوٹی سی چوٹی میز رکھ کر اس پر کھانے والی ٹرے سجادی۔ مذکورہ ٹرے میں پوریاں اور آم کا جوس آیا تھا۔ یہ بالکل دیہاتی اور دیسی قسم کا آم کا جوس تھا جو ایک مخصوص طریقے سے نکالا جاتا ہے۔ امتیاز ہمیں تنہائی فراہم کرتے ہوئے ڈیرے کے بیرونی گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ریمان بھی اس وقت ڈیرے سے باہر ہی تھا۔

وہ دو پہر کا وقت تھا لہذا ہلکی ہلکی بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے نعمت خداوندی کے ساتھ انصاف جاری رکھتے ہوئے ضیا باجوہ کو مکمل موضوع کی طرف لاکر پوچھا۔ ”تو آپ میرے اس خیال سے مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ کسی بہت بڑی مجبوری ہی کی بنا پر انسان خودکشی کا راستہ اپناتا ہے؟“

”جی ہاں، یہ حقیقت ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور آپ کی سمجھ کے مطابق طاہر جندرا کے ساتھ ایسی کون سی مجبوری تھی کہ اس نے خود کو ختم کر لیا؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ چند لمحات تک حذبذب رہنے کے بعد الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ یقیناً وہ کوئی نہایت ہی اہم بات ہوگی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”باجوہ صاحب! میں نے اب تک تحقیق و تفتیش کی

ہے اس کی روشنی میں طاہر جندرا کا کسی بھی ٹرکی یا عورت کے ساتھ عشق و محبت کا کوئی معاملہ نہیں تھا جو سمجھا جائے کہ کسی نا آسودگی یا نامرادی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے خودکشی کی ہو۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس کی زندگی میں کوئی اور مرد ہی بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ وہ ایک خوش باش اور زندہ دل انسان تھا۔ جس شخص کو کسی بھی قسم کا کوئی روگ نہ ہو وہ بیٹھے بیٹھے یوں خواہ مخواہ خودکشی کیوں کرے گا؟“

”تھا اسے ایک روگ۔“ ضیا باجوہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے بے ساختہ اضطرابی انداز میں پوچھا۔

وہ اپنی ہی صحن میں ہوتا چلا گیا۔ ”ایک ایسا روگ جندرا کو لگ گیا تھا کہ وہ کسی سے اپنی تکلیف کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی پریشانی صرف مجھے ہی پتا تھی۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بڑی تسلی دی تھی لیکن اس کے دل میں جیسے ایک وہم سا بیٹھ گیا تھا۔“

”کیسا وہم؟“ میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔ ”یوں سمجھیں ملک صاحب کہ لوہے کے جندرے کو رنگ لگنے لگا تھا۔“

”ضیا صاحب! بھارت میں نہیں ڈالیں!“ میں نے قدر سے تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ کے دل اور ذہن میں جو کچھ بھی ہے کھل کر بیان کریں۔“

”آئندہ دس منٹ میں ضیا باجوہ نے وضاحت کر دی۔ اس کے مطابق طاہر جندرا کی کبڈی کی صلاحیت نے رنگ پکڑ لیا تھا۔ وہ اپنی کمزوری سے واقف ہو چکا تھا اور پریکٹس کے موقع پر ایک دوسرے جندرا کی کمزوری ضیا باجوہ نے بھی پکڑ لی تھی۔ طاہر جندرا اس حوالے سے بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔“

”جناب! جندرا بہت ہی حساس اور جذباتی بندہ تھا۔ اپنی وضاحت کے اختتام پر ضیا باجوہ نے بتایا۔“ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ کوئی بھی انسان ہمیشہ نبردیں نہیں رہ سکتا۔ انسان کی صلاحیت اور کارکردگی میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں خود اسے اپنے ساتھ پریکٹس کراؤں گا اور میں نے اسے پریکٹس کرائی بھی تھیں۔“

وہ ہلہلا دھواں پھوڑا خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”تجربین کیا جوتہ۔۔۔؟“

”لیکن جناب، حقیقت یہ ہے کہ میں صرف اسے پریکٹس کر سکتا تھا، تسلیاں دے سکتا تھا لیکن اس کے بڑی نیازی سے مراد ہوتے ہوئے خود پر اعتماد کا علاج نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے۔۔۔۔۔ سو فیصد یقین ہے کہ جندرا نے اپنے دل سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی ہے۔“

”ہوں!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”ہو بولا۔“ جندرا کو کسی بھی قیمت پر یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی پڑ میں آیا ہو کھلاڑی خود کو چھڑا کر نکل جائے یا یہ کہ جب وہ کبڈی ڈالنے جائے تو کوئی اس پر ہاتھ بھی رکھ سکے۔ اس کے بے حد جذباتی پن نے اس کے لیے انا کا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا اور یہ مسئلہ اس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔

وہ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”ایک منٹ کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ طاہر جندرا نے تاکامی کے خوف سے دل برداشتہ ہو کر خود کو ختم کر ڈالا ہے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اتنی آسانی سے تسلیم کاغذی ڈرم یہاں سے چرا کر لے گیا اور آپ کے ملازمین کو کانوں کان خبر نہ ہوئی؟ پھر یہ کہ اس کی پلاننگ میں ڈرم ہی کیوں شامل ہوا؟ وہ کسی اور شے پر پڑ کر بھی تو پھانسی کے پھندے کو اپنی گردن میں فٹ دیتا تھا؟ میں اس کمرے سے ڈیرے تک کے فاصلے کو بھی جاننا نہیں جانتا جہاں پھت سے لٹک کر اس نے جان دی ہے۔ اس نے آخر کس بنا پر ڈرم چرا لیا اور ڈیرے سے لڑھکا کر اسے لے کر تک لے جانے کا ریسک لیا؟ اگر وہ ڈرم چراتے ہوئے یا اسے لڑھکا کر لے جاتے ہوئے پکڑا جاتا تو۔۔۔؟“

”دیکھیں ملک صاحب!“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بولی اٹھا۔ ”آپ نے فرمایا تھا کہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اور آپ نے دس سوالیہ باتیں کر ڈالی ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ۔۔۔“

”یہ دس سوالیہ باتیں دراصل ایک ہی بات کی شاخیں ہیں۔“ میں نے قطع کلاری کرتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر اس نے خودکشی کے بارے میں سوچ ہی کی تو اس کام کے لیے اتنا پیچیدہ طریقہ کار اختیار کرنے کی کیا وجہ تھی جس میں سراسر پڑے جانے کا اندیشہ کسی تیز سالنکار کے مانند بر لو سر پر لگتا رہے۔۔۔؟“

”جناب! ان تمام سوالات کے جوابات تو صحیح معنوں میں انداز ہی دے سکتا تھا جواب ہمارے درمیان موجود نہیں تھا۔ میں نے مجھ سے مشاورت کے بعد خودکشی کا فیصلہ نہیں کیا۔“

تھا کہ مجھے اس کے ارادے کی خبر ہو۔ ہاں البتہ۔۔۔۔۔“ وہ لمبے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”البتہ۔۔۔۔۔ جہاں تک میرے ملازموں کی کوتاہی اور عدم توجہی کا تعلق ہے تو میں نے صبح سے لے کر اب تک تین چار مرتبہ انہیں بری طرح چھڑکا ہے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ ہونے والی بات ہو کر ہی رہتی ہے۔ چاہے اس کا بھانڈا کسی کی کوتاہی اور بے پروائی بنے یا کسی کا ظلم اور زیادتی۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا ملک صاحب!“

اس بات سے میں بھی متفق تھا کہ ہونے والی بات کو کوئی نہیں روک سکتا اور یہ بات بھی طے تھی کہ اس قسم کی صورت حال پیش آجائے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا جو کہ ضیا باجوہ اس سلسلے میں کہہ چکا تھا۔

میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور ڈیرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے کیس کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ خودکشی کا نہیں بلکہ سیدہ حاسدہ قاتل کا کیس تھا۔۔۔۔۔!

مذکورہ رپورٹ کے مطابق طاہر جندرا کی موت وقوع کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کا سبب زہر خورانی تھا۔ خوراک کی مدد سے ایک زود اثر زہر اس کے معدے میں پہنچا تھا جس نے چند سیکنڈ میں کبڈی کے ایک عظیم الشان کھلاڑی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز انکشاف یہ تھا کہ جب طاہر کو پھانسی کے پھندے سے لٹکا یا گیا، وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ طاہر جندرا نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ ایک گہری سازش کے تحت اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور بعد ازاں اس کی لاش کو پھانسی دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ طاہر جندرا نے خودکشی کی ہے۔ اب میں نے جانا کہ شروع ہی سے میری چھٹی حس غیر محسوس انداز میں مجھے کیوں تنبیہ کر رہی تھی کہ اس واقعے میں ہمیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ طاہر جندرا کا قاتل کون ہے۔۔۔؟ یہ خاصا سمجھ بھرا سوال تھا جس نے اس کیس کو پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔ میری اب تک کی تحقیق کے مطابق طاہر کا کوئی دشمن منظر عام پر نہیں آ سکا تھا۔ یہی صورت

حال میرے لیے الجھن کا باعث تھی۔ اس نوعیت کا سنگین اقدام کوئی دوست تو اٹھائیں سکتا تھا۔
میں نے طاہر جندرا کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اللہ رکھا کے حوالے کرنے سے پہلے اس سے چند سوالات پوچھنا ضروری سمجھے۔

”اللہ رکھا!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کی رات گھر کے تمام افراد نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا تھا اور اس کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔“
”جی ہاں، میں نے آپ کو یہی بتایا تھا۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور یہی حقیقت بھی ہے۔“
”تم صبح جب سو کر اٹھے تو طاہر کا بستر خالی پڑا تھا۔“
میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ”تم یہی سمجھتے کہ وہ ورزش وغیرہ کے لیے نکلا ہوا ہے اور تھوڑی سی دیر بعد واپس آ جائے گا؟“
”میں نے یہی سوچا تھا جناب!“ وہ دلی گرفت لہجے میں بولا۔ ”لیکن وہ واپس نہیں آیا بلکہ اس کی موت کی خبر۔۔۔“
اس کی آواز رندہ گئی۔

میں نے استفسار کیا۔ ”اللہ رکھا! کیا تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ آدھی رات کو کوئی اسے ملانے نہیں آیا تھا؟“
”اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آتا تو جناب، میں آپ کو ضرور بتاتا۔“ وہ زخمی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آپ آدھی رات کے حوالے سے یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟“
”اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، تمہارے بیٹے کی موت وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ بھی جان لو کہ یہ خودکشی والا معاملہ نہیں۔۔۔!“
”جی۔۔۔!“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں اللہ رکھا!“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”طاہر جندرا کو زہر دے کر موت کی وادی میں دھکیلا گیا ہے اور اس کی موت کے بعد پچاسی پر لاکھ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمہارے بیٹے نے خودکشی کی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور طاہر کے معدے کے نیپارڈی ٹیسٹ نے زہر سے موت واقع ہونے کی تصدیق کی ہے۔ تمہارے بیٹے کو ایک سو پتے سمجھے منصوبے کے تحت باقاعدہ قتل کیا گیا ہے۔“

”ایسا کس نے کیا ہے۔۔۔ اس کا تو کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔۔۔؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”اسی بات کا تو پتا چلتا ہے۔۔۔“ میں نے خود کلاوی واسے انداز میں کہا۔ ”اور میں بہت جلد اس کا پتا چلاؤں گا۔“

وہ ہفتوں کی طرح مجھے نکلنے لگا۔
میں نے کاغذی کارروائی پوری کرنے کے لیے دو چار مزید غمنی سوالات کیے۔ ”اللہ رکھا! وقوعہ کی رات تمہارے گھر میں کیا کیا تھا؟“
”سائن روٹی اور گڑ والے چاول بنے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔
”سائن کس چیز کا تھا؟“
”آلو بیٹلن کا۔“
”تم سب لوگوں نے ایک ہی کھانا کھایا تھا؟“
اس نے اثبات میں جواب دیا۔
”اور کھانا کھانے کے بعد حسب معمول سو گئے تھے؟“

”جی ہاں۔۔۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔
میں نے آخری سوال کیا۔ ”وقوعہ کی رات آپ لوگوں نے لگ بھگ کتنے بجے کھانا کھایا تھا؟“
”یہی۔۔۔ کوئی آٹھ بجے۔۔۔“ اس نے بتایا۔
میں نے طاہر جندرا کی لاش اللہ رکھا کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اطمینان سے اپنے بیٹے کی تدفین وغیرہ سے فارغ ہو لو۔ میں بعد میں تمہارے پاس آؤں گا۔“ میں نے لگائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر تائیدی انداز میں کہا۔
”یہ زہر دانی بات میں نے صرف تمہیں بتائی ہے۔ گاؤں میں کسی اور کو اس کی پہنک نہیں پڑنا چاہیے ورنہ تمہارے بیٹے کا قاتل محتاط ہو جائے گا۔ میں اسے چپ چاپ بٹھانا چاہتا ہوں۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اس کے گھر سے نکل آیا۔
کھانے کے حوالے سے میں نے اللہ رکھا سے جو سوالات کیے تھے وہ احتیاط کا اقتضا تھا ورنہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ ایک سرخ لاش زہر نے طاہر جندرا کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اگر اس کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ موت سے چند منٹ

پہلے زہر دیا گیا تھا، گویا۔۔۔ رات کا کھانا اس کی موت کا سبب نہیں تھا۔

☆☆☆
طاہر جندرا کی تدفین سے اگلے روز ایک نوجوان مجھ سے ملنے تھا۔ اس نے اپنا نام آفتاب بتایا لیکن فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آ سکا کہ وہ کون سا آفتاب ہے۔ یہی وال جب میں نے اس سے کیا تو وہ رنجیدہ لہجے میں بولا۔

”خانے دار صاحب! میں طاہر جندرا کا دوست ہوں۔ آج ہی شیخوپورہ سے واپس آیا ہوں۔ اللہ رکھا نے آپ سے میرا ذکر کیا ہوگا۔۔۔۔۔!“

مجھے فوراً یاد آگیا کہ اللہ رکھا نے طاہر جندرا کے ایک گہرے دوست کا تذکرہ کیا تھا جو اپنے چاچا کے پاس شیخوپورہ گیا ہوا تھا۔
”اچھا۔۔۔ تو تم وہ آفتاب ہو!“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تم تین دن صاحب! یہ سب کیا ہو گیا!“ وہ دھکی لیجے میں بولا۔ ”میں تو طاہر جندرا کو بھلا چکا چھوڑ کر گیا تھا۔۔۔۔۔؟“
”یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، بہت ہی افسوس ناک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کیس کو قتل کرنے کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے آفتاب کیونکہ میری معلومات کے مطابق قاتل معصوم شاہ میں طاہر جندرا سب سے زیادہ قریب تھا۔“

آفتاب کی عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ وہ چھوٹے قد اور تمام سب بدن کا مالک تھا۔ رنگت گوری اور بائیں بازو میں ”مومن سائیز“ تھا، بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ”نیزہ“ کیڈی کے میل کا تحفہ تھا۔ ڈاکٹر کی غفلت نے جوڑ بیج طور پر نہیں بخود تھا جس کے نتیجے میں اس کے بائیں بازو میں لنگ سا پتہ تھا۔ آفتاب کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی موٹی موٹی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں اور شکل و شمائل کی بنا پر کئی قریبی دوستیں وہ بھی شہید دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک بہت جوان تھا جس پر میں اعتماد کر سکتا تھا۔

آفتاب نے میری بات کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”طاہر جندرا میرا اچھا دوست تھا جناب۔ آپ تعاون نہ کریں گے۔۔۔۔۔ اس کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“

یہ تمہارے پر غلوں جذبات ہیں اپنے دوست کے۔ میں نے سناٹے کی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن فی الحال تمہاری جان کی ضرورت نہیں۔ اگر تم اپنے سارے کام چھوڑ کر میری مدد کے لیے تیار ہو جاؤ تو طاہر جندرا کے لیے یہ تمہاری سب سے بڑی قربانی ہوگی۔“
”جی حکم کریں۔۔۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ وہ بڑے غم سے بولا۔

یہ چیک کرنے کے لیے کہ اللہ رکھا نے زہر دانی بات آفتاب سے شیئر کی ہے یا نہیں، میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا تم جانتے ہو، طاہر جندرا کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے؟“

”اس نے چھانسی لگا کر خود کو ختم کر لیا ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”یعنی اس نے خودکشی کی ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

”جی ہاں، میں نے یہی سنا ہے۔“
”اور تم نے یقین بھی کر لیا؟“

”نہیں!“ اس نے بڑی شدت سے گردن کھنٹی میں جھٹکا۔ ”یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوئی۔“

”مجھے بھی ہضم نہیں ہوئی تھی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں نے طاہر جندرا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا تھا۔“

اس نے ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”پھر جناب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا بتاتی ہے؟“

”اس رپورٹ کے مطابق تمہارے دوست کو ایک خطرناک زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔“ میں نے سناتے ہوئے لیجے میں بتایا۔ ”یہ خودکشی کا نہیں بلکہ قتل کا کیس ہے۔۔۔۔۔“

”ظاہر کو کس نے زہر دیا ہوگا۔۔۔؟“ وہ تشویش ناک انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہی تو مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“ میں نے نہایت ہی تحیر سے ہوئے لیجے میں کہا۔ ”تمہاری مدد اور راہنمائی مجھے طاہر جندرا کے قاتل تک پہنچا سکتی ہے۔“ میں نے لگائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔

”تمہارے خیال میں حاکم کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟“
وہ گہری تشویش میں ڈوب گیا۔

میں نے اس کی مشکل کو آسان کرنے کی غرض سے کہا۔ ”میری تحقیق کے مطابق ظاہر نے وقوعہ کی رات اپنے گھر والوں کے ساتھ حسب معمول رات کا کھانا کھایا اور

ہے۔ ہم سب کھلاڑی اسے کپتان کی حیثیت سے برداشت کرنے پر مجبور ہیں ورنہ اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے۔“ آفتاب کی وضاحت نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”تھانیدار صاحب! کیا بات ہے۔“ آفتاب نے پوچھا۔ ”آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟“

جواب میں، میں نے اسے ضیا باجوہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔

”میں سمجھ گیا جناب، اس نے ایسی بات کیوں کی ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”کیوں کی ہے؟“ میں پوچھنے بیٹا نہ رہ سکا۔

”اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔

میں نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔ ”کون سی دو وجوہات؟“

”نمبر ایک.....!“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔

”ضیا کی کبڈی چونکہ واجبی ہے اس لیے وہ طاہر کی ماہرانہ صلاحیت سے حسد کرتا ہے۔ اسے اس بات کی بھی علم ہے کہ

نیم کا کپتان ہونے کے باوجود بھی وہ فن کے میدان میں طاہر سے بہت پیچھے ہے۔ اسی علم اور رقابت میں وہ طاہر کے خلاف اتنی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن اس صفائی کے ساتھ

کہ کسی کو اس کی نیت بلکہ بد نیتی کا پتا نہ چلے جیسا کہ اس نے آپ کو بتایا ہے۔ اس نے طاہر کی خود کشی کا جواز بیان کرتے ہوئے اپنے حاسدانہ جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔“

”اس غلط بیانی پر میں اس سے ضرور باز پرس کروں گا۔“ میں نے پُر غمزہ انداز میں کہا۔ ”اب تم دوسری وجہ کی وضاحت کرو؟“

”دوسری وجہ بھی حسد اور رقابت ہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا سبب کبڈی نہیں.....!“

”پھر کیا سبب ہے؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔

”غزالہ!“

اس کے یک لفظی جواب نے میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”غزالہ..... یہ کون ہے؟“

”غزالہ، ضیا باجوہ کے چاچا کی اکلوتی بیٹی ہے اور ادھر لاہور میں رہتی ہے۔“ آفتاب نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”غزالہ کے ساتھ اس کی منگنی بھی ہو چکی ہے اور اگلے

چند آفتاب تاکہ میں جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔“

”جی..... پوچھیں جناب!“ وہ انھیں زوہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا طاہر چندرا صرف تمہارے ساتھ ہی کبڈی کی پریکٹس کیا کرتا تھا یا اس کام کے لیے وہ پارٹنر

تیار کرنا رہتا تھا؟“

”کسی ٹورنامنٹ سے پہلے تو ہم سب لوگ مل کر پریکٹس کیا کرتے تھے۔“ آفتاب نے بتایا۔ ”لیکن عام دنوں میں سب اپنے اپنے طور پر تیاری جاری رکھتے تھے۔ ہم سب نے اپنا جواز اپنا رکھا تھا۔ جیسے میرا اور طاہر چندرا کا جواز.....“

”کیا ابھی حال ہی میں کبڈی کا کوئی ٹورنامنٹ ہونے والا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ایک ماہ پہلے ہی تو ہم ٹورنامنٹ جیت کر آئے ہیں۔ اگلا ٹورنامنٹ دسمبر میں ہوگا۔“

”گویا آج کل آپ لوگ ایک ساتھ مل کر نہیں بلکہ جوازوں کی شکل میں محنت کر رہے ہو؟“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

”تو شہ نواز ٹامنٹ میں طاہر چندرا کی کارکردگی کیسی رہی تھی؟“

”نمبر دو.....!“ اس نے غریہ لہجے میں بتایا۔ ”بلکہ یہ ٹورنامنٹ ہم نے اسی کی وجہ سے جیتا تھا۔ اس کی کارکردگی مثالی اور نمایاں رہی تھی۔“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔ ”میرا پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا اس دوران میں تم نے اس کی کبڈی میں کسی کمی یا کمزوری کو محسوس کیا، اسے کسی فکر یا پریشانی میں مبتلا

دیکھا؟“

”نہیں جناب، بالکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور پوچھا۔ ”کیا اس ایک ماہ کے دوران میں طاہر چندرا نے ضیا باجوہ کے ساتھ مل کر بھی کبڈی کی پریکٹس کی تھی؟“

”اس ایک ماہ میں کیا، طاہر نے تو مجھے بھی ضیا کے ساتھ پریکٹس نہیں کی تھی۔“ آفتاب نے بڑے وثوق سے بتایا۔

”کیا ضیا باجوہ کی تو اپنی کبڈی بس ایسی ہی ہے، وہ طاہر کو اپنی پریکٹس کرا سکتا تھا۔ وہ چونکہ گاؤں کے چودھری صاحب

ہیں، جو نہ جانا ہے اسی لیے اسے نیم کا کپتان بھی بنا دیا گیا۔“

اسی لمحے میرے ذہن میں ضیا باجوہ کی کئی ہونے والی بات چٹکی۔ اس نے طاہر چندرا کی خود کشی کا ٹھوس جواز پیش کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ ان دنوں اپنی کبڈی کی کم ہوتی ہوئی صلاحیت سے سخت پریشان تھا۔ اسے اس بات کا خوف تھا کہ اگر کبڈی کے میدان میں کسی مرحلے پر اس کی کم ہوتی ہوئی اس کے زندہ درگور ہونے کے مترادف ہوگا۔ وہ کسی بھی قیمت پر شکست کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے آج تک کامیابی کے سوا اور کسی شے کا مت نہیں دیکھا تھا۔ ناکامی اس کے لیے موت کا دوسرا نام تھا لہذا اسی خوف سے طاہر نے خود کشی کر لی تھی کیونکہ وہ پرستاروں کے سامنے شکست کھا کر ذلت کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ چپ چاپ خاموشی سے خود کشی کر لی جائے۔

یہ وہ توجہ تھی جو ضیا باجوہ نے طاہر چندرا کی خود کشی کے ذیل میں دی تھی لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے ثابت کر دیا تھا کہ طاہر چندرا نے خود کشی نہیں کی۔ یہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس تھا۔ میرے جی میں آئی کہ میں طاہر چندرا کی تیزی سے کم ہوتی کبڈی کی صلاحیت کے بارے میں آفتاب

سے بھی تصدیق کروں۔

”آفتاب! تم بھی تو کبڈی کے بڑے سحرے اور پھر تیلے کھلاڑی ہو۔“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے

کہا۔ ”کیا تمہیں طاہر کے ساتھ پریکٹس وغیرہ کا بھی اتفاق ہوتا رہتا تھا؟“

”کیوں نہیں جناب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”ہم نے ہمیشہ مل کر ہی پریکٹس کی ہے بلکہ ہم تو روزانہ ہی ایسی مشق کرتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو تیاری کروانے کے لیے ہم سب نے سب سے زیادہ سچ کا استعمال کرتے تھے تاکہ

مقابلے میں کسی کی کمزوری کا احساس نہ ہو۔“

”تم نے آخری مرتبہ طاہر کے ساتھ کب پریکٹس کی تھی؟“

”شیخوپورہ جانے سے ایک روز پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور اس سے پہلے تم روزانہ اس کے ساتھ پریکٹس کرتے رہے ہو؟“

”جی ہاں۔ بالکل۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

پوچھا۔ ”لیکن آپ اس بات پر اتنی تشویش..... کیوں کر رہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت نہیں ہے آفتاب..... میں نے سمجھ لیا تھا کہ..... تمہیں بہت سوچ کر میرے سوال کے جوابات

سننے کے لیے لیٹ گیا۔ آدمی رات کو وہ گھر سے نکلا۔ وہ خود نکلا یا کسی نے اسے بلایا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال، وہ گھر والوں کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔ وہ جن لوگوں کے پاس پہنچا انہوں نے اسے ایک خطرناک زہر کھانے کی کسی شے میں ملا کر دیا جس سے جھٹ پٹ اس کی موت واقع ہو گئی۔ بعد ازاں انہی لوگوں نے منظور حسین کھار کے کمرے میں طاہر کو پھانسی پر لٹکا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے خود کشی کی ہے حالانکہ درحقیقت انہوں نے طاہر چندرا کی لاش کو پھانسی دی تھی۔“

”آپ نے بار بار..... انہی لوگوں کا ذکر کیا ہے۔“ میرے خاموش ہونے پر آفتاب نے سوال کیا۔ ”کیا آپ کے خیال میں وہ کئی افراد تھے؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال، طاہر کے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے وہ اکیلے آدمی کے بس کا کام نہیں۔ ایک لاش کو پھانسی پر لٹکانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!“ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاہر کا اتنا خطرناک دشمن کون ہو سکتا ہے؟“

”تم طاہر چندرا کے سب سے گہرے دوست ہو۔“

میں نے آفتاب کی غلطی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”لہذا اس کے دشمن کی نشاندہی بھی نہیں کرنا ہوگی..... میں نے تھوڑی دیر تک کر ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اب تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح یہ مت کہہ دینا کہ طاہر چندرا کا کوئی دشمن ہی نہیں تھا۔ سب لوگ اسے چاہتے تھے، اس کے پرستار تھے اور عقیدت کی حد تک اس سے محبت کرتے تھے..... وغیرہ وغیرہ!“

”جناب! حقیقت تو یہی ہے لیکن.....!“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“

”لیکن یہ کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر طاہر کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو یقیناً یہ اس کے کسی دشمن ہی کا کام ہو سکتا ہے۔“

”بالکل.....!“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”میں اسی فیصلے پر غور کرتے ہوئے طاہر کے قاتل تک پہنچنا ہے۔“

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

زیر لب ہنکراتے ہوئے کہا۔ "میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔"

"لیکن ضیا باجوہ پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"تو تشریح بھرے لہجے میں بولا۔

"کیوں؟" میں نے استغابیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا ضیا باجوہ کی چھلاوے کے اولاد ہے؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب۔۔۔" وہ ہلکا گیا۔

"میں نے پوچھا۔ پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟"

"وہ جناب۔۔۔" وہ قدرے سہجے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ضیا اس گاؤں کے چودھری صاحب کا بیٹا ہے۔ ان لوگوں کا اپنا اثر رسوخ ہے اور۔۔۔"

"تم نے ابھی تک قانون کی طاقت نہیں دیکھی؟"

"آقا ب! میں نے سننا ہے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسی لیے ان چھوٹے موٹے چودھریوں کے اثر رسوخ سے مرعوب ہو۔ میں نے بڑے بڑے سوراخوں اور پھینے خانوں کو تھ ڈالی ہے۔ تم دیکھتے جاؤ، میں اس چودھری زادے کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔۔۔" میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ضیا کو گھیرنے کے لیے میں ایک چھوٹا سا ٹیم کروں گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ کس خطرناک جال میں قدم رکھ چکا ہے۔ میں شاطر مجرموں پر کیا ہاتھ ڈالنے کا عادی نہیں ہوں۔ انہیں بڑے طریقے سیکھتے سے قابو کرتا ہوں۔"

"ہاں بھی میں ایک نفسیاتی چال چلوں گا اور بے خیالی میں ضیا آگے بڑھتا چلا آئے گا پھر میں اسے محسوس ثبوت کے ساتھ رفتار کر کے اس کی زبان سے حقیقت اگلاؤں گا۔"

"پھر تو ٹھیک ہے جناب!" وہ قدرے اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

"میں نے کہا۔ لیکن اس کھیل کے لیے مجھے تمہاری معاونت کی ضرورت ہوگی۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔"

"دیر کی گئی!"

☆☆☆☆

جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پیش نظر کوئی نہ ولی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ یا تو وہ کسی ایسی بات کو چھپانے کی کوشش میں ہوتا ہے جو آگے چل کر اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہونے والی ہو یا پھر وہ اس جھوٹ کے توسط سے کوئی ناکامی اٹھانے کی تمکد میں ہوتا ہے، بہر حال۔۔۔ یہ بات سب سے کہ جھوٹ چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، یہ

سال ان کی شادی ہونے والی ہے۔"

"لیکن ضیا کی سنگیتر کا طاہر جندرا کے ساتھ کیا واسطہ؟"

میں نے انہیں زندہ لہجے میں دریافت کیا۔ "تم نے ضیا کے حصار اور قیامت کا حوالہ کیوں دیا ہے؟"

"جناب قصہ کچھ یوں ہے کہ۔۔۔" وہ بھڑے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے ایک ماہ پہلے والے جس کبڈی نورمانٹ کا ذکر کیا ہے، وہ یہاں قلعہ معصوم شاہ ہی میں مقعد ہوا تھا اور اتفاق سے ان دنوں ابور سے غزالہ بھی آئی ہوئی تھی۔ کبڈی نورمانٹ کو گاؤں والے بڑے ذوق و شوق اور جوش و جذبے سے دیکھتے ہیں، اس میں مردوزن اور بچے بوڑھے کی کوئی تفریق نہیں بلکہ تماشا کی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے الگ سے تہو (منٹ) لگا کر بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس نورمانٹ کو غزالہ نے بھی دیکھا تھا اور طاہر جندرا کی پھرتیوں نے اس کے حواس اور جذبات پر اپنی محبت کا جندرا لگا دیا۔ وہ اس گہر و جوان پر بری طرح مرمی مگی۔!"

"اوہ۔۔۔!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "تو یہاں یہ سچ پڑا ہوا ہے۔"

"غزالہ جب تک قلعہ معصوم شاہ میں رہی، طاہر کی کبڈی کی تعریف کرتے ہوئے اس کی زبان نہیں کھلتی تھی اور اس کا یہ عمل ضیا کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ اسی دوران میں غزالہ نے کوشش کر کے طاہر جندرا سے ایک دو ملاقاتیں بھی کر لی تھیں اور طاہر کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے بلکہ اس نے طاہر کو اپنی پسندیدگی کے طور پر ایک انگوٹھی بھی دی تھی۔ طاہر چونکہ مجھ سے اپنا ہر معاملہ بیان کر دیتا تھا لہذا میں نے غزالہ اور اس کی انگوٹھی والی تمام مہمانی بھی مجھے سنا ڈالی تھی۔"

"کیا ضیا کو اپنی سنگیتر کی اس جرأت کا علم تھا؟"

آفتاب خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"انگوٹھی اور طاہر سے ملاقاتوں کا تو شاید اسے علم نہ ہو۔" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "لیکن وہ غزالہ کے تہو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ کس سمت بہنے لگی ہے۔"

"ہوں۔۔۔!" میں نے بھیرے انداز میں ہنکا رہا پھر پوچھا۔ "کیا طاہر نے تجھے والی انگوٹھی نہیں بھی دکھائی تھی؟"

"جی ہاں، دکھائی تھی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "طاہر نے بتایا تھا کہ غزالہ کے مطابق یہ انگوٹھی وہ ضیا کے لیے لائی تھی لیکن طاہر کی کبڈی سے وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس انگوٹھی کا اصلی حقدار اس کی نظر میں طاہر جندرا کے

طور پر دی تھی۔ میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سسکی خیر لیجے میں کہا۔ "اس نے محبوب کی اس نشانی کو ٹریک میں کپڑوں کے نیچے چھپ کر رکھ دیا تھا اس لیے تمہیں بھی اس کے پاس نظر نہیں آتی۔"

"مجھے تو اس انگوٹھی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یہ یقین نہیں آ رہا کہ ظاہر نے عشق و عاشقی دانا کوئی پتھر پال رکھا تھا۔" وہ بھی غلطی انگوٹھی کو اور بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ "میرا بیٹا ایسا تو ہرگز نہیں تھا۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں اللہ رکھا۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "واقعی، یہ کام ظاہر جندرا کے بس کا تھا بھی نہیں۔ وہ تو بہت ہی شرمیلہ اور سیدھا سادا انسان تھا۔ یہ لڑکی خود ہی اس کے پیچھے پڑ گئی تھی اور زبردستی اس بے چارے کو غلطی انگوٹھی کا حقد بھی دے دیا۔"

"کون ہے وہ؟" اللہ رکھا نے بے آواز بلند سوال کیا۔

اس وقت اتفاق سے وہ گھر میں اکیلا تھا۔ کلثوم اور اس کی بیٹی عابدہ، ظاہر کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان گئی ہوئی تھیں۔ میں نے اللہ رکھا کے سوال کے جواب میں بتایا۔

"اس لڑکی کا نام غزالہ ہے۔"

"غزالہ؟" اس کے چہرے پر ابھرنے کے آثار نمودار ہوئے پھر حذب لب لہجے میں اس نے کہا۔ "ہمارے گاؤں میں تو اس نام کی کوئی لڑکی نہیں ہے۔"

"تم غلطی کہتے ہو اللہ رکھا!" میں نے کبریٰ سنجیدگی سے کہا۔ "غزالہ کا تعلق قلعہ معصوم شاہ سے نہیں۔"

"تو پھر.....؟" اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"غزالہ لاہور کی رہنے والی ہے۔"

"پر ظاہر تو بھی لاہور گیا ہی نہیں.....!" اللہ رکھا کی حالت دیدنی تھی۔

"ظاہر تو لاہور نہیں گیا لیکن غزالہ مہینا، ڈیڑھ مہینا پہلے یہاں قلعہ معصوم شاہ آئی تھی۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اس نے ظاہر کی کبڈی کے کمالات دیکھے اور اس پر عاشق ہو گئی پھر... محبت کی نشانی کے طور پر، یہ انگوٹھی اسے دے کر دوا جس لاہور چلی گئی۔"

"جناب! آپ جو کچھ بھی بتا رہے ہیں، اس کا مجھے یقین تو نہیں آ رہا لیکن ظاہر ہے، آپ بھی غلط کیوں نہیں گئے۔" وہ بے بسی کے عام میں بولا۔ "اتنا تو جادوین کہ غزالہ یہاں کس کے گھر آئی تھی؟"

"چودھری برکت باجوہ کے گھر۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"سنگ..... کیا.....؟" وہ گفت زدہ انداز میں بولا۔

"ہاں اللہ رکھا.....!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "غزالہ، چودھری برکت باجوہ کی بیٹی اور ضیا باجوہ کی سگیتر ہے۔ اگلے سال غزالہ اور ضیا کی شادی ہونے والی ہے۔"

"اوغدا یا.....!" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر قہام لیا۔ "یہ کیا غضب ہو گیا۔ چودھری برکت باجوہ تو....."

"کچھ نہیں ہوگا اللہ رکھا!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارے جوان جہان بیٹے کی جان چلی گئی۔ اس سے زیادہ تمہارے ساتھ اور کیا زیادہ ہوگی۔ اللہ رکھا! مجھے یقین ہے کہ ظاہر جندرا کو غزالہ والے معاملے ہی کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے لیکن تم فکر نہ کرو..... میں بہت جلد قاتل کو گرفتار کر لوں گا۔"

اللہ رکھا کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ "مگر اس واردات میں چودھریوں کا ہاتھ ہوتا تو.....؟"

"تو کیا اللہ رکھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جناب! میں بہت غریب آدمی ہوں۔" وہ لہجہ آواز میں آمیز لہجے میں بولا۔ "بہت کمزور ہوں میں۔ میں چودھری کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں مقابلہ کرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ "تمہیں تو پتا بھی نہیں کہ پولیس کس نوعیت کی کارروائی میں مصروف ہے۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ظاہر جندرا نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے زبردستی قتل کیا گیا ہے۔ تم تو اپنے بیٹے کی تدفین کے بعد غمزہ اور دہکی ہو کر گھر میں بیٹھے ہوئے ہو۔ تم نے کسی کی شکایت نہیں کی۔ پولیس جو کچھ بھی کرتی پھر رہی ہے، اس کی تمہیں مطلق خبر نہیں..... تم میری بات تو سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تائیدار صاحب! آپ کتنے اچھے ہیں آپ نے تو میرے دل و دماغ کا سارا بوجھ اتار دیا ہے۔"

"بس، تمہیں اسی طرح غمزہ اور بے خبر بنے رہنا ہے۔ تم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ تمہارے بیٹے نے خودکشی کی ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "باقی کے تمام معاملات تم مجھ پر چھوڑ دو..... اور یہ میرا قلم سے وعدہ ہے کہ اگر میں نے ظاہر جندرا کے قاتل کو گھر سے ناک انجم سے دو چار نہ کیا تو میرا نام بھی ملک مندر حیات سے

وہ عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں اس کے گھر سے نکل کر تھانے پہنچا اور اسے اس جانی سلیمان شاہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس دوران میں جی پھٹکی یونہی ہانڈی شروع ہو چکی تھی۔

سلیمان شاہ کو مجھ سے بہت ساری شکایات تھیں۔ مثلاً یہ کہ میں اس کا اور اس کی صلاحیتوں کا استحصال کر رہا ہوں۔ اسے کام کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ اسے بے کار اور فضول کاموں پر لگائے رکھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی ترقی ہو لے یا اسے کوئی بھی اہم مشن نہیں سونپتا وغیرہ وغیرہ۔ اسی حوالے سے اس نے ایک دو بار اعلیٰ افسران سے بھی اپنا دکھنوار پیا تھا لیکن کہیں سے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی تھی۔ اس ناکامی سے اس نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ میں نے اس کے خلاف اور بریک کان بھر رکھے ہیں۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔

سلیمان شاہ کی اس بدگمانی کا میرے پاس کوئی علاج تھا اور نہ ہی میں نے بھی اس کی کوئی خاص پروا کی تھی۔ میں اگر اسے اہم ذمے دار یاں نہیں سونپتا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ میں اس کی صلاحیتوں اور کارکردگی سے بے غرضی آگاہ تھا۔ میں اچھے خاصے بننے ہوئے کام کو بگاڑنے کا ہرگز ہرگز کوئی شوق نہیں رکھتا تھا لہذا اسے اس کی اوقات میں رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا، وہ چودھری برکت باجوہ کے تنگ خواروں میں سے تھا اسی لیے مجھے ایک شرارت سوجھی تھی۔ اسی شرارت کے ذیل میں، میں نے سلیمان شاہ کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

میں نے ہمیشہ اس بات کو سخت ناپسند کیا تھا کہ میرے محلے کا کوئی آدمی تھانے سے زیادہ کسی اور کا تنگ خوار اور دلا دار ہو۔

سلیمان شاہ نے میرے کمرے میں آ کر مجھے سلام کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی اس عادت سے بھی مجھے چڑھائی کہ اسے آرام کی پڑی رہتی تھی۔ جہاں بھی کوئی خالی کرسی درجہ دیکھتا، کھٹک سے بیٹھ جاتا تھا۔ کئی بات تو یہ ہے کہ اگر بات چاہے مختلف ہی کیوں نہ رہی ہوں، ہم دونوں ایک کمرے سے بہت بیزار اور تنگ تھے۔

"شاہ جی! میں نے آپ کے لیے ایک مشن نکالا ہے۔" میں نے سلیمان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں آپ کی ترقی ملے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، آپ کو سب انسپکٹر بنا کر کسی تھانے میں

قبل مسیح

سن عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کا یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں قبل مسیح آتا ہے۔

اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردش ایام کو بچے کی طرف دوزاٹے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ذہنی "فٹنس" آسن "کرنا پڑتا ہے جو ارتقائی دشوار ہے جتنا اگلے پہاڑ سے سناٹا، اس کو غالب علموں کی خوش قسمتی کیسے کہ تاریخ کل میلاد مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔

اگرچہ مؤرخین کو شاید ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل 753 قبل مسیح میں پڑی تو وہ نیچے سے ہاتھ اٹھا کر سوال کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کیسے پتا چل گیا کہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے میں 753 سال باقی ہیں جان کی سمجھ میں ہے بھی نہیں آتا کہ 753 ق۔ م کو ساتویں صدی شمار کریں یا آٹھویں؟ عقل مند استاد ان جاہلانہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں، آگے چل کر جب یہی سچے پڑتے ہیں کہ سکندر 350 ق۔ م میں پیدا ہوا اور 323 ق۔ م میں فوت ہوا۔ تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچھا! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

مفتاح احمد پری کی کتاب چراغ تلے سے انتہاس مرسد: تفسیر عباس باہر، ادکاڑہ

انچارج مقرر کر دیا جائے۔"

اس زمانے میں محلے کی کمی کے باعث سب انسپکٹر کے عہدے کے لوگوں کو بھی تھانیدار بنا دیا جاتا تھا۔ چھوٹے گاؤں دیہات میں یہ چلن عام دیکھنے کو ملتا تھا۔

میری مبہم سی پیش کش پر اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور حذب لب لہجے میں پوچھا۔ "کون سا مشن ہے جناب؟"

"قلعہ معصوم شاہ سے ایک بندے کو گرفتار کر کے تھانے لانا ہے۔"

"کس بندے کو؟" اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

”خیا کو.....“ میں نے دھماکا کیا۔ ”خیا باجوہ کو.....!“
 ”چودھری برکت باجوہ کے بیٹے کو.....؟“ اس نے
 پھنسی پھنسی آواز میں تصدیق چاہی۔
 ”ہاں ہاں..... میں اسی باجوہ کی بات کر رہا ہوں۔“
 میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ
 خیا باجوہ کا نام سن کر پریشان کیوں ہو گئے ہیں۔ کوئی مسئلہ
 ہے کیا؟“

”مسئلہ تو کوئی نہیں جناب!“ وہ جربز ہوتے ہوئے
 بولا۔ ”لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ باجوہ صاحب کو کس جرم میں
 گرفتار کر کے لانا ہے؟“
 ”اس کے جرائم کی ایک لمبی فہرست ہے میرے
 پاس۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”آپ یہ بتاؤ شاہجی.....
 کہ خیا باجوہ کو گرفتار کرنے جا رہے ہو یا نہیں.....“ میں نے
 لحاظی توقف کیا پھر معنی خیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”یہ آپ کے لیے ترقی کرنے کا آخری موقع ہے.....
 اب فیصلہ کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

چند لمحات کے بعد سر مل کی آواز میں
 بولا۔ ”جاتا ہوں جناب.....“
 جب اسے ایسی آئی سلیمان شاہ میرے کمرے سے
 رخصت ہو گیا تو حوالدار محفوظ علی میرے پاس چلا آیا۔ میں
 نے سلیمان کو جس مشکل میں ڈالا تھا وہ راز محفوظ علی کو بھی معلوم
 تھا۔ اس نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔
 ”ملک صاحب! آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا شاہجی خیا
 باجوہ کو گرفتار کر کے لے آئیں گے؟“

محفوظ علی بہت ہی جی دار اور کام کا بندہ تھا۔ میرے
 عملے کا سب سے زیادہ قابل بھروسہ شخص وہی تھا۔ میں ہر
 نازک معاملہ اس سے شیئر کیا کرتا تھا۔ اس نے بھی مجھے مایوس
 نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔
 ”شاہجی کی حکمت جاتی قابلیت پر ہم دونوں میں اتفاق
 رائے پایا جاتا ہے لہذا میرا حتمی جواب یہ ہے کہ..... ہرگز ہر
 گز نہیں۔ سلیمان شاہ ایک ایسا کھوتا ہے جسے صرف گھاس
 کھانے سے مطلب ہوتا ہے۔ یہ خیا باجوہ کو گرفت میں لینے کا
 تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ دو کام کرے گا۔“
 میں نے لحاظی توقف کیا تو حوالدار سوالیہ نظروں سے
 مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”نمبر ایک۔ یہ بندہ (اسے ایسی آئی) تھوڑی دیر
 باہر گھوم پھر کر خالی ہاتھ واپس آ جائے گا اور آکر بتائے گا کہ
 تلاش کے باوجود جی خیا باجوہ کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ قلعہ

مصر میرے کمرے کا تھا اور ڈرامے کا آغاز ہو چکا
 تھا۔
 امتیاز میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر
 موت کی زد کی چھائی ہوئی تھی کیونکہ ٹرائل روم سے اس کے
 ساتھی ریحان کے بلبلانے اور چلانے کی آوازیں مسلسل ابھر
 رہی تھیں۔ چند منٹ پہلے ہی حوالدار محفوظ ان دونوں
 دشمنوں کو گرفتار کر کے لایا تھا اور میں نے ریحان کو حوالدار
 کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”پہلے اسے ٹرائی کرو۔ امتیاز
 کی باری بعد میں آئے گی۔!“
 اور حوالدار اس وقت تفتیشی کمرے میں ریحان کی
 ”ٹرائی“ کر رہا تھا۔ دراصل، حوالدار کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔
 چھپنے چلانے، ڈکرانے اور بلبلانے کی آوازیں ایک
 کانٹیل کی تھیں جو مختلف آوازوں کی نقالی کا ماہر تھا۔ یہ سارا
 صوتی ڈراما امتیاز کو متاثر کرنے کے لیے رچا گیا تھا۔
 چند لمحات کے بعد اذیت اور کرب میں ڈوبی ہوئی وہ
 آوازیں ابھرنا بند ہو گئیں۔ پھر خطرناک تیوروں کے ساتھ
 حوالدار کمرے میں داخل ہوا اور چٹائی لہجے میں بولا۔
 ”ملک صاحب! طرم نے زبان کھول دی ہے۔ وہ
 اپنے جرم کا اقرار کرنے کے لیے تیار ہے۔ آپ اس کا اقبالی
 بیان لے لیں۔“
 ”ٹھیک ہے.....“ میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے
 ہوئے کہا پھر امتیاز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔
 ”اب تم اسے بھی لے جاؤ اپنے ساتھ۔!“
 امتیاز نے دہشت زدہ نظروں سے باری باری مجھے اور
 حوالدار کو دیکھا پھر خوشامد بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔
 ”تمنا میرا صاحب میں حوالدار کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔
 میں تباہی میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“
 میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے۔
 ریحان کی مصنوعی آہ دیکھا اور دلخراش چیخوں نے اس کا چٹپٹا پی
 کر دیا تھا۔ وہ کسی ٹرائل سے گزر رہے بغیر ہی اقبال جرم کا
 فیصلہ کر چکا تھا۔ میری نفسیاتی چال ابتدا ہی میں کامیابی سے
 ہنگامہ بوری تھی۔
 میں نے حوالدار کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چند
 اشارے کیے پھر امتیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک
 ہے۔ تم ادھر میرے کمرے ہی میں بیٹھو، جو لوگ پولیس سے
 قاتل کرتے ہوئے بچے جاتے ہیں ہم انہیں ایک تھپڑ بھی نہیں
 دیتے۔“ پھر میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ

کیا۔ ”تم یہاں رک کر امتیاز کی نگرانی کرو، میں ابھی ریحان
 کا بیان لے کر آتا ہوں، پھر اس سے بھی بات ہوگی..... اور
 ہاں، اس کے ساتھ کوئی مار پیٹ نہیں کرنا۔“ آخری جملہ میں
 نے بڑے ذومعنی انداز میں ادا کیا تھا جس کا واضح مطلب
 یہی تھا کہ پروگرام کے اگلے حصے پر فوراً عمل ہونا چاہیے۔
 میں دوسرے کمرے میں ریحان کے پاس پہنچا ہی تھا
 کہ تیسرے کمرے سے ”امتیاز“ کے ڈکرانے کی آوازیں
 ابھرنے لگیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ امتیاز کی نہیں
 بلکہ اداکار کانٹیل کی آوازیں تھیں۔ حوالدار نے میری
 ہدایت کے مطابق اسے دوبارہ ”متحرک“ کر دیا تھا۔ اس
 سے پہلے بھی جو ”آوازیں“ ابھری تھیں، وہ بھی یقیناً ریحان
 نے سنی ہوں گی۔“
 ریحان نے بے حد سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا
 اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے جناب.....؟“
 ”تفتیشی ہو رہی ہے۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔
 ”یہ تمہارے ساتھی امتیاز کی درد میں ڈوبی ہوئی آوازیں ہیں۔
 اس کے بعد تمہاری باری آئے گی۔ ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔“
 ”دلیل..... لیکن..... ہمارا قصور کیا ہے.....؟“ وہ پچھلی
 ہوئی آنکھوں سے مجھ دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”یہ تو تم لوگ اپنی زبان سے خود ہی بتاؤ گے.....!“
 میں نے سیاہ لہجے میں کہا۔
 میں تھوڑی دیر تک مختلف انداز میں ریحان کو خوف
 و ہراس میں مبتلا کرتا رہا۔ اس دوران میں ”امتیاز“ کے
 رونے، بلکنے اور بلبلانے کی آوازیں مسلسل ابھرتی رہیں پھر
 خاموشی چھائی۔ اگلے ہی لمحے حوالدار محفوظ علی میرے پاس
 پہنچ گیا، اس اطلاع کے ساتھ۔
 ”ملک صاحب! طرم امتیاز نے زبان کھول دی ہے۔
 وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے کو تیار ہے، آپ اس کا اقبالی
 بیان ریکارڈ کر لیں.....“
 میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے،
 میں امتیاز کا بیان لیتا ہوں۔ تم ذرا اس کو بھی چیک کر لو۔“ بات
 ختم کرتے ہی میں نے انگلی سے ریحان کی جانب اشارہ کیا۔
 وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قدموں میں گر گیا پھر
 فریادی لہجے میں بولا۔ ”جناب! آپ مجھ سے تفتیش نہ کریں۔
 میں کسی مار پیٹ کے بغیر ہی اپنے جرم کا اقرار کرنے کو تیار
 ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے!“ میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے
 ہوئے کہا۔ ”تم ریحان کا خیال رکھو۔ میں امتیاز کا بیان قلم بند

کرنے کے بعد اس کا بیان لوں گا۔“

اس کے بعد میں نے ضیا باجوہ کے دونوں ڈشکروں کے ساتھ ایک جیسی چال چلی۔ امتیاز کے پاس آکر میں نے اسے بتایا کہ ریحان نے اقرار کر لیا ہے کہ وہ دونوں نے ضیا باجوہ کے ایما پر طاہر جندرا کو پہنچا دیا ہے۔ یہ کہہ کر ہلاک کیا پھر اس کی لاش کو چھائی پر لٹا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ امتیاز نے جب یہ صورت حال دیکھی تو نہ صرف اقبال جرم کر لیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہی طاہر جندرا کو گھر سے بلا کر ڈیرے پر لایا تھا کہ باجوہ صاحب کو اس سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔ میں امتیاز کے پاس سے اٹھا اور ریحان کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ امتیاز نے طاہر جندرا کو گھر سے بلا کر ڈیرے پر لایا ہے اور پھر زبردستی سے ہلاک کرنے کا اقرار کر لیا ہے۔ اس قتل میں تم بھی اس کے سہمگنی تھے۔ اب بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو؟“

ریحان کی ہمت تو پہلے ہی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اقبال جرم کے علاوہ اس نے اس بات کا بھی اقرار کر لیا کہ انہوں نے یہ کام ضیا باجوہ کے حکم پر کیا تھا اور..... یہ حقیقت وہ عدالت میں کھڑے ہو کر بیان کرنے کو بھی تیار ہے۔

میں نے باری باری دونوں کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ان کے انگوٹھے لگوائے اور انہیں حوالات کے دو قلف کمروں میں بند کر دیا۔ ان کا ایک جلد رہنا ضیک نہیں تھا ورنہ میری چالاکي کار ازل کھل جاتا۔ ویسے مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ میری چال کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ وہ مجرم تھے، انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا تھا اور اپنے اس سنگین جرم کا حلیفہ اقبال بھی کر لیا تھا، کسی ٹرائل سے گزرنے کے بعد یا اس سے پہلے..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

امتیاز اور ریحان کے اقبال جرم کے تھوڑی دیر بعد اسے ایس آئی سلیمان شاہ حسب توقع خان ہاتھ داپس آگیا۔ میں نے اس کی انگلی ہوئی صورت دیکھ کر پوچھا۔

”شاہ جی! کیا رہا؟“

”وہ جناب.....“ وہ انگڑی وضاحت پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”ضیا باجوہ صاحب تو گاؤں سے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ ویسے میں نے بڑے باجوہ صاحب، چودھری برکت کو بتا دیا ہے کہ ضیا باجوہ کو ملک صاحب قہانے میں بلا رہے ہیں۔“

”اور آپ کو یقین ہے، ضیا جیسے ہی واپس آئے گا..... میں نے طرز یہ سب نہیں کہا۔“ تو برکت باجوہ اسے

کان سے پکڑ کر تھانے پہنچا دے گا؟“

”انہوں نے وعدہ تو کیا ہے جی۔“ وہ نگاہ جرات سے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا..... یا تو وہ موضع قلعہ معصوم شاہ گیا ہی نہیں تھا اور یا پھر وہ وہاں پہنچ کر باجوہ اینڈ کمپنی کو ”اطلاعات“ فراہم کر آیا تھا۔ اس کی کارکردگی زیادہ دیر جیسے والی نہیں تھی لہذا میں نے بڑے ٹیمے انداز میں طفر کرتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی! آپ کے پھیرے نے بڑا کام دکھایا ہے۔ چودھری برکت باجوہ نے اپنے ڈیرے کے ملازمین امتیاز اور ریحان کو قہانے پہنچ دیا تھا۔ میں نے ان سے کڑی پوچھ گچھ کر کے حوالات میں بند کر دیا ہے۔ میں خواجہ ضیا باجوہ کو قصور وار سمجھ رہا تھا۔ اصل مجرم تو یہی دونوں بندے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک طاہر جندرا کے قتل کا اعتراف تو نہیں کیا لیکن جب میں انہیں خطرناک تفتیش سے گزاروں گا تو وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے اسی جیسے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ فکر نہ کرو شاہ جی۔ میں آپ کی ترقی کے لیے ضرور سفارش کروں گا۔ آپ نے کوشش تو پوری کی ہے نا۔ اب اگر ضیا باجوہ گاؤں میں موجود ہی نہیں تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے.....“

وہ خاموش بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا تاہم منہ سے کچھ نہ بولا۔ شام سے ذرا پہلے سلیمان شاہ کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی۔ چودھری ضیا باجوہ اپنے دو حواریوں کے ہمراہ سچے سچے تانے میں بیٹھ کر قہانے پہنچ گیا۔ وہ خاصا فیس میں دکھائی دیتا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس وقت آفتاب بھی قہانے میں سوہو دھا۔ اس ڈرامے میں اس کا بھی ایک اہم کردار تھا۔

میں نے آفتاب کو فی الحال ضیا کے سامنے نہیں آنے دیا اور ضیا باجوہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حوالدار محفوظ علی چونکہ اس گیم میں میرا اہم راز تھا اور اس کا کردار ایک پیش کار کا سا تھا لہذا وہ بہ خوبی جانتا تھا کہ کب کس مہرے کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ بدستور میرے کمرے میں موجود تھا۔

میں نے ضیا باجوہ پر بالکل یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ یہاں اب تک کیا ہو چکا ہے اور مزید کیا ہونے والا ہے۔ میں نے اسے اور اس کے باڈی گارڈ ڈوکوزت سے بٹھایا اور ان کے تاثرات کے پیش نظر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”خیریت تو ہے باجوہ صاحب! آپ پہلی مرتبہ قہانے آئے ہیں اور وہ بھی اتنے غصے میں.....“

”ملک صاحب! آپ نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ مجھے مجبوراً آپ کے پاس آنا پڑا.....“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کے اعتماد اور جارحانہ انداز سے مجھے یہ سمجھنے میں ذرا وقت پیش نہ آئی کہ سلیمان کے توسط سے یہ اطلاع اس تک پہنچ گئی ہے کہ میں طاہر جندرا والے کس میں اسے بے قصور سمجھتا ہوں جب ہی وہ بے خوف و خطر مجھ سے ملنے قہانے چلا آیا تھا۔ میں نے سلیمان شاہ کو دانستہ یہ بھی بتایا تھا کہ امتیاز اور ریحان نے اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا تا کہ ضیا باجوہ غائب ہونے کے بجائے انہیں چھڑانے فوراً قہانے پہنچ جائے اور بالکل ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ ضیا بے چارے کو پتا نہیں تھا کہ اس نے قہانے میں قدم رکھ کر خود کو کتنی بڑی مصیبت میں پھنسا لیا تھا۔

”میں نے ایسا کون سا کام کر دیا ہے باجوہ صاحب؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”آپ نے طاہر جندرا کے قتل کے الزام میں میرے دو بندوں کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔“ وہ کھلی آغیز لہجے میں بولا۔

”الزام میں نہیں باجوہ صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غصے لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس ان کے جرم کا ثبوت بھی ہے۔“

”ثبوت!“ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ یہ غشاف اس کے لیے خلاف توقع تھا، اضطرابی لہجے میں اس نے پوچھا۔ ”کس قسم کا ثبوت.....؟“

”اس قسم کا ثبوت.....!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ اچھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے نیز کی دراز کھول کر پوسٹ مارم کی رپورٹ باہر نکالی اور نمبر سے ہونے لہجے میں کہا۔

”باجوہ صاحب! میں جانتا ہوں، انگریزی میں تحریر زبردستی رپورٹ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی لہذا میں ہی آپ کو اس کا مفہوم بتاتا ہوں۔ یہ طاہر جندرا کے پوسٹ مارم کی رپورٹ ہے اور اس رپورٹ کے مطابق اس جوان رعنا کو قودہ نارات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان زبردستی ہر ہلاک کیا گیا تھا اور بعد میں اس کی لاش کو بھائی پر لٹا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ طاہر جندرا نے خودکشی کی ہے۔“

”جندرا نے خودکشی کی تھی یا اسے زبردستی ہر ہلاک کیا.....“ وہ رعب جھانے والے انداز میں بولا۔ ”اس کی موت سے میرے بندوں کا کیا تعلق.....“

”تعلق..... تعلق..... تعلق.....!“ میں نے اس کے جارحانہ استفسار کا برا منائے بغیر معتدل انداز میں دہرایا پھر دراز میں ہاتھ ڈال کر طلالی انگوٹھی برآمد کر لی اور اسے ضیا باجوہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے تعلق جناب باجوہ صاحب.....!“ طلالی انگوٹھی کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے شناسائی کی جھلک دیکھی، اضطرابی لہجے میں متفسر ہوا۔ ”یہ انگوٹھی آپ کو کہاں سے ملی.....؟“

”کیا آپ اس انگوٹھی کو پہچانتے ہو؟“ میرے لہجے میں سختی شامل ہونے لگی۔

”نہیں.....!“ وہ گڑبڑا گیا پھر سنبھلا لیتے ہوئے بولا۔ ”مم..... میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ اس انگوٹھی..... سے یہ کیسے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہر جندرا کی موت کے ذمے دار میرے بندے ہیں.....؟“

اس نے جی کڑا کر مجھ سے سوال تو کر لیا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے اندر بڑی خوفناک ٹوٹ پھوٹ جاری تھی اور اس شکست و ریخت کے آثار اس کے چہرے اور آنکھوں میں بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔

میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ”یہ انگوٹھی مجھے طاہر جندرا کی جامد تلاش کے دوران میں ملی تھی۔ بعد میں، میں نے اس انگوٹھی کے حوالے سے تفتیش کی تو پتا چلا کہ اسے لاہور کے انارکلی بازار کے ایک جیولری دکان سے خرید لیا تھا۔“

میں نے بڑے منتقلی انداز میں غلط بیانی کر کے حقائق کو اجاگر کر رہا تھا۔ یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا۔ اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔

”میں انارکلی بازار کے جیولر کے پاس پہنچ گیا۔ جب میں نے اسے یہ انگوٹھی دکھا کر پوچھا کہ اس کے خریدار کا نام بتاؤ تو اس نے غرا دانی ایک لڑکی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ غزالہ کے باپ، کی اسی بازار میں گھڑیوں وغیرہ کی دکان ہے۔ میں اس دکان پر پہنچ گیا اور وہاں جا کر میں نے غزالہ کے باپ رحمت باجوہ سے ملاقات کی اور مجھی یہ بات میرے علم میں آئی کہ رحمت باجوہ تو تمہارا چاچا ہے اور غزالہ تمہاری منگیتیر۔ اگلے سال تم لوگوں کی شادی ہونے والی ہے۔“

اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری اس وضاحت کے جواب میں کیا ہونے والا ہے۔



انتساب

تویر ریاض

تخلیق کا چاہے کوئی بھی ذریعہ ہو... ہوتا بہر حال تکلیف دہ ہے... جس میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اس نے بھی جب قلم کا سپارا لیا تو کئی سپاروں سے دوڑی ہو گیا... لیکن تخلیق کے مراحل میں ایسا کب ہوتا ہے جیسا اس کے ساتھ ہوا... اس پر نہ صرف وہ خود حیران تھا بلکہ شاید پڑھنے والے بھی ششدر رہ جائیں گے۔

ایک ناکار کا بچہ نکال دینے والا انداز تحریر

پیٹرک پندرہ سال کا تھا جب اس نے چارلی ویٹرڈن کا سنسنی خیز ناول آئی ڈاکٹر پڑھا۔ یہ چارلی کا پہلا ناول تھا اور اس کا شمار کلاسیکی ناولوں میں ہوتا تھا۔ اس نے اس سے پہلے ایسی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اور نہ ہی وہ سوچ سکتا تھا کہ کسی ناول میں تشدد اور گروہی جرائم کی اتنی حقیقی عکاسی کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد وہ نہ صرف چارلی کا بہت بڑا مداح بن گیا بلکہ اس نے چارلی کی تحریروں کو ڈیوڈ ہونڈلر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کی ہر آنے والی کتاب کی اشاعت کا بے چین سے انتظار کرتا اور مارکیٹ میں آتے ہی اسے خریدنے پہنچ جاتا۔ وہ چارلی ویٹرڈن کی شخصیت اور اس کی تحریروں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود بھی مصنف بننے کا فیصلہ کر لیا۔ کالج میں اپنے لیے انگریزی ادب کا مضمون منتخب کیا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ایک ناول کے سوا کچھ نہ لکھا۔

ہو، مجھے تم پر کیسے شک ہوا؟“ میں نے رک کر سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ مرمل سی آواز میں بولا۔ ”شک... کیسے؟“ ”تمہارے جھوٹ کی نقاب کشائی کے بعد! میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا پھر حوالدار محفوظ علی کو ایک مخصوص اشارہ کرنے کے بعد دوبارہ ضیا باجوہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”تم نے طاہر جندرا کی کبڑی کی صلاحیتوں کے زوال کے حوالے سے مجھے بتا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے شکست اور ناکامی کے خدشے کے پیش نظر، دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی تھی مگر آفتاب کی زبانی مجھے پتا چل گیا کہ جندرا تو ہمیشہ کبڑی کی پریکٹس اس کے ساتھ کیا کرتا تھا اور یہ کہ... اس کی کارکردگی، پکڑ، جکڑ، پھیرنے اور صلاحیت میں ذرا بھی کمی یا کمزوری واقع نہیں ہوئی تھی۔ تم نے یہ جھوٹ اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے بولا تھا نا؟“

میں نے اس کے فرار کے تمام راستے مسدود کر دیے تو وہ جھرجھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آ... غائب...!“ اسی لمحے حوالدار، آفتاب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ضیا باجوہ کا رنگ مزید اڑ گیا۔ میں نے حوالدار سے کہا۔ ”محفوظ علی! ذرا حوالاتیوں کو بھی یہاں لے آؤ تاکہ باجوہ صاحب کو اقبال جرم کرنے میں کسی دقت یا تکلیف کا سامنا نہ ہو۔“

اس کے بعد میرے کمرے میں جس قسم کی قانونی کارروائی ہوئی ہوگی، اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس، اتنا سمجھ لیں کہ ایک گھنٹے کی گرامری اور زمانری کے بعد میں نے ضیا باجوہ کی جان اس وقت چھوڑی جب اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

مجھ سے جان چھوٹنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے اسے اور اس کے معاونین کو حوالہ عدالت کر دیا تھا جہاں سے لمبی سزائیں پا کر چھوٹنے کے بعد وہ تینوں سیدھے جیل چلے گئے۔

اس کیس میں تفتیش کے نام پر ایک تھپڑ تک مارنے کی نوبت پیش نہیں آئی تھی۔ مارییٹ اور مختلف ٹرائل کے بغیر کرائے جانے والے ”اقبال جرم“ کو عدالت بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور عوام بھی اس عمل کو لائق تحسین جانتے ہیں۔

یہ کیس بھی کچھ اسی نوعیت کا ثابت ہوا تھا۔

”غزالہ نے اسے دی... اس لیے پہنچی!“ فضا نے خفت بھرے انداز میں باری باری اپنے حواریوں کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئے تو بولے ”غزالہ نے یہ انگوٹھی... اسے کیوں دی تھی؟“

”اس لیے دی تھی کہ...“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کہ وہ جندرا کو دل و جان سے پسند کرنے لگی تھی۔ یہ انگوٹھی جندرا کے لیے غزالہ کی محبت کا تحفہ تھی۔ وہ انگوٹھی لائی تو تمہیں دینے کے لیے تھی لیکن کبڑی ٹورنامنٹ میں طاہر جندرا کی کارکردگی نے اس کا دل موہ لیا اور اس کی محبت کا دھارا تمہاری طرف سے مڑ کر جندرا کی جانب بہنے لگا۔ اس نے واپس لاہور جانے سے پہلے تمہاری

میں جندرا سے ایک دو ملاقاتیں بھی کیں...“ ”یہ جھوٹ ہے!“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ چیخ سے مشابہ لہجے میں بولا۔ ”سراسر بکواس...!“ ”کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ...“ میں نے اس کے پیش اور برہمی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دلوک انداز میں پوچھا۔

”تمہیں غزالہ اور جندرا کے معاملے کا علم ہو گیا تھا اور اسی لیے تم نے ایک سازش کے تحت جندرا کو اپنی راہ سے ہٹایا ہے؟“ ”میں نے... جندرا کو...“ وہ مصروفی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”میں جندرا سے دشمنی کیوں کروں گا... پتا نہیں، آپ کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں...؟“ ”جب انسان چشم پوشی اور ڈھٹائی کے توسط سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو تو اسے ہر منقول اور سیدھی بات الٹی ہی نظر آتی ہے۔ اس میں تمہارا کچھ زیادہ قصور نہیں...“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ تم غزالہ کے جھکاؤ کے باعث جندرا کے دشمن ہو گئے تھے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمہارے بندوں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ میں ان کے اقبالی بیانات قلم بند کر چکا ہوں کہ کس طرح انہوں نے تمہارے علم پر پہلے طاہر جندرا کو گھر سے بلا کر ڈیرے پر پہنچایا اور کھانے کی کسی شے میں ایک خطرناک زہر کھلا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کے لیے اس کی لاش کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ علم اور زیادتی تمہارے کہنے پر کی گئی تھی ضیا باجوہ، طاہر جندرا کی موت کے ذمے، اور صرف اور صرف تم ہو اختیار اور ریمان نے تو تمہارے خمر کی قبیل کی تھی اور تم

www.paksociety.com

اسے اپنی جوانی کے قسے سنایا کرتا جب اس کا جرم پیشہ افراد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔
 ”ایک بات واضح کروں۔“ وہ اکثر کہا کرتا۔ ”ان لوگوں سے میرا ملنا جلنا ضرور تھا لیکن میں نے کبھی کوئی واردات نہیں کی۔ ساتھ رہ کر ان کے طریقہ کار کا مشاہدہ کیا کرتا تھا یا ان کا کوئی چھوٹا موٹا کام کر دیتا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے کسی کی ٹانگیں توڑی ہوں یا کسی عظیم جرم کا ارتکاب کیا ہو، یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ کہیں تم میرے بارے میں کوئی غلط خیال دل میں نہ لاؤ۔“

پیٹرک جانتا تھا کہ چارلی کی ان باتوں میں کوئی کھوٹ نہیں ہے، جب وہ جرم پیشہ لوگوں کے درمیان رہنے کا اعتراف کر سکتا ہے تو اس کے لیے کسی اور جرم کا اقرار کرنا مشکل نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ چوتھریس سال کا ہو چکا تھا اور اس عمر میں آدمی پہلے سے زیادہ راست باز، صاف گو اور نڈر ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں بھی اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ چوڑا سینہ، مضبوط موٹے موٹے بازو اور چوڑی ہتھیلیاں۔ اب بھی وہ کسی کو تھپڑ رسید کر دے تو اس کی ضرب سے مقابل کے چہرے پر سرخ نشان ضرور پڑ جائے گا گو کہ اس کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن ان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور وہ انہیں بڑی نفاست اور سلیقے سے سنوارتا تھا۔ اس کے جہز سے بھاری اور چہرہ چوڑا تھا جس پر جاہ جاذبوں کے نشانات اس بات کی پختی کھارہے تھے کہ اس کی جوانی بڑی ہنگامہ خیز رہی ہوگی۔

چارلی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے کر دھوئیں کے مرغولے بنا رہا تھا اور پیٹرک سوچ رہا تھا کہ اس عمر میں بھی اس کا انداز مجرموں اور بدعماشوں جیسا تھا اور اسے دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا مصنف ہے۔ پیٹرک عقیدت کے عالم میں اپنے استاد کو دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ چارلی کی بیوی ایش کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کے کندھے داہنا شروع کر دیے۔ وہ غالباً اس سے پندرہ سال چھوٹی ہوگی۔ پیٹرک نے اس کی جوانی کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت حسین اور شاندار رہی ہوگی لیکن اب بھی دیکھنے میں وہ خوب صورت لگتی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر اور ہنسنے پر خاص توجہ دی تھی اسی لیے اس کے چہرے پر بہت کم جھریاں تھیں اور وہ آج بھی اپنے بالوں کو اسی رنگ میں رنگتی تھی جو بیس سال پہلے تھا۔ چارلی نے گردن موڑے بغیر بیوی سے پوچھا کہ کھانے میں تھکن دیر ہے، پھر وہ انداز مذاق بولا۔ ”ذرا اس لڑکے کی

تھا لیکن اب اسے اپنی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے الماری کھول کر اپنا اکلوتا سیاہ رنگ کا سوٹ نکالا جس کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ پیٹرک نے اپنی سستی اور بے پردائی پر لعنت بھیجی اور سوچنے لگا کہ اگر اس نے اس سوٹ کو ڈرائی ٹیکن کر دیا ہوتا تو یہ خاصا بہتر ہو سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ جیسے ہی چار پیسے ہاتھ میں آئیں گے۔ وہ اپنے لیے ایک نیا سوٹ ضرور خریدے گا۔

چارلی نے پہلے کی طرح اس کا خوش دلی سے استقبال کیا پھر اس نے پیٹرک کے سامنے اس کا مسودہ رکھ دیا جس کے کمزور حصوں پر اس نے نشان لگا رکھے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”لڑکے! میں تمہاری تعریف کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا کیونکہ تمہیں تعریف کی نہیں بلکہ تنقید کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی بے جا تعریف انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اب تم میری شاگردی میں آگئے ہو تو یہ میرا فرض بنتا ہے کہ تمہاری کمزوریوں اور خامیوں کی نشان دہی کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے جن حصوں پر نشان لگائے ہیں۔ انہیں فور سے پڑھو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کھانے میں کتنی دیر ہے؟“

اس شام چارلی نے اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ وہ سر جھکائے عقیدت سے انہیں سن رہا۔ اس کے ذہن میں کچھ سوال بھی ابھرے لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ایک نشست میں پورے مسودے کا احاطہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے چارلی نے اسے اجازت دے دی کہ وہ جب چاہے اس سے ملنے کے لیے آسکتا ہے۔ اس کے بعد چارلی اور پیٹرک کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ اب ان کے درمیان صرف پیٹرک کے مسودے پر ہی گفتگو نہیں ہوتی تھی بلکہ دیگر موضوعات بھی زیر بحث آتے تھے۔ چارلی کا مشاہدہ بہت وسیع اور گہرا تھا۔ وہ ہر واقعے کو اس طرح بیان کرتا جیسے وہ خود بھی اس میں شامل رہا ہو، اب پیٹرک کو اندازہ ہوا کہ چارلی کی تحریریں پڑھ کر حقیقت کا گمان کیوں ہوتا ہے۔

پیٹرک روزانہ انہیں تو ایک دن چھوڑ کر چارلی کے پاس ضرور جاتا۔ یوں لگتا تھا کہ چارلی صرف اس کا استاد ہی نہیں بلکہ ان میاں بیوی نے اسے گود لے لیا ہے۔ چارلی کی بیوی ایش بالکل اپنی اولاد کی طرح پیٹرک کا خیال رکھتی تھی۔ وہ آئے دن اسے نت نئے مزے دار کھانے بنا کر کھلاتی اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر بیڈروم میں چلی جاتی تو استاد اور شاگرد شراب سے دل بہلانے بیٹھ جاتے۔ چارلی

علاوہ کسی سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسی لیے چارلی کا فون سننے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔

وہ مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر اپنے محبوب مصنف سے ملنے کے لیے نکل گیا۔ پہلی ملاقات میں وہ وہیں پہنچے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے لیکن اس پوری نشست کے دوران میں چارلی نے اس کے مسودے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا جبکہ پیٹرک اس کی رائے جاننے کے لیے بے چین تھا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ خود ہی یہ موضوع چھیڑ دے لیکن چارلی کی شخصیت کا رعب اس سوچ پر حاوی ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں چارلی اسے بے وقت کی راگنی سمجھ کر ناراض نہ ہو جائے چنانچہ وہ بڑے صبر اور سکون کے ساتھ اس امید پر بیٹھا اس کی باتیں سن رہا کہ جلد یا بدیر وہ خود ہی اس موضوع پر بات کرے گا۔

یہ طویل نشست رات گئے ختم ہوئی۔ چارلی اسے دروازے تک چھوڑنے آیا اور پر جوش انداز میں رخصت کرتے ہوئے بولا۔ ”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تمہارے اندر ایک ہونہار مصنف بننے کی صلاحیت ہے۔ تم جب جاؤ مشورے اور رہنمائی کے لیے میرے پاس آ سکتے ہو۔ میں تمہیں کامیاب مصنف بننے کے گر سکھائوں گا بشرطیکہ تم شاگرد بننا قبول کرو۔“

پیٹرک کو ایک بار پھر اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ چارلی جیسا معروف شخص اسے اپنا شاگرد بنانے پر آمادہ ہے۔ اس سے زیادہ اسے اور کیا چاہیے۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ وہ چارلی ویٹرون کے حلقے میں شامل ہو رہا ہے۔ اس نے جھک کر چارلی کے ہاتھ کو عقیدت سے بوسہ دیا اور جلد آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا آیا۔

دوسری ملاقات خاصی نتیجہ خیز رہی۔ وہ اسی ادھیز بن میں تھا کہ چارلی سے دوبارہ ملنے کے لیے کب جانا مناسب ہوگا لیکن یہ مشکل بھی چارلی نے آسان کر دی۔ اس نے تیسرے دن ہی فون کر کے پیٹرک کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ ”لڑکے! آج کی شام میرے پاس تمہارے لیے تھوڑا سا وقت ہے اگر فارغ ہو تو آ جاؤ۔ ہم تمہارے مسودے پر گفتگو کر لیں گے اور ہاں تم، ڈرن بھی میرے ساتھ ہی کرو گے۔“

پیٹرک کا سینہ فخر سے تن گیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ چارلی کو اس کا مسودہ پسند آ گیا ہے۔ جیسا وہ اسے اتنی اہمیت دے رہا ہے۔ اس روز پیٹرک نے چارلی کے گھر جانے کے لیے خاص اہتمام کیا۔ وہ عام طور پر جینز اور ٹی شرٹ پہنا کرتا

اغرامات پورے کرنے کے لیے اس نے قالینوں کی دکان پر ملازمت اختیار کر لی جو فروخت کے ساتھ ساتھ گھروں اور دفاتر میں قالین بچھانے کی خدمت بھی سرانجام دیتی تھی۔ جب پیٹرک کو پہلی بار یہ خدمت انجام دینے کے لیے ایک محل نما مکان میں بھیجا گیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے پڑھ رکھا تھا کہ اچھی تحریر کے لیے گہرا مشاہدہ بہت ضروری ہے۔ اس کا خیال تھا کہ گھروں اور دفاتر میں جانے سے اس کا مشاہدہ بڑھے گا اور اسے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے اور انہیں پرکھنے کا موقع ملے گا۔ وہ دکان میں آنے والے گاؤں کا بھی عین نظروں سے جائزہ لیتا۔ ان کے لباس، چال ڈھال، انداز گفتگو اور رویوں کا بغور مشاہدہ کرتا۔ اسے ہر گام کے چہرے پر ایک تحریر لکھی ہوئی نظر آتی جیسے وہ اپنے ٹیکل کی قوت سے کہانی کا روپ دینے کی کوشش کرتا۔

ایک طویل عرصے تک چارلی ویٹرون اس کا ہیرو رہا اور اب وہی عظیم مصنف نہ صرف اس کا استاد بن چکا تھا بلکہ ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ دونوں چارلی کے نیو جرسی والے گھر کے قریبی محن میں بیٹھے شراب اور کیک باکے مگاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جبکہ کچن سے آنے والی گوشت کے پارچوں کے بھنے کی خوشبو ان کی اشتہا کو مزید بڑھا رہی تھی۔

ان دونوں کے عشق کا آغاز بھی بڑے دلچسپ اور منفرد انداز میں ہوا۔ ایک سال پہلے پیٹرک نے چارلی کو اپنا تحریر کردہ مسودہ بھیجا تھا۔ اسے یہ خوش بھی تھی کہ شاید وہ اس ناول پر اپنی رائے ضرور دے گا لیکن اسے اس بارے میں بہت زیادہ توقع نہیں تھی کیونکہ چارلی ایک مشہور اور مصروف مصنف تھا اور اس کے پاس شاید اس کا مسودہ پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ہوگی جبکہ اس کے مقابلے میں چھبیس سالہ پیٹرک ایک غیر معروف مصنف تھا جس کی ابھی تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے چارلی کا فون موصول ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا ”لڑکے! تمہارے مسودے میں کچھ اچھا مواد موجود ہے لیکن اسے مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے، کیوں نہ ہم ساتھ بیٹھ کر کام کریں؟“

اس نئے پیٹرک نے اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا بڑا مصنف اس جیسے نوآموز کے لیے اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکال سکے گا۔ ویسے بھی اس نے چارلی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ بہت ہی الگ تھلک زندگی گزارنے کا عادی ہے، نہ کہیں جاتا ہے اور نہ کسی کو اپنے گھر لاتا ہے۔ اپنے ہمشیر کے

تقسیم نہیں ضرب

اشفاق احمد کا مطالعہ و مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ باحول اور انسانوں کا بنور مشاہدہ کرتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کر لیتے تھے۔ ایک بار وہ باغ میں اپنے نو عمر بیٹے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بچہ کھیل رہا تھا باغ کے مالی نے دیکھا تو نزدیک آیا اور پوچھا۔ ”بابو جی سی آپ کا بچہ ہے؟“

”جی ہاں۔“ انہوں نے کہا۔
”اللہ رکھے بہت پیارا بچہ ہے، ایسے بچوں سے تو ہر بندہ پیار کرتا ہے۔“
اشفاق صاحب نے پوچھا۔ ”آپ کے ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں؟“
”جی میرے دس بچے ہیں۔“

اشفاق صاحب حیرت سے بولے۔ ”کمال ہے، آپ اتنے بہت سارے بچوں میں اپنا پیار کیسے تقسیم کر سکتے ہو؟“
مالی نے جواب دیا۔ ”بابو جی پیار تو تقسیم نہیں کرتے۔ اس کو ضرب دیا کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا مگر اشفاق صاحب بیٹھے سوچتے رہے کہ ایک اُن پڑھ مالی کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔
مرسلہ: تقسیم جاس با برادار کا ذہ

ایک سے بڑھ کر ایک

نوجوان نے اپنا سفری بیگ کندھے پر لٹکا کر ہوئے جذباتی لہجے میں باپ سے کہا۔ ”ڈیڈی! میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتا ہوں، عیش و عشرت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ خوبصورت لڑکیوں کے سنگ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ خدا را مجھے مت روکیے۔“
”کون کم بخت تمہیں روک رہا ہے؟“ باپ نے اٹھتے ہوئے کہا۔
”میں تو خود تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔“

مرسلہ: نابالایا ایمان و حافظ آباد

بیٹہ ترک سے حیرت سے چارلی کی جانب دیکھا۔ اس روز تیس تاریخ تھی۔ اس نے چارلی کو اپنی جانب متوجہ کیا اور چارلی کو اشارے سے یہ بات بتائی۔ چارلی نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے بیٹہ ترک کی جانب سے اپنا منہ پھیر لیا۔ وہ بچی مگر سخت آواز میں باتیں کر رہا تھا تاہم بیٹہ ترک کے کانوں تک اس کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔

”میں تم سے مذاق کر رہا تھا۔ جانتا ہوں کہ آج کیا تاریخ ہے۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لیتا کہ میں یوزھا ہو گیا ہوں اور مجھے تاریخ بھی یاد نہیں رہتی۔“ پھر اس نے ایک لمبا وقت لیا اور پھر اپنے مخاطب کو نسل دیتے ہوئے بولا کہ وہ بالکل پریشان نہ ہو۔ اس سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا کیا جائے گا۔ بات ختم کرنے کے بعد وہ کافی دیر خاموش بیٹھا خلا میں گھورتا رہا پھر بیٹہ ترک نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری باتوں سے تو یوں لگا جیسے کسی کتاب کا مسودہ دینے کی آخری تاریخ گزر گئی ہو؟“
”ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ وہ خالی خالی نظروں سے بیٹہ ترک کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی جھلک رہی تھی اور اس کے ہونٹ نیچے کی جانب لٹک گئے تھے۔
”میں اس وقت ایسے ان دونوں کے لیے تازہ میز لے آئی اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ کھانا تیار ہے لہذا وہ اندر آ جائیں۔“

کھانے کے دوران میں بھی چارلی خاموش اور گم مسم رہا۔ ایسے معمول کے مطابق اس سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ اس کی ہر بات کا جواب ہوں، ہاں میں دے رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایسے برتن دھو رہی تھی بھی چارلی نے بیٹہ ترک کو ایک طرف لے جا کر کہا کہ اسے اس کی مدد چاہیے۔

”مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے، وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ آٹنے جانے میں آدھ گھنٹا لگ جائے گا۔ اس طرح ہم اپنا کام ختم کر کے ایک گھنٹے میں واپس آ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں!“ بیٹہ ترک نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
چارلی نے سر ہلایا اور بے ترتیب قدموں سے چلتے

چارلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کس واقعے کا ذکر کر رہے ہو۔“
”ہاں۔ واقعی تم کچھ نہیں جانتے۔“ بیٹہ ترک نے طنز کیا۔
”میں سچ کہہ رہا ہوں کہ واقعی نہیں جانتا لیکن تم کافی بولڈ ہو رہے ہو۔ تمہیں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔“
”میں نے تمہارا ناول پڑھا ہے۔ تم وہ ناول لکھ ہی نہیں سکتے تھے مگر تم نے خود کسی جرائم پیشہ گروہ کے ساتھ کام نہ کیا ہو۔“

”وہ سب میرا تخیل تھا۔“ چارلی نے اپنی شہادت کی انگلی کو دماغ پر مار دے ہوئے کہا۔ ”یہ سب باتیں میرے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اپنے علاقے میں لڑکوں کی زبانی ایسی کہانیاں سنا کرتا تھا۔ ان میں کچھ جی خور بھی تھے جو اپنی بڑائی اور اہمیت جتانے کے لیے معمولی سا واقعہ بھی نمک مرچ لگا کر بیان کرتے۔ میں جرم کی یہ داستانیں غور سے سنتا اور اپنے ذہن میں محفوظ کرتا رہتا پھر جب کچھ لکھنے بیٹھتا تو تخیل کے ذریعے اپنی تحریر میں کچھ اس طرح رنگ آمیزی کرتا کہ پڑھنے والے یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں بھی جائے واردات پر موجود تھا، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں نے کبھی اس طرح کی کسی واردات میں حصہ نہیں لیا۔“

”ٹھیک ہے، میں بھی ان لڑکوں سے مل کر کچھ کہانیاں سننا چاہوں گا۔“
چارلی کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھوں میں حسرت کی لہر ابھری اور وہ سمجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ”یقیناً تمہیں ان سے ملنے کا اشتیاق ہو رہا ہو گا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جن لڑکوں کو میں جانتا تھا وہ مر چکے ہیں یا ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ عرصہ دراز سے میرا ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس لیے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

اسی لمحے چارلی کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا۔ وہ ایک سستا سا ڈیپوزیٹ بل سپٹ تھا جسے دیکھ کر بیٹہ ترک کو یقین ہو گیا کہ چارلی انتہائی نجس شخص ہے۔ اس نے فون کان سے لگا یا اور کئی منٹ تک دوسری جانب سے کی جانے والی گفتگو سن رہا پھر اس کے چہرے پر سختی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

”تم کیا بات کر رہے ہو؟“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”میں تاریخ میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟“

حالت تو دیکھو، بھوک سے اس کا دم نکلنے والا ہے۔ ہمیں جلد از جلد اسے کھانے کو کچھ دے دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ یہ اس دنیا سے کوچ کر جائے۔“
ایس نے ہلکا سا تہقید لگایا اور بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ مزید پانچ منٹ تک زندہ رہ سکے گا۔“
”میں کچھ نہیں جانتا۔ اس لڑکے کی کھال ویسے ہی ہڈیوں سے چپکی ہوئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ہماری نظروں کے سامنے ہی ضائع ہو جائے۔“

وہ کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لے رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ چند ہفتوں میں چارلی کے گھر کا کھانا کھا کر بیٹہ ترک کا وزن میں پونڈ بڑھ گیا تھا۔ ایس نے آنکھیں سمھاتے ہوئے کہا کہ وہ پانچ منٹ میں کھانا لگا دے گی۔ چارلی نے یہ سن کر اس کے عقب میں سینی بجائی۔ ایس نے مرکز دیکھا اور مسکراتے ہوئے کچن میں داخل ہوئی۔
”آہ!“ چارلی نے ایک سرود آہ بھرتے ہوئے کہا۔
”ابھی بیوی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔“ پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”لڑکے تمہیں بھی ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے۔“

”میں اس بارے میں غور کر رہا ہوں۔“ بیٹہ ترک نے ٹالنے والے انداز میں کہا پھر سمجھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم نے میرا تازہ مسودہ دیکھ لیا ہے؟“
”ہاں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب تم میری بتائی ہوئی باتوں سے قریب ہوتے جا رہے ہو۔ پلاٹ، ٹیمپو، ڈھانچا اور کردار سب کچھ بہت اچھا ہے۔ یہ کتاب اور بھی اچھی ہو سکتی ہے لیکن اب بھی اس کے کچھ حصے حقیقت سے دور ہیں۔ خصوصاً بینک میں ڈاکے والا منظر۔ اس میں بالکل بھی حقیقت نظر نہیں آتی۔“

چارلی نے ایک اور دھوئیں کا سرغولہ بنانے کے لیے توقف کیا، پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں زندگی میں مزید تجربات کی ضرورت ہے۔ تم اس دنیا کو کسی مضبوط انسان کی نظر سے دیکھو۔ شراب خانوں میں ہونے والے جھگڑوں میں ٹانگ اڑاؤ۔ کسی شوٹنگ رینج میں جا کر دیکھو اور یہ محسوس کرو کہ سب کا نشانہ کیسے لیا جاتا ہے؟“

بیٹہ ترک نے بابوی سے سر ہلایا۔ اسے امید تھی کہ یہ آخری مسودہ اس کے استاد کو ضرور پسند آئے گا۔ اس نے خوشک لہجے میں کہا۔ ”کیا تم مجھے اپنے کسی پرانے دوست سے نہیں ملوا سکتے تاکہ میں بھی تجربے حاصل کرنے کی خاطر کچھ لوگوں کی ٹانگیں توڑ دوں جیسا کہ تم نے ایک دفعہ کیا تھا؟“

کمرے سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس نے ہاتھ میں ایک جم بیک تھا۔ اس نے بیٹرک کو اپنے پیچھے اسے کا اشارہ کیا پھر وہ کچن کے دروازے پر رک کر اٹھیں۔
”میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔“
تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔“

”تم دونوں کو باہر نکلنے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“ وہ اپنے شوہر کو نڈرتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں جانتی کہ یہ لڑکا تمہارے ساتھ کلب یا بار میں جا کر بکر جائے۔“
چارلی نے اس کی بات سن کر برا سا منہ بنایا اور وہ کچن کے بغیر کمرے سے باہر آ گئے۔ بیٹرک اس کے پیچھے پیچھے نکل رہا تھا۔ کمرے سے چند میل کے فاصلے پر واقع ایک شاہجہاں مال کی پارکنگ لائٹ میں اس نے اپنی کیڑی لیک کھڑی کی اور وہاں پر پہلے سے موجود ایک پرانے ماڈل کی جیپ میں سوار ہو گیا۔ بیٹرک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اسے چارلی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ سامان ایک جگہ بچھا ہے۔ لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت سناؤں گا۔“
”میرا خیال ہے کہ وہ فون کتاب کے مسودہ کے بارے میں تھا جس کی تاریخ آج ختم ہو رہی ہے۔“
”ہاں۔ وہ فون کتاب کے بارے میں ہی تھا لیکن یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔“

ان کی منزل پارکاس تھی۔ راستے میں چارلی نے سیاست اور دی وی شوز کے بارے میں مختصری گفتگو کی لیکن وہ زیادہ تر مضطرب اور پریشان ہی نظر آتا رہا۔ اس کی باتوں کے جواب میں بیٹرک نے جو کچھ کہا، چارلی نے اس پر کبھی کوئی توجہ نہیں دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی بیٹرک نے غصوں کیا کہ اس پر فینڈ کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو چارلی کی بے ربط گفتگو اور دوسری بڑی وجہ اس کا بنا ہوا مزے دار کھانا اور بیٹرک کی اور اس کا خمار ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ان کی گاڑی ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئی۔ بیٹرک کے تجسس میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب اس نے دیکھا کہ چارلی نے ڈرائیو سے میں بیٹھنے سے پہلے ہی گاڑی کی ہیڈلائٹس بجھا دی تھیں۔

جیسے ہی وہ گاڑی سے باہر آئے۔ چارلی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گھر کے بغلی دروازے کے پاس پہنچ کر اسے نہ پریم بیک سے وٹی شے نکالی

اور بیٹرک کو پکڑا دی۔ اندر رہا ہونے کی وجہ سے وہ نہ دیکھ سکا لیکن وہ لوہے سے بنی ہوئی کوئی چیز بھی اور زیادہ بھاری بھی نہیں تھی۔ چارلی نے دروازے پر انگلی سی دنگ دی۔ اس دوران بیٹرک کو اندازہ ہو چکا تھا کہ چارلی نے اسے ایک ہسپتال تھمایا ہے جبکہ ایسا ہی ایک ہتھیار اس کے پاس بھی تھا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا۔ چارلی نے بلا توقف فائر کر دیا۔ گولی اس شخص کے سینے میں لگی جس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ شخص پیچھے کی جانب گرا۔ کیونکہ ہسپتال میں سائیکلنگ لگا ہوا تھا اس لیے گولی چلنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ بیٹرک کے لیے یہ ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ ابھی وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ چارلی نے ہلکا سا دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ وہ شخص جس انداز میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ ایک دہلا پتلا شخص تھا اور اس کی عمر بہ مشکل تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے خاکی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو دل کے قریب گولی گھسنے سے خون میں تر ہو گیا تھا۔ چارلی نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر گولی چلائی جو اس کی دائیں آنکھ پر لگی پھر وہ مڑا اور تقریباً غرائے کے انداز میں اس نے بیٹرک کو اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ بیٹرک نے اس کی تعمیل کی۔ اس وقت وہ ایک معمولی طرح عمل کر رہا تھا چنانچہ اس نے چارلی کے اگلے حکم کا انتظار نہیں کیا اور اس کے کہے بغیر ہی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اندر سے کسی دوسرے آدمی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی نوٹی نامی شخص سے یہ آواز بلند ہو چ رہا تھا کہ دروازے پر کون سے؟ چارلی تیزی سے اس جانب بڑھا جہاں سے آواز آرہی تھی۔ بیٹرک نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کا ذہن ابھی تک اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی جاسوسی ناول کا سنسنی خیز باب پڑھ رہا ہے بلکہ خود بھی اس کا ایک کردار بن گیا ہے۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھے۔ ایک شخص ہاتھ روم سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً یہی شخص نوٹی کو آواز دے رہا تھا۔ دھمکنے والے کے مقابلے میں عمر میں بڑا، لہبا اور جسمانی طور پر مضبوط نظر آ رہا تھا۔ اس نے جب چارلی کو دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھیل گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی کمر میں لگی بیٹی سے ہسپتال نکالتا، چارلی نے بے درپے تین فائر کر کے اس کے سینے کو گولیوں سے چھللی کر دیا۔ وہ لڑکھڑاکر پیچھے کی جانب گرا۔ چارلی آگے بڑھا تاکہ مرنے والے کی جیبوں کی تلاشی لے سکے۔ ابھی وہ جھکا ہی تھا کہ اسے بیٹرک

کے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ بری طرح چونک گیا کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق گھر میں کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ وہ اپنے ہسپتال کی پانچ گولیاں پہلے ہی استعمال کر چکا تھا اور درمیان میں بیٹرک کے ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ آگے والے فرد کو نشانہ بنا سکے۔ وہ برہم ہوتے ہوئے بولا۔ ”لڑکے! تمہارے پیچھے کوئی ہے، اسے روکو۔“

بیٹرک نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے گولی چلا دی۔ چارلی کی طرح اس کے ہسپتال میں بھی سائیکلنگ لگا ہوا تھا چنانچہ گولی چلنے کی ہلکی آواز سنائی دی۔ وہ ایک لڑکی تھی جو نیم عریاں حالت میں یہ دیکھنے کے لیے بیڈ روم سے نکل آئی کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ اس کی عمر بہ مشکل تیس برس رہی ہوگی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اس کے لیے سنہری بال عریاں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

بیٹرک نے ایک ساتھ دو گولیاں اس کے پیٹ میں اتار دی تھیں اور وہ جاں کنی کے عالم میں فرش پر لپٹی کر رہی تھی۔ بیٹرک خوف اور دہشت کے عالم میں پچھلی پچھلی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور حیران تھا کہ اس سے یہ فعل کیسے سرزد ہو گیا؟ ہسپتال چلانا تو درکنار اس نے بھی اس ہتھیار کو ہاتھ بھی نہیں لگا یا تھا۔ البتہ ٹلموں اور کپڑوں میں اس کے بارے میں ضرور دیکھا اور پڑھا تھا۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت جاری تھی اور لگتا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کو بیٹھا ہے۔ دوسری جانب چارلی بڑے اطمینان سے مرنے والے کی سٹاشی لینے میں مصروف تھا۔ اس نے اس کی جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بیٹرک کو غور سے دیکھا جو ابھی تک سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ غصے سے بولا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے لڑکے! کیا گولی چلا کر پچھتا رہے ہو؟ اس لڑکی کی شکل آسان کیوں نہیں کر دیتے؟“

اس نے چند لمحے بیٹرک کے رد عمل کا انتظار کیا لیکن جب اس نے کوئی حرکت نہیں کی تو وہ خود آگے بڑھا اور لڑکی کی ٹانگیں میں گولی مار دی۔ واقعی اس گولی نے لڑکی کی مشکل آسان کر دی اور وہ پتھر کی بے جان مورٹی کی طرح ساکت ہو گئی۔ بیٹرک کو یہ سب کچھ ایک خواب کے مانند لگ رہا تھا۔ لڑکی کی موت کا منظر اس کے لیے شدید صدمے کا باعث بنا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ کسی بت کے مانند پچھلی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اس کے برعکس چارلی کے اعصاب بالکل پرسکون

تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی معمول کی کارروائی میں حصہ لیا ہو۔ وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر بیٹرک سے اس کا ہسپتال لے لیا پھر اس نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں اس مکان سے باہر آ گئے۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس علاقے کے لوگ جلد سوجانے کے عادی ہیں۔ سڑک پر بھی پرانے نام ٹریفک تھا اور اکا دکا گاڑی گزرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ بیٹرک نے گاڑی کا دروازہ کھول کر دونوں ہسپتال بیک میں رکھے اور چابی بیٹرک کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

”گاڑی تم چلاؤ گے۔ مجھے اسٹریپ مال کے پارکنگ لائٹ کے قریب اتار دینا جہاں میری لیک کیڑی کھڑی ہوئی ہے۔ پھر تم یہ گاڑی نیو آرک کے علاقے میں اس پتے پر چھوڑ دینا۔“ اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

بیٹرک نے ایک معمولی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور اس سے اسٹریٹنگ سنہاٹا مشکل ہو رہا تھا۔ چارلی نے اپنی جیب سے ایک بوٹس نکالی اور اس کے ڈھکنے میں مشروب انڈیلنے ہوئے بولا۔ ”یہ پنی لو۔ اس سے تمہارے اعصاب پرسکون ہو جائیں گے اور تم اپنی دنیا میں واپس آ جاؤ گے۔“

بیٹرک نے ایک ٹھونٹ لینے کے بعد جتنی نگاہوں سے چارلی کی طرف دیکھا تو اس نے بوٹس ہی اسے تھما دی جسے وہ ٹھونٹ ٹھونٹ کر کے خالی کر گیا۔

”اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں نے جوانی میں ورزش کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا ہے۔“ چارلی نے سپاٹ آواز میں کہا، البتہ اب اس کے لہجے میں نرمی آئی تھی۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کتنا بڑا مصنف ہوں اور یہ چیز مجھے جرم کی راہ پر چلنے سے نہیں روک سکتی کیونکہ آدمی ایک بار اس دلدل میں چھس جائے تو مرتے دم تک اس سے نہیں نکل سکتا۔ اس کے لیے معافی اور توبہ کا ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔“

بیٹرک نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو ضبط کیا۔ وہ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ اس کا بس چھٹا تو ہسپتال کی باقی گولیاں چارلی کے سینے میں اتار دیتا پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”کینہ، ڈائیل“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ چارلی اس کی بڑبڑاہٹ پوری طرح نہیں سن سکا تھا۔



سزا

محمد زبیر سلیمانی

جینے والوں کو جینے کی سزا تو ہر دور میں ملتی رہی ہے۔ یہ اور بات کہ کسی کے حصے میں جانوروں کے مانند زندگی آتی ہے اور کہیں کسی جانور کو اتنا عیش و عشرت نصیب ہوتا ہے کہ انسانی آنکھ حسرت و یاس کی تصویریں کر رہ جاتی ہے۔ بہر کیف، جینا تو ہر حال میں پڑتا ہے۔

سطر سطر پر فکر: ایک سلسلہ تحریر

یورپی کا منہ جیسے ہی کھلا اس میں سے ایک تھا ساکتا باہر نکل آیا اور کچھ دور جا کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا اور پھر اچانک وہاں سے بھاگا اور ساتھ والے ایک خالی پلاٹ میں جا گھسا جس میں لمبی لمبی گھاس لہرا رہی تھی۔ نئی آبادی ہونے کے باعث آن پاس کے گھروں کا گندا پانی اسی پلاٹ میں جمع ہو کر جو بڑی کھل اختیار کر گیا تھا۔ اسی ننھے پلے کو

چارلی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
”کل شام سات بجے گھر ضرور آنا۔ میں ایس سے کہہ کر تمہاری پسندیدہ ڈش لسان کھاؤں گا۔ اس کے بعد تمہیں چند لوگوں سے بھی متعارف کرواؤں گا۔ چاہے تم اسے پسند کرو یا نہیں لیکن اب تم بھی اس گروہ کا حصہ بن چکے ہو۔ البتہ میں تمہارا پورا خیال رکھوں گا اور اس بات کو یقینی بنائوں گا کہ تمہارے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔ تمہیں اپنی تحریر کو جاندار اور پراثر بنانے کے لیے اس کی شدید ضرورت ہے اور تم جان جاؤ گے کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”جہاں تک تمہیں اس جرم میں ملوث کرنے کا تعلق ہے تو مجھے واقعی اس پر افسوس ہے لیکن میرے پاس اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں، ویسے بھی میں تمہیں صرف اپنی مدد کے لیے ساتھ لے گیا تھا۔ اس لڑکی کی وہاں موجودگی کا کوئی امکان نہ تھا، اگر وہ درمیان میں نہ آتی تو تم اس جرم سے بچ سکتے تھے۔ تمہیں میری مجبوری کا اندازہ نہیں۔ مجھے واقعی تاریخ یاد نہیں رہی تھی اور مجھ رہا تھا کہ ابھی تیس تاریخ میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو ایسے واقعات تمہارے ساتھ بھی پیش آئیں گے۔ اس نے مجھے فون پر دھمکی دی تھی اس لیے اسے آج رات ہی ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کام کے لیے مجھے ایک آدمی کی مدد درکار تھی اور اتنی جلدی کسی دوسرے شخص کا بدوہست نہیں ہو سکتا تھا۔ تم نے اس لڑکی کے پیٹ میں گولیاں مار کر عقل مندی کا ثبوت دیا اور نہ وہ لڑکی ہمارے لیے مشکل کھڑی کر سکتی تھی۔“

”تم واقعی بہت بڑے کہنے ہو۔“ اس نے غصے سے ہنسنے لگا۔ ”تم نے مجھے بھی جرم کی راہ پر لگا دیا۔“
”بہتر ہوگا کہ تم اپنی زبان قابو میں رکھو۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور آئندہ تمہارے منہ سے ایسے گندے الفاظ نہیں سنا جاتا۔ تمہیں اپنے مرتبے کا خیال ہونا چاہیے۔ تم ایک بڑے معصف کے شاگرد ہو اور تمہارا مستقبل بے حد تابناک ہے۔“
یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”جہاں تک تمہیں اس جرم میں ملوث کرنے کا تعلق ہے تو مجھے واقعی اس پر افسوس ہے لیکن میرے پاس اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں، ویسے بھی میں تمہیں صرف اپنی مدد کے لیے ساتھ لے گیا تھا۔ اس لڑکی کی وہاں موجودگی کا کوئی امکان نہ تھا، اگر وہ درمیان میں نہ آتی تو تم اس جرم سے بچ سکتے تھے۔ تمہیں میری مجبوری کا اندازہ نہیں۔ مجھے واقعی تاریخ یاد نہیں رہی تھی اور مجھ رہا تھا کہ ابھی تیس تاریخ میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو ایسے واقعات تمہارے ساتھ بھی پیش آئیں گے۔ اس نے مجھے فون پر دھمکی دی تھی اس لیے اسے آج رات ہی ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کام کے لیے مجھے ایک آدمی کی مدد درکار تھی اور اتنی جلدی کسی دوسرے شخص کا بدوہست نہیں ہو سکتا تھا۔ تم نے اس لڑکی کے پیٹ میں گولیاں مار کر عقل مندی کا ثبوت دیا اور نہ وہ لڑکی ہمارے لیے مشکل کھڑی کر سکتی تھی۔“

چارلی نے اسے وہ رقم دینے کی کوشش کی جو اس نے مکان کے اندر موجود دوسرے شخص کی جیب سے نکالی تھی۔ جب اس نے انکار کیا تو چارلی نے وہ گلدی زبردستی اس کی جیب میں ڈال دی اور بولا۔
”یہ دو ہزار ڈالرز سے زیادہ ہیں۔“ وہ سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے آپ کو قصور وار مت سمجھو۔ جانتا ہوں کہ تم اس لڑکی کی وجہ سے پریشان ہو۔ یقیناً جانو کہ اس کے وہاں ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور میری معلومات کے مطابق اس گھر میں صرف دو ہی افراد کو ہونا چاہیے تھا۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے اس لڑکی کا وہاں ہونا باعث شرم بھی تھا۔ اگر وہ وہاں نہ ہوتی تو تمہیں کچھ بھی نہ کرنا پڑتا اور تم محض ایک خاموش تماشا کی عیارت رہتے۔“

اس کے بعد ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد ہی وہ اسٹریٹ مال کی پارکنگ اسٹ میں داخل ہو چکے تھے۔ پیٹرک نے گاڑی چارلی کی کار کے برابر میں کھڑی کی۔

☆☆☆

انتساب

”میں اس کہانی کو ڈیوڈ تھاٹن کے نام منسوب کرتا ہوں۔ انہوں نے جاسوسی ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اس انٹسٹری میں ایسے ناشر بہت کم ہیں جنہوں نے غیر معروف اور نوآموز مصنفین کی اسٹے پر جوش انداز میں حوصلہ افزائی کی ہو۔ ان کی نامگہانی موت ہم سب کے لیے بہت بڑا نقصان ہے اور ان کی کمی ہمیشہ شدت سے محسوس کی جائے گی۔“

6

جانے کون لوگ چھوڑ گئے تھے؟

سوز و گداز میں جو لوگ پوری لے کر آئے تھے وہ کب کے جا چکے تھے اور آس پاس کی روزمرہ زندگی بغیر کچھ دیکھنے سے معمول کے مطابق جاری تھی۔ چند لوگوں نے اگر کتے کو پوری سے براہ راست دیکھا بھی تو یہ ان کے نزدیک ایک معمولی سا کارروائی تھی۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ اگلے 15 منٹ بعد تک یہ بات یا پھر واقعہ لوگوں کو یاد رہتا۔ پلاٹ کے سامنے نئے قصاب کی دکان بھی جو شام ڈھلے تک پانی سے گوشت کو فروخت کرتا رہتا تھا، گویا اس جیسے کتے کے لیے یہاں خوراک کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اگلی دکان ایک موہاں شاپ بھی جس کے آس پاس چند نوجوان لڑکے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ جبکہ اس کے قریب ہی دو تین دکانیں اور بھی تھیں۔ وہ کتا جہاں سے بھی آیا یا زبردستی لایا گیا تھا، اب اس کا موجودہ مسکن بھی گنا بہتر تھا۔ خالی پلاٹ میں اس کے لیے عمل چنگل کا ماحول تھا اور قریب ہی قصاب کی دکان تھی۔ گویا قیام کے علاوہ طعام کا بھی مستقبل بندوبست تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کتے نے گھاس میں سے سر اٹھار، اس کی جسامت ایک بڑی بلی کے برابر تھی۔ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے وہ پلاٹ سے باہر آ گیا۔ اس نے مخصوص انداز میں خود کو دو تین جھٹکے دیے جس سے جوہر کا پانی پھینکوں کی صورت میں اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔ پھر اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور منہ کھول کر لمبی سی جھانکی لے کر باریک سی آواز نکالی، پھر خراماں خراماں چلتے ہوئے قصاب کی دکان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر تک ارد گرد کا جائزہ لیا جیسے وہاں پر دوست اور دشمن کی تعداد کا اندازہ لگا رہا ہو۔

چند لمحوں بعد وہ سچ گلی میں آ کر بیٹھ گیا۔ دور سے ایک سائیکل سوار آ رہا تھا جو بالکل اس کی سیدھ میں تھا۔ کتے نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید سائیکل سوار اپنا راستہ بدل لے لیکن جب وہ بالکل سر پر آ گیا تو وہ ایک لمبی سی بھونک کے ساتھ گلی پار کر گیا۔ کچھ فاصلے پر دو تین کتے اور بھی موجود تھے جو خامسے ہنسنے لگے تھے، انہوں نے غور سے اس ننھے کتے کو دیکھ کر پھرتیوں اس پر بھونکنے لگے۔ وہ بھی اپنی باریک سی آواز میں تینوں کو اسی انداز میں جواب دے رہا تھا جس پر ایک موہاں سا کتا غصے میں آ گیا اور اس کی طرف ہکا۔ یہ دیکھتے ہی غصے کے نلے قدموں دوڑ لگائی اور پلاٹ کی جھاڑیوں میں ایک بار چھبم ہو گیا۔ بڑا کتا کچھ دیر جھاڑیوں کو دیکھ کر بھونکتا رہا پھر وہاں اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا جو قصاب کی حرکت

وسکنا ت کو بخور دیکھ رہے تھے۔ قصاب نے ایک بڑا سا چھچھرا ان کی طرف اچھال دیا۔ وہ تینوں کتے ایک وقت اس کی طرف لپکے مگر اس سے پہلے ہی ساتھ والی دیوار پر بیٹھے ہوئے کتے نے گویا غوطہ لگایا اور اس چھچھرے کو چوچ میں دبا کر اڑ گیا۔ اپنی خوراک کو لٹا دیکھ کر کتے ایک بار پھر قصاب کی طرف دوستانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

دن گزرتے گئے، اس خالی پلاٹ میں اب خامسے کھنی مچاڑیاں بن گئی تھیں، ویسے بھی وہ پلاٹ دو کنال کا تھا۔ اس کتے نے خوب قد کاٹھ دکھلا تھا۔ نئے قصابی کے تازہ چھچھرے اور بڑیوں کا اثر اس کتے کی صحت سے ظاہر تھا۔ اب اس کے ساتھ دو تین اور کتے بھی گھومتے تھے لیکن وہ اپنے مسکن میں تنہا رہتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے پلاٹ سے نکلا اگلی ناگلوں کو پھیل کر انگڑائی لی اور کسی انجان راستے کی طرف چل دیا۔ شام سے کچھ دیر پہلے لوہا تو اس کے ہمراہ اس کی نئی ہم سفر بھی تھی، وہ کتیا اس کے ہاتھ نہ جانے کہاں سے لگ گئی تھی؟ اب دونوں ساتھ ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ آس پاس کے چند اور کتے بھی بھی گھسی گھسی آتے تھے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے مگر وہ کتا کچھ اس طرح سے غراتا کہ وہ ہم کردور ہٹ جاتے تھے۔ پھر ان دونوں کی محبت رنگ لائی اور اس پلاٹ میں دو پلوں نے جنم لیا۔ ایک گورا چنٹا تھا جبکہ دوسرا کالا۔ اب کتیا کا زیادہ وقت پلاٹ میں ہی بسر ہوتا تھا، کتا بھی کم کم نظر آتا تھا۔ دونوں بچے رفتہ رفتہ بڑے ہونے لگے۔ گورا پلاٹ کالے سے قد میں بڑا ہوتا گیا جبکہ کالا تقریباً بلی جیسا ہی رہا۔ جب دونوں ماں باپ کہیں باہر جاتے تو گورا کتا بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ کالا کتا ساتھ چلتے لگا تو کتیا نے اس کو بری طرح چھچھوڑ ڈالا جس پر وہ کاؤں کاؤں کرتے ہوئے واپس جھاڑیوں میں چلا گیا۔ کتیا کا سلوک دونوں پلوں سے خاصا غیر مساویانہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گورے بچے کو پسند کرتی ہو جبکہ کالے سے اس کو خاص دگ و نکس تھا۔ کالا پلاٹ خاصا چڑچڑاسا تھا۔ اب اس کے ماں باپ اور بھائی کہیں چلے جاتے تو وہ سارا غم اپنی آواز میں بھونکتا رہتا تھا۔ جب وہ واپس آ جاتے تو اس کی آواز بھی بند ہو جاتی تھی۔

کچھ عرصے بعد ایک دن کتا اور کتیا پلاٹ سے باہر نکلے۔ گورا پلاٹ میں ان کے ساتھ تھا اور۔۔۔ پھر وہ بھی دو پارہ لوٹ کر نہ آئے۔ شاید انہوں نے یہ علاقہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے چار پانچ دنوں تک ان تینوں کا انتظار کیا مگر وہ تو شاید کوئی نئی جگہ ڈھونڈ بیٹھے تھے۔ وہ کتا کتا جو کہ شمار کیا تھا، سارا دن اپنے پلاٹ میں بیٹھا بیٹھتا رہتا تھا۔ قد اس کا بلی سے کچھ ہی

بڑا تھا۔ کمزور اس قدر تھا کہ اس کی پسلیاں نظر آتی تھیں۔

ایک دوپہر کو وہ اپنے مسکن سے باہر نکلا۔ زمین کو سوگھتے ہوئے آگے بڑھا اور قصاب کی دکان کے سامنے بیٹھ گیا۔ قصاب نے ایک ہڈی باہر پھینکی، وہ ہڈی کی جانب جانا چاہتا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایک بد معاش قسم کا کتا اس ہڈی کو منہ میں دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ پلاٹ اس کتے پر یوں بھونکنے لگا جیسے گالیاں دے رہا ہو۔ اس دن وہ کافی دیر تک بیٹھتا رہا یہاں تک کہ اس کی آواز بیٹھ گئی۔ میں گھر گیا اور فرج سے گوشت کا ٹکڑا نکال لایا اور اس کی طرف پھینکا مگر وہ اسی لمحے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے سمجھا کہ میں شاید پتھر مار رہا ہوں۔ گوشت کا وہ ٹکڑا گلی میں ہی پڑا رہ گیا اور وہ ننھا کتا جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ میں نے وہ پوٹی اٹھائی اور جھاڑیوں کی طرف اچھال دی۔

اگلے ہی روز تک وہ مجھے قصاب کے آس پاس گھومتا ہوا نظر آیا۔ وہ مسلسل زمین سوگھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں جوہر کے کچھڑے سے تھڑے ہوئے تھے۔ شاید وہ بھوکا تھا۔ پھر اسے ایک بوسیدہ سی ہڈی نظر آ گئی، وہ اس کی طرف لپکا اور اگلے دونوں پاؤں میں پسپا کر اس سے زور زامی کرنے لگا۔ وہ ہڈی شاید کسی کتے نے کھانے کے بعد پھینک دی تھی۔ ننھا کتا کافی دیر تک اس کے ساتھ گویا لڑتا رہا، پھر اس نے ہڈی کو وہیں چھوڑ دیا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ چند فٹ دور کھڑے ایک بچے نے اس کی طرف پتھر پھینکا تو وہ فوراً بھاگ کر اس پلاٹ میں گھس کر غائب ہو گیا۔

میرا دل شدت کے ساتھ چاہا کہ میں پلاٹ میں گھس کر اس کے آگے بڑیوں اور گوشت کا ڈھیر لگا دوں، اس سے خوب باتیں کروں، اس کو اپنے ساتھ سلاؤں، اس کو وہ پیار دوں جو اسے بھی ملا ہی نہ تھا۔ نہ جانے اس کو پیار کی ضرورت تھی یا نہیں۔ بوسکتا ہے کتا پیار کا مطلب ہی نہ جانتا ہو۔ پھر مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی کو یاد کرتا ہے۔ شاید اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی محرومی تھی۔ تب ہی چھوٹا رہ گیا ہے۔ اس نے کوئی دوست بھی تو نہیں بنایا تھا۔ ایسی ہی نہ جانے کتنی سوچیں میرے ذہن میں گردش کرتی رہتی تھیں۔

اب میں نے یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ وہ روزانہ مسلسل کتنی کتنی کھنے آنے جانے والے لوگوں پر بھونکنے لگا ہے۔ اس کی تکی آواز پر کسی نے بھی بھی کان نہیں مڑھا تھا۔ میں گھر سے نکلا تو وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کر

کھڑا ہو گیا۔ وہ مسلسل عف عف کر رہا تھا۔ دور سے ایک نوجوان اپنے بڑے سے بل ڈاگ کے ہمراہ آ رہا تھا، وہ بل ڈاگ واقعی کسی بل سے کم نہ تھا۔ امرکنڈیشنڈ کمرے میں رہنے اور اچھی خوراک کھانے کی وجہ سے وہ خاصا صحت مند تھا۔ جب وہ بل ڈاگ میرے سامنے سے گزرا تو وہ ننھا کتا اس پر بھی بھونکنے لگا جس پر اس بل ڈاگ کے قدم رک گئے اور وہ سرزنش کرنے والی نظروں سے اس بلی جیسے نلے کو دیکھنے لگا جو اس بل ڈاگ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسلسل بھونک رہا تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی سی بجنے لگی پھر دفعتاً اس بل ڈاگ نے اس ننھے بچے کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ پلا جلدی سے پلاٹ کی جانب بڑھا لیکن وہ بل ڈاگ اپنے مالک سے زنجیر پھڑپھڑاتا تھا، اس نے کسی جیتے کے مانند چھلانگ لگائی اور بچے کو دو بچ لیا۔ کتے کی خوفناک غراہٹ کے ساتھ بچے کی دردناک آوازیں میرے کانوں میں ہتھوڑے کے مانند برس رہی تھیں، اس کے مالک نے اپنے بل ڈاگ کو کئی بار آوازیں دے کر بلایا مگر وہ تو جیسے اپنے ہوش میں نہ تھا۔ اس ساری دھیمکا شستی میں جو کہ نقص زدہ بچہ بھی ہوسکتی تھی صرف وہ بل ڈاگ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ننھا کتا دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی دم توڑتی ہوئی پتلی پتلی سی دردناک آواز اب بھی آ رہی تھی۔ یہ منظر میری برداشت سے باہر تھا۔ تقریباً چند منٹ تک یہ ایک طرف جنگ ہوتی رہی پھر جب ننھے کتے کی آوازیں یکسر معدوم ہو گئیں تو وہ بل ڈاگ باہر نکلا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا، پھر زمین پر لیٹ گیا۔ جب اس کی سانس درست ہوئی تو مالک کی طرف بڑھا۔ یکبارگی اس نے منہ کی جانب دیکھا جیسے اس ننھے کتے کی موت کا یقین کر رہا ہو، مالک نے اس کو ڈانٹ پلائی اور زنجیر تھام کر روانہ ہو گیا۔

میرے علاوہ دو تین لوگوں نے کچھ دیر کے لیے رک کر اس ننھے کتے کو دیکھا، پھر آگے بڑھ گئے۔ گلی میں معمول کی زندگی رواں دواں تھی جیسے روز ہوتی تھی۔ میں نے ایک موہوم سی امید پر جوہر میں دیکھا کہ شاید اس بچے میں زندگی کی رشت موجود ہو مگر وہاں خاموشی کا راج تھا۔

اس ننھے بچے نے اپنے سے طاقتور کو لکارا تھا۔ سزا تو پھر ملتی تھی۔ اندھی طاقت کے نزدیک کمزور کے لیے کم سے کم سزا موت ہے۔ آج بھی ایک اندھی طاقت ننھے ایک کمزور کو جرم مشنی پر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

مغل شہزادہ



محمد امجد ریاض چچوٹی، مطلع ساہیوال
جو آتا چاہو ہزار رستے، نہ آتا چاہو تو عذر ہزاروں
مزاج برہم، طویل رستہ، برستی بارش، خراب موسم
محمد زریاں سلطان..... اردو بازار، کراچی
ہر اک ملک نے اپنے افکار بدلے
مگر ہم نے ہر گز نہ اطوار بدلے
وہی بریت صدیوں سے قائم ہے اپنی
نہ نادار بدلے نہ زر دار بدلے
جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
میرے ہونے ہی سے مشروط ہے ہونا تیرا
دیکھنے والا نہ ہو تو آئینہ کچھ بھی نہیں



شوکت علی..... گلبرگ، لاہور
آدمی کی زد میں آئے ہوئے پھول کی طرح
میں کھڑے کھڑے ہو کے فضا میں ٹھہر گئی
عمران حیدر بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہوا نے موسم باراں سے سازشیں کر لیں
مگر شجر کو خبر ہی نہیں شرارت کی
قاسم نصیب..... صفدر آباد، شیخوپورہ
شب تاریک رستے میں جو آجائے تو یہ آنکھیں
کبھی جگنو، کبھی تارے، کبھی قندیل کر لینا
ہمیشہ سے یہی اپنا شعاع زندگی رکھنا
جو رستہ عام ہو جائے اسے تبدیل کر لینا
محسن علی..... بالا کوٹ
بارش ہوئی تو پھول کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے
حسنین عباس بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تاروں میں چمک نہ گلابوں میں باس ہے
تم کیا گئے ہو شہر کی ہر شے اداس ہے.....
کیسے چھپاؤں گا میں تیرے پیار کی دھنک
ہر شخص تیرے شہر کا چہرہ شناس ہے.....

پیارے یوسف میاں..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے
برسات میں بھی یاد نہ جب ان کو ہم آئے
عاصم اقبال جہاں..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
نور چلی تھی دبے پاؤں شام تنہائی
تیرا خیال جو آیا تو آنکھ بھر آئی
ذیشان افتخار دھلوں..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے
صوبیدار (ر) انوار بخش..... ملیر کینٹ کراچی
سندر، کوئل سپنوں کی بارات گزر گئی جاناں
ہو پ آنکھوں تک آنچلی ہے رات گزر گئی جاناں
عمون عباس باہر..... اوکاڑہ
قافلہ تو رات بھر چلتا رہا
میں چراغ شب تھا سو جلتا رہا
ریاض بٹ..... حسن ابدال
عید کا چاند ہے خوشیوں کا سوال اے دوست
خوشیاں بھیک میں مانگے سے کہاں ملتی ہیں
ناہا ایمان..... پنجاب
س جان گلستان سے یہ ملنے کی گھڑی تھی
خوشبو میں نہائی ہوئی اک شام گھڑی تھی
یوں دیکھنا اس کو کہ کوئی اور نہ دیکھے
انعام تو اچھا تھا مگر شرط کڑی تھی
محمد قاسم..... ضلع خوشاب
تنہا دید کی موٹی کرے اور طور جل جائے
عجب دستور ملقت ہے کرے کوئی، بھرے کوئی
راجا ضیا الحسن کہانی..... رتی ٹبی، ساہیوال
ہم اپنی کہانی جس سے نہیں خود، ہم کو جھوٹی لگتی ہے
وہ کون تھا، کس کو چاہا تھا، اے عمر گریزاں بھول گئے
محمد آصف ساجد..... ارزانی پور، قصور
ہم کو جدا نہ کر دے یہ ایک فرق ذرا سا
تم فاصلوں کے قائل، میں قربتوں کا پیاسا
زاہد آزاد نیپال
تو مرنے حق میں کوئی نیک فال دے مولا
مگر تو بہت کو مرنے..... لعل رتے مولا

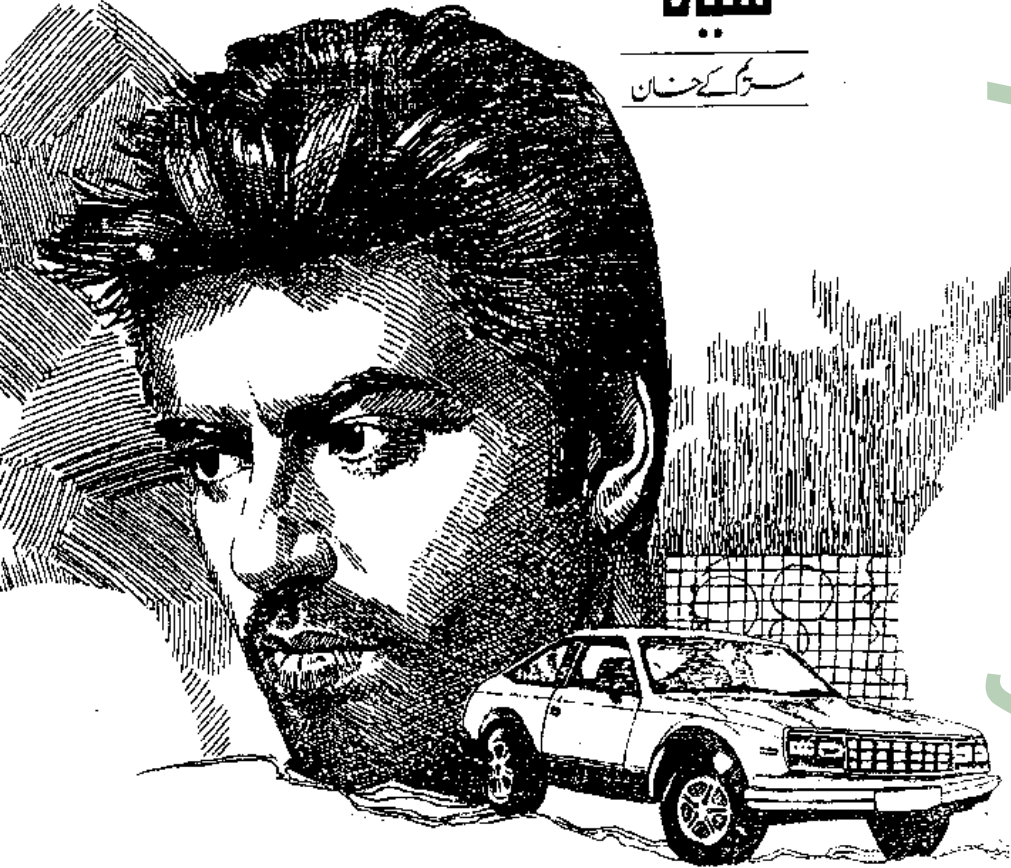
محمد انور ندیم..... حویلی لکھا، اوکاڑہ
کریں ترکب زمیں یا جائیں جاں سے
وہی انداز ان کے آسمان سے
عدنان صدیقی..... ملتان
سنائیں جب حال دل وہ اپنا میرے مسافر خوش رہتا
وہ جھوٹ بولیں تو کچھ نہ کہنا صدائق کا حساب رکھنا
اختر شاہ عارف..... جہلم
کوئی منزل کوئی سایہ تو نظر آنے دو
پھر بڑے شوق سے تم جدا ہو جانا
مجھ سے فرط محبت میں ہوئے تھے مجھ سے
تمہیں کس نے کہا تھا کہ خدا ہو جانا
ارسلہ اہل..... دروہڑی
اک زمانہ ہوا ہم کو جیتے ہوئے
بے بس جئے جانا ضروری نہیں
افشاں..... وہاڑی
یہی چار شے تھیں تو تھے آشیاں میں
جلا کر ملا تجھ کو کیا آشیانہ
رضوان..... لاہور
نہ جانا کہ جاتا ہے دنیا سے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
ارحم علی..... گوجرانوالہ
آتے نہیں انداز مجھے حسن طلب کے
اے رحمت یزداں یہ مرا دست دعا ہے
نور روز خان..... ایبٹ آباد
میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہن رکھے ہیں دستانے
نوشین ناز..... راولپنڈی
آج تمہاری خوشخبری پر حیرت ہے حیوانوں کو
تم تو کل تہذیب سکھانے نکلے تھے انسانوں کو
زہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
شہر آبادی سے خالی ہو گئے، خوشبو سے پھول
اور گنتی خواہشیں ہیں جو دلوں میں قید ہیں
آصف محمد حیدر آباد
ایک ایک کر کے خود سے پھٹنے لگے ہیں ہم
دیکھو تو جا کے قافلہ سالار کون ہے

سمجھداری اچھی چیز ہے مگر... جب مکاری کی حدود میں داخل ہو جائے تو "سمجھ" اور "داری" کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ گویا یوں سمجھ لیں کہ ساری سمجھ... بار پر چڑھ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا... جب عقل دور کھڑی اس پر کبھی ہنستی اور کبھی ماتم کرتی رہی... جبکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔

ایک کامیاب بزنس مین کی ناکام چالوں کا احوال

سیانا

سڑک کے حسان



زمانے میں کوئی بہت خاص گاڑی یا کار تیار کی گئی تھی جو آپ انٹرنیک میں شمار ہوتی ہے۔ بلکہ جنگ عظیم اور خاص طور سے انیس سو تیس کی دہائی کے درمیان بننے والی ٹکڑی گاڑیاں انٹرنیک میں شمار ہوتی ہیں۔ بعض ایسی عام گاڑیاں جو بہت پہلے بنی ہوں اور اصل حالت میں ہوں وہ بھی انٹرنیک کے شوقین نے لیتے ہیں۔

میرا نام جونی کیپ ہے۔ میں انٹرنیک گاڑیوں کا ڈیزائن اور ان کی تلاش میں پورے امریکا میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ ویسے میری رہائش اور کاروبار فلوریڈا میں ہے کیونکہ یہاں دولت مندوں کو انٹرنیک گاڑیاں جمع کرنے کا شوق ہے اور ان میں سے بہت سے میرے گاہک بھی ہیں۔

ٹینک کاروں یا گاڑیوں سے مراد یہ نہ لی جاسکے کہ کسی

☆ اشفاق خان زادہ... اسلام آباد
☆ شمع کی لو پہ کیوں پروانہ آن گرتا ہے
☆ کسی نصاب میں ایسا کوئی سوال نہیں
☆ محمد آصف پیرزادہ... گوجرانوالہ
☆ اٹھائیں ناز خود شہنشاہ کب تک
☆ ہوگا دل آخر تیرا قاتل کب تک

☆ اطہر حسین... کراچی
☆ ہم اپنے دل کے پردوں سے رہے نا آشنا برسوں
☆ کہاں موجود تھا وہ اور ہم اس کو کہاں سمجھے
☆ ملک آصف نواز ملک... کینال کالونی، ریلوے
☆ سب کو سیراب وفا کر کے بھی خود کو پیاسا رکھنا
☆ ہم کو لے ڈوبے گا اسے دل تیرا دیریا ہونا

☆ محمد اقبال... کورنگی، کراچی
☆ لوگ ہم ایسے نادانوں کو آئیں گے سمجھانے بھی
☆ تیرا غم پھر تیرا غم ہے غم ہے تو غم خوار بہت
☆ امتیاز احمد... عظیم پورہ، کراچی
☆ چراغِ قمع سے شامِ وطن کی بات کرو
☆ جو راہ میں ہے ابھی، اس کرن کی بات کرو

☆ مجاہد رضا... جامعہ ملیہ، کراچی
☆ جو آتا ہے نظر دہیا ہی کیوں ہو
☆ کہ ہر محل نشیں لیلیٰ ہی کیوں ہو
☆ راشد خان... گلشن جدید، کراچی
☆ عجب نہیں جو کبھی پھر کسی بہانے آئے
☆ ابھی گیا ہے جو آنکھیں دکھا کے رستے میں

☆ سید محی الدین... سیالکوٹ
☆ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لہجہ
☆ دل دیتا ہے لفظوں کے معانی
☆ محمد خرم... لاہور
☆ سبے ہوئے لوگوں پہ مکانوں کی پتھوں پہ
☆ اک تیغ نے خوف کی سو بارگزی ہے

☆ محمد کمال انور... اورنگی ٹاؤن، کراچی
☆ قربتیں ہوتے ہوئے بھی فاصلوں میں قید ہیں
☆ کتنی آزادی سے ہم اپنی حدود میں قید ہیں
☆ مولا بخش... میرپور ساکرو
☆ ہم اہلِ عشق پر ایسا بھی دور آیا محبت میں
☆ کوئی بھی ابتدا کرتا مگر آخر کرتے ہم

☆ عمیر منہاس... گلشن اقبال، کراچی
☆ ہم ایک کھل کے عینی گواہ ہیں لیکن
☆ بتانا چاہتے ہیں پر زباں نہیں رکھتے
☆ جبران احمد... کراچی
☆ تمام عمر اسی آرزو میں بیت گئی
☆ ہمیں بھی ٹوٹ کے چاہے کوئی ہماری طرح

☆ عبدالعزیز... کراچی
☆ ہیں چند احباب ایسے اسے نہیں نہ آیا حساب کرنا
☆ کہ بھول سارے سب لیں گے عین عادت ہے بھول کرنا
☆ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر... نئی منڈی سکسکی
☆ یاد آیا ہے وہ اور بھی شدت سے ہمیں
☆ بھول جانے کا اسے جب بھی ارادہ چاہا

☆ ربیہ سلیم... کراچی
☆ جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
☆ ان کو زباں ملی تو ہی پہ برس پڑے
☆ محمد قدرت اللہ نیازی... حکیم ڈن خانہ نوال
☆ کوئی تو برسات ایسی ہو جو تیرے سنگ برسے "جاناں"
☆ تنہا تو میری آنکھیں روز برستی ہیں

☆ احمد خان توحید... پاکستان اسٹیل، کراچی
☆ بننے کا مجھے کچھ شوق نہیں فقط گزارہ کرتا ہوں
☆ کچھ دیر نشے کی لہروں میں دنیا سے کنارہ کرتا ہوں
☆ احمد علی... نواب شاہ
☆ مہک اٹھا سخن چمن یار کے آجانے کے بعد
☆ لیا سنگی شاخ گل زلف کے لہرانے کے بعد

محفل شعرو شخص

نام: _____

پتہ: _____

کوین
برائے
شمارہ
نومبر
2011

میرا زیادہ تر کاروبار کپڑوں کے توسط سے چلتا ہے۔ ان کے پاس کوئی پرانی کار اچھی حالت میں آتی ہے تو وہ مجھ سے رابطہ کرتے ہیں اور اگر میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ٹھیک ٹھاک ہو کر اچھی قیمت میں نکل جائے گی تو میں اسے خرید لیتا ہوں۔ پرانی گاڑیاں ٹھیک کرنے کے لیے میرے پاس ایک ورکشاپ ہے جس کا سپروائزر شہاب پرانی گاڑیوں کا ماہر ترین مکینک ہے۔ شہاب ایرانی ہے لیکن گزشتہ تیس سال سے امریکا میں ہے۔ وہ شاہ ایران کے شاہی گیراج کے سیکڑوں مکینکوں میں سے ایک تھا۔ اس لیے جب انقلاب آیا تو اسے بھی فرار ہونا پڑا۔ شاہ ایران کو تو نہیں البتہ اس کے بہت سارے حایوں کو امریکا میں پناہ مل گئی تھی اور شہاب ان میں سے ایک تھا۔ اسے تقریباً تمام پرانی گاڑیوں کے تمام حصوں کا کام آتا تھا بس وہ انجن کا زیادہ ماہر نہیں تھا لیکن باڈی اور آرائش میں اس کے ہاتھ خوب کام کرتے تھے اور گاڑی کی ظاہری حالت کسی ہی خراب کیوں نہ ہو وہ اسے بالکل اصل حالت میں لے آتا تھا۔ اس لیے شہاب میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں اسے منہ مانگا معاوضہ دیتا تھا تاکہ وہ کہیں اور نہ چلا جائے۔ انجن کے کام کے لیے ایک لڑکا میگاں تھا۔ وہ بھی اپنے کام کا ماہر تھا۔ اگر کسی گاڑی کا کوئی پرزہ نہیں ملتا تھا تو میں اسے ایک خاص کارخانے سے بنا لیتا تھا۔ یہ کارخانہ اسی قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھا۔

کپڑوں کی مدد سے کام تو چلتا رہتا تھا لیکن اس میں دو قباحتیں تھیں۔ اول وہ مجھے زیادہ اچھی گاڑیاں نہیں دیتے تھے۔ یہ گاڑیاں وہ اس کام میں موجود ایسے افراد کو دیتے تھے جو ان کو منہ مانگی قیمت دے سکتے تھے۔ دوسرے وہ درمیانے درجے کی گاڑیوں کی بھی اچھی خاصی قیمت وصول کیا کرتے تھے۔ اس لیے مجھے اچھی گھڑی گاڑیوں کی تلاش میں جنک یارڈ کھانٹنے کے لیے نکلتا پڑتا تھا۔ یہاں سے اکثر مجھے اچھی گاڑیاں بہت کم قیمت میں مل جاتیں۔

میں سال میں دو مرتبہ پرانی گاڑیوں کی تلاش میں نکلتا تھا اور میری توجہ کارمز کہ وہ جنک یارڈ ہوتے تھے جہاں لوگ اپنی ناکارہ یا پرانی ہو جانے والی گاڑیاں چھوڑ آتے تھے اور جنک یارڈ والے انہیں توڑ پھوڑ کر اسکرپ میں تبدیل کر دیتے تھے۔ یہ اسکرپ بیچ دیا جاتا۔ پورے امریکا میں ایسے دو ہزار سے زیادہ جنک یارڈ ہیں جنہیں پرانی گاڑیوں کا قبرستان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر شہروں اور آبادی سے باہر ویرانوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں بعض اوقات بڑی تباہی گاڑیاں مل جاتی ہیں۔

دو سال پہلے مجھے بتیں کے ماڈل کی ڈیملر کار ملی تھی۔ یہ بالکل اصل حالت میں تھی لیکن برسوں سے کھڑے کھڑے اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔ یہ بٹر کی پسندیدہ کار تھی اور وہ اسے اپنی سواری کے لیے استعمال کرتا تھا۔ جنک یارڈ سے یہ مجھے صرف ایک سو تیس ڈالرز کی مل گئی اور اسے ورکشاپ تک لاسنے میں میرے پانچ سو ڈالرز خرچ ہوئے پھر اسے اصل شکل میں بحال کرنے پر پانچ ہزار ڈالرز سے زیادہ کا خرچ آیا تھا لیکن ایک شوقین نے اسے ایک لاکھ پینتالیس ہزار ڈالرز میں فنی خوشی خرید لیا تھا۔ اس طرح چانس کے سودے سال میں ایک آدھ بار ملتے تھے اور سال بھر کی کسر پوری ہو جاتی تھی۔ میری خوشحالی کا راز ایسی ہی گاڑیاں تھیں جو مجھے جنک یارڈ سے سستے داموں مل جاتی تھیں۔ ان کی وجہ سے میں نے ساحل کے ساتھ شاندار قسم کا بچ و لاخریدا تھا اور اس سے کچھ ہی دور میری ورکشاپ تھی۔ میرے پاس دو بہترین گاڑیاں تھیں اور میری بیوی، بچوں کو ہر آسائش میسر تھی۔

ایک سفر کے دوران میں، میں عام طور سے کسی ایک ریاست میں گھومتا پھرتا ہوں۔ اس بار میں کیلیفورنیا کے لیے نکلا۔ مجھے یہاں آئے کی سال بیت چکے تھے۔ آخری سفر میں، میں نے یہاں درجنوں جنک یارڈ دیکھے تھے لیکن کوئی کام کی چیز نہیں ملی تھی۔ کیلیفورنیا کے باشندے چیز کے حسن سے زیادہ اس کی مضبوطی دیکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں گاڑیوں کے گھڑی ماڈل کم ہی ملتے ہیں۔ مگر لاس اینجلس اور سان فرانسسکو کے آس پاس جنک یارڈز میں بعض اوقات کوئی اچھی چیز بھی آ جاتی ہے۔ میں اپنے فورڈ پک اپ ٹرک میں کیلیفورنیا کے لیے روانہ ہوا۔ میری بیوی نے بے نیازی سے گلے لگا کر رخصت کیا۔ ظاہر ہے شادی کے تیس سال بعد پہلے والی گرم جوشی کہاں رہ جاتی ہے۔ البتہ میرا پندرہ سال کا بیٹا راجر کیپ اور بارہ سال کی بیٹی مشل کیپ میرے لیے اداس تھے۔ مشل نے مجھ سے کہا۔

”پاپا جلدی آنا۔“

”میں کوشش کروں گا میری گڈیا۔“ میں نے اس کے گال چومے۔ ”لیکن پاپا کو کام کے لیے دوڑنا پڑتا ہے۔“

”مشل، راجر اندر آؤ۔“ کورینا نے اندر سے پکارا۔ ”بارش ہونے والی ہے۔“

میں بچوں سے مل کر رخصت ہوا۔ فورڈ اسے کیلیفورنیا تک فاصلہ کوئی ساڑھے تین ہزار کوئی میٹر ہے۔ میں تیسرے دن کیلیفورنیا میں داخل ہوا۔ دن میں بارہ گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب جہاں

رہوں گا وہاں کم سے کم چوبیس گھنٹے آرام کروں گا اور اس کے بعد ہی آگے روانہ ہوں گا۔ خوش قسمتی سے مجھے لاس اینجلس سے دو سو کوئی میٹر پہلے ایک ڈرائیو مل گیا۔ یہ خاص طور سے ٹرک ڈرائیوروں کے لیے تھا لیکن کوئی بھی ہائی وے پر سفر کرنے والا اس میں ٹھہر سکتا تھا۔ یہاں زیادہ تر لاس اینجلس کے لیے آنے والے ٹرک ڈرائیور رکتے تھے کیونکہ اس کے بعد انہیں اپنی منزل پر پہنچ جانا ہوتا تھا۔ سفر ختم ہونے سے پہلے وہ اس ڈرائیو میں دل کھول کر تفریح کر لیتے تھے۔ یہاں اس کے تمام تر مواقع بھی موجود تھے۔ بے شمار کمرہ کے موزک کے ساتھ بہت بڑا بار تھا جس میں ہر قسم کی شرب میسر تھی، ریسٹوران تھا جس میں فرمائش پر ہر کھانا مل جاتا تھا اور ایک ٹائٹ کلب بھی تھا جس میں درجنوں کے حسب سے حسنین لڑکیاں ڈرائیوروں کا دل بہلانے کے لیے ہر وقت موجود رہتی تھیں اس لیے یہاں سے گزرنے والے ہر ٹرک ڈرائیور کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ایک بار ضرور رکے۔ بہت سے تو صرف رات میں چند گھنٹوں کے لیے رک کر دوبارہ سفر پر روانہ ہو جاتے تھے اور میرا خیال تھا کہ ڈرائیو ان کی اصل رونق ایسے ہی ڈرائیور تھے۔

میں نے ڈرائیو ان میں ایک کمرہ حاصل کیا اور کچھ دیر آرام کر کے تفریح کرنے نکل کھڑا ہوا۔ شام ہوتے ہی انڈیان ڈرائیو ان میں رونق نظر آنے لگی اور سورج غروب ہوتے ہی وہاں روشنیوں اور ہنگاموں کا سیلاب سا اٹھ آیا۔ سارا دن کے تھکے ہارے ڈرائیور اپنے ٹرک اور گاڑیاں دور تک پھیلی پارکنگ میں کھڑی کرنے لگے۔ میں نے بار کا رخ کیا۔ بار اور ٹائٹ کلب آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن ہر شخص کو ٹائٹ کلب میں جانے کی اجازت نہیں تھی جب تک وہ ایک ڈالر کا ٹکٹ نہ لے۔ مجھے ٹائٹ کلب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں نے ٹکٹ نہیں لیا اور پارکنگ محدود رہا۔ جلد یہاں مجھے ایک اچھی کہن مل گئی۔ یہ چند ٹرک ڈرائیور تھے جنہیں صرف پینے پلانے سے دلچسپی تھی۔

گفتگو میں میرے کاروبار کا ذکر آیا تو ایک ڈرائیور باری ٹیمر نے کہا۔ ”تب تمہیں یہاں سے کچھ دور ایک جنک یارڈ کا دورہ کرنا چاہیے۔ یہ لاس اینجلس سے ستر میل کے فاصلے پر ہے اور یہاں زیادہ تر گاڑیاں وہیں سے آتی تھیں۔ اسے جارج شیلٹر نے ہی چلا رہا ہے اور میں نے اسے سب باتوں کی حد تک سادہ پایا ہے۔ ایک بار میرے ٹرک کا ایک ٹرک بھٹ گیا تھا اور اس نے مجھے ایسا ہی مارا صرف دس ڈالرز میں دے دیا تھا جسے میں نہیں اور سے لیتا تو اس قسم کا

ٹائرسوڈالرز کم کا نہیں ملتا۔“

”وہاں گھڑی گاڑیاں ہوتی ہیں؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

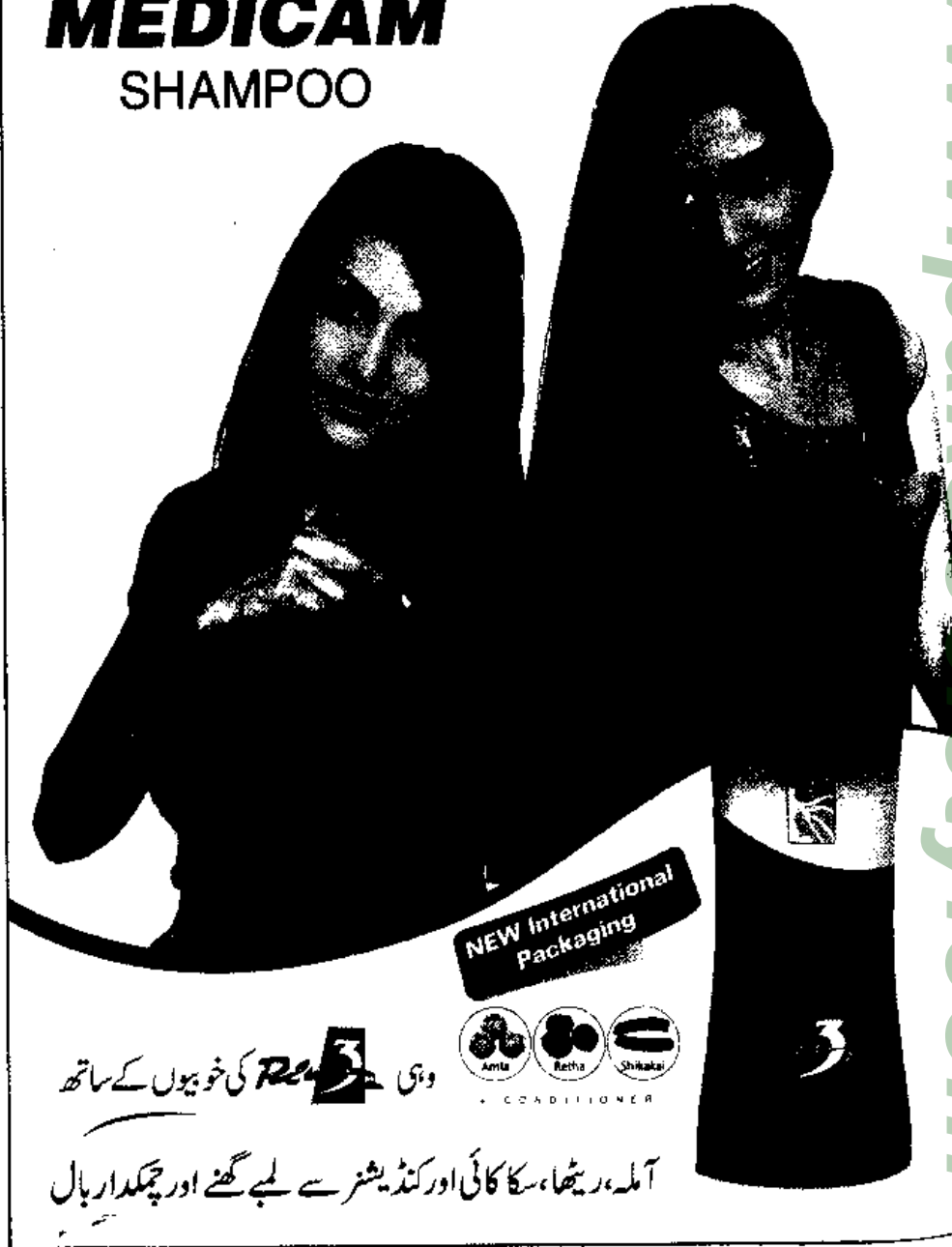
”شاید ہوں، میں نے غور تو نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے وہاں گھڑی گاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔“ باری نے کہا۔ ”تمہیں ایک بار جا کر دیکھنا چاہیے، تمہارے راستے میں ہی پڑے گا۔“

میں نے باری سے پتا سمجھ لیا تھا۔ اس رات دیر تک میں بار میں بیٹھا رہا پھر نہ گھبرا ہونے لگا تو میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور اگلے دن سہ پہر تک سوتا ہی رہا۔ میری آنکھ بھوک سے کھلی تھی۔ نہادھو کر میں نے ریسٹوران کا رخ کیا۔ مل میں پہلے ہی ادا کر چکا تھا اس لیے چابی موکل کے کاؤنٹر پر دے کر میں وہاں سے نکل آیا۔ میرا رخ جارج شیلٹر کے جنک یارڈ کی طرف تھا۔ بقول باری کے سڑک کے کنارے شیلٹر جنک یارڈ کا بڑا سا بورڈ لگا ہوگا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے بورڈ نظر آ گیا۔ لیکن جنک یارڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہائی وے سے کوئی نصف کلومیٹر دور ایک بہت بڑے احاطے میں پھیلا ہوا تھا۔ احاطہ لوہے اور ٹین کی چادروں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا اور جہاں ہمیں غلامہ گیا تھا اسے خاردار تاروں سے بند کیا گیا تھا۔ اندر کھڑے ٹرکوں اور بسوں کی جھلک یہاں سے بھی نظر آ رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں زیادہ تر بڑی گاڑیاں آتی ہیں۔ میں نے اپنا ایک اپ ٹرک احاطے کے باہر ہی روک دیا اور پانی کا بڑا والا لین اٹھا کر اندر داخل ہوا۔

کہیں دور ہانڈروک کرشر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اس طرف کا رخ کیا۔ یہ بھی میرا ایک حربہ تھا، میں جب کسی جنک یارڈ میں داخل ہوتا تو پانی لینے کا بہانہ کرتا اس طرح جنک یارڈ کے مالک پر واضح نہیں ہوتا کہ میں اصل میں بزنس کے لیے آیا ہوں اور پھر اپنے مطلب کی چیز جیسے اتفاقاً دیکھ لیتا تھا لیکن جیسے جیسے میں اس جنک یارڈ میں آگے بڑھ رہا تھا مجھے مایوسی ہو رہی تھی۔ یہ سچ کچھ زیادہ تر بڑی گاڑیوں کا جنک یارڈ تھا۔ یہاں ٹرک، ہٹی ٹرک، بسیں اور وین کھڑی تھیں۔ بالآخر میں کرشر کے پاس پہنچ گیا۔ یہ بہت بڑا کرشر تھا جو بس اور ٹرک کی باڈی کو بھی دبا کر اسے ڈبے میں تبدیل کر سکتا تھا اور اس وقت وہ ایک بس کو دبا کر اسے چھوٹے سے چوکور ڈبے میں تبدیل کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوئی تیس فٹ لمبی اور بارہ فٹ چوڑی اور اونچی بس صرف دو ضرب دو فٹ کے چوکور ڈبے میں تبدیل ہوئی اور

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM SHAMPOO



وہی 3 کی خوبیوں کے ساتھ

آملہ، ریشم، سکا کافی اور کنڈیشنر سے لمبے گھنے اور چمکدار بال

یہاں زیادہ تر بڑی گاڑیاں ہیں اس لیے مجھے چھوٹی گاڑیوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔
”مجھے جونی کیپ کہتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
”جارج شیلٹر۔“ اس نے میرا ہاتھ گرم جوش سے لیا۔

میں نے کین ہلایا۔ ”میں ہائی وے پر سفر کر رہا تھا میری پک اپ کا انجن گرم ہو گیا اور میں پانی کی تلاش میں یہاں چلا آیا۔“
”تمہیں پانی ضرور ملے گا۔“ اس نے خلوص سے کہا۔ ”ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
میں خوش ہو گیا۔ ”میں شکر گزار ہوں مسٹر شیلٹر۔“
اس نے ایک کونے میں لگے گل کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم وہاں سے پانی لے سکتے ہو۔ جب تک تم پانی میں کافی لاتا ہوں۔“

وہ کہہ کر کین میں چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا خود ساختہ کین اور یقیناً جارج شیلٹر کا دفتر تھا کیونکہ اسے چھوٹے کین میں رہائش کی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی کیا کہا جاسکتا تھا انسان بعض اوقات سونے کے لیے درکار جتنی جگہ میں بھی سکتا ہے۔ میں کین لے کر گل کی طرف بڑھ گیا اور اس پانی بھرنے لگا۔ جب تک میں نے کین میں پانی بھرا وہ جگہ اندر سے دو کپ کافی لے آیا۔ اس نے ایک کپ مجھے دیا۔ ”تم لاس اینجلس جا رہے ہو؟“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“
”اگر تم لاس اینجلس سے آرہے ہو تو تو سڑک دوسری طرف سے گزرتے اور اس طرف سے میرے چمک یارڈ کا بورڈ نظر نہیں آتا ہے۔“

”تم نے بالکل درست اندازہ لگا لیا ہے مسٹر شیلٹر۔ میں نے تقریبی انداز میں کہا اور کافی کی چمکی لے بولا۔ ”کافی بھی اچھی ہے۔“

وہ واقعی سادہ آدمی تھا، میری اتنی ہی تعریف سے غور نظر آنے لگا۔ مگر میں اتنی جلدی اس کی سادگی پر اعتبار کر کے لیے تیار نہیں تھا۔ جنک یارڈ چلا آنا اور اس سے نفع کمانا سادہ مزاج آدمی کا کام نہیں ہے۔ سادہ نظر آتا اور بات ہے جبکہ سادہ ہونا اور بات۔

”تمہارا جنک یارڈ بہت بڑا ہے اور یہاں گاڑیاں خاصی نظر آ رہی ہیں۔“ میں نے آس پاس دیکھا۔ ”اس مطلب سے تمہارا کاروبار اچھا چل رہا ہے۔“

پھر ایک کمرے میں یہ ڈبا اٹھا کر ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں رکھ دیا جہاں پہلے ہی ایسے بے شمار ڈبے موجود تھے۔
میں آس پاس دیکھ رہا تھا۔ کرشر اور کمرے چلانے والے تو اپنی جگہ موجود تھے لیکن اس کے علاوہ وہاں کوئی اور شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کرشر سے ذرا دور آیا اور ایک کین کی طرف بڑھا ہی تھا کہ رک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ ہاسٹ ماڈل کی پورٹ تھی۔ سیاہ رنگ جو یقیناً اصلی تھا اور اس کے بائیں اور وائیل کیپ تک اصلی تھے۔ پورٹے میری پسندیدہ ترین کاروں میں سے ایک تھی کیونکہ یہ بہت مہنگی ہے۔ پورٹے ایک زمانے میں تیز رفتار اسپورٹس کاروں کے شوقین حضرات کی پہلی ترجیح ہوتی تھی۔ درحقیقت یہ پہلی کار تھی جسے تیز رفتار ڈرائیو کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کا پتہ سلیڈز کا طاقت ور انجن اسے صرف ایک منٹ میں سو میل فی گھنٹہ کی رفتار تک پہنچا دیتا تھا۔ اس کا خصوصی ایروڈائنامک ڈیزائن اسے تیزی سے سفر کرنے میں مدد دیتا تھا۔

میری سمجھ نہیں آئی کہ یہ کار یہاں کیسے موجود تھی کیونکہ جس شخص کے پاس پورٹے ہو وہ اسے بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے ان جنک یارڈز میں دنیا کی ہر گاڑی دیکھی لیکن مجھے آج تک کبھی پورٹے نظر نہیں آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ایک پورٹے اور وہ بھی اتنی اچھی حالت میں ایک جنک یارڈ میں کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کی باڈی درست حالت میں تھی۔ سیٹوں کا کور خراب ہو رہا تھا لیکن ان کی ساخت برقرار تھی اور سب سے بڑھ کر کار کا ڈیش بورڈ اصل حالت میں تھا۔ کسی بھی پرانی کار کا ڈیش بورڈ بالکل اصل کی طرح بنوانا نہایت دشوار کام ہے۔ اس لیے کوئی پرانی کار اصل ڈیش بورڈ کے ساتھ مل جاتی تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں ہانگوں کی طرح کار کو گھورے جا رہا تھا۔ خاصی دیر بعد کوئی کھنکراتو میں چونکا تھا۔ یہ ایک ادیب عرصے کا تھا جس نے ڈانگری پہن رکھی تھی۔

”معاف کرنا۔“ میں نے خفت سے کہا۔ ”وہ میں اسے دیکھ کر متاثر ہوا ہوں۔ کیا خوب صورت دیکل ہیں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں اچھی کار ہے۔“
”کار نہیں میں صرف پہیوں کی بات کر رہا ہوں۔“

میں نے جلدی سے کہا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ”ویسے یہ کون سی کار ہے؟“
”پتا نہیں شاید پورٹ کا کوئی ماڈل ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ پورٹے سے ناواقف تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ ”تم دیکھ رہے ہو

”بہت حد تک“ اس نے تائید کی۔ ”لیکن سال کے کئی مہینے بالکل بیکار بھی گزرتے ہیں اور چھوٹی موٹی چیزیں بیچ کر گزارا ہوتا ہے۔ جیسے یہ اس باریک آخری کھپ سے اور ابھی کوئی آرڈر نہیں ہے۔“ اس نے کرشر پر جاری کام کی طرف اشارہ کیا۔ ”ایک اسکیل سے اسکرپ کا آرڈر ملا ہے۔“

”معافی حالات خراب چل رہے ہیں۔ ٹیس اور کارخانے بند ہو رہے ہیں۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”چین نے ہماری معیشت کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔“

”چین نے نہیں ہمارے لاکھ سرمایہ داروں نے، وہ چین سے سستی چیزیں خریدنے کے لیے یہاں کارخانے بند کر رہے ہیں۔ انہیں صرف اپنے نفع سے غرض ہے امریکا بے شک ڈوب جائے۔“ اس نے کہا تو میں نے اپنے اندازے پر نظر ثانی کی، وہ اتنا سادہ نہیں تھا جتنا نظر آرہا تھا۔ معیشت پر اس کی گہری نظر تھی لیکن اس کی اس بات سے مجھے بات آگے بڑھانے کا موقع مل گیا۔

”لیکن چین کی بنی ہوئی چیز پائیدار نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں میں نے اپنی گاڑی کے لیے چین کے بنے ہوئے پیسے لیے اور وہ چند مہینوں میں جواب دے گئے۔ مجھے ان کے لیے اچھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اس کار کے پیسے اپنے کام کے لگ رہے ہیں۔ سٹریٹلیر، کیا تم یہ گاڑی بیچنا چاہو گے؟“

اس نے میری بات پر غور کیا۔ ”میں صرف پیسے درکار ہیں؟“

”نہیں، یہ گاڑی بھی ٹھیک لگ رہی ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ممکن ہے اس کے کچھ انجن پارٹس میری گاڑی میں فٹ ہو جائیں۔“

”یہ خاصی پرانی گاڑی ہے، ممکن ہے اس کے انجن پارٹس تمہاری گاڑی میں فٹ نہ ہوں۔“

”میں گاڑیوں کا مکانیک بھی ہوں، میں جو تو ذکر کے اپنا کام چلا لیتا ہوں۔“ میں نے امید سے کہا۔ ”تو کیا خیال ہے؟“

”ظاہر ہے یہاں موجود ہر شے برائے فروخت ہے۔“ اس نے اپنی شخصی ڈاڑھی کھائی اور بولا۔ ”میرا خیال ہے دو سو ڈالر مناسب ہوں گے۔“

میرا خوشی سے برا حال ہو گیا، وہ گاڑی مجھے فری میں دے رہا تھا لیکن میں اپنی خوشی کا اظہار کر کے اسے چونکا تا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے برا سامنہ بنایا۔ ”دو سو ڈالر..... بہت زیادہ ہیں۔“

”نہیں، مناسب ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”دیکھو اس کو الٹی کے پیسے تم مارکیٹ سے لو تو کم سے کم چالیس ڈالر کا

ایک پیسے ملے گا یعنی چار پیسوں کا سیٹ ہی ایک سو ساٹھ ڈالر کا ہو گا۔ باقی انجن پارٹس کے لیے تمہیں صرف چالیس ڈالر میں پڑ رہا ہے۔“

”لیکن یہ پرانی گاڑی ہے اس کے پیسے اچھے خاصے استعمال ہو چکے ہیں۔“ میں نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ”پارٹس کا معاملہ رسک پر ہے ممکن ہے میرے کام آجائیں اور ممکن ہے نہ آئیں۔ میرا خیال ہے اس کے سو ڈالر ٹھیک ہیں۔“

”نہیں دوست! سو ڈالر بہت کم ہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور مجھ سے کپ لے کر واپس کہیں میں چلا گیا۔ ایک لمبے کویر اڈل ڈوب گیا کہ اس نے انکار کر دیا ہے۔ میں اسے دو سو ڈالر بھی خوشی سے دے سکتا تھا لیکن میں اسے چونکا تا نہیں چاہتا تھا۔ سو ڈال بھی ہوا نہیں تھا اور میں ممکن تھا کہ سمجھ جاتا کہ کار بہت تیزی سے اس لیے میں اس کی واپسی تک کار کا معائنہ کرتا رہا اور ایسی شکل بنا تا رہا جیسے خود کو اس کی مانگی قیمت دینے پر آمادہ کر رہا ہوں۔ میں نے کار کا یونٹ اٹھایا۔ پورے گاڑی کا انجن شاہکار تھا اور انجن بھی بہترین حالت میں تھا اگرچہ یہ کار کے سپریشن سے الگ تھا۔ یعنی انجن صرف رکھا ہوا تھا کار سے جڑا نہیں تھا لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا اسے بعد میں آسانی سے جوڑا جاسکتا تھا۔

وہ یقیناً کہیں سے میرا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہیں اٹھایا اور جیسے واپسی کا ارادہ کیا لیکن پھر رک گیا۔ قریب دس منٹ بعد وہ کہیں سے برآمد ہوا اور اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے کہا۔ ”ٹھیک ہے صرف تمہارے لیے میں ڈیڑھ سو ڈالر لے لوں گا لیکن اس سے ایک ڈالر بھی کم نہیں ہوگا۔“

میں نے ظاہری طور پر بادل نا خواستہ کہا۔ ”مجھے منظور ہے کیونکہ تم ایک اچھے آدمی ہو اور مجھ سے اچھی طرح پیش آئے ہو۔“

”ٹھیک ہے، لاؤ ڈیڑھ سو ڈالر۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا۔

میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے پچاس ڈالر والے تین نوٹ اس کے حوالے کر دیے۔ ”سو ڈال ہے۔“ اس نے نوٹ دیکھ کر اپنی جیب میں ٹھونس لیے اور بولا۔ ”تمہارے پاس کون سی گاڑی ہے؟ تم نے شاید کبھی کبھی کبھار کہا تھا؟“

”میرے پاس ڈوج پک اپ ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تب تو کوئی مسئلہ نہیں، آرام سے آجائے گی۔“

پورے چھوٹی کار ہوتی ہے لیکن اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوتی کہ میرے پک اپ ٹرک میں آسانی سے آجائی، مگر ریسوں سے باندھ کر میں اسے محفوظ طریقے سے لے جاسکتا تھا۔ میں اپنی خوشی چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے لگا کہ میں دیر اس کے سامنے رہا تو پھٹ پڑوں گا اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ”میں اپنی پک اپ لے کر آتا ہوں۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے تم آرام سے آؤ۔“ اس نے کہا اور اپنے آڈیوں کو آواز دینے لگا۔ میں تیزی سے باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میری آواز خارج ٹیلنریا اس کے ساتھ لپکتی نہیں جائے گی تو میں نے منہ اوپر کر کے ایک بھر پور تہقہہ لگایا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اپنی زندگی کا سب سے نفع بخش سودا کر لیا ہے۔ کار پر زیادہ خرچ نہیں آتا اور چند ہزار ڈالر کے خرچ سے یہ ایسی ہو جاتی جیسے ابھی شو روم سے نکلی ہو۔ اس پورے کی قیمت کم سے کم بھی دو لاکھ ڈالر بنتی تھی اور اگر میں اسے غلام کر کے فروخت کرتا تو اس کی کہیں زیادہ قیمت مل سکتی تھی۔ میرا دل رقص کرنے کو چاہ رہا تھا لیکن یہ موقع نہیں تھا، مجھے جلد از جلد یہ کار حاصل کر کے یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ میں پک اپ کے پاس آیا۔ اس کا انجن بالکل بھی گرم نہیں تھا لیکن میں نے ریڈی ایٹر کا بانی بول دیا اور ٹھوڑا پانی سامنے بھی گرایا تا کہ میری کہانی بالکل حقیقی لگے۔ میں اس تمام باریکیوں کا خیال رکھتا تھا اور اسی وجہ سے میں ایک کامیاب کاروباری تھا۔ میں نے کوئی پندرہ منٹ بعد پک اپ اسٹارٹ کی اور جنگ یارڈ کے اندر آیا۔

میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا لیکن جب کہیں کے پاس پہنچا تو جیسے دھڑام سے زمین پر آگرا۔ وہاں کار نہیں تھی بلکہ اس کے چاروں پیسے اور انجن پڑا تھا۔ اس کی باڈی غائب تھی۔ میں بدحواسی میں پک اپ سے اترا اور گرتے پڑتے جارج ٹیلنر کے کہیں تک آیا۔ میں نے چلا کر اسے آواز دی۔

”جارج تم کہاں ہو؟“

وہ کہیں سے نکلا اور خفگی سے بولا۔ ”کہیں ہوں اس میں اتنا چلانے کی کیا بات ہے؟“

کار کو غائب دیکھ کر میں پاگل ہو گیا تھا اور میں نے اس کا ریمان پکڑ لیا۔ ”کار کہاں ہے؟“

”یہ ہے۔“ اس نے اپنا گریبان چھڑایا اور پیسوں اور ٹیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہیں ان چیزوں کی ضرورت تھی۔“

”مجھے پوری کار کی ضرورت ہے۔“ میں نے چلا کر کہا۔

”لیکن تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ تمہیں پوری

مسئلہ

شوہر، ہوئی ٹیجر سے۔ ”جلدی سے میرے ساتھ آئیں میری بیوی کرے گی کھڑکی سے کود کر جان دینا چاہتی ہے۔“

ٹیجر۔ ”سر، آپ اسے روکیں میں کیا کر سکتا ہوں؟“

شوہر۔ ”میری تو مسئلہ ہے کہ کھڑکی نہیں مل رہی۔“

سر۔ ”تفسیر عباس باہر ادا کاڑھ

کار کی ضرورت ہے۔“ اس نے مجھے یاد دلایا۔ ”تمہیں اصل میں پیسے درکار تھے اور انجن کے کچھ پرزے بھی۔ وہ میں نے نکال دیے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میں نے صرف پیسوں اور انجن کی بات کی تھی لیکن مجھے پوری کار چاہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے، میں اب بتا رہا ہوں مجھے پوری کار چاہیے۔“

اس نے ہانسی سے سر ہلایا۔ ”اب تو وہ شاید تمہیں نہیں مل سکتی۔ تم نے دیر کر دی ہے۔“

میں بدحواس ہو گیا۔ ”نہیں مل سکتی..... لیکن کیوں؟“

”وہ کئی سال سے یہاں بے کار کھڑی تھی اور اب تو مزید بے کار ہو گئی تھی، میں نے اپنے آڈیوں سے کہا انجن اور پیسے نکال کر باقی باڈی کرشر میں ڈال دیں۔ میرے آدمی اسے کرشر میں ڈالنے کے لیے لے گئے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں چلا یا۔

”لعنت ہو تم پر۔“

میں زندگی میں بھی اتنا تیز نہیں دوڑا تھا جتنا اس وقت دوڑا۔ سر پٹ بھاگتے ہوئے کرشر کے سامنے پہنچا تو پورے کار اس کے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اس کی باڈی صحیح سلامت تھی۔ میں کرشر کے کنٹرول کہیں کے نیچے آیا اور اس میں موجود جارج ٹیلنر کے آدمی کو چلا چلا کر کرشر چلانے سے روکنے کی کوشش کرنے لگا مگر افسوس کرشر..... کہیں کے شور میں اس تک آواز ہی نہیں گئی اور اس نے ہانڈ رولک جبکہ کاؤنڈل صبح لیا۔ اوپر سے کرشر کی گول فولادی پلیٹ کار کی باڈی پر گری اور اسے پکڑ کر رکھ دیا۔ مجھے لگا جیسے کرشر نے کار کی باڈی کا نہیں اصل میں میرا قید بندا یا ہو، میں چکر اکر گر پڑا تھا۔ (9)



اناٹی

66

خوب صورت دل رنگ جیڑوں سے گدھی ایک تیز رفتاری

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناٹی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناٹی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس واس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لپھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لائری کھل گئی، ایسی لائری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناٹی سے کھلاڑی بننے کے بعد... وہ لوٹا... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناٹی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دور حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ پرنگ

گرد و پیش کا احوال۔ منظر کشی کا کمال۔ ایک داستان لا زوال، آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ اور عمر آراء انداز تحریر نے تخلیق کیا۔

سے پڑنے والے یہاں سے شروع کریں۔

انھارویں صدی کے آغاز میں امریز فوج کو شہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ فوج جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے حالت میں میر سے پرواد کے پردہ اٹھانے اپنی بیٹی کا غازی میں ڈال کر یہ طاقت پر تاس کے قلعے میں آکر بیڑی چھائی تک پہنچا دیا۔ انعام کے طور پر امریز نے اعزازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جیتی زمین کا چکر اپنی تل گازی دوڑا کے لگائے گئے وہ ان کے نام کر دی جائے گی۔ یوں بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میر سے آباد ایداد خواب کھلائے۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا ملی اور اس کے چھ جوان بیٹے باری مختلف حادثات کا شکار ہو کر مر گئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن کسی خرابی کے باعث جہاز بحر اکمال میں گر گیا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی بیٹی بیویوں کو مارا اور پھر خودکشی کر لی۔ جو بی بی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میر سے والدہ ماجدہ کا رخ سے ریاکار ہوئے۔ میں ان کا انکشاف دینا تھا زمانہ طالب علمی میں میر افسانہ ایک سیاسی تنظیم کے درمیت گردوں سے ہو گیا۔ میری زندگی بچانے کے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بھانے امریکا بھیج دیا۔ وارڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لاڈلارڈ اسٹریٹ کی درس فرم میں ایک مہینہ کے کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی لیلیٹھا مجھ پر فریفت ہو گئی اور اپنا نام تک بدل کر عاشق بن گئی۔ مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا کیونکہ میں فریٹا چاہتا تھا۔ فریال پہلے ماڈل اور الیکٹریشن تھی اور اپنی بے وقتی کے باعث ایک عیاش اور شخص اور فکسٹا چوہری سلطان سے عشق بھی کر رہی تھی۔ میں فریال نے چھ سال تک اس کی عداوت کا مقابلہ کیا۔

ایک ایک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے کسی نئے رشتے کے پردہ اٹھانے کا طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور دماغ کے سوا ان کا جسم منقطع تھا۔ ان کی معلومات کے مطابق میں ان کا رشتہ دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انھوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ ساتویں بیٹے تھے جن کا چھانڈنڈن جاتے ہوئے سمندر میں گر گیا تھا۔ وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بیہوش میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانو ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کسی سرانظر میں ادا سے کی دوسرے انھیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔ اب مجھے کھلم کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان کرشموں میں میری جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ سو سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ مدتی بی بی روڈ پر لاہور اور کھلم کے درمیان دینے جانے والی مسڑ پر بدھاس کے تاریخی قلعے کے کھنڈروں سے چندہ گلوبل کے فاصلے پر تھی۔ حویلی کے ساتھ بندہ تجور یوں اور مشتعل الماریوں سے مجھے منتی میرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور پیش بھانڈا اور تار کا جن میں گاڑا بی بی شامل تھے۔ خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اربوں تک پہنچ چکی تھی۔

اپنے چند دوستوں کی مل حمایت سے میں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگل فروغ فریجیر بنانے اور ایکسپورٹ کرنا اور دریائے کیہان سے پین بلی پیدا کرنے کا منصوبہ پیش تھا۔ مجھے دوستوں سے دوادلوگوں سے پڑائی کی لیکن کامیابی بخشی جاگیر میرا دشمن ہو گیا۔ میری انسان دوستی اور غربا پروری کی شہرت پھیلی تو رانا کو اپنی صوبائی اسمبلی کی سیٹ فخر سے میں نظر آ گئی تھی۔ موروثی حق سمجھتا تھا۔

ابتداء میں شہر چھوڑ کر میر سے ساتھ آنے والوں میں میرا دوست راجا اور اس کی محبتیز ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچا زاد بہن راجہ میر سے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا نامی گرامی ڈاکٹر اور اسی جاتی اور دوست بن گیا۔ شادی بادشاہ نے میر سے کہنے سے فیصلہ کیا کہ سحائی ملنے کے بعد ست بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خیر پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انھوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما چاکے سب کوراستے میں مار ڈالا۔ زندگی شادی بادشاہ کو اس کی بیوی کوئی نکال کر لے گئی۔

شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میر سے والد اور چچا ہی ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک وراثت بنانے برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی راجہ سے شادی کر لیتا تو حق قلمی کا ازالہ ہو سکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے راجہ کو بہن کا درجہ دیا اور دوست بدھائی میں میر سے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دوبارہ صو کا کھایا۔ بدھیتی سے دینے والے میر سے دوست تھے رتنہ راجہ بھی مجھے قلمی اور اپنے والدین کی موت کا ڈر سے اور دیکھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے کا کافی کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی واسطہ تھی۔ برہہ فروشی سے نبشتا فروشی تک کارہ پار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی لیکن نور جہاں بھی حسین عورت نہیں دیکھی۔ اس نے مجھ سے مراسم استوار کرنے میں مدد و ناجز کو پسند دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہدہ چان کے باوجود میں نور جہاں کے حال میں بری طرح محسوس کیا۔ اس نے میر سے لیے اپنے نہادشوہر کو بھی لے کر دیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دی۔ فریال میر سے ساتھ لندن، جیس اور نیو یارک شہروں کی چکا چوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نور جہاں کے معاملے نے اسے جو افراتفری اور ہولناکتوں کو شہر میں ملنے لگی جہاں چوہری کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملے ہی اس نے چوہری سلطان کو گولی کر دیا اور اپنے اعلیٰ علمی مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آئے بھی محفوظ رہی۔

نور جہاں نام نہادشوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر ماہ نو بہن گئی۔ ایک نئے شادی کا ڈراما پاپورٹ کا حصول

رہتی۔ میں اسے لندن میں لے گیا۔ وہ اپنی بی بی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی واپس آ جائے۔ میں اسے لاڈلارڈ اسٹریٹ کی دوسرے برطانوی شہریت لی دلوں چاہتا تھا۔ وہ اپنی بعد لندن پہنچ کر کھجور پر انکشاف ہو کر عاشق ہو کر لیلیٹھا بن چکی تھی اور پڑائش کے باعث شہر کرتی ہے۔ میں ان سر چکی تھی اور باپ سیاسی اور کاروباری دوسرے میں الجھتا ہوا تھا۔ انکشاف کا شوق مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا، اس نے نور کو انوکھا کر کے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کروں۔ نور نے جان بچانے کے لیے مجھے یہ دہرا بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا اس کی وارث صرف مالک کی بیٹی تھیں دو بچا تھا کہ انکشاف کی بیٹی نے پانچواں سال تک اس سے سرنے سے پہلے اپنی ایک سو سو بیٹی تھیں پانچویں جاکر اور دو بچا تھا کہ انکشاف کے بھائی کے بھائی کے بعد لیلیٹھا نیک ہو جائے گی۔ میرے انکار اور میں باپ کی موت نے ماش کے اسان بزم کو شہر پر زور دیا اور وہ اپنے گناہوں کا انکار وادار کرنے کے لیے ترک دنیا کی پڑائش میں ہو گئی۔ قدرت کی طرف سے فوج بھیجی کی دوسری افری میر سے لیے ایک آرائش بن گئی، نور یہاں اگلی رہنے پر راضی تھی اور میں نے بتایا وہاں جاتا۔ پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ ایک ایک مجھے وہ شخص مل گیا جو چیف کھلا تھا۔ اس نے اس سال پہلے اور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں وارث گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلا وطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا بی بی مشیر بنا لوں تو

انھارویں صدی میں اپنے حریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر اس کی پیشکش قبول کر لی۔ ست بدھائی کے اسپتال کو وصیت دینے میں میر سے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بنا شامل تھے، اس کی بی بی تیسری رکن بھی تھیں ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ماکھی اور پھر شوہر کے قتل سے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب دھیمہ من لیا اور کسی حد تک قابل بھی ہو گئی۔ وہ ایک لالائی مصور تھا جو لندن میں عریاں نقاد بن کر اپنے پوتے بچ رہا تھا اور انکشاف کا شکار تھا۔ بچتا ہے اپنی جان بچانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جاتا ضروری تھا۔ وہ دو بیوی کرنا میں کا رہتا تھا۔ میں نے اس کے تمام تر سنے ہاں کیے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ چیف نے مجھے پہلی پ دی کہ میں وحید کو اپنے ڈیڑھ بیٹ سے بطور برہمنی استعمال کر سکتا ہوں۔ چیف کا اصل نام قلمی تھا۔

اگرچہ میں یہ سیکھتا تھا کہ ست بدھائی کو راجہ کے سپرد کردوں تاکہ اس کا حق قلمی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید بڑھادوں۔ مگر نور کے سمجھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ لاڈلارڈ اسٹریٹ کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ڈر سے وار مجھے تھے۔ وہ سب احتجاجا ملازمت چھوڑ گئے۔ لاڈلارڈ کے سابق شوہر اور پڑوسی گارڈ نے میری راستوں سے ناواقفیت کے باعث مجھے ایک ویران احاطے میں تھوکر مارنے کی کوشش کی لیکن ایک ناک آؤٹ کر کے میں نے قلمی کو طلب کیا اور خود لیلیٹھا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ قلمی نے احاطے میں کھڑا بیڑہ چلا کر ست بدھائی کے دھرم میں لاشوں کو یاد دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوتیس گھنٹے گزر گئے سے پہلے وہ گرفتار ہو گیا۔ میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتا دیا جو فراموشی کے ساتھ میں مجھے بتانا تھا۔ چوری کے دہرا رہتی جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہی گئے۔ حالات نے پٹا کھایا اور مجھے آخر کار پک گیا۔ مگر فریٹا نے نہیں چھوڑا۔ جس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ چیف کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسی دوران چیف کی ایک نفسیاتی تفریق کی دولت میں نے بی جان لیا کہ فرسٹ رسل چیف تھیں بلکہ اس کا ذیلی بیٹ ہے۔ اصرار لندن پولیس کی مہارت اور جہاد بینکالوکی کے ذریعے چیف اور ان کے قتل کر کے قتل کر لیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک عمر افریز جوز سے کی دے دیا۔ اپنے گھر پہنچا۔ مگر سب کچھ اس کے ساتھ میں کرنا اور اس کے ساتھ میں کرنا۔ میں نے صرف ہون گیا۔ میں اور نور تمام امور سے دست کر ششگل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ایک ایک لیلیٹھا پرانے میں بیوی نکلی۔ اب وہ اپنی پانچواں سال کا صاحبہ کر رہی تھی مجھے اس کی ذہنی حالت پر شہید بندہ میں نے ان کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے بیٹوں نکال دیا۔ وہ اپنی کی حالت میں مجھ پر ناکر کر دیا۔ پولیس اسے لے گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو لیلیٹھا نے جو اچھے پڑائش کی باتیں کہیں وہاں کچھ نہیں کہیں تھی اور لاڈلارڈ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلک میل کرنے سے لیلیٹھا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز حق سے مسترد کر دی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں ست بدھائی راجہ کے تمام کردار اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہر حال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان کا بے کا فیصلہ کن اور بڑی مشکل سے تینا لندن میں رہنے پر راضی ہو لی۔ تینا پڑنے پر میرا بیٹھ کس پیوری ہو گیا جس کے باعث لیلیٹھا سے میری روایتی خطرے میں پڑ گئی۔ اسی غلط فہمی میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بے ہوش کر دیا گیا اور بیولیس میں ڈال کر مقدمہ مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے انوکھا کرداروں میں پھر جب راجہ میر سے سامنے آئی تو میں بھوکا اور مریز یہ یہ کہ میر سے خریف زہیب کے ساتھ مل کر یہ بار بار چاہتا تھا۔ اس کا دیرینہ مطالبہ تھا کہ جاگیر اس کے نام کی جائے۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کے دوران ایک بات پر مشتعل ہو کر اس نے ریا اللہ سے مجھ پر ناکر کر دیا۔ اس کا لکھنا خط لیا۔ اسی اثنا میں اس کے کانڈے داخل ہوئے اور اسے لے کر چلے گئے۔ ایک دن میر سے میں کی وی رکھ دیا گیا جس کے ذریعے راجہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا مطالبہ بڑھا۔ مسلسل قید اور ذہنی آزیت کے باعث میں کتابے زار تھا کہ میں نے ان کا مطالبہ منظور کر لیا۔ معاملہ یہ طے پا گیا کہ میں جاگیر راجہ کو گفٹ کر دوں گا۔ بعد ازاں راجہ نے مجھ سے رابطہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی میں نے اسے انکار کیا تو وہ اپنی ناکامی پر دوبارہ مخالفت پر کمر بست ہو گئی۔ یہاں مجھے یہ طیمان ضرور ہو گیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وہ وکیل اور بے درمیان میں آجائے سے جان کا خطرہ مل گیا تھا۔

قید کے دوران ایک دن میری خرابی پر مامور افراد میں سے ایک کے دل میں آخر دم تک کا جذبہ پیدار ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں زخموں ڈال کر مجھے ہلاک کر دیا۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ کوئی مشرک گیسٹ ہاؤس تھا۔ دیرانے میں مجھے ایک بیٹی جو نظر آ رہی تھی مجھے ایک سابق فوجی مل صاحب کے گھر تک لے گیا۔ یہاں مل صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجہ سے رابطہ کرنے اور وہ جنگ پیچھے میں کا بیاب ہو گیا۔ راجہ کی ہمارا رگشہ کی پڑائش میں آ گیا۔ راجہ نے ایک اسپتال لے گیا تاکہ میری صحت پر سنی بات ڈال دے۔ پھر مجھے شہر سے لے لایا۔ اور قلمی کے ساتھ وید کی بیٹی کی بھیجی کہ میری بی بی۔ پھر راجہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہی مگر رہا نہ اسے مجھ کو دیا۔ پھر وقت گزرا اور میں نے اپنی بیٹی کی موت کی اطلاع پاس لے لی۔ میں نے اپنا حال جا کر دیکھا تو حالت اور دیگر احوال سے وہ براہ راست بتا دی کہ میں کا چہرہ دس تھا۔ میں نے اسے دیا اور اسے راجہ کے میر سے مقبب میں

آئی گاڑی گاڑی دھاک سے تیار ہوئی اور ایک موٹی موٹی معرکہ کے بعد میں حویلی واپس پہنچا تو نور نے فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آ رہی ہے لہذا میں اسے لینے کے روانہ ہوا لیکن راستے میں سولادوانی ڈاکو نے مجھے ڈھک کر لیا۔ سولادوانے کے زیرے پر ٹیم ڈاکو نے مجھے اس کے گزرتے سے آگاہ کیا اور میری مدد کی۔ یہاں سے ڈاکوؤں سے سخت کرب اور پورٹ پہنچا تو دیکھا تو نہیں آئی بلکہ فون پر مجھے اطلاع دیا کہ میں نے راجہ کے بارے میں اس سے اطلاع دی کی ہے۔ میں نے وضاحت کی تو اس نے فون پر راجہ کی موجودگی کا انکشاف کیا اور اس کی آواز میں ہلکا کر رہ گیا۔

راجہ میرے لیے دوسری جگہ چلے گئے تھے۔ لیکن نور نے مغلدی کا مشورہ دیتے ہوئے راجہ کی گمرانی کی جس پر ذرا پہلے انکشاف ہوا کہ راجہ کا حویلی میں کسی سے رابطہ قائم ہے۔ لہذا نتیجے میں ایک گاڑی سردارانِ جرم ثابت ہو اور ایک مختصر ٹرائی کے بعد میں نے اسے اپنے حویلی واپس لایا۔ دوسری جانب وحید کو انور کے لیے کی کوشش کی گئی۔ ایک مٹا لیے کے بعد انور کا بھی قیدی بنا لیے گئے۔ میں نے نوٹوں کی شکل میں منسلک ہوئے۔ اور راجہ کی گمرانی کرنے کی ہدایت کی اور لندن جانا چاہا لیکن راجہ نے مجھے مطلع کیا کہ انور خود لندن جانے کا فیصلہ کیا جبکہ قیدیوں سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق ان سردار کا رونا ہوا ہے۔ پیچھے دلاور کا راجہ تھا۔ یہ نام میرے لیے نیا تھا۔ اسلئے اور غیبت کا ایک بین الاقوامی اسکند تھا۔ وہ انگلینڈ میں اپنے حق میں بری دستبرداری خواہش مند تھا مگر میں نے اسے پہنچ کر دیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے ایک نسوانی شخص سنا دی گئی جس نے اپنے کمرے سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ خود کی بھی جسے کی صف بوش نے پوچھ رکھا تھا۔ میری مداخلت پر وہ فرار ہو گیا۔ حملہ آور کی حویلی میں موجودگی باعث تشویش تھی۔ اسی دوران ڈاکٹر شہناز کی کرن جوڈاکر بھی، جی ہمارے ایک رکن بن گئی۔ سخت تشویش کے بعد جاتا رہا جس کا لگا لگا جو دلاور خان کا آدمی تھا۔ بعد ازاں حجاب نے اپنی ایک بھینسی کی سٹائی کے سر طرکس و دلاور کے قتلے میں چھپنا مگر اب وہ حقیقت جان کر دلاور کا دشمن بن گیا ہے۔ میں اس کے چھپنے میں یقین کر کے اسے اپنے دوست کی حیثیت سے حویلی میں رکھ لیا جبکہ ڈاکٹر شہناز نے حقیقت محسوس کر لی۔ راجا کا فون آیا اور اس نے اطلاع دی کہ راجہ فرار ہو گئے۔ ہم نے جلدی بارے میں معلومات کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا۔ جس کی روایتی کے بعد ایک نامعلوم کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وہ اسپتال میں زخمی حالت میں ہے۔ حیران تھے کہ اتفاقاً صوبے والے میجر صاحب نے میرے پھول کی صفائی کے دوران ٹرانسمیٹر ٹائپ ایک ڈیوائس دریافت کی اور جلدی پر جوش تھا وہ یقین کر بدل گیا لہذا اس سے تھوڑے تھوڑے میں تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ شدید زخمی ہو گیا اور اسی حالت میں فوت ہو گیا۔ اس امر کی تصدیق ہوا کہ اسے پیچھے والا ذریعہ تھا۔ راجہ نے اطلاع دی تھی کہ وہ دور دور پاکستان آ رہے ہیں لہذا اسے لینے میں اپنے گاڑی کے ساتھ ان پورٹ پہنچا جہاں ایک گاڑی مجھے کن پورٹ پر رکھا۔ اسی دوران ایک فائر ہوا اور میں نے ایک گاڑی کو گرتے دیکھا۔ ایئر پورٹ پر اس صورت حال پر پولیس بروقت پہنچ کر پوچھا تو جھکا سطر شروع کرتی ہے۔ راجا دور دور ایئر پورٹ سے برآمد ہوتے ہیں۔ نو بڑی ٹرمنڈے معاملہ پھری کا ہے لہذا انکس دیں رکنا پڑتا ہے۔ اسی دوران راجا کا ایک کرپورٹ دوست انٹر ویو کا حال ہے ان کی مدد کرتا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ ست بدحالی پہنچ جاتے ہیں جہاں ڈاکٹر شہناز کو اپنے کمرے سے بلاوے پر بلا کر سرور کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے لیکن سرور زخمی حالت میں اس کا اطلاع دیتا ہے کہ شہناز کو انور کا کرنا گیا ہے۔ یہیں بھی راجا کا دوست نامر کا آتا ہے اور شہناز بازیاں کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد درمیان سکون کا سامن لیتا ہے کہ اس کا فون کال کا سکون غارت کر رہی ہے۔

کال راجہ کی تھی اور اس نے اپنی مطلوبیت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کئی بار جھڑکنے کے بعد بالآخر میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا اور اس کے بتائے ہوئے پہنچ گیا جہاں مجھے قید کر کے دہشت گردی کا بیڑا چلایا جاتا ہے لیکن ایک بار پھر میری بروقت مداخلت سے اسے رہائی ملی ہے اور ساتھ ہی راجہ کو بھی آزاد کر لیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک شخص چھوٹو بھی یہاں فعال بنا کر قید کر دیا جاتا ہے۔ راجہ اپنی رام کہانی سنا رہا ہے۔ لاہور میں برہمنی کے ایک دوست کی فوج میں قیام کرتے ہیں۔ جہاں مجھ پر ایک حملہ کیا جاتا ہے۔ کوئی نکلے سے زخمی ہو جاتا ہوں۔ یہ فوجی کے منہ سے ایک نیا مشا کہہ سکتے ہیں جو ابور کا فیصلہ ہے۔ اس سلسلے کے سلسلے میں حال لینے پولیس انفر آتا ہے اور رخا کر کے متعلق بتاتا ہے لیکن رفیق الاطی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی دوران دروازے کے باہر فوجی کی کسی سے سخت کی آواز آتی ہے۔ حویلی میں ایک بلی غور سے گھس آئی تھی جس سے گاڑی دھکے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کو گمان کی ہے۔ پرانی پر رش کی اور بلی کو روک دیا۔ راجہ کو اس سے نامر کا فون آیا اس کا کیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کی مزاح پر ہی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا جبکہ سکر نے بھی اپنے والد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر لہذا وہ بھی ساتھ ہی۔ راستے میں یہ معلوم ہوا کہ ہم پر حملہ کیا۔ ٹیم نے پھر پر انداز میں مدد کی اور ہجرات کی ڈپٹی کمشنر کی مدد کی بدولت میں اسپتال تک پہنچ کر جہاں سے راجا کو فون پر اطلاع دی اور وہ آ کر مست بدحالی لے گیا۔ اس صبح کے دوران میرا موبائل وینز پر تھا۔ اسی دوران فوجی کفریائی کر دیا گیا ہے اور اس کے لاش کے پاس ہی میرا موبائل ملا ہے۔ یہ انتہائی تشویشناک صورت حال تھی لیکن راجہ کے تعلقات اور ڈپٹی کمشنر کی مدد سے اس صورت حال پر قابو پا گیا۔ ایک دن مجھے شاکر کا فون موصول ہوا جو مجھ سے فون کرنا چاہتا تھا۔ فوجی نے پریشانی کے عالم میں مجھے راجہ کے متعلق خبر دی۔

راجہ نے ڈراما کر کے بنا دینے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ بلی نے ایک بار پھر حویلی میں داخل ہونے کی ہجرات کی جس پر اسے حویلی بلایا گیا جس نے انکشاف کیا کہ وہ پاگل پن کا دھوکہ دے چاہتی تھی رات کے ظلم کی وجہ سے۔ لیکن بعد ازاں وہ جتنی ثابت ہوئی اور حویلی سے فرار ہو گئی۔ اسی دوران لندن سے سوٹی کا فون آیا اور ایک بڑے معاملہ کے سلسلے میں نور کو لندن واپس بلایا۔ راجہ کو لپٹا لے گیا اور جہاں سے وہ ہجرات کی حالت میں فرار ہو گئی۔ لندن رو آگئی سے پہلے نور کی شاپنگ کے سلسلے میں لاہور جاتے ہوئے راستے میں ایک بھولے شاکر سے دوستانی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے والد اور کے درمیان جادو کا تازہ ماف کے بارے میں بتایا۔ وہاں ہی میں کچھ لوگوں نے نواب رفیق اور نور کو انور کے قید کر۔ یہاں رفیق نے منتقل کر کے ایک ڈاکو کو بکر کر۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”ہاں، ریٹیم!“ میں نے سرور لہجہ میں کہا۔ ”میں تمہارا جتنا خیال کرتا ہوں، تم مجھے اتنی ہی آکلف پہنچاتی ہو، تم نے اس حویلی کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کسی اور ملازم میں اتنی جرات

ہوئے میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ”وہ اصل میں اس فوجی نے بات کی تھی۔“

”اچھا، میرے پیروں میں مت بیٹھو!“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”آئندہ اگر تمہاری طرف سے ایسی کوئی حرکت ہوگی تو تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔ فوجی آخر تمہارا شوہر ہے۔ تم تو اسے بالکل اپنا زرخیز ملازم سمجھتی ہو۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتا ہے اس لیے کچھ کہتا بھی نہیں ہے، ورنہ تم جانتی ہو کہ گاؤں کے دوسرے مرد اپنی عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟“

”اب آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میری بلا سے وہ گھر میں کتے پالے یا پتھر یا پورے گھر کا چرچا نہ بناوے۔“

مجھے اس کے انداز پر فحش آگئی۔ میں نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”میں نے وہ کتا ٹیلیم کے حوالے کر دیا ہے، اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟“

”آپ پہلے سارا کام مجھ سے کراتے تھے، اب وہی کام تمہیں کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“

”اچھا آئندہ سے میرے سارے کام تم ہی کروگی۔“

ابھی تو میں ست بدحالی سے باہر جا رہا ہوں۔ ہاں، ڈراما کو

”جی صاحب جی!“ وہ خوش ہو کر بولی۔

تھوڑی دیر بعد ٹیلیم اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت وہاں موجودی یا پھر مجھے یہ ایسا لگتا تھا کہ اس کے آنے سے مابوں ایک دم بدل جاتا ہے۔ ویسے جب سے وہ ہجرات اور لاہور میں میرے ساتھ رہ کر آئی تھی، مجھ سے کچھ بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔

”ٹیلیم! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ لاہور چلو۔“

”تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

”صاحب جی! لاہور؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں لاہور!“ میں نے کہا۔ ”تم نے بھی لاہور کا نام نہیں سنا؟“

”آپ نے اچانک جانے کا فیصلہ کیا ہے اس لیے مجھے حیرت ہوئی تھی۔“ ٹیلیم نے کہا۔ ”مجھے جھلا کیا اعتراض تھا۔“

”کب جاؤ گے؟“

”میں ابھی آدھے گھنٹے میں نکلیں گا۔“ میں نے کہا۔

”خیر، تم کبیں میں اپنے چلے۔“ اور نہ دیر کی دوسری باتیں۔

”میرے پاس سامان ہی کیا ہے صاحب جی!“ ٹیلیم نے کہا۔

”میں تو ابھی دس منٹ میں تیار ہو جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

”آدھے گھنٹے بعد ہم لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔“

اس مرتبہ میرے پیچھے گاڑی کی ایک گاڑی بھی تھی لیکن وہ لوگ پرانی ہی ایک ٹویوٹا پک اپ میں موجود تھے اور اپنے حلیوں سے گوالے لگ رہے تھے۔ پک اپ میں دودھ کے دو چادر ڈر بھی تھے۔

میری گاڑی حسب معمول فوجی ڈرائیو کر رہا تھا۔ پینچر سیٹ پر راجا تھا اور عقبی سیٹ پر میرے ساتھ ٹیلیم بیٹھی تھی۔ سرور، احمد شاہ اور شوکا (مالی) ٹویوٹا پک اپ میں سوار تھے۔ اس پک اپ کو شوکا ڈرائیو کر رہا تھا۔ ان کی گاڑی کا فاصلہ ہماری گاڑی سے کچھ زیادہ تھا لیکن فوجی کا سرور اور احمد شاہ سے سب فون پر رابطہ تھا۔

ہاں، میں بتاتا تو بھول ہی گیا کہ ہماری گاڑی میں ایک مسافر اور موجود تھا، یہ مسافر وہ جرمن شیفرڈ تھا جو فوجی اور ریٹیم کے درمیان وجہ تنازع بن گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت آرام سے اس نوکری میں سو رہا تھا جو فوجی نے خاص طور پر اس کے لیے تیار کی تھی۔

ٹیلیم البتہ اب تک حیران تھی کہ ہم اسے لاہور میں کیوں لے جا رہے ہیں؟

آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ ”صاحب جی! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“

”تم سے شکایت؟“ میں نے کہا۔ ”تم سے کیا شکایت ہوگی؟“

”پھر آپ مجھے لاہور کیوں لے جا رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی حویلی میں جو آرام ملا ہے، میں نے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آپ مجھے کس کے حوالے کرنے جا رہے ہیں؟“

”تم کیا سمجھ رہی ہو، ہم تمہیں کسی کے حوالے کرنے جا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو یہی سمجھ رہی ہوں۔“ ٹیلیم نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے لاہور میں آپ کے کسی دوست کو ملازمد کی ضرورت ہو ورنہ آپ مجھ سے سامان باندھنے کو کہتے۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اصل میں ہم لوگ خود لاہور میں کچھ دن رہنا چاہتے ہیں۔ وہاں ہمیں جانے اور پانے وغیرہ کی ضرورت تو پڑنے کی نالیہ کاموں

خان حیرت سے بولا۔

”ہم تو حکم کے غلام ہیں۔“ غنی نے کہا۔ ”شاہ جی نے کہا کہ آفتاب خان کو اٹھانا ہے۔ میں نے تمہیں اٹھا لیا، وہ کہیں گے کہ آفتاب خان کو گولی مار دو تو ہم تمہیں گولی بھی مار دیں گے۔“

”لیکن میرا قصور؟“

”ڈاکٹر کہاں ہے؟“ راجا نے لہجے کو کرحشت بنا کر پوچھا۔

”میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹر کہاں ہے؟“ آفتاب خان نے کہا۔

”تم جانتے ہو کہ اس کے پاس کتنی ویز پوز اور سی ڈیز ہیں۔ اگر وہ شاہ جی کے کسی مخالف کے ہاتھ لگ گئیں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“ راجا نے درشت لہجے میں کہا۔ ”شاہ جی سب سے پہلے تو تمہیں اس دنیا سے رخصت کر دے گا کیونکہ صرف تم ہی اس راز سے واقف ہو کہ شاہ جی وہ تمام ویز پوز اور سی ڈیز ڈیز کہاں رکھتے ہیں۔“

”میں ہی نہیں اس راز سے قددوائی اور چار خان بھی واقف ہیں۔“ آفتاب خان نے کہا۔

”ان کا نمبر بھی آئے گا۔“ راجا نے کہا۔ ”پہلے تو شاہ جی تمہیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔“

”شاہ جی مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں۔“ آفتاب خان بذیانی انداز میں بولا۔ ”انہیں شاید معلوم نہیں کہ میں نے بھی اپنا بندوبست کر رکھا ہے۔ میں نے اپنے وکیل سے کہہ دیا ہے کہ میری موت کی صورت میں وہ تمام سی ڈیز، خطوط اور سی ڈیز ڈیز پریس کا نفرنس کر کے سردار جہا نکلیں گے حوالے کر دیں۔ پھر شاہ جی کہاں ہوگا؟“

”تم سچ اپنے وکیل کو فون کرو گے اور اس سے کہو گے کہ وہ تمام اشیائیں تمہیں واپس کر دے۔“ راجا نے کہا۔

”تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو؟“ آفتاب خان نے کہا۔ ”میں خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودوں گا؟“

”اس کا مطلب تو یہی ہے کہ شاہ جی کا تمام ریکارڈ تمہارے پاس محفوظ ہے۔“

”ہاں، اور یہ بات شاہ جی بھی جانتا ہے۔“

”پھر تو مجبور کی ہے۔“ راجا نے کہا۔

آفتاب خان کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ ”میں شاہ جی کے کہنے پین سے واقف ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے بیٹا کا پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔“

”یاد رہے کہ ان آدمیوں کو انیس بلو جو قددوائی کو

اٹھانے سے پہلے میں نے ان کے اٹھانے کا ارادہ کیا تھا۔“ راجا نے سے کہا۔

”وہ بھی ایک نمبر کا حرام زادہ ہے۔“ آفتاب خان نے کہا۔ ”شاہ جی جتنی بھی پی ویز پوز بناتا ہے، انہیں سی ڈیز پر وہی منتقل کرتا ہے اور ڈاکٹر انہیں ارسال کرتا ہے۔“

”لیکن اب ڈاکٹر بھی تو کہیں غائب ہو گیا ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”اب شاہ جی کیا کرے گا؟“

”اس کے پاس بندوں کی کمی نہیں ہے۔ اسے ڈاکٹر نہیں، ان کی ڈیز کی فکر ہے جو اس کے پاس ہیں۔ ویسے وہ صاف کمر جائے گا کہ میرا ان سی ڈیز سے کیا مطلب

استغفر اللہ! میں بھلا ایسا کام کر سکتا ہوں۔“

”شاہ جی کو زندگی میں پہلی دفعہ میں نے اپنی غلطی سمجھتے دیکھا ہے۔“

”شاہ جی سمجھتا رہا ہے۔“ آفتاب خان نے کہا۔ ”تو اپنی سگی بہن کا سودا کرتے ہوئے بھی نہ سمجھتے۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے جمال خان شیردانی کو چھپا کر اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت ضدی انسان ہے۔ اس کی جان بچا جائے لیکن وہ شاہ جی کی بات نہیں مانے گا۔“

آفتاب خان قہقہہ لگ کر ہنسا۔ ”ڈاکٹر قددوائی کو اس ویز پوز کی سی ڈیز کی تیار کر لینے دو۔ پھر دیکھا، اس ضدی اصول پسند انسان کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اولاد کی محبت بہت بڑی ہوتی ہے۔“

”میں تم سے کہوں گا۔“ راجا نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”اپنے وکیل کو جمع فون کر کے تمام ریکارڈ منگوا لیں ورنہ۔“

”ورنہ کیا۔“ آفتاب خان حقارت سے بولا۔

”ورنہ تمہاری بھی تو ایک جوان بیٹی ہے۔ شاہ جی اس کی ویز پوز بھی بنا سکتا ہے۔ اون کی محبت واقعی بہت بڑی ہوتی ہے۔“

”اگر اس کتنے نے میری بیٹی کی طرف میلی آنکھوں سے بھی دیکھا تو میں اس کا بھانڈا چھوڑ دوں گا۔“

”وہ بڑی عرصہ ہائے لگا۔“

”وہ تمہاری بیٹی کو میلی آنکھ سے نہیں بلکہ کیمیرے کی آنکھ سے دیکھے گا۔ نہ صرف خود دیکھے گا بلکہ دنیا کو بھی دکھائے گا۔ سنا ہے تمہاری بیٹی بہت خوب صورت ہے؟“

”جو اس بند رو۔“ وہ اپنے ہاتھ آزاد کرانے کے لیے بری طرح کھینچا۔

”اس سے چھوٹیں ہوگا۔ تم جی تو تمام ریکارڈ شاہ جی

کے حوالے کرو گے یا پھر تمہاری بیٹی کی ویز پوزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے بنے گی۔“

آفتاب خان غصہ ناک ہو کر شاہ جی کی شان میں بیٹن لالیاں بکھیرنے لگا جو میں نے اس سے پہلے بھی نہیں سنی تھیں۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ راجا نے اپنی ذہانت سے کام لے کر آفتاب خان کو شاہ جی کے خلاف کر دیا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ قددوائی کو اٹھانے کا تھا۔

☆☆☆

”یہ تو بتاؤ، تم لوگ کون ہو؟“ آفتاب خان نے پوچھا۔

”او بھائی!“ راجا نے کہا۔ ”تم یہ سوال کتنی دفعہ کرو گے؟“

”تم نے پہلے کب بتایا ہے کہ تم لوگ کون ہو؟“ آفتاب خان نے راجا کو گھورتے ہوئے کہا۔

”پہلے نہیں بتایا ہے تو اب کیسے بتا سکتے ہیں؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتے تھے۔ شاہ جیسا کہینہ آدمی کسی احمق کو تو اپنا دست راست بنا نہیں سکتا۔ تمہیں ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ ہم لوگ کون ہیں؟“

”اندازہ کیا، مجھے یقین ہے کہ تم اسی حرامی کے لیے ہو رہے ہو، اسی نکال بھگت شاہ جی کے زرخیز بونیکل میں رہتے ہو۔“

”تم کسی کے لیے کام نہیں کرتے احمق!“ راجا نے کہا۔ ”ہم صرف پیسے کے لیے کام کرتے ہیں، صرف پیسے کے لیے۔“ راجا کا لہجہ خاص بد معاشوں والا تھا۔ ”اگر تم شاہ جی سے زیادہ پیسے دے دو تو ہم تمہارے لیے بھی کام کر سکتے ہیں۔“

آفتاب خان کے چہرے پر اس دوران میں پہلی دفعہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”اس حرامی نے کتنی رقم دی ہے تمہیں؟“ آفتاب خان نے پوچھا۔

”اس نے ہمیں اس کام کی اتنی رقم دی ہے کہ تم سوچ سکتے ہو۔ اسے کروڑوں روپے کی ان سی ڈیز کی قیمت دے دی ہے، وہ تمہیں بھی پارٹی سے نکال چاہتا ہے۔“

”یاد رہے کہ اسے کچ سی ڈیز نہیں بتا دیتے؟“ میں نے بات چیت میں اپنی پارٹی سے نہیں، اس دنیا سے بھی

”میں اس سے قوی رقموں کا۔“ آفتاب خان پھر کر

”ہم ہمیشہ رقم اڑوانس لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور نقد یعنی پیش کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔“ راجا نے ٹکڑا لگایا۔

”اور تم شاید فوری طور پر اتنی رقم کا بندوبست نہ کر سکو۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے اس بات کو بھول جاؤ۔“

”تمہارے ہاتھ۔“ آفتاب خان نے گردن اڑا کر کہا۔ ”دس کروڑ روپے!“ میں نے یوں کہا جیسے دس ہزار کی بات کی ہو۔

”دس کروڑ؟“ آفتاب خان حیرت سے بولا۔ ”یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔“

”یہ تو ہمیں شاہ جی سے ملی ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”تم نے تو اس کا دھوکا دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

آفتاب خان ہانپوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ”وہ حرام زادہ کتنوں اتنی بڑی رقم خرچ کر ہی نہیں سکتا۔“

”اس کا ایک کام نہیں ہے بلکہ پورا بیکنج ہے۔ تمہارا انگو، تم سے سی ڈیز کی وصولی، تمہاری بیٹی کا انگو اور اس کی ویز پوز۔“

”جو اس بند کرو۔“ آفتاب خان نے پھر کر میری بات کاٹ دی۔ ”اگر میری بیٹی کا نام بھی لیا تو۔“

میں نے اچانک اس کے منہ پر زور دار چھڑ پھیر دیا۔

”میں بہت دیر سے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”آئیے اس لہجے میں بات کرو گے تو میں تمہاری زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

”میں کروڑ میرے لیے بہت بڑی رقم ہے، میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟“ وہ بھرتائی، مولیٰ آواز میں بولا۔

”ہم نے تو اب آفر کی تھی۔“ راجا نے کہا۔ ”تمہیں نہیں قبول تو نہ سہی۔“

”اس بات کو چھوڑو۔ اب جلدی سے یہ فیصلہ کر لو تم وہ سی ڈیز دی ویز دے کر اپنی بیٹی کی عزت بچاؤ گے یا۔“ میں نے ہلکا دھجورا چھوڑ دیا۔ ”ہم سوچنے کے لیے تمہیں صرف آدھا گھنٹہ دے سکتے ہیں۔“

”آدھا گھنٹہ تو بہت سے فی۔“ راجا حادوت کے مطابق مجھے لپکے پتر کہتے کہتے رگ گئی۔ وہ بات بنانے کو بولا۔ ”فی زمانہ ایک منٹ کی بھی بہت قیمت ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم رو پو۔“ راجا نے کہا۔ ”ہم ذرا سے تجھے بعد آئیں گے۔“

”ہم کمرے سے باہر نکلتے تو حسب معمول وہاں فی

موجود تھا۔

سینئر ڈائجسٹ 169 اکتوبر 2011

www.paksociety.com

http://www.digestpk.com

"تم یہیں بھڑو۔" میں نے غمی سے کہا۔ "یا پھر احمد شاہ کی ڈیوٹی لگا دو۔"

میں راجا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد نسیم نے کمرے میں جھانکا۔ "کافی دس صاحب جی؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور تم اس وقت تک جاگ کیوں رہی ہو؟"

"آپ بھی تو جاگ رہے ہیں صاحب جی؟" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"ٹھیکے پتر؟" راجا نے مسکرا کر کہا، پھر انگریزی میں بولا۔ "اس کی تمام حرکات و سکنات بیگمات والی ہیں، میرا مطلب ہے جو یوں والی! تو آخر مان کیوں نہیں لیتا کہ....."

"میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا۔" میں نے گلگتا کر کہا۔ "ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اب آپ نے بکواس فرمائی تو آپ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔"

"پھر میں کہتا پھر دوں گا عورت یعنی زن کے معاملے میں جگری دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ جیسے تو میرا ہو گیا ہے کہ اپنی بیگم نمبر پانچ کی خاطر میرا خون کرنے پر آمادہ ہے۔" راجا مسلسل انگریزی میں بکواس کر رہا تھا۔

نسیم کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ہلکی سی چپکری تھی۔ "تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔" میں نے نسیم سے کہا۔ "مجھے کافی کی ضرورت ہوگی تو میں غمی سے کہہ دوں گا۔ وہ بھی ابھی کافی بنا لیتا ہے۔"

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ راجا کی مسلسل بکواس میں آدھا گھنٹا گزر چکا تھا، صرف ایک منٹ باقی تھا۔ میں اور راجا دوبارہ اس کمرے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں آفتاب خان کو بند کیا گیا تھا۔

میں دیکھ کر وہ بولا۔ "میں نے بہت سوچا ہے، بہت فکریا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم شاہ جی کے آدمی نہیں ہو۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ "الو کے بھٹے! ہم نے کب کہا کہ تم شاہ جی کے آدمی ہیں؟" میں نے کہا۔ "تو اب تک یہی سوچتا رہا ہے کہ ہم شاہ جی کے آدمی ہیں یا نہیں ہیں۔" پھر میں نے بلند آواز میں کہا۔ "تو عزت سے رہنا نہیں چاہتا ہے، یہ ہے تو پھر یہی کہی۔" احمد شاہ! میں نے آواز دی۔

احمد شاہ فوراً ہی کمرے میں آگیا۔ "میں پاس!"

"بھئی، تم لوگوں نے آفتاب صاحب کا کھڑو دیو لیا۔"

لیا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کی بیٹی کو یہاں ہونا چاہیے۔"

"او کے پاس! احمد شاہ نے سوہانہ انداز میں کہا۔

"مم۔" میری بیٹی تو دہشت ہی سے مر جائے گی۔ وہ بہت کمزور دی ہے۔"

"کیا جمال خان شیروانی کی بیٹی مر گئی؟" میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ "وہ بھی اتنی ہی معصوم ہے جتنی تمہاری بیٹی ہے۔ اس کی ڈیوٹی اور تصویریں بناتے ہوئے تمہیں یہ خیال نہیں آیا؟"

"ٹھیک ہے، میں وہ ڈی وی ڈیز تمہیں دینے کو ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں صبح اپنے وکیل کو فون کروں گی۔ لیکن وہ ڈی وی ڈیز کہاں پہنچا گا؟"

"اسے پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس سے غم وصول کر لیں گے۔"

"وہ میرے بغیر ڈی وی ڈیز تصویریں اور ان کے گلیٹھو دے گا نہیں۔" آفتاب خان نے کہا۔

"تمہارا درد دوسرے۔" راجا نے کہا۔ "میں تو صورت میں وہ چیزیں منج پانچوں۔"

"تم نے کیا وکیل کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ڈی وی ڈیز اور بند لگانوں میں کیا ہے؟"

"نہیں وکیل کو میں نے کچھ نہیں بتایا ہے۔" آفتاب خان نے کہا۔ "وہ سب چیزیں ایک بریف کیس میں ہیں۔"

"پھر تو وکیل کو کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" آفتاب نے کہا۔

"کوشش نہیں، ہمیں وہ بریف کیس چاہیے۔" راجا نے کہا۔ "وہ نہ پھر ہم صرف کوشش نہیں کریں گے بلکہ....."

"یار، مجھے بار بار دھمکیاں مت دو۔" آفتاب خان مت ہٹا کر بولا۔

"ایک بات اور!" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ان تصویروں اور ڈیوٹی کارڈ بھی ہے۔ ان میں سے ایک بھی تصویر، ڈی وی ڈی یا ڈیوٹی کم نہیں ہوتا چاہیے۔ ہم وہ چیزیں پہلے چیک کریں گے، پھر تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔"

ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے غمی سے کہا۔ "تم اس کا کہنا اچھی طرح الٹ کر دو، راجا، یا لڑو جاؤ۔"

"جی ہاں، آپ سوچا نہیں۔" احمد شاہ نے کہا۔ "میں یہاں موتیوں میں۔"

اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں نے سوچا، میں بھی کمرہ سیدھی کر لوں۔

راجا بھی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ میں بھی کپڑے پر سے بغیر ہسٹر پر گر پڑا اور فوراً ہی مجھے بہت گہری خند آئی۔

یہ کمرے کے بعد مجھے اتنی گہری خند آئی تھی کہ وہ میری خند ہی اڑ گئی تھیں۔

مجھے کسی نے آہستہ آہستہ سے شانہ تھپکرا دیا۔

"سو نے نوٹور!" میں نے فنوڈ کی کے عالم میں کہا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے، اب اندھ جاؤ۔" میرے کانوں میں زور کی آواز آئی۔ اس نے پھر میرا شانہ تھپکرایا۔

میں نے آنکھیں بند کیے کیے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

آہستہ آہستہ میرے ذہن سے دھند صاف ہونے لگی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ نور تو یہاں سے ہی نہیں، پھر یہ کون ہے؟ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے بازوؤں میں تکیہ تھا۔ میں اندھ کر بیٹھ گیا کیونکہ واقعی ہر طرف دن پھیل گیا تھا۔ میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس میں ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس دن بھی شدید سردی تھی لیکن ہسٹر سے تو گلنا ہی تھا۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور راجا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ "قبلہ نواب صاحب، سپیدہ سحر نمودار ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ اب جلدی سے تیار ہو جا اور سوچ کہ اس ٹرانسپورٹر کے وکیل سے وہ بریف کیس کیسے وصول کیا جائے؟"

"راجا! آج نور کو انہو سے کتنے روز ہو گئے؟" میں نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

"تیرے خیال میں کیا مجھے احساس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا صرف تجھے ہی نور کی لگر ہے؟"

"ایک لڑکی میرے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہی تھی۔ وہ انہو ہونے کے بعد نہ جانے کس حال میں ہے اور ہم یہاں بیٹھ کر رہے ہیں۔" میں نے دل رنجی سے کہا۔ "جب تک وہ موجودگی تو میرے لیے بہت اہم تھی، وہ نور۔ جس سے تیری بزم میں تھے بگاڑے، گئے تو کیا تیری بزم خالی سے بھی گئے؟"

"یہ سب کچھ ہم نور ہی کے لیے تو رہے ہیں لیکے!"

میں نے خلاف معمول نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے اتنا نہیں ہے۔" نور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا میں نے۔ وہ تجھ سے اتنی تڑپتی سو دے بازی کریں گے۔"

یہ تو میں بھی جانتا ہوں راجا! میں نے کہا۔ مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ وہ۔"

"تو تمام شدہ شات کو دل سے نکال دے لیکے پتر! یہ کچھ ہی کچھ تو بھی کیا بات ہے یہ۔" فی الحال تو ہمیں اس آفتاب خان سے ملنا ہے۔"

"تو کہیں شکار پر جا رہا ہے؟" میں نے راجا کی جنیئر اور نیڈر ڈیکٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، شکار بھی آدم نور شکار! راجا! میں کر بولا۔" وہ کمین شاہ جی آدم نور ہی تو ہے۔ وہ اپنے زہد و تقویٰ اور شرعی گیت اپ کی آڑ میں کیسے کیسے گھٹاؤنے کام کر رہا ہے۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ "چلی اب اٹھ جا، ناشتا تیار ہے اور چوہے میرے پیٹ میں کبڑی کھیل کھیل کے نہ حائل ہو چکے ہیں۔"

میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو راجا ڈرائنگ روم میں میرے انتظار میں کھل رہا تھا۔ مجھ کو کچھ ہی نسیم نے ناشتا لگا دیا۔

"غمی! اپنے مہمان کو بھی ناشتا کرا دو۔" میں نے کہا۔ "اور دھیان رکھنا وہ کوئی معمولی چور چکان نہیں ہے۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

غمی اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد آفتاب نے کمرے میں پہنچے تو اس نے نگہداری سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "آپ لوگ اب آئے ہیں۔ میرا وکیل تو اب تک کورٹ کے لیے نکل چکا ہوگا۔"

"کورٹ کیا عالم کیا میں ہے؟" راجا نے حق لہجے میں کہا۔ "جہاں سے واپس نہیں آ سکتا؟ اس کے پاس سل فون تو ہوگا؟"

میں نے غمی سے اس کا سل فون منگوایا اور اس سے کہا۔ "اپنے وکیل کو فون کر دو کہ وہ جہاں بھی ہے، فوراً اپنے آفس پہنچے۔"

"وہ آفس تو پہنچ جائے گا، پھر؟" آفتاب نے مجھے گھورا۔

"اس سے کہنا کہ میں نے جو بریف کیس منگوایا ہے، وہ تیار رکھے۔ میں اپنے ایک آدمی کو بھیج رہا ہوں۔ وہ بریف کیس اسے دے دینا۔"

"وہ نہیں دے گا۔" آفتاب نے کہا۔

راجا نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ "ہم نے راست ہی لکھے تیار کیا تھا کہ یہ نور دے رہے ہیں۔ ہمیں آج ہر صورت میں وہ بریف کیس ہا سبے۔"

بند آواز میں غنی کو پکارا۔
 غنی فوراً ہی کمرے میں آگیا۔ "میں ہاں!"
 "تمہارے کتے نے آخری مرتبہ انسانی زبان کب
 سیکھی تھی؟"
 "تین دن ہو گئے ہاں!" غنی نے کہا۔ "انسانوں کی
 زبان، کان اور ناک تو اس کی پسندیدہ غذا ہے۔"
 "چلو، پھر اس کی زبان بھی کاٹ لو۔" میں نے بے
 نیازی سے کہا۔
 "اوکے ہاں!" غنی نے مستعدی سے کہا۔
 "دیکھو میری بات سنو!" آفتاب خان نے ہڈیاں
 انداز میں کہا۔ "تمہیں وہ بریف کیس چاہیے نا! وہ تمہیں مل
 جائے گا۔ اللہ کے واسطے اپنے آدمی کو واپس بلاؤ۔ میری بیٹی
 تو رشت سے مر رہی جائے گی۔"
 "یہ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔" میں نے
 کہا۔ "تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔" پھر میں نے
 جیب سے سیل فون نکالا اور پوچھی ایک نمبر شیج کر کے سیل فون
 پر من لگایا۔ "ہاں احمد شاہ! مشن آدھے گھنٹے کے لیے
 مقرر کر دو۔ اپنی گھڑی دیکھ لو۔ اگر آدھے گھنٹے کے اندر اندر
 یہی کال نہ آئے تو تم اپنا کام کر سکتے ہو۔" میں نے سیل فون
 اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا۔
 "آدھا گھنٹا تو بہت کم ہے۔" میں نے...
 "دیکھو، اب تم خود وقت ضائع کر رہے ہو۔" میں نے
 کہا۔ "تیس منٹ میں سے دو منٹ گزر چکے ہیں۔"
 "میرا سیل فون دو۔" وکیل کوئی انجینیئر دیکھ کر شے
 میں پڑ جائے گا۔"
 "راجا اس دوران میں اتفاقی سے ایک کمری پر بیٹھا
 تھا۔
 میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ غنی نے جیب میں ہاتھ ڈال
 کر اس کا سیل فون نکال لیا، اسے آن کیا اور میری طرف بڑھا
 دیا۔
 وہ خاصا قیمتی سیل فون تھا۔ میں نے آفتاب سے
 پوچھا۔ "وکیل کا فون نمبر بتاؤ۔"
 "مجھے زانی یاد نہیں ہے۔"
 "وکیل کا نام بتاؤ۔" میں نے کہا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا
 کہ... میں نے بتائے کسی اور کو فون نہ کر دے۔
 "معتذر! علوان!" اس نے میرے سر سے انداز میں
 ہاتھ اٹھا دیا۔
 "میں نے اس نے موبائل کی فون تک اسے موبائل
 پر رکھوا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اب سرین خاموش
 رہیں۔"

اس لیے وہ اس وقت گھر میں ہی ہوگی۔"
 "میری بات سنو، دیکھو میری بیٹی بہت محسوس ہے۔ وہ تو
 یہاں تک آتے ہی مر جائے گی۔" آفتاب تھلا کر بولا۔
 میں نے اس کی طرف توجہ دے دیے بغیر کہا۔ "ہاں
 آفتاب کی کوئی اور بیٹی ہو تو اسے بھی اٹھا لانا۔"
 "میری بات سنو!" آفتاب چیخ کر بولا۔
 "ہاں جانے سے پہلے عام کو فون کر لینا کہ وہ مووی
 کیمرے اور لائسنس وغیرہ لے کر یہاں پہنچ جائے۔"
 "میری بات سنو حرام زادے!" آفتاب پھر کر
 بولا۔
 میں نے سڑکراس کے منہ پر اتنا زور دار ہاتھ مارا کہ
 صرف اس کے ہونٹ بلکے پایاں رخسار بھی زخمی ہو گیا۔ "اگر
 اگر تو نے جو اس کی تو تیری زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔"
 میں احمد شاہ سے مخاطب ہوا۔ "اپنے ساتھ تین چار آدمی
 لے جاؤ۔ اس کے گھر میں کوئی ذرا بھی مزاحمت کرے تو اسے گولی
 مار دینا۔ ہاں، آتے ہوئے اس کی بیوی کو بھی گولی مار دینا۔"
 "خدا کے واسطے میری بات سن لو۔" آفتاب نے
 خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔
 میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات سنی ان سنی کر دو
 اور احمد شاہ سے کہا۔ "اگر اس کی بیوی طرح دار اور خوب
 سمورت ہو تو گولی مارنے کے بجائے اسے بھی اٹھا لانا۔"
 "تمہیں اللہ کا واسطہ اپنے بچوں کا واسطہ! میری بات
 سن لو۔"
 "جاؤ احمد شاہ!" میں نے آفتاب کی طرف دیکھے بغیر
 کہا۔
 "احمد شاہ کمرے سے باہر جانے لگا تو میں نے غیر محسوس
 انداز میں اشارہ کر دیا کہ ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔
 وہ دھڑکنے لگا تو آفتاب خان نے کہا۔ "اگر... میری
 بیٹی... اور بیوی... کو... کوئی گزند پہنچی تو... تو میں...
 پورے شہر کو... انت پلٹ کر دوں گا۔"
 وہ اس وقت مجھے بالکل جنونی لگ رہا تھا۔
 "شہر کو کیا تم پورے ملک کو تہہ بالا کر دینا۔" میں نے
 کہا۔ "لیکن تمہاری بیٹی کی وہ بے ضرورت بیٹھی تو... تو میں...
 "کیونے تو تم لوگ، کتنے جو حرام زادے! یہ کوئی مروا
 ہے۔" وہ آہستہ آہستہ اپنے حواس بحال ہو رہا تھا۔
 میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر پھر ایک زنا
 مار دیا۔
 "میں نے کہا۔" تم ابھی آفتاب نے کہا
 "اس کی بیٹی کو اٹھا لو۔ آج کل سڑکیں کی گلیاں ہیں
 بے گار۔"

میرے آفس آجائیں، میں.....
 "اس میں میرے کچھ انتہائی اہم کاغذات ہیں اور مجھے فوری طور پر ان کی ضرورت ہے۔"
 "اس وقت تو میں ہائی کورٹ میں ہوں۔" وکیل نے کہا۔
 "دو مقدمات کی پیشیاں ہیں، میں اس وقت کیسے آسکتا ہوں؟" وکیل نے سرد لہجے میں کہا۔
 "آپ کورٹ میں اپنے کسی اسسٹنٹ کی ڈیوٹی لگا دیں، مجھے آدھے گھنٹے میں وہ بریف کیس چاہیے۔"
 "لیکن سر! میرے دوسرے مقدمات....."
 "اگست کیجوان مقدمات پر! آفتاب جھنجھلا کر بولا۔
 "میں تمہیں اتنا بھاری معاوضہ یوں ہی نہیں دیتا۔"
 "لیکن سر.....!"
 "میں کچھ نہیں جانتا۔" آفتاب خان نے چیخ کر کہا۔
 "مجھے آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ بریف کیس چاہیے، اندر اسٹینڈ!"
 "اوکے سر!" وکیل نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس وقت ساڑھے دس بجے ہیں۔ آپ گیارہ بجے تک دفتر آجائیں یا میں خود وہ بریف کیس آپ کے گھر پہنچا دوں؟"
 "نہیں، میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں، میں آدھے گھنٹے بعد خود ہی تمہارے آفس آ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سندھ قطع کر دیا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "اب تو اپنے آدلی فون کر دو کہ وہ میرے گھر کی طرف نہ جائے۔"
 "ہو، تمہیں آدھے گھنٹے کی سہولت مزید دے دیتے ہیں۔" راجا نے کہا۔
 "میں نے پھر اسے دکھانے کے لیے یوں ہی ایک نمبر ملا یا اور بولا۔ "احمد شاہ! میں آدھے گھنٹے بعد تمہیں کال کروں گا۔" یہ کہہ کر میں سے سل فون جب میں ڈال لیا۔
 آفتاب خان نے میری ہی ہدایت پر وکیل کے آفس آئے کو کہا تھا۔ یعنی نے اس کے دفتر کا پتا تو لکھ ہی لیا تھا، میں نے تصدیق کر کے آفتاب خان سے پوچھا۔ "وکیل کے آفس کا ایڈریس بتاؤ۔"
 "جب تم مجھے لے جا رہے ہو تو ایڈریس کی کیا ضرورت ہے؟"
 "تمہیں کون سے چارہ ہے؟" راجا نے کہا۔ "وکیل بریف کیس لے آئے گا تو باقی کام ہم لوگ خود ہی کر لیں گے۔"
 راجا کے جواب سے آفتاب خان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔
 "تم کیا سمجھ رہے تھے کہ ہم تمہیں بھی وہاں سے

جاکیں گے اور تم وہاں جا کر کوئی چالائی دکھاؤ گے؟ تم حضور ڈھونڈ کا ایڈریس بتاؤ۔"
 آفتاب خان نے اس کا وہی پتا دہرایا جو وکیل نے مجھے بتایا تھا۔
 "وکیل کا حلیہ بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔
 "آپ کی طرح قد آور اور صحت مند آدمی ہے۔ رے بین کا چشمہ استعمال کرتا ہے۔"
 میں نے فنی کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر آ کر میں نے اس سے کہا۔ "تم اور احمد شاہ ابھی وہاں چلے جاؤ۔ تم اس وکیل سے پہلے پہنچ جاؤ گے۔ بڑے وکیل اپنی کوئی سکرٹری یا کوآرڈینیٹر ضرور رکھتے ہیں۔ اگر اس کا آفس کھلا ہو تو تم لوگ اندر جا کر بیٹھ جانا اور اگر....." میں بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ میں نے سوچا، اس بریف کیس میں انتہائی قیمتی اسٹنٹ ہے۔ اس موقع پر مجھے یا راجا کو بھی ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔
 "میں بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔" راجا نے کہا۔
 میں چونک کر اٹھا کہ راجا بھی میرے ہی انداز سے سوچ رہا ہے۔
 فنی نے آفتاب خان کے کمرے کو تالا لگایا اور وہ لوگ بکلت میں روانہ ہو گئے۔ فنی نے جانے سے پہلے آفتاب خان کے کمرے پر مانی کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ وہ وہیں براہِ رعبے میں بیٹھ ہوا تھا۔
 میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔
 "مساحب! کافی لاؤں آپ کے لیے؟" نسیم نے کمرے میں جھانکا۔
 "نہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور کمرے میں ٹھنکنے لگا۔
 میری نظریں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔
 جب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو میں نے راجا کو فون کر لیا۔
 مجھے یہ جان کر جرات ہوئی کہ راجا کا سل فون بند تھا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی لیکن دوبارہ بھی وہی ریکارڈنگ سنائی دی۔
 میں مزید پریشان ہو گیا کہ راجا نے سل فون آف کیوں کر رکھا ہے؟
 میں نے فنی کو فون کیا۔ اس کا سل فون بھی بند تھا۔ میں

بہت زیادہ فکر مند ہو گیا۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ میں شدید بخیر اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ احمد شاہ کو کال کروں لیکن پھر یہ سوچ کر نہیں کیا کہ اگر اس کی طرف سے بھی کوئی جواب نہیں آیا تو؟
 اچانک میرے سل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں گھنٹی کی آواز سے یوں اچھلا جیسے میرے قریب ہی بم پھٹا ہو۔
 میں نے جب سے سل فون نکالا تو اسکرین پر احمد شاہ کا نام تھا۔ میں نے بے غامی سے سل فون کان سے لگا لیا۔
 "ہاں احمد شاہ؟" میں نے پوچھا۔
 "سر، یہاں تو اچھی خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے۔" احمد شاہ نے کہا۔ "راجا صاحب اور فنی کو کچھ لوگوں نے گمن پوائنٹ پر اس وکیل کے آفس ہی میں روک لیا ہے۔"
 "تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔
 "میں اس بلڈنگ کے نزدیک ہی ہوں، بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف کھڑا ہوں۔"
 "تم وہیں ٹھہرو، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور سل فون جب میں رکھتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا، جاتے جاتے میں نے مانی سے کہا۔ "مخاطب رہنا اور قیدی کا خیال رکھنا۔"
 اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
 میں نے اپنی گاڑی نکالی اور آندھی طوفان کی طرح روانہ ہو گیا۔
 احمد شاہ وہیں موجود تھا۔ میں نے گاڑی مناسب جگہ پارک کی اور احمد شاہ کی طرف بڑھ گیا۔
 "کیا ہوا تھا؟" میں نے بے غامی سے پوچھا۔
 "سر! راجا صاحب اور فنی مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ میں احتیاطاً ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم لوگ الیٹ ایک ہی لفٹ میں اوپر پہنچے تھے۔ لفٹ میں ہمارے علاوہ کچھ لوگ اور بھی تھے۔ میں ان دونوں سے بالکل انجان بنا اور پہنچا۔ کوریڈور میں بھی وہ لوگ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ وہ دونوں وکیل کے دفتر کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ اندر سے دو آدمی نکلے۔ مجھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ہاتوں کی جھک دکھائی دی، پھر وہ ان لوگوں کو یوں اندر لے گئے جیسے وہ وہی معزز مہمان ہوں کیونکہ اس وقت کوریڈور میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔"
 "کیا وہ لوگ اب بھی وہیں ہیں؟"
 "جی سر! احمد شاہ نے جواب دیا۔ "اس عمارت سے وہ نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ ان دونوں کو اگر نہیں اور اسے

جا جاتا تو مجھے ضرور معلوم ہو جاتا۔ میں نے بلڈنگ کے مین گیٹ سے ایک لمحے کو بھی نظر نہیں ہٹائی ہے۔"
 میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟
 "میں اس وکیل کے دفتر میں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم پہلے کی طرح دور رہ کر میری غرائی کرنا اور اگر میں آدھے گھنٹے تک نہ آؤں تو تم اپنے طور پر کارروائی کرنا۔"
 "سر، آپ نہیں ٹھہریں۔" احمد شاہ نے کہا۔ "میں ابھی اپنے طور پر کارروائی کر لیتا ہوں۔"
 احمد شاہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔
 ابھی احمد شاہ لفٹ سے کچھ فاصلے پر تھا کہ لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے کئی آدمی باہر نکلے۔ ان میں ایک وکیل بھی تھا۔ وہ اپنے کالے کوٹ کی وجہ سے پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاصا بھاری بھرکم ایک بریف کیس بھی تھا۔
 لفٹ سے نکلے ہی اس نے دوڑنا شروع کر دیا اور احمد شاہ کے نزدیک سے گزر کر مین گیٹ کی طرف بھاگا۔
 میں اسے دیکھ کر ٹھنک گیا۔ وہ بلڈنگ کی عمارت سے نکل کر مین روڈ پر دوڑنے لگا۔
 اسی وقت مجھے راجا اور فنی دکھائی دیے۔ وہ دونوں شاید سیز جیپوں کے ذریعے پیچھے آئے تھے۔ فنی کی نظر اس وکیل پر پڑ گئی۔ وہ بھی اندھا دھند اس کے پیچھے بھاگ لیا۔
 احمد شاہ نے بھی راجا اور فنی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی تیزی سے واپس آ گیا۔
 وکیل دوڑ کر ایک بس میں سوار ہو گیا۔
 "احمد شاہ!" میں نے کہا۔ "بھدڑی سے گاڑی لے کر آؤ۔"
 وہ میرے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے کر گاڑی کی طرف چھٹا۔ وہ بس میری نظروں میں تھی۔ احمد شاہ گاڑی لایا تو میں اور راجا اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے احمد شاہ سے بس کا پیچھا کرنے کو کہا۔
 فنی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا نہ جانے کس طرف نکل گیا تھا۔ اسے ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا، اس لیے ہم بس کے پیچھے چلتے رہے۔ بس ایک اسٹاپ پر رکی تو احمد شاہ نے بھی گاڑی کی رفتار بہت کم کر دی۔
 بس میں سے دو آدمی اترے۔ ان دونوں میں سے کوئی دو وکیل نہیں تھا۔
 میں نے احمد شاہ سے کہا۔ "تم اس کو اور ٹیک کر کے

اس کے آگے آ جاؤ، میں بس سے اترنے والے مسافروں پر دھیان رکھوں گا۔"

اسی وقت بس کی رفتار بہت سست ہو گئی۔ احمد شاہ نے بہت مہارت سے اسے اور ٹھیک کیا اور بس کے آگے آ گیا۔ اب میں بہت آسانی سے اترنے والے تمام مسافروں پر نظر رکھ سکتا تھا۔

میں نے ابھی تک راجا سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا، نہ اس نے مجھے کچھ بتایا تھا۔ فوری طور پر تو ہمیں اس بریف کیس کی فکر تھی جو ہمارے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

اچانک میری نظر پیچھے کی طرف سڑک پر پڑی۔ وکیل آئے والی گاڑیوں کی پروا کیے بغیر سڑک پار کر رہا تھا۔ "گاڑی روکو!" میں نے چیخ کر احمد شاہ سے کہا۔

اس نے ایک دم بریک لگا دیے۔ بریکوں کی چرچاہٹ سے آس پاس کی گاڑیوں والے اور راہ گیر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ تو شہر ہے کہ ہمارے پیچھے جو گاڑی تھی، وہ خالصے حاصل پر تھی۔ اس نے بھی بروقت بریک لگا دیے۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "وہ جا رہا وکیل!" گاڑی سے باہر کو گھسیا۔

میں خاصی تیزی رفتار سے وکیل کے پیچھے بھاگا لیکن اس وقت تک وہ آئے جانے والی دونوں سڑکیں پار کر کے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ میں نے بھی سڑک پار کرنے کی کوشش کی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وکیل ایک رکشا میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

"تم گاڑی گھما کر لاؤ۔" میں نے احمد شاہ سے کہا۔

"میں دوسری طرف جا کر کوئی رکشا یا ٹیکسی دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بھی اندھا دھند سڑک پار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ گاڑی کو یوٹرن لینے کے لیے بہت آگے جا کر سڑک کے درمیان راستہ ملے گا۔

میں آٹا فانا سڑکیں پار کر کے دوسری طرف پہنچا لیکن دور دور تک کسی رکشا یا ٹیکسی کا چٹا نہیں تھا۔

وکیل کا رکشا بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

میں نے ایک دو گاڑی والوں کو بھی رکسنے کا اشارہ کیا لیکن وہ لوگ رکے بغیر گزر گئے۔ جس قسم کے حالات تھے، ان میں تو وہ گاڑی والے گاڑی نہ روکنے میں حق بہ جانب تھے۔

اسی وقت احمد شاہ نے میرے پاس گاڑی روکی۔ میں تھکے تھکے انداز میں دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"کل" یا "مردود!" میں نے بھنبھلا کر کہا۔ "نہیں"

جائے گا کہاں! میں اس صاحب خان کے نام کی حالت کو دیکھتا ہوں گا۔" میں راجا سے مخاطب ہوا۔ "ہاں راجا! اب تو بتا، وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"میں اور غنی، وہاں پہنچے تو احمد شاہ ہم سے کچھ فاصلے پر تھا۔" راجا نے کہا۔ "میں نے آگے بڑھ کر احمد شاہ کے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور اندر سے کرخت چہرے والے آدمی نے باہر بھاگا۔"

"مجھے وکیل صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"آئیے اندر آ جائے۔ وکیل صاحب ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔" اس نے کہا اور عجیب سی نظروں سے ایک جانب دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا۔

مجھے فوراً ہی کسی گڑ بڑ کا احساس ہو گیا۔ غنی نے اندر جانا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا اور کرخت چہرے والے سے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم باہر ہی وکیل صاحب کو انتظار کر لیتے ہیں۔"

میں وہاں مڑنے ہی والا تھا کہ کرخت چہرے والے نے اچانک گن نکال لی۔ پھر ایک دوسرا شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریو اور تھا۔ وہ دونوں جلدی سے باہر آ گئے۔ ایک نے میری کمر سے ریو اور لگا یا اور دوسرے نے غنی کو گن پرائنٹ پر نیا لیکن اتنی مہارت سے کہ آس پاس سے گزرنے والوں کو شبہ تک نہ ہو سکا کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھیں۔

کرخت چہرے والا غن سے بولا۔ "کوئی چالاکی مت دکھانا ورنہ میرا پستول بے آواز چلتا ہے۔"

دوسرا دوستانہ انداز میں مسکرا کر غنی سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے بھی میرے ساتھی کی بات سن لی ہوگی۔ اب خاموشی سے اندر چلو۔"

قریب سے گزرنے والے لوگوں نے یہی سمجھا ہوا کہ ہم لوگ وہاں کھڑے ہوئے گپ شپ کر رہے ہیں۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو انہوں نے ہمیں ہاتھ سر پر رکھتے کا حکم دیا اور رخ دیوار کی طرف پھیر دیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے سچ لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب کے کلائنٹس کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے یہاں؟"

"وکیل صاحب وقت دیے بغیر کسی سے نہیں ملتے۔ کرخت چہرے والے کی آواز سنائی دی۔ ہمارا رخ دیوار کی طرف تھا اس لیے مجھے ان کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ان دونوں نے بہت مہارت سے ہماری خاموشی اور ان میں سے ایک نے یہ لہجہ میں روانہ کیا۔ "وکیل صاحب کے

کلائنٹس مسلح ہو کر نہیں آتے۔"

میں نے سچ لہجے میں کہا۔ "میں کوئی ایرافیر نہیں ہوں۔ مجھے اپنی حفاظت کے لیے نہ صرف مسلح رہنا پڑتا ہے بلکہ باؤی گارڈ بھی رکھنا ہوں۔"

ان لوگوں نے ہماری بیویوں سے کل فون بھی نکال کر "تف" کر دیے۔

"سرا! آپ کے وکیل تو میرا سجاد صاحب ہیں۔ پھر کسی چھوٹے موٹے وکیل سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" غنی نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ غنی ان لوگوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سرور دھلون بھی شہر کے چند بہترین اور مہنگے وکیلوں میں سے ایک تھا۔

"کیا کہا؟" کرخت چہرے والا بھنا کر بولا۔

"چھوٹے موٹے وکیل!"

"یار! یہ تو دیکھ کر ہی معلوم ہوگا کہ وہ چھوٹے ہیں یا موٹے؟" غنی نے نفی کی آواز میں کہا۔

ہم لوگ غیر محسوس طور پر ان کی طرف گھوم چکے تھے۔

میں نے بہت پرانا اور گھسا پٹا حربہ آزمایا۔ "وہ جرح بھی کیا سیاب بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے اچانک کہا۔ "لو وہ وکیل صاحب بھی آ گئے۔"

ان دونوں نے بہت بیک وقت گھوم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ غنی کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے اپنے نزدیک کھڑے ہوئے بد معاش کے پستول پر ہاتھ مارا اور دوسرے بد معاش کی ناف پر زوردار دھڑکتے ہوئے کر دی۔

اس کے حلق سے ایک کراہ برآمد ہوئی اور ریو اور دور پار گرا۔ میں نے ٹپک کر ریو اور اٹھا لیا۔ غنی بھی دوسرے بد معاش سے ریو اور چھین چکا تھا۔

"ہاں، اب تم یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور یہ سب کیا ہے؟"

"ہم تو وکیل صاحب کے ملازم ہیں۔" ان میں سے ایک نے بولا۔

"تم لوگ کیا وکیل صاحب کے ہر کلائنٹ کے ساتھ اس سلوک کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔" وہ دہستائی سے بولا۔

"غنی!" میں نے کہا۔ "ان دونوں کے منہ میں چند باتیں نہیں چھپنے سے انکا دونا۔"

"ہم میں انہیں مار کر کے ان کی جگہ سے دور کر دیتا ہوں۔"

کمرے میں یا ہاتھ روم میں چھپا دیتا ہوں، پھر اس وکیل سے بھی نصرت میں گئے۔" یہ کہتے ہوئے غنی نے اپنی جیب سے تیز دھار والا خنجر نکال لیا۔

"ہم سے وکیل صاحب نے کہا تھا کہ یہاں آفتاب صاحب کے ملازم کوئی بھی آئے اسے میرے پاس آنے سے روک کر رکھنا۔"

"کیوں؟"

"یہ تو وکیل صاحب خود ہی بتائیں گے۔ وہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ اس نے باری باری پشت پر جا کر دونوں کی کھوپڑیاں ریو اور کے دتے سے سلوا دیں۔ وہ دونوں فوراً ہی تاک آؤت ہو گئے۔ غنی نے انہیں کھینچ کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا۔

ہم لوگ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنے کل فون تک آف نہیں کیے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو غنی نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔

وکیل نے بھی آہستہ سے دروازہ کھولا۔ پھر مجھ پر اور غنی پر نظر پڑے ہی وہ اچانک بھاگ نکلا۔ لیکن وہ بھاگ کر جائے گا بھی کہاں؟ راجا نے کہا۔ "ابھی آفتاب خان تو ہمارے قبضے میں ہے۔"

"یار، مہاراجا! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وکیل کو سب کچھ معلوم ہو اور وہ آفتاب خان کو بھی ڈبل کر اس کر رہا ہو؟"

"ہوئے تو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" راجا نے کہا۔ "تو مرغ کی طرح بانگ دے سکتا ہے، سر کے بل کھڑا ہو سکتا ہے۔" "سوسائٹی میں اور بھی بے شمار ایسے ہیں مہاراجا! تو کن کن مسائل کو روئے گا۔" میں نے کہا۔

"تو تو یوں چپک رہا ہے جیسے تو نے نور کو بازیاب کر لیا ہے؟" راجا نے کہا۔

میرا اچھا بھلا موڈ راجا کے اس جھٹے سے غارت ہو گیا۔

شاید راجا کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "سواری ٹیکے پتر اوہ میں۔"

"بس کر پارا!" میں نے سچ لہجے میں کہا۔ "چل ذرا اس ٹرانسپورٹ کی خبر لیں۔ مجھے شبہ ہے کہ اس غمزداد سے نے فون پر وکیل سے کوئی ایسی بات نہ کی تھی کہ وہ پیٹھ پی سے غنی کو ہتھیار نہ دے دیا۔ وہ ان بد معاشوں کا بدلتا ہوا دست نیوں دتا۔"

میرا پہنچنے تو وہ پیر کے بارہ بج چکے تھے۔

میں سیدھا آفتاب خان کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ
بید پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے تھوڑے کچھ کر کے کھلا کے اٹھ بیٹھا۔
”میں نے تم سے کہا تھا کہ زیادہ اسامات بننے کی
کوشش مت کرنا۔“ میں نے کہا۔
”میں سمجھا نہیں۔“ وہ تھوک لٹک کر بولا۔
میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ
مارا کہ وہ الٹ کر بید پر گر گیا۔ ”الو کے چھٹے! تو نے فون پر
اس وکیل سے کیا کہا تھا؟“
”میں نے آپ کے سامنے ہی تو بات کی تھی۔“ وہ اپنا
گال سہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر میری انگلیوں
کے نشانات ثبت ہو گئے تھے۔ اس کے ہونٹ بھی چھٹ گئے
تھے اور ان سے بھی خون جاری تھا۔
”تم نے وکیل سے کیا کہا تھا؟“ میں نے درشت لہجے
میں پوچھا۔
”تو کیا سرور تمہیں نہیں ملا؟“ اس نے حیرت سے
پوچھا۔
”دیکھو آفتاب خان!“ میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے
ہوئے کہا۔ ”مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو، ورنہ تم جانتے
ہو کہ میں۔۔۔“
”میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اس سے کچھ
بھی۔۔۔“
”بند کرو یہ کواں!“ میں نے گرج دار آواز میں اس
کا جملہ کاٹ دیا۔ ”کیا تم مجھے اتنا ہی اٹوکا پٹھا سمجھتے ہو کہ میں
تمہاری اس کواں پر یقین کر لوں گا۔ وہ تمام زائد پہلے تو
میں گھبرنے کے چکر میں تھا، پھر جب بات نہیں بنی تو وہ
بریف کیس سمیت کہیں غائب ہو گیا۔“
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ آفتاب خان الجھ کر بولا۔
”ایسا ہوا ہے؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں
تمہیں پانچ منٹ دے رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے سب
کچھ سچ بتا دو۔“ پھر میں نے بلند آواز میں پکارا۔ ”احمد شاہ!“
”تھوڑی دیر بعد احمد شاہ کمرے میں موجود تھا۔ اس کی
سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید وہ کوئی کسی دوسرے حصے
میں تھا اور یقیناً فنی نے سل فون پر کال کر کے اسے بلا لیا تھا۔“
”میں سر!“
”تم ابھی آفتاب خان کے گھر جاؤ اور اس کی دونوں
ہتھیلیوں کو اٹھاؤ۔“
”جی ہاں۔۔۔“
”چھوٹی ہتھیلی تو مشکل سے ابھی تیرہ چودہ سال کی ہوئی۔“

”ہاں، اس کی بیوی کو بھی اٹھا لانا۔“
”دیکھو! میں نہیں جانتا کہ وہ وکیل کیوں بھاگ گیا،
میں۔۔۔“
”ابھی تمہارے دوست باقی ہیں۔“ میں نے کہا۔
میں گولی پر نظر میں بنائے کھڑا رہا۔
پانچ منٹ پر سے ہوتے ہی میں نے احمد شاہ کو جانے
کا اشارہ کیا۔
وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔
”دیکھو، میری ہتھیلیوں پر یہ غلم مت کرو۔ مجھے جو کچھ
معلوم تھا وہ میں نے بتا دیا۔“
”مگر میں تمہاری ہتھیلیوں یا بیوی کو کچھ معلوم ہوا؟“
میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔
”تم لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟“
آفتاب خان اچانک کچھ کر بولا۔
”اگر تمہیں کچھ یاد آجائے تو بتا دینا۔“ میں نے کہا۔
”میں تمہاری ہتھیلیوں کو یہاں لانے کے بعد بھی چھوڑ دوں گا۔“
میں کمرے سے باہر آ گیا۔ راجا مجھے کوریڈور میں
لا۔ ”کچھ بتا یا اس ٹرک ڈرائیور نے؟“ راجا نے پوچھا۔
”کوئی ٹرک ڈرائیور؟“ میں نے کہا۔
”نیکے پتر! یہ آفتاب خان جو آج اتنا معزز بننا بیٹھا
ہے۔ یہ پہلے ٹرک ڈرائیور تھا۔“ راجا نے کہا۔ ”اور ٹرک بھی
اس کا اپنا نہیں تھا بلکہ یہ تھیکے پر ٹرک چلا تھا۔ جیسے تو اچانک
ست بدھائی کا نواب بن بیٹھا ہے۔“ راجا نے مجھے چھینٹنے
کو کہا۔
”میں نے نواب بننے کے لیے کسی کا گلا نہیں کاٹا، غیر
اغلائی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیا، منیات کی
اسٹنگ نہیں کی، پردہ فروشی اور اغوا برائے تاوان کی
وارداتیں نہیں کیں۔“
”ہاں، تیری تو لاٹری لگی ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”لیکن
ہر شخص اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا۔ اس بات کو چھوڑ، اس نے
مجھے کچھ بتا یا اس وکیل کے بارے میں؟“
”وہ مسلسل یہی کہہ رہا ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ وکیل
فرار کیوں ہوا ہے؟“
”پارامیں تو سمجھتا تھا کہ تو ہی وحیث ہے پر یہ ٹرک
ڈرائیور تو مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔“
”بلو اس کمرے کا تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔“
”پارہ، یہ یقین ہی نہیں ہے کہ آفتاب خان کو کچھ معلوم
ہو۔“ راجا نے ہنسنا شروع کیا۔

”تو کیا واقعی اس کی بیٹیوں کو اٹھاؤ لوں؟“
”تو پہلے اس سے وکیل کا پتا اور اس کے دوسرے
بانی کے معصوم کر۔“ راجا نے کہا۔ ”بلکہ تو رہے دے۔ یہ کام
فنی وارنے دے۔“
”کھانا کھا کر میں خود ہی معصوم کر لوں گا۔“
☆ ☆ ☆
کھانے کے بعد میں راجا اور فنی کے ساتھ ایک مرتبہ
چراغ آفتاب خان کے کمرے میں پہنچا۔
”مجھے یقین ہے کہ اب تک تمہیں یاد آ گیا ہوگا۔“ میں
نے کہا۔
آفتاب خان خاموشی سے ہمارے چہرے دیکھتا رہا۔
میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی بیٹی اور بیوی کو درشت
زدہ کروں لیکن وہ آفتاب خان اتنا ذہین تھا کہ کسی طرح
زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، ایک
آخری کوشش کر لوں، پھر اس کی بیٹی اور بیوی کو اٹھاؤ گے بغیر
کوئی چارہ نہیں رہے گا۔
میں نے اچانک گن نکالی اور آفتاب خان کی کینٹی پر
رہ دی۔ ”اگر تم نے میرے تین کہنے سے پہلے زبان نہ کھولی
تو میں تمہاری کچھ پڑی اڑا دوں گا۔“ میں نے سفاک لہجے
میں کہا۔ ”مجھے تمہاری زندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس
نیل کو شاہ فنی بھی خود تلاش کر لے گا۔“
”اس کی بیٹیوں اور بیوی کا کیا کرنا ہے سر؟“ راجا نے
نہیدگی سے کہا۔
”ان کی وڈیو بنا کر مارکیٹ میں پھیلا دو۔“ میں نے
کہا۔ پھر آفتاب خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ایک دو۔۔۔“
”نصبر کرو۔“ آفتاب خان نے کہا۔ ”ایک دفعہ میری
بیوی سے بات کرادو۔“ اس نے خوشامد لہجے میں کہا۔
”اب یہ ممکن نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری فیملی
بہنا نہیں ہے۔ ان کی تو وڈیو بن رہی ہوگی۔“
”ایسا مت کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں
گا۔“ آفتاب خان نے کہا۔
”اب یہ کوئی نئی چال ہے؟“ راجا نے پوچھا۔
”وہ اصل میں میری بیوی۔۔۔ وہ۔۔۔ وکیل۔۔۔ میری
بیوی کی کچھ چالیں۔“ راجا نے ہنسنا شروع کیا۔
”پھر بیوی کی کچھ۔“
”پھر بیوی کی کچھ۔“ میں نے کہا۔ ”فون تو تم
سے مانگ لیا تھا۔“
”میں نے اپنے وکیل کو بیٹہ ہدایت دے رکھی تھی کہ

اگر میں بھی فون پر تم سے بریف کیس کا مطالبہ کروں تو اس پر
یقین مت کرنا۔ مجھے جب بھی بریف کیس کی ضرورت ہوگی،
میں خود آفس آ جاؤں گا۔“
”لیکن اس مردود نے تو ہمیں ٹھہرنے کا بندہ دست کر
رکھا تھا۔“ میں نے کہا۔
”یہ اس نے میری بیوی کی ہدایت پر کیا ہوگا۔“ آفتاب
خان نے کہا۔ ”میں نے وکیل کو ہدایت دی تھی کہ اگر کبھی تمہیں
میری طرف سے ایسا کوئی فون موصول ہو تو تم میرے گھر فون
کر کے مجھ سے یا میری بیوی سے تصدیق ضرور کرنا۔“
”تو کیا ان کا لے دھندوں میں تمہارے ساتھ تمہاری
بیوی بھی ملوث ہے؟“ راجا نے حیرت سے پوچھا۔
”ہاں۔“ آفتاب خان نے سر جھکا کر کہا۔ ”وہ
میرے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ اس کا رابطہ براہ راست
شاہ جی سے بھی ہے۔ اب تک شاہ جی کو بھی میرے اغوا کا حکم
ہو گیا ہوگا۔“
”اس کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے اسی کے حکم
پر تو تمہیں اٹھایا ہے۔ شاہ جی نے اس سے یہی کہا ہوگا کہ
آفتاب خان کو میں نے اپنے کسی کام سے بھیجا ہے۔“
”میری بیوی اچھی گورت نہیں ہے۔“ آفتاب خان
نے کہا۔ ”اسے آپ جیسے چاہیں مزادیں لیکن میری دونوں
ہتھیلیاں بہت معصوم ہیں۔۔۔“
”اگر یہ بات تم پہلے ہی بتا دیتے تو تمہاری بیٹیوں کو
کیوں اٹھاؤ؟“ راجا نے اسے انہنیائی طور پر مرعوب
کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔“ اس
نے میری طرف اشارہ کیا۔
”مجھے اگر وہ بریف کیس مل جائے تو میں اب بھی
تمہاری بیٹیوں کو باعزت طور پر واپس چھوڑ آؤں گا۔“ میں
نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
راجا میرے پیچھے پیچھے آیا اور بولا۔ ”نیکے پتر! کہیں یہ
بھی اس ٹرک ڈرائیور کی چال نہ ہو۔“
”یہ اگر کوئی چال ہوئی تو میں اسے گولی مار کے کسی
کوڑے کے ذریعہ پر پٹکاؤں گا۔“ میں نے کہا۔
”پارہ! میں اس تدوین کی بھی فکر کرنا چاہیے۔ آفتاب
خان کے اغوا کے بعد وہ بھی ہوشیار ہو گیا ہوگا۔“ میں نے شاہ
جی نے اسے فنی الجھال منظر سامنے نہ لایا ہوگا۔
”پہلے میں آفتاب خان کے کچھ حقائق سے دست نوں،
پھر ان کے بارے میں کچھ جانوں گے۔“
میں کمرے میں جا کر اپنے نوٹس کر کے فنی کی

تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئی۔

”تم اپنا کام کرتی رہو۔ ہم باہر لاؤنج میں بیٹھ جاتے ہیں۔“ میں نے کہا اور لاؤنج میں آگیا۔ ”احمد شاہ کو بلاؤ۔“ میں نے راجا سے کہا۔

راجا سے پہلے غنی اسے بلائے چلا گیا کیونکہ اس وقت لاؤنج میں وہ بھی موجود تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد احمد شاہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ ”احمد شاہ!“ میں نے کہا۔ ”تم نے آفتاب خان کا گھر دیکھا ہے؟“

”نہیں سہ!“ احمد شاہ نے جواب دیا۔

”تم اور غنی جا کر ایک بار پھر اس کا جائزہ لے لو۔ وہاں کتنے گاڑ ڈ ہیں، کتنے ملازم ہیں اور۔۔۔۔۔۔“

”یہ سب جائزہ میں لے چکا ہوں سہ!“ احمد شاہ نے کہا۔ ”آفتاب خان کا بنگلا آبادی سے کچھ ہٹ کر ہے۔ اس کے ارد گرد کی پلاٹ خالی پڑے ہیں۔ گیسٹ پر دو گاڑز ہوتے ہیں۔ ہنگلے کے اندر تین مرد ملازم ہیں اور دو عورتیں، وہ لوگ سرونٹ کو انرژ میں رہتے ہیں۔“

”آج تم لوگوں کو آفتاب خان کی بیوی اور اس کی بیٹیوں کو اٹھانا ہے۔“ میں نے یوں کہا جیسے برسوں سے یہی کام کرتا آیا ہوں۔

”اچھی!“ غنی نے پوچھا۔

”رات میں کسی وقت۔“ راجا نے کہا۔

”یاد راجا!“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ بریف کیس آفتاب کی بیوی کے پاس ہے تو ہم وہاں خود بھی تو جا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تیرا دامغ چل گیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ چل رہا ہے، یہی بات اگر میں تجھ سے کہتا تو کبھی نہ مانتا۔“

”یار! میں بڑکیوں کے انوا وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر وہ بریف کیس ہمیں آفتاب خان کے ہنگلے سے مل جائے تو ہمیں ان لوگوں کو انوا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ پھر غنی نے کہا۔ ”ہم آج رات آفتاب خان کے ہنگلے میں داخل ہوں گے۔ تم اور احمد شاہ تیار بننا۔“

”میں سب بد حالئی سے بچھ اور گاڑز کو بیاؤں!“ غنی نے کہا۔

”یہاں ہم ہی ملک پر مدد کرنے جا رہے ہیں۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور انکار کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم لوگ آفتاب خان کے ہنگلے کے دو چکر لگا چکے تھے۔ اس کے مین گیٹ پر تیز روشنی والے دو بلب روشن تھے اور گیسٹ بند تھا۔ گاڑز گیسٹ کے اندر تھے۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں ہنگلے کی غنی سمت سے اندر داخل ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”ہنگلے میں کتنے تو نہیں ہیں؟“ راجا نے پوچھا۔

”نہیں سہ!“ احمد شاہ نے جواب دیا۔

”دو ہانگوں پر چلنے والے کتنے تو ہنگلے کے اندر بھی ہیں اور باہر بھی۔“ میں نے کہا۔

”نیکے پترا!“ راجا نے کہا۔ ”تجھے اس وقت بھی فلسفہ سوچ رہا ہے؟“

”اس وقت تو اندھیرے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تیری مکروہ صورت نیک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔“

”پھر تو تجھے آئینہ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہوگا ورنہ اپنی مکروہ صورت تو دیکھ ہی لیتا۔“

غنی نے گاڑی ایک ایسی جگہ پارک کر دی کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ وہ دو ہنگلوں کی درمیانی دیوار تھی۔ ہر ہنگلے کا کین بھی سمجھتا کہ گاڑی میں پڑے کے ہنگلے میں کوئی آیا ہوگا۔ وہاں سے آفتاب کے ہنگلے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

ہم لوگوں نے پھر ایک مرتبہ اپنے ہتھیار چیک کیے اور ہنگلے کی پشٹ پر پہنچ گئے۔

رائفل چھپانے کے لیے غنی نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ احمد شاہ کی پشت پر کیوس کا ایک بگ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بگ میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہوگی۔

ہنگلے کی چادر دیواری سے کچھ فاصلے پر نیم کا ایک گھما درخت تھا۔ اس درخت کے ذریعے اوپر چڑھ کر ہنگلے کا جائزہ تو لیا جاسکتا تھا لیکن اس کے ذریعے ہنگلے میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ ہنگلے سے اتنے فاصلے پر تھا کہ کوئی بندر یا گنگوڑی لمبی چھانگ نہ کر اندر جاسکتا تھا۔ چادر دیواری غاسی اونچی تھی اور اس پر خاردار تار بھی تھے۔

احمد شاہ پھر غنی سے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی پھر پی پی پی میں اس کی اس کر اٹھا۔ ہم سب اس سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں بیٹھ گئے۔

اب ہمیں احمد شاہ کی نیوے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یوں ہنگلے کی پشٹ پر تاریکی تھی۔ احمد شاہ اوپر نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ غنی نے جب سے پس فون نکالا اور اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی وہ ہمیں ایک منسوب شاخ پر بیٹھنا نظر

آیا۔ نور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ احمد شاہ نے شاخ کے گروہ کی پشٹ رکھی ہے اور اس ری میں جھول رہا ہے۔

پھر اس نے ایک لمبی سونگ لی لیکن اندر پہنچنے میں ہمیں ب نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ زیادہ قوت سے سونگ لی۔

مارا یاڑ آتے ہوئے ہنگلے کی چادر دیواری عبور کر گیا۔ اس کے نیوے سے اندر ہلکا سا دھماکا ہوا۔ ہم لوگ اضطراب کے نیم میں باہر کھڑے رہے۔ احمد شاہ نے یوں اندر کود کر گویا اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی۔ ممکن ہے اس حصے میں بھی آفتاب خان کا کوئی گاڑز ہو۔ وہ تو احمد شاہ کو دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔

مجھے اپنے اتنے اچھے گاڑز اور کمانڈو کے ضائع ہونے کا انجوس زندگی بھر رہتا۔

چند منٹ تک وہاں بالکل سناٹا رہا۔ ایسا سناٹا کہ ہمیں اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

پھر بہت آہستگی سے غنی سمت کا چھوٹا سا دروازہ کھلا اور مجھے احمد شاہ کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ ہمیں اندر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں بے اختیار احمد شاہ سے پیٹ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے تم پر فخر ہے احمد شاہ!“

”شکر سہ!“ احمد شاہ نے انکساری سے جواب دیا۔ ہم نے اندر داخل ہو کر وہ دروازہ بھڑ دیا۔ اس میں جی ہاں تھا لیکن احمد شاہ نے اسے نہ جانے کیسے کھول لیا تھا۔

”میں اور غنی مین گیٹ کی طرف جا کر ان دونوں گاڑز کو قابو میں کرتے ہیں۔ آپ لوگ سرونٹ کو انرژ کی طرف چلے جائیں۔“

”پہلے ہم سب مین گیٹ کی طرف چلتے ہیں۔“ راجا نے کہا۔

”سہاویاں سرف دو آدمی ہیں۔ ان سے میں اور غنی سہانی سے منٹ سکتے ہیں۔“ احمد شاہ نے کہا۔

”زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم لوگ چلو، ہم لوگ کچھ فاصلے سے تمہیں گوردیں گے۔“

ہم لوگ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ہم ایک سب پھر کھات کر ہنگلے کے سامنے والے حصے کی طرف آئے تو غنی نے ہمیں وہیں دیواری کی آڑ میں رکنے کا اشارہ کیا اور خود اپنے پیٹھے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ مین گیٹ کے ساتھ ہی نیوے کا ایک کمر بننا ہوا تھا۔ وہ گویا گاڑز روم تھا۔ اس کمر میں تیز روشنی تھی اور مجھے ابھی تک وہاں کوئی گاڑز دکھائی نہیں آیا تھا۔ میری نظریں غنی اور احمد شاہ پر پڑی ہوئی تھیں۔

انہوں نے مخالف سمتوں سے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک فماریت کی طرف سے ایک شخص نکلا اور دھبے

پاؤں احمد شاہ کی طرف بڑھا۔ میں بھی تیزی سے اس طرف بڑھ گیا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں رائفل تھی جسے اس نے مال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور احمد شاہ پر اس کے دھبے سے وار کرنے والا تھا۔

اس نے جوں ہی رائفل ڈانڈے کی طرح بلندی میں نے پیچھے سے اس کی کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ وہ اونڈھے میں گر اٹھا احمد شاہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

اس شخص کے منہ سے مقلات کا طوفان ابل پڑا۔ میری لات زیادہ بھری نہیں پڑی تھی ورنہ وہ گالیاں تو درکنار اپنا نام تک بھول جاتا۔ احمد شاہ نے جھپٹ کر اس کی کھوپڑی پر زوردار ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ فوراً ہی ناک آؤٹ ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً اس کی پٹنی پر ایک ہاتھ مزید رسید کر دیا۔

اچانک وہاں کتے کے بھونکنے کی آواز گونجی تو میرے ساتھ ساتھ احمد شاہ بھی بری طرح چونک اٹھا۔

فوراً ہی گاڑز روم سے ایک آدمی نکلا اور الجھن آئیز انداز میں ارد گرد دیکھنے لگا۔ میں اور احمد شاہ ڈم ڈم کی بازھ کے پیچھے چھپ گئے۔

اب دو طرف سے خطرہ تھا۔ ایک طرف تو وہ گاڑز تھا، دوسری جانب وہ کتا تھا جو نہ جانے کس نسل کا تھا۔ آواز اور غراہٹ سے تو مجھے وہ خوف ناک قسم کا ڈور مین لگ رہا تھا۔

میں نے ریوالبور نکال لیا اور فائر کرنے کو تیار ہو گیا۔ احمد شاہ کے ہاتھ میں لمبے اور پتک دار پھل کا بھتر تھا۔

گاڑز مزید آگے بڑھا تو اچانک لڑکھڑا کر گر گیا۔ میں نے سر توڑا سا اوپر اٹھا کر اس طرف دیکھا، وہ گر نہیں تھا بلکہ غنی نے اس کا پیچہ پکڑ کر کھینچ لیا تھا اور وہ اس کے سینے پر سوار تھا۔ غنی نے ایک ہاتھ سے گاڑز کے بال پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گلہ دیوچ لیا۔ وہ خاصا کیم جھڑا آدمی تھا لیکن غنی کے بھاری بھر کم وجود کے نیچے دب کر گویا بے بس ہو گیا تھا۔

لجھوں میں اس کی گردن ایک طرف ڈھک گئی۔

غنی نے اسے کھینچ کر ڈم ڈم کی بازھ کے ساتھ ڈالا اور دے قدموں گاڑز روم کی طرف بڑھا۔ گاڑز روم کے ساتھ بھی ڈم ڈم کی غنی بازھ تھی۔ غنی اس بازھ کے پیچھے غائب ہو گیا اور مجھے پھر کتے کی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر اوپر اٹھ دیکھا، پھر احمد شاہ سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ وہ ہنگلے میں کتنے نہیں ہیں۔“

اس سے پہلے کہ احمد شاہ کوئی جواب دیتا۔ اتنا غنی مجھے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی برآمدے میں آگیا۔ ہم دونوں داخل

زمین سے چپک گئے۔ وہاں اپنی روشنی تھی کہ اگر ہم معمولی سی حرکت بھی کرتے تو اس شخص کی نظروں میں آجاتے یا اگر وہ برآمدے سے اتر کر پورچ میں آجاتا تو ہمیں دکھ لیتا۔ اس نے غار آلود آواز میں کہا: ”کون ہے؟“ غلام علی اُدکھو، یہ کتنا کہاں سے آگیا؟“

”ابھی دیکھتا ہوں۔“ دور سے غلام علی کی آواز سنائی دی، پھر وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آواز غلام علی کی نہیں بلکہ غنی کی تھی۔

وہ آدمی تجسس میں مزید آگے بڑھا۔ اسی وقت پیچھے سے کسی نے اسے دبوچ لیا۔ دوسرے ہی لمحے دونوں ایک دوسرے سے گتے ہوئے زمین پر گر پڑے۔ اس پر عقب سے حملہ کرنے والا راجا تھا اور اس نے بہت صبح وقت پر مداخلت کی تھی۔ احمد شاہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور لحوں میں ان دونوں کے سر پر پینچ گیا، پھر اس نے راجا سے لپٹے ہوئے آدمی کی گردن یوں پیچھے سے پکڑ لی جیسے سپرے سانپ کی گردن پکڑتے ہیں۔ وہ شخص بوکھلا کر پلٹنا چاہتا تھا لیکن احمد شاہ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ کسی کچھوے کی طرح بے بس ہو گیا۔

احمد شاہ نے اسے چھوڑا تو وہ مردہ پھٹکی کی طرح پٹ سے زمین پر گر گیا۔

”کیا یہ مر گیا؟“ راجا نے پوچھا۔

”یہ صرف بے ہوش ہوا ہے سہرا“ احمد شاہ نے کہا اور بے ہوش ہونے والے کی کینچی پر ایک ہاتھ اور مار دیا۔ اس نے اسے بھی گھسیٹ کر ڈم ڈم کی بازو کے ساتھ ڈال دیا۔ ”جلدی کریں سہرا“ غنی کی آواز آئی۔ ”وقت بہت کم ہے، یہ لوگ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہیں گے۔“

”راجا!“ میں نے کہا۔ ”تم گاڑی جنگلے کے گیٹ پر لے آؤ۔“

غنی نے گاڑی کی چابیاں راجا کو دے دیں اور بولے۔ ”گیٹ کی طرف اب کوئی نہیں ہے۔“

”وہ کتنے بھی شاید تھری تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی سہرا“ غنی نے کہا۔ ”گاراڑ کو ان کے کمرے سے تو نکالنا تھا۔“

اس سے ہمیں دوسرا فائدہ یہ ہوا تھا کہ جنگلے کے اقامتی جسے کا صدر دروازہ داخل تھا اور نہ اس کے بے بھی ہمیں کوئی شیشہ توڑنا پڑا یا کوئی کرل کا ٹاپا پڑی۔

ہم تینوں تیزی سے اندر کی طرف بڑھے۔ راجا جیٹ

گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ”غنی! تم دروازے کے پاس ٹھہرو۔ ممکن ہے کوئی غلام سرورنٹ کوادرے اس طرف آجائے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اندرو کوئی غلام ہو تو اس سے ہم لوگ منت لیں گے۔“

ہم لاؤنج عبور کر کے کوریڈور کی طرف آگئے۔ وہاں دونوں اطراف میں دودھ کمرے تھے۔ میں نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ احمد شاہ کے پاس محدود روشنی والی پینل تارچ تھی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”یہ کمرہ تو خالی ہے سہرا“ ہم آہستگی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں نے دروازے پر لگی ہوئی تاب گھمائی لیکن کمرہ اندر سے لاک تھا۔

احمد شاہ نے جیب سے عجیب سا ایک آہنی تار کا ٹکڑا نکالا اور اسے کی ہولی میں ڈال کر مخصوص انداز میں حرکت دی۔ جیسے سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں لاک کھل گیا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں زیر و باور کا ٹینگلوں بلب روشن تھا اس لیے احمد شاہ کو تارچ روشن کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ بہت شاندار اور آراستہ خواب گاہ تھی۔ کمرے میں جہاز سی سائز ڈبل بیڈ تھا۔ اس پر کوئی سورا تھا۔ سردی کے باعث سونے والے نے لحاف اوڑھ رکھا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ سونے والا ایک ہی ہے کیونکہ بیڈ کا آدھا حصہ خالی تھا۔

میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس کے سرہانے بجلی لگا گیا۔ پھر میں نے احمد شاہ کو اشارہ کیا۔

احمد شاہ نے جیب سے وہی لمبے پھل والا خنجر نکالا اور بائیں ہاتھ سے لحاف گھسیٹ لیا۔

اچانک برقی سی کوند گئی۔ سونے والی نے بجلی کی سی تیزی سے احمد شاہ کے سینے پر آلات ماری اور پلک جھپکتے میں رعب اور کانٹا لیا۔ وہ اس پر فائز کرنے ہی والی تھی کہ میں نے جھپٹ کر پشت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کے ریو اور والے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا، ریو اور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسرا ہاتھ میں لے کر اس کے منہ پر جھکا دیا تھا کہ وہ شور شرابا نہ کر سکے۔

اس نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرے ہاتھ پر خراشیں ڈال دیں۔ اس نے میرا چہرہ بھی نوچنے کی کوشش کی لیکن میں نے سر پیچھے جھکا کر اپنا چہرہ بچا لیا۔

احمد شاہ نے اچانک خنجر اس کے گلے پر رکھ دیا اور ناک لمبے میں بولا۔ ”اگر آواز نکالی تو تمہاری یہ خوب صورت گردن صابن کی نکلیا۔ کی طرح کاٹ دوں گا۔“

اس نے زور زور سے سر بلایا اور اشاروں سے مجھے بے نیکی کوشش کی۔

”اگر تم شور شرابا نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔“

عورت نے جلدی جلدی اثبات میں سر بلایا۔ ”اگر آواز نکالے تو اس کی گردن جسم سے علیحدہ کر دینا۔“ میں نے احمد شاہ سے کہا اور اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ پھر میں گھوم کر اس کے سامنے آگیا۔ میں نے جنگلے میں داخل ہونے سے پہلے احتیاطاً اپنے چہرے پر منظر لیٹ لیا تھا۔ احمد شاہ کے چہرے پر بھی منظر تھا، صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

وہ انتہائی حسین عورت تھی۔ اس کی عمر تقریباً چالیس، پینیس سال ہوگی لیکن وہ اپنے متناسب جسم اور پرکشش چہرے سے تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

”اگر تم لوگوں کو کشش یا زیورات بائیں تو تمہیں مایوسی ہوگی۔“ اس نے پھر اپنی ہولی آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں خیرا بہت نمایاں تھی۔ ”میں گھر میں کیش نہیں رکھتی اور زیورات بھی بینک لاکر میں ہیں۔“ اس نے کہا۔

”وہ بریف کیس کہاں ہے جو وکیل نے تمہیں دیا ہے؟“ میں نے غرا کر پوچھا لیکن آواز بھی تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ”کون ہو تم؟“

”دیکھو! میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔“

اس نے میرے چہرے کو دیکھ کر پوچھا کہ میں اس کا جواب دوں۔

”تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے ڈھنگی سے کہا۔

”دیکھو، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم نے فوراً جواب نہ دیا تو میرا سامی تمہارے منہ سے کر دے گا۔“

”تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ پھر بولی۔

میں نے اچانک اس کے لمبے اور گھنے بال اپنی منجلی میں پکڑ لیے۔ ”مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔“

احمد شاہ نے میرے اشارے پر اس کی کینچی پر پلٹا سا ہاتھ مار دیا۔ وہ اتنا ترسٹر پر گر گئی۔

”اس کے ہاتھ چر بانہو۔“ میں نے احمد شاہ سے کہا۔ ”میں اس کی بنیوں کو دیکھتا ہوں۔“

میں تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ اس تمام عمل میں مشکل سے تین منٹ لگے تھے۔ میں اس کے سامنے والے بیڈروم میں پہنچا تو وہ خالی تھا۔ سامنے والے دوسرے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو پنا!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے شب خوابی کے لباس میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی عمر مشکل سولہ سترہ سال رہی ہوگی۔

وہ لڑکی اتنی مصدوم تھی کہ مجھے ایک لمحے کو تو خود سے شرم محسوس ہوئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے فوراً ہی اس کے منہ پر اپنا ہاتھ جما دیا۔ وہ مجھے بھیجی پھنی آنکھوں سے گھومنے لگی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی دونوں کپٹیاں دبائیں۔ وہ چند لمحوں بعد میرے ہاتھوں میں بھول گئی۔

میں نے اسے آہستگی سے فرش پر لٹایا اور بیڈ کی طرف بڑھا۔

بیڈ پر اس سے بھی چھوٹی ایک مصدوم صورت بچی سو رہی تھی۔ اس نے کسمسا کر روت بدلی تو میں فوراً نیچے کی طرف دب گیا۔

اچانک میری نظر بیڈ کے نیچے رکھے ہوئے ایک بنڈل پر پڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چیز ہے اور بچوں کے کمرے میں کیوں ہے؟

میں نے اپنا ٹیل فون نکالا۔ اور اس کی تارچ روشن کر کے دیکھ تو مجھے ایک چادر میں کچھ لپٹا ہوا نظر آیا۔

اچانک میرے ذہن میں یہی سب کچھ آگئی۔ چادر کا ایک سرا ہٹا ہوا تھا اور اس میں سے سیاہ رنگ کے بریف کیس کا ایک کوا بھانک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے بیڈ سے باہر گھسیٹ لیا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن مجھے کامیابی نہ ملی۔

اس بریف کیس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر وہ

ہیں۔ اس کی بجائے میں ایک کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وکیل ہی نے اصل بریف کیس وہاں نہیں پہنچایا تھا۔

نور کو انخواہوئے آج باغیچہ میں ہو گئے تھے اور میں ابھی تک آفتاب خان اور وکیل کے پتھر میں الجھتا ہوا تھا۔ اب آفتاب خان کو قید رکھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بریف کیس تو فی الحال میرے ہاتھ لگا نہیں تھا لیکن وہ مجھے مل بھی جاتا تو کیا ہوتا؟ اس میں شاہ جی کے خلاف ثبوت تھے۔ وہ بریف کیس یقیناً وکیل کے پاس تھا اور وہ زیادہ دیر تو چھپا رہ نہیں سکتا تھا۔ وہ شہر کا خاصا نام وروکیل تھا۔ اس بریف کیس اور آفتاب خان کے چکر میں اپنا کیریئر تو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ مجھے خوری طور پر نور کو تلاش کرنا تھا۔ اسے انوار کرنے والوں نے اب تک مجھ سے کوئی مطالبہ کیا تھا اور نہ ہی رابطہ کیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی، صبح ہونے والی تھی، میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے کہا۔ ”آفتاب خان کو بے ہوش کر کے کسی دور دراز کے علاقے میں ڈال آؤ۔“

”میں سر!“ احمد شاہ نے کہا۔

”اب تو کیا اس فداوائی کو انخواہوئے گا؟“ راجا نے پوچھا۔

”جہنم میں گیا تو دانی۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”مجھے خوری طور پر نور کا سراغ لگانا ہے۔ اسے کس لوگوں نے انخواہ کیا ہے؟“

اچانک مجھے شاکر کا خیال آیا۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا۔ اس نے اس وقت بھی ان لوگوں کو پیچان لیا تھا جب ہم اس ریستورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔

”یار دیکھ!“ راجا نے کہا۔ ”اس وقت تو اپنے دماغ پر بالیں زور مت ڈال اور کچھ دیر کے لیے سوچا۔“ صبح دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے؟“

رات بھر کی بھگ دوڑ اور ڈی وی ڈیز دیکھنے کی ذہنی اذیت نے مجھے واقعی غر حال کر دیا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک ساتھ دیگر ٹیم کی دو گولیاں پانی سے نکل لیں اور خالی الذہنی کے عالم میں بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

پھر صبح میری آنکھ کھلی تو وہاں خیر گوئی سات بج رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دیگر ٹیم کی دو گولیاں کھانے کے باوجود میں وہ میٹھے سے زیادہ نہیں پیا تھا لیکن مجھے ٹھنک باطن میں

نہیں تھی۔ میں ابھی تھکے ہوئے تھیں۔ نور کی بہت بڑی کسٹل مندی تھی وہ گریس پانی سے نہانے کے بعد دور ہو گئی اور میں بالکل پاکا پھنکا ہو گیا۔

میں ہاتھ دھو کر سے باہر نکلا تو راجا میری مائیک جیکر پر بیٹھا بھول رہا تھا۔

”نواب صاحب خواب خرگوش بلکہ خواب خر سے بیدار ہو گئے؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”ہیں خواب میں ہنوز کہ جاگے ہیں خواب سے!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یار مہاراجا! میں دو گھنٹے کی فینڈ سے اتنا ہشاش بشاش ہو گیا؟“

”دو گھنٹے؟“ راجا نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”قبلہ نواب صاحب! آپ تو اب زمان و مکان سے بھی بے بہرہ ہو گئے۔ حضور! آپ پورے پندرہ گھنٹے بعد اس خواب غفلت سے بیدار ہوئے ہیں۔“

اس کا مطلب ہے کہ اس وقت شام کے سات بج رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”سازھے سات!“ راجا نے کہا۔

”اسی لیے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اتنی بھوک کیوں لگ رہی ہے؟“ میں نے کہا۔

”سوچے مت بلکہ اب ذرا تناول فرما لیجیے۔ آئیے تشریف لے آئیے کھا ڈالو!“ راجا نے کہا۔

”کھانے کی میز پر واقعی کھانا موجود تھا۔ میں راجا کی تحریروں کو نظر انداز کر کے کھانے پر نوت پڑا۔ کھانے کے بعد نیلم کافی لے آئی، میں نے کافی پی کر ہوئے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے آفتاب خان کے بارے میں پوچھا۔

”آفتاب خان کو شیو پورہ کے ایک علاقے میں ڈال کر آیا ہوں سر!“ احمد شاہ نے کہا۔

”گدا!“ میں نے کہا۔ پھر میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔

میرا ارادہ تھا کہ شاکر کو فون کر کے کہیں ملنے کا وقت ملے کروں۔ فی الحال لاہور کا یہ ٹھکانا میں اسے بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

اچانک میرے سیل فون کی ٹھنکی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ دو کوئی اجنبی نمبر تھا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد میں نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو!“

”نواب صاحب!“ فون کی طرف سے ایک اور فون کی آواز آئی۔ ”میں نے آپ کی طرف سے ایک اور فون کی آواز سنی ہے۔“

”نواب صاحب!“ فون کی طرف سے ایک اور فون کی آواز آئی۔ ”میں نے آپ کی طرف سے ایک اور فون کی آواز سنی ہے۔“

”جی فرمائیے، کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”نواب صاحب! آپ کی ایک امانت ہے ہمارے پاس!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کون صاحب بول رہے ہیں۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اپنا تعارف تو کرنا چاہیے۔“

”اجی چھوڑیے، ان رکی باتوں میں کیا رکھا ہے۔“ دوسری طرف سے گویا چڑانے والے انداز میں کہا گیا۔

”آپ کو تو اپنی امانت سے غرض ہونا چاہیے۔“

”کسی امانت؟“ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نور کے بارے میں بات کرنے والا ہے۔

”آپ اتنی جلدی بھول گئے؟“ دوسری طرف سے غصہ کیا گیا۔ ”یہ ایسے ہم نے سنا تو تھا کہ آپ اپنی محبوبا کی بدل دیتے ہیں لیکن.....“

”آپ صاف صاف بات نہیں کر سکتے؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”جیلے، پھر صاف لفظوں ہی میں سن لیجیے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کی محبوبہ دو سال یعنی مس ماہ نور، اس وقت ہماری مہمان ہیں۔“

”تم ہو کون؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اور نور کو تم نے کیا انخواہ کیا ہے؟“

”نواب صاحب!“ دوسری طرف سے سرد آواز آئی۔ ”میں آپ سے انتہائی شائستگی سے گفتگو کر رہا ہوں اور آپ جواب میں انتہائی غیر شائستہ زبان استعمال فرما رہے ہیں۔“

”جناب شائستہ صاحب! آپ نے نور کو کیوں قید کر رکھا ہے۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے؟“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں نے عرض کیا تھا کہ محترمہ ماہ نور ہماری مہمان ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہی ہو۔“

”اور آپ چاہتے کیا ہیں، اب یہ بھی فرمادیں۔“ میں نے تمنا کر کہا۔

”مجھے تو آپ کو صرف یہ اطلاع دینا مقصود تھا۔“ اس نے کہا۔ ”باقی باتیں بعد میں ہوں گی اور ہاں، اب اس نمبر پر ہم نے آپ کی رحمت مت کیجیے گا کیونکہ اب اس نمبر سے آپ کو بھی بات نہیں ملے گی۔“

”تو آخر کون؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اور تو کیا جانتے ہیں کہ تمہارے منہ سے کتنی باتیں نکلیں گی؟“

”اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں خود ہی بکواس کر رہا ہوں۔ دوسری طرف سے سسٹم منقطع ہو چکا ہے۔“

”کون تھا فیکہ پتھر؟“ راجا نے پوچھا۔ ”وہ نور کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا اور تو اتنا غصے میں کیوں ہے؟“

”یہ رانا زوہیب اور دلاور ایڈوکیٹ کی حرکت معلوم ہوئی ہے فیکہ!“ راجا نے کہا۔

”مجھے بھی یقین ہے کہ نور کے انخواہ میں رانا اور دلاور کا ہاتھ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس مہم میں... فون کال کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“

”مجھے نفسیاتی طور پر توڑنا۔“ راجا نے کہا۔

”تو شاکر سے بات کیوں نہیں کرتا؟“ راجا نے کہا۔

”وہ بھی ان ہی کے قبیلے کا آدمی ہے۔ وہ واقعی اگر تیرے ساتھ ٹھہرے تو اس سلسلے میں تیرے بہت کام آ سکتا ہے۔“

”میں ہی کو فون کر رہا تھا کہ یہ کال آگئی۔“ میں نے کہا اور شاکر کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

”میں اسے یہاں تو نہیں بلاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”تو اسے ست بدھائی بلا لے۔“ راجا نے کہا۔ ”مہم لوگ بھی ست بدھائی روانہ ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی اب لاہور میں کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔“

”میں نے شاکر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف ٹھنکی بجی رہی لیکن شاکر نے کال وصول نہیں کی۔

میں جھنجھلا کر سسٹم منقطع کرنے کی دلا تھا کہ مجھے شاکر کی آواز سنائی دی۔ ”السلام علیکم نواب صاحب!“

”وعلیکم السلام!“ میں نے کہا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو شاکر؟“

”خیریت تو ہے نواب صاحب!“ شاکر سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں، خیریت ہے مجھی اور نہیں مجھی۔“ میں نے کہا۔

”کیا تم مجھ سے آج مل سکتے ہو؟“

”کیا آپ لاہور میں ہیں؟“ شاکر نے پوچھا۔

”میں لاہور میں تھا لیکن اب ست بدھائی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میرے لیے آج ست بدھائی پہنچنا تو مشکل ہے۔“

”ہاں، میں کل دوپہر تک حاضر ہو سکتا ہوں۔ ویسے کوئی ایمر جنسی ہے تو میں آج بھی آ سکتا ہوں۔“

”ایمر جنسی تو ہے لیکن حرم کی محنت بدھائی آج آئی۔“

”ٹھیک ہے نواب صاحب! میں کل بارہ بجے سناڑے دروازے پر منتظر رہتا ہوں۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گا، اوکے، اللہ حافظ!“ میں نے کہا۔ پھر میں نے غنی کو بلا کر کہا۔ ”ہم ابھی ست بدھائی کے لیے نکل رہے ہیں۔“

غنی نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کال اسی ”شائستہ خان“ کی ہوگی لیکن اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔ میں نے ہنسنے لگا اور سیل فون کان سے لگالیا۔ ”ہیو ناصر! کیسے ہو؟“

”میں بخیریت ہوں نواب صاحب! مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ لاہور میں ہیں؟“

”ہاں، بس ابھی تھوڑی دیر بعد دست بدھائی کے لیے نکلنے ہی والے ہیں۔“

”ابھی کچھ دیر ٹھہر جائیں، میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ مجھے اپنا پتا بتائیے۔“

میں نے اسے پتا بتایا اور ناصر کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شاید کہیں قریب ہی تھا، اس لیے دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گیا۔

”میڈم! انور کی کوئی اطلاع؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی تک مجھے سرف ایک فون کال موصول ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس شخص نے صرف مجھے یہ اطلاع دی کہ نور اس کے قہقے میں ہے۔“ پھر میں نے چونک کر پوچھا۔ ”تم!؟ ہور کب آئے؟“

”میں دوپہر کے وقت اپنے ایک ذاتی کام سے لاہور آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اطلاع ملی کہ شاہ جی کا سب سے قریبی ساتھی پریس کلب میں پریس کاغذیں کرنے اور ہے۔“

”کون قریبی ساتھی، آفتاب خان؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، وہی شاہ جی کا دایاں ہاتھ تھا۔“ اس نے پریس کاغذیں میں سب سے پہلے تو یہ اعلان کیا کہ میں سسٹن شاہ جی پارٹی سے مستعفی ہو رہا ہوں۔ آج کے بعد میرا اس پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا پھر اس نے شاہ جی پر اسے نکالنا اور اسے اگلے کے میں حیران کر دیا۔ میں ہی کیا پوری صحافتی برادری حیران تھی۔ جواب میں صحافیوں نے آفتاب خان سے یہ سب اپنے جیسے ہونے والے بات کیے کہ وہ تلمذ کر رہا ہے۔ اعلان کیا کہ وہ جلد ہی اس کا بھٹک شاہ جی سے غلاف باندھ کر اپنے بیٹے کو اپنے نام سے لگا کر اس کے لیے سب سے بڑا ثبات

کا لقب اتر جائے گا۔“

”مستر آفتاب! میں نے کہا۔“ آپ جانتے ہیں کہ آپ پارلیمنٹ کے ایک معزز اور نیک نام رکن پر اسے ایک الزامات لگا رہے ہیں۔ اگر آپ ثبوت فراہم نہ کر سکتے تو خود آپ کی پوزیشن کیا ہوگی؟“

”شاہ جی مجھ پر ہنگ عزت کا دعویٰ کر رہے۔ عدالت کے دروازے تو سب کے لیے کھلے ہیں لیکن وہ بھی اپنے کرے گا نہیں۔“ آفتاب خان نے جواب دیا۔

”نواب صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ آفتاب خان جوکل تک شخص ایک ٹوک ڈرا بیورو تھا، جوشاہ جی کی وجہ سے آج اس مقام پر پہنچا ہے، وہ کیا ایک اس کے خلاف کیسے ہو گیا؟“

میں نے جواب میں اسے آفتاب خان کے اغوا سے لے کر اس کی رہائی تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

”اچھا... اچھا... اسی لیے وہ کہہ رہا تھا کہ شاہ جی کے بد معاشرے نے اسے اغوا کرنے کے بعد جس بے جا میں رکھا، اس کے گھر میں غیر قانونی طور داخل ہونے اور اس کی بیوی سے بدسلوکی کی۔ ان لوگوں کو ان شواہد کی تلاش بھی میں نے شاہ جی کے خلاف کی تھی۔“

بد معاشرے نے مایوس ہو کر مجھے خود ہی چھوڑ دیا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری محنت رانگاں نہیں گئی رہا ہے۔“

میں نے ناصر کو شاہ جی کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ”نکل اس کے لیے آپ ست بدھائی جا رہے ہیں۔ اس سے تو آپ یقیناً ملاقات کر سکتے ہیں۔ آپ اگر اسے یہاں تک جانا چاہتے تو گھبرا کر بلائیں۔ وہاں میرا ایک صحابی دوست رہتا ہے۔“

میں نے شاہ جی کو فون کر کے بتا دیا کہ مجھے ایک ضروری کام سے دوبارہ لاہور آنا پڑے گا۔ تم کل شام کو جا رہے مجھ سے گھبرا کر میں تو، میں وہاں اپنے ایک دوست کے گھر میں قیام کروں گا۔“ میں نے اسے ناصر کو بتایا ہوتا بھی بتا دیا۔

میں نے دوسرے پوچھا۔ ”بھائی! خان شیر والی کی کوئی خبر ہے؟“

”میں نے پریسوں میری سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”ابھی تک شاہ جی کی طرف سے ان کی کوئی شکایت نہیں ملنے۔“

میں نے اسے دوسرے دوستوں کے شکے میں سے

شاہ جی کا انتظار کر رہے تھے۔ درانی خود کسی ضروری کام سے پہنچا تھا۔

”شکریہ چار بجے شاہ جی وہاں پہنچ گئے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ تیار لے کے بعد اس نے کہا۔“ یہ بہت چننا ہوا کہ آپ سے لاہور میں ملاقات ہوگئی۔ میں آج کل ایک ضروری کام میں پھنسا ہوا ہوں۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”آپ فرمائیے، کیسے زحمت کی؟“

”شاہ جی، تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو جو اس دن رینٹورٹ میں بھی موجود تھے؟ تم نے مجھے خطرے سے آگاہ بھی کیا تھا۔“

شاہ جی چند لمحے تک سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”میں یہ بات آپ کو اسی دن بتا دیتا لیکن مجھے خود بھی پوری طرح علم نہیں تھا۔ میں نے بعد میں اپنے طور پر معلومات کی تو علم ہوا کہ وہ اکبر سندھو کے آدمی تھے۔“

”اکبر سندھو!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے اور اسے مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

”انڈر ولڈ کا ایک مضبوط آدمی ہے۔ اسے آپ نے کچھ غلط سمجھ سکتے ہیں۔ آپ سے دشمنی کی ایک ہی وجہ ہے، کسی نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔“

”مطلب یہ کہ وہ وہاں بھی ہو سکتا ہے اور رانا بھی؟“

میں نے کہا۔

”فی الحال تو آپ کے دشمن وہی ہیں۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے میڈم نور کو تانے کے لیے نوکرانی سوا اور وہ آپ سے بھاری رقم کا مطالبہ کرے۔ وہ بات ہو کہ آپ اس کا مطالبہ پورا کر سکتے ہیں۔“

”یہ اکبر سندھو کہاں سے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے کئی شکارنے ہیں۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کے تمام شکارنے معنوم کر لیتا ہوں۔“ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈیال کرنے لگا۔

میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ جہاں کوئی ابھی نہیں تھا۔ میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر کال ریسپونڈ کر لی۔ ”ہیلو!“ میں نے کہا۔

”نواب صاحب! کیسے ہیں آپ؟“

”میں صاحب بول رہے ہیں؟“ میں اس کی آواز پہچان گیا تھا۔ یہ اسی کا فون تھا جس نے مجھے نور کے بارے میں بتایا تھا۔

حیرت کی بات ہے۔ آپ میری آواز نہیں پہچان

رہے ہیں؟“

”جناب! نفسا نفسی کے اس دور میں بعض اوقات بھائی، بھائی کو اور باپ بیٹے کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ آپ آواز کی بات کر رہے ہیں، یہاں تو لوگ خون کے رشتے بھی بھلا دیتے ہیں۔“

”نواب صاحب! آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”آپ کو میری باتیں مذاق لگ رہی ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”بہر حال، آپ اپنا نام تو بتائیے؟“

”میں آپ کا خدمت گزار بول رہا ہوں، آپ کی جان جاناں ہماری مہمان ہیں۔“

”تو بھائی کریں مہمان نوازی!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”یہ بات مجھے بار بار کیوں بتا رہے ہیں؟“

”جی میں... وہ... آپ...“ وہ جواب دیتے ہوئے کچھ بولا کھلا سا گیا۔ ”یعنی آپ وان خاتون کی کوئی نگہبانی نہیں ہے؟“

”بھئی، جب آپ جیسا مہذب اور شائستہ میزبان ہوتو مجھے فکر کیوں ہوگی؟“

”آپ... کو...“

”ایک تو بات کرتے ہوئے آپ ہکا تے بہت ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میری طرف سے جب تک دل چاہے، آپ ان موصوف کو مہمان بنا کر رکھیں۔“

”نواب صاحب! آپ شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ وہ خاتون میری مہمان ضرور ہیں لیکن میرے پاس میری طرح رحم دل نہیں ہیں۔“

”مطلب کی بات کر لیں۔“ میں نے لہجہ کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

”پاس کے کچھ ملاقات ہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے اسے یہ بھلا دیا کرتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہو۔

”پھر اپنے پاس سے نہیں کہ وہ خود مجھ سے بات کریں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اور آپ کے پاس ہیں کون؟“

”آپ کچھ توقف فرمیں۔“ اس نے تعلق شخص نے کہا۔ ”ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔“

تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے ایک بھاری اور گزرتی آواز سنائی دی۔ ”نواب! رقیق! تمہاری ہونے والی نیٹم میرے قہقے میں ہیں۔“

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مطلب کی بات کرو۔“

”پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اگر تم مجھے باتوں میں لگا کر یہ چاہتے ہو کہ میرا نمبر نہیں کر سکو ہے تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔ اپنا وقت اور توانائی ضائع مت کرو۔“ اس نے اکھر لہجے میں کہا۔

”یار! مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے اپنا وقت ضائع کرنے کی، تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟“

”میں کیا چاہتا ہوں یہ بھی تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میری کچھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا مقصد تھا؟ کیا وہ لوگ مجھے ذہنی طور پر مزید سرب کرنا چاہتے تھے؟

راجا بہت غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کیا ہوا فیکے اس کا فون تھا؟“

”یار، وہ فور کے بارے میں بات کر رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اتنا تو میں بھی سمجھ گیا ہوں لیکن وہ ہے کون؟“

”اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔“ میں نے سچ لہجے میں کہا۔ ”فضول بک بک کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب سے بڑے فونوں میں سے ہے۔“

”ممن ہے وہ لوگ مجھے ذہنی طور پر منتشر کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہوں۔“ راجا نے کہا۔ ”اب اگر ان کی کال آئے تو ان سے کہنا کہ فور سے میری بات نہ کرنا۔“

شاگرد مختلف جگہ فون کرنے کے بعد مجھ سے بولا۔

”نواب صاحب! ابھی ایک شخص سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ کچھ دن پہلے تک اکبر سندھو کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اب ان میں کچھ اختلافات ہو گئے ہیں۔“

”تم اس سے معلومات حاصل کرو۔ اکبر سندھو کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا ہوگا۔“ ناصر نے کہا۔

”میں نے آج اسے اپنے ایک ٹھکانے پر بلایا ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”آپ ابھی لاہور میں رکھیں گے یا نہایت پر حاشیہ چلے جائیں گے؟“

”تم معمولات کر رہے ہیں نہیں بھی ہوا، تم سے سیل فون پر بات کر لوں گا۔“ دیت آئی بات میں تو لاہور ہی میں رہا۔

”میں نے کہا۔“

”جیسا کہ، پھر میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“

”جیسا کہ، ناصر نے کہا۔“ یار شاگرد! تم یہ چھوٹے موٹے کاموں کوئی بڑا کام بھی کرتے ہو؟“

”میں نے ان کواری سے اسے دیکھا۔“ ناصر صاحب! میں اب یہ کہتا ہوں، اس کا علم آپ کو بھی ضرور ہوگا۔ یہ کام تو

میں نصاب صاحب کی خاطر کر رہا ہوں۔“

”یہ کام تو کوئی بھی کر لے گا۔“ ناصر نے کہا۔ ”تم نے اگر کوئی بڑا کام کیا جائے تو تم کر لو گے؟“

”آپ حکم کریں، کام کیسا ہی ہو، میں کبھی انکار نہیں کرتا۔ سوائے دو کاموں کے۔“ شاگرد نے کہا۔ ”میں لوگوں کا اغوا اور بد رفتاری نہیں کرتا، چاہے کوئی مجھے کتابی معاوضہ کیوں نہ دے۔“

”ہمیں بھی ایسے گھنیا کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ناصر نے کہا۔

”تو پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟“ شاگرد نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”رانا زویب کو اٹھالو۔“ ناصر نے اچانک دھماکا سا کر دیا۔

”رانا زویب کو!..... آپ کا مطلب ہے کہ.....“

”ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔“ ناصر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کر سکو گے یہ کام؟“

”رانا زویب کوئی بھیڑ کا بچہ نہیں ہے کہ کوئی جانے اور اسے کان سے پکڑ کر لے آئے۔“ شاگرد نے کہا۔

”بقول تمہارے، تجربہ قسم کا کام کرتے ہو؟“ ناصر نے کہا۔ ”پھر کیا مسئلہ ہے؟“

”میں تو یہاں نواب صاحب کی مدد کرنے آیا تھا۔“ شاگرد نے کہا۔ ”کوئی ذیل کرنے نہیں آیا تھا۔“

”یہ بھی تو نواب صاحب کی مدد ہی ہوگی۔“ ناصر نے کہا۔ ”اس وقت نواب صاحب کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہی یہ بھی بتا سکے گا کہ میڈم فور کہاں ہیں۔“

”لیکن اسے اغوا کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“ شاگرد نے کہا۔

”اسی لیے تو میں تم سے کہہ رہا ہوں ورنہ تو کسی چھوٹے موٹے بد معاش سے یہ کام لیا جاسکتا تھا۔ یوں بھی نے کھٹے نام دلاور کی مخالفت شروع کر دی ہے۔“

شاگرد نے میری طرف دیکھا۔ ”نواب صاحب! آپ بھی یہی چاہتے ہیں؟ اگر آپ کہیں تو میں دلاور کو تم دوں؟“

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”رانا مجھے زندہ چاہیے۔ ویسے اگر یہ کام تمہیں مشکل لگ رہا تو رہنے دو، ہم کوئی اور بندہ دست کر لیں گے۔“

”نواب صاحب! آپ کو شاید میری قوت کا اندازہ نہیں ہے۔“

”نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

”میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

www.digestpk.com

”مجھے اندازہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لیے تو میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“ اخراجات کی فکر مت کرنا۔“

”اخراجات کا نام لے کر مجھے گالی مت دیں نواب صاحب!“ شاگرد نے کہا۔ ”اس سلسلے میں جتنے بھی اخراجات ہوں گے، میں خود کروں گا۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اگر رانا زویب پاکستان میں ہے تو آپ کا کام بہت جلد ہو جائے گا۔“ اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ناصر سے پوچھا۔ ”یہ تمہیں اچانک کیا سوچھی؟“

”نواب صاحب!“ ناصر نے کہا۔ ”مجھے شروع ہی سے اس شخص پر نہ جانے کیوں اعتبار نہیں ہے۔ وہ صرف دلاور کی مخالفت میں آپ کی حمایت کر رہا ہے۔ جس دن اس نے دلاور کا پتا صاف کر دیا، اسی دن یہ آپ سے لاطعلق ہو جائے گا۔“

”بغض و عناد ہی میں سبھی، وہ ہماری مدد تو کر رہا ہے۔“ راجا نے کہا۔

”یہ ہماری مدد نہیں کر رہا ہے بلکہ نواب صاحب کے اندھے پر رکھ کر بددعوت چلاتا چاہتا ہے۔“ ناصر نے منہ بنا کر کہا۔

”ہاں!“ راجا نے کہا۔ ”تم بھی با محاورہ اردو بولنے لگے۔“

”شکر ہے کہ فیکے کی صحبت میں رہ کر تم نے شعر و شاعری شروع نہیں کی۔“

”بھلا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ، افسوس تم کو یہ سبھی نہیں رہی۔“ میں نے کہا۔

”اور جہاں تک اس اکبر سندھو کا معاملہ ہے تو جب پانڈوں، میں الوکی گردن، تاپ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ملتا ہے۔“

”تم جانتے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نواب صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں نے ان سال تک کراٹم رپورٹنگ کی ہے۔ آج بھی ایک طرح سے کراٹم رپورٹنگ ہی کر رہا ہوں۔“ پوچھنے لگا۔ ”فون کی خبر بھی تو دلاور پر ریزی ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے بات دانوں کے کراٹم منظر عام پر آتا ہے۔“

”تم مجھ سے پوچھ رہے ہو یا مجھے بتا رہے ہو؟“ راجا نے کہا۔

”میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

”میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

”میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

”میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

”میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

”میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان پرانے کھلاڑی ہو۔“ ناصر نے کہا۔

www.paksociety.com

”یہ اکبر سندھو کہاں لے گا اس وقت؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

ناصر نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی، پھر جیب سے سیل فون نکال کر کسی کو کال کرنے لگا۔ سلسلے سے پروہ بولا۔ ”ہینو، لاؤ! میں..... اچھا تم پہچان گئے۔“ ہاں، خاص کام تو نہیں ہے۔ بس یہ معلوم کرنا ہے کہ اس وقت سندھو کہاں ہوگا؟.....

”ہاں..... ہاں ہاں، تم یو..... گلبرگ..... اچھا..... ٹھیک ہے.....“ اس نے سلسلہ منقطع کر کے میری طرف دیکھا۔

”اکبر سندھو اس وقت گلبرگ کے ایک فلیٹ میں موجود ہے۔ وہ کچھ خوش وقتی کے لیے وہاں اپنی محبوبہ کے پاس جاتا ہے۔“

”چلو، پھر وہیں ملتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”فیکے پتر!“ راجا نے کہا۔ ”اتنی پھر تکی مت دکھا۔ پہلے شاگرد کو معلومات کر لینے دے۔“

”شاگرد اب صرف دلاور اور رانا کی فکر میں ہوگا۔“ ناصر نے کہا۔ ”اور صحیح لفظ پھرٹی ہے، پھر تکی نہیں۔“

ناصر جس کر بولا۔

”ادیار! اب تو بھی مجھے اردو سکھانے کا؟“ راجا منہ بنا کر بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ صحیح لفظ پھرٹی ہے لیکن اپنے نواب صاحب کچھ زیادہ ہی تیزی سے کام کرتے ہیں اس لیے میں اسے پھر تکی کہہ رہا ہوں۔“

”سندھو کے لیے میرے ساتھ فنی غنی اور ناصر جائیں گے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”یار، مجھے گھر تو چھوڑ دے۔“ راجا نے اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ ”میں بھی تیرے ساتھ چلتا لیکن ناصر کی سندھو سے کچھ یاد اللہ بھی رہی ہے۔“

میں نے ناصر کی طرف دیکھا۔

”ہاں، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ راجا کو بھی جانتا ہے۔ کراٹم رپورٹر اور کراٹم کلاچوکی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔“

☆ ☆ ☆

ہم وہاں سے نکلے تو ملکی ملکی بارش ہو رہی تھی۔ ہمارا مطلوبہ فلیٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

راجا نے مجھ سے کہا۔ ”اب تو میری وجہ سے ماڈل ہاؤس جانے گا فیکے؟ چل میں بھی تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔“

”ڈرائیونگ سیٹ پر فنی تھ۔“ ناصر نے فنی کو ایئر رلیس بتایا۔ اس نے سات منٹ کے عرصے میں ہمیں اس کپڑاؤں کے سامنے پہنچا دیا جہاں سندھو کے فٹے کا دروازہ تھا۔

”فنی! انہما پر جاؤ۔ میں اور ناصر تمہارے پیچھے پیچھے

www.paksociety.com

آئیں گے۔ راجا گاڑی میں بیٹھ کر ارد گرد نظر رکھے گا۔ میں نے کسی فوجی کمائڈر کی طرح ہدایت دیں۔

غنی گاڑی سے اتر کر ٹیبلے والے انداز میں بلڈنگ کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بہت صاف ستھرے اور نگلٹری فلیٹ تھے۔ مین گیٹ پر بریڈر بھی موجود تھا، اس کا مقصد غالباً انجینوں اور مہمانوں کی گاڑیوں کو اندر آنے سے روکنا تھا۔ بریڈر کے دائیں جانب اتنی جگہ تھی کہ ایک آدمی آرام سے گزر سکتا تھا۔ گیٹ پر چونکدار بھی موجود تھا لیکن اس نے غنی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

میں اور ناصر بھی گاڑی سے باہر آگئے اور غنی کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ سندھو کو تو صرف ناصر پچھانتا ہے۔ اگر وہ فلیٹ میں ہوا بھی تو کہہ سکتا ہے کہ اکبر سندھو یہاں نہیں ہے۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور غنی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ ”غنی! ام ٹھہرو! فلیٹ میں ناصر جائے گا۔ تم میرے ساتھ رہنا۔“ میں نے سیل فون اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔“ ناصر نے کہا۔ ”فلیٹ میں پہلے مجھے جانا چاہیے تھا۔“

غنی لفٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اسی وقت لفٹ آگئی۔ ناصر لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ میں اور غنی زینے کی طرف بڑھ گئے کیونکہ ہمیں صرف سیکنڈ فلور تک ہی جانا تھا۔

میں فلیٹوں کے نمبر دیکھتے ہوئے آگے بڑھا تو ایک کوریڈور میں مجھے ناصر دکھائی دیا۔ وہ ایک فلیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے غنی کو کوریڈور کے دوسرے سرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں ٹھہر کر جیب سے سگریٹ کا پیکیٹ نکال لیا۔ میں عادی سگریٹ نوش نہیں ہوں لیکن دن میں دو چار سگریٹ پی لیتا ہوں۔ اس وقت تو مجھے وہاں ٹھہرنے کا جواز بھی چاہیے تھا۔

اچانک فلیٹ کا دروازہ کھلا لیکن اسے کھولنے والا میری نظروں سے اوجھل تھا۔

ناصر نے اس سے کچھ کہا، پھر فوراً ہی اپنا پاؤں دروازے کے بیچ میں اڑا دیا۔ اندر سے شاید کسی نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے ناصر کے ہاتھ میں گن نظر آئی۔ اس نے درشت لہجے میں کچھ کہا تھا۔ مجھے صرف اس کے چہرے کے تاثرات نظر آرہے تھے۔ الفاظ سنا کر نہیں دے رہے تھے۔

میں نے بھی سگریٹ پھینکی اور اس فلیٹ کی طرف لپکا۔

فلیٹ کا دروازہ اب تک کھلا ہوا تھا۔ میں نے بھی بغلی ہولسٹر سے ریوالت نکال لیا اور اندر داخل ہو گیا۔

اندراٹھا نہیں، تیس سال کی ایک دلکش عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مزید سہمی گئی۔ میں نے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اکبر یہاں نہیں ہے۔“ وہ عورت آہستہ سے بولی۔

”لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ یہیں آیا ہے۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”آپ کی اطلاع درست ہے جناب!“ وہ عورت اب کچھ زیادہ اعتماد سے بول رہی تھی۔ ”اکبر کو یہاں آنا لیکن وہ اب تک یہاں آیا نہیں ہے۔“

میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ وہ خاص حسین عورت تھی۔ اس وقت کچھ سہمی ہوئی تھی لیکن اس کی دلکش مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ شاید میک اپ کرنے میں مصروف تھی اور ادھورا چھوڑ کر دروازہ کھولنے آگئی تھی۔ اس کی دائیں آنکھ پر آبی شید اور کا جل لگا ہوا تھا۔ جسم انتہائی متناسب تھا۔ وہ نیلے رنگ کی ساری اور مختصر سے ہلاؤز بھی تھی۔ اس میں اس کی پیٹھ اور پیٹ پر ہندو تھوڑا سا جلد نظر آ رہی تھی۔

”آپ چاہیں تو میرے فلیٹ کی تلاشی لے لیں۔“ اس نے کہا۔ ”یوں بھی پولیس والے کئی دفعہ میرے فلیٹ کی تلاشی لے چکے ہیں۔“

گو یا وہ ہمیں پولیس والا سمجھ رہی تھی۔ اتنے دھڑلے سے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا خود ساختہ اختیار صرف ہماری پولیس ہی کو تھا۔

اس کا ادھورا میک اپ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کی یہ تیاری اور سولہ نگہار صرف اکبر سندھو ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔

”ٹھیک ہے، ہم فلیٹ کی تلاشی ضرور لیں گے۔“ میں نے کہا۔

میں نے فلیٹ کا داخلی دروازہ پوٹ کیا اور عورت کے پیچھے پیچھے داخل ہو کر اندر کی طرف بڑھا۔

میں اس وقت بھی بہت محتاط تھا۔ مبادا سندھو اندر سے کمرے میں دوڑا اور اچانک میرا کام تمام کر دے۔

اس عورت کی چال مشکعل کردینے والی تھی۔ اس فلیٹ میں تین کمرے تھے۔ دو بیڈروم اور ڈرائنگ، ڈائننگ روم

اس میں کچھ شے بھی تھی۔

ناصر میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے پہلے لاؤنج اور ڈائننگ روم کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر وہ بیڈروم کی طرف بڑھا۔

میں عورت کے پیچھے اس کے بیڈروم میں چلا گیا۔ اس نے آراستہ بیڈروم دیکھ کر مجھے اس کے ذوق کا اندازہ ہوا۔ وہ

ن۔ ف حسین بھی بلکہ نفاست پسند بھی تھی۔

”اچھی طرح تلاشی لے لیں آفسیر!“ اس نے کہا۔

مجھے اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس ہوا۔

میں نے بیڈ کے نیچے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اس کا بیڈ ڈورن طرز کا تھا۔ ایسے بیڈز میں عموماً نیچے جھپکنے کی جگہ نہیں

ہوتی ہے۔ وہ چاروں طرف سے بند ہوتے ہیں اور عام بیڈ کے متعلقے میں ان کی اونچائی بھی کم ہوتی ہے۔

اس نے اپنی جہاز کی سائر ڈیوار گیرالٹا ریاں پہلے ہی کھول دی تھیں۔ ان میں اس کے پیڑے اور ضرورت کا

دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ روم میں جھانک کر دیکھا، پھر بیڈروم میں موجود ایک دروازہ مزید دکھائی دیا۔ وہ

دروازہ باہر میز میں کھلتا تھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا اور وہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں سے کوئی فرار ہو سکے۔

”آپ کی سیل ہوگئی؟“ عورت نے چہیتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میری سیل ابھی نہیں ہوئی۔“ میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا گدا انا تازم تھا کہ میں اس میں دھنسن کر رہ

تا۔ ”اکبر اکبر کو یہاں آنا ہے تو وہ یہاں ضرور آئے گا۔“ میں نے ہاتھ مار کر اس کا

مجھے اس کے چہرے پر پینٹی دفعہ شدید پریشانی کے تاثرات دکھائی دیے۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے موضوع بدلنے کو چاہا۔

”میرا نام نورین ہے۔“ اس نے کہا۔

ناصر بھی یقین کے عالم میں اندر داخل ہوا۔ ”یہاں تو ان لوگوں کے علاوہ چڑیا کا بچہ تک نہیں ہے، میرے خیال

میں کسی خطہ اطلاع ملی تھی۔“

”نورین نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اکبر کو یہاں آنا تھا۔“ میں نے کہا۔

”نورین! ناصر چونک کر ہوا۔ ”اچھا انی خاتون کا نام نورین ہے؟“ پھر وہ دوسری انداز میں بولی۔ ”میں اس کا نام نورین ہی سمجھتا ہوں۔“

”نورین! آپ کا اصلی نام ہے؟“

”جی ہاں، انی میرا اصل نام ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”نورین! آپ پر ایسی بات فرم میں چاہیے کہ نورین۔“

”میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا جان! آج

...

”اکبر سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“ ناصر نے پوچھا۔

”اکبر میرا دوست ہے۔“ اس نے کہا۔

”ایسا دوست جو رات کو یہاں قیام بھی کرتا ہے؟“

ناصر نے طنز لہجے میں کہا۔

”جی ہاں، ابھی رات زیادہ ہوتی ہے تو وہ یہاں ٹھہر بھی جاتا ہے۔“

اچانک سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے چونک کر ناصر کی طرف دیکھا، پھر نورین کو دیکھا، وہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر

رکھا ہوا سیل فون اٹھا رہی تھی۔ ”نور!“ میں نے ڈپٹ کر کہا۔

”سیل فون مجھے دے دو۔“

”یہ میری..... پر سیل کال ہے آفسیر!“ اس نے رک کر کہا۔

”سیل فون مجھے دو۔“ میں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس نے سیل فون میرے حوالے کر دیا۔

تھنی بیج بیج کر خاموش ہو چکی تھی۔ میں نے مس کال دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اکو کی کال تھی۔ میں سمجھ گیا کہ نورین

نے اکبر سندھو کا نمبر اکو کے نام سے محفوظ کر رکھا ہے۔

”یہ اکبر تمہیں فون کیوں کر رہا ہے؟“

”وہ آنے سے پہلے ہمیشہ فون کرتا ہے۔“ نورین نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کی کال ابھی پھر آئے گی۔ تم اس مرتبہ کال ریسیو کرو گی اور اس سے کہو گی کہ تم ہاتھ روم میں

تھیں۔ اس سے کہو کہ تم بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہو۔“

”ام پیکر فون آن کر دینا۔“ ناصر نے کہا۔ ”اور اگر ایسی ویسی کوئی بات کی تو میں تمہاری یہ خوبصورت گردن اپنے ہاتھوں سے ماچس کی تیلی کی طرح توڑ دوں گا۔ یہ سمجھ لو کہ.....“

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ نورین کے سیل فون کی بیل پھر بجنے لگی تھی۔ اسکرین پر اکو کا نام تھا۔ میں نے ام پیکر

آن کر کے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

ناصر نے اس کی پینٹی پر ریوالت رکھ دیا۔

”ہیلو!“ نورین نے ہتھیل کر کہا۔

”تم کہاں تھیں ریو؟“ دوسری طرف سے ایک بھاری

آواز سنا دی۔ ”میں کب سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔“

”میں ہاتھ روم میں تھی۔“ نورین نے کہا۔ ”اور یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے کہ تم کہاں تھے؟ میں کب سے تمہارا انتظار

کر رہی ہوں۔“

”میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا جان!“ اکبر

...

نے کہا۔ "میں بس ابھی پندرہ تیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟"

ناصر نے ریوالور کی نال اس کی تینٹی پر رکھ کر اس کا سفینی کچ بٹا دیا۔

"مگر بڑی سی جانور؟" نورین نے پوچھا۔

"آج کل ایک کیس کے سلسلے میں دشمن میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پولیس بھی میری تاک میں ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔" نورین نے کہا۔

ناصر نے اشارے سے کہا کہ اب بات ختم کرو۔

"اوکے جانو! ایک کیئر۔" نورین نے یہ کہہ کر سیل فون آف کر دیا۔

اس کا چہرہ پریشانی میں مزید حسین لگ رہا تھا۔ ناصر نے اس کا سیل فون آف کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا اور اس سے کہا۔ "چلو تم لاؤنج میں بیٹھو۔"

وہ خاموشی سے اٹھی اور لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

نورین کے چہرے پر فکر مندی اور پریشانی کے تاثرات تو تھے لیکن وہ اضطرابی کیفیت نہیں تھی جو اس موقع پر ہونا چاہیے تھی۔

خاطر ہے، اکبر وہاں اپنی زندگی کے کچھ لحاظ کو رنگین کرنے آتا تھا۔ اس ضمن میں وہ نورین کو براہ خاصی خطیر رقم دیتا ہوگا۔ نورین کو اکبر سے ملنے والی رقم آئندہ نہ بننے کا افسوس ہو تو ہو، اسے اکبر کی گرفتاری پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں اپنے خیالات میں اتنا غم تھا کہ اس دوران میں اطلاعی ٹیم بھی تو میں بری طرح چوک اٹھا۔

میں اور ناصر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اپنا ریوالور لیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے دوسرے سرے پر ناصر ریوالور پر دست کھڑا تھا۔ میں نے ریوالور کی نال سے نورین کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ نورین ابھی تک ادھورے میک اپ میں تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے نورین کو چومکتے دیکھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "آؤ اندر آ جاؤ۔"

آنے والا اندر آیا تو اس کا رخ نورین کی طرف تھا۔ میں نے اچانک چیخے سے اس کی کمر پر ایک بھرپور بات رسید کی۔ ضرب غیر متوقع تھی اس لیے وہ اونٹھے۔ مگر لیکن فوراً ہی سیدھا ہو گیا۔ میں نے جھک کر اس کی پریشانی پر ریوالور کی نال رکھ دی۔

ناصر نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا اور نووار پر نظر پڑتے ہی بولا۔ "یہ اکبر نہیں ہے۔"

جیری گرے ہاؤس بس سے ففٹھ اور مین کے منظم پر اتر اور حیرت سے اطراف پر نگاہ دوڑانے لگا۔

اتنے میں ایک نو عمر لڑکا اپنے اسکیٹ بورڈ پر تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ "کیا واقعی یہ لوکس دل ہے؟" جیری نے لڑکے سے بلند آواز میں پوچھا جو تیزی سے جوش میں آ کر نکل گیا تھا۔

لڑکے کی عمر چودہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اسکیٹ کرتے ہوئے رک گیا اور اپنے اسکیٹ بورڈ پر ایک ہیرا اس طرح مارا کہ بورڈ ہوا میں اچھل گیا۔ لڑکے نے مشاق انداز میں بورڈ کو ایک ہاتھ سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اپنی نیکی شرٹ کو اوپر اٹھاتے ہوئے، ماتھے پر گرے ہوئے بالوں کو درست کیا اور بولا۔ "دادا جان! یہ سن 2011ء ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ ایلیس پر سٹلے کے دور کے اس کوٹ سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور زمانے کے ساتھ چلیں۔"

جیری نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس دوران میں وہ نو عمر لڑکا ہوا میں اچھلا اور اپنے اسکیٹ بورڈ پر قدم جھاتے ہی دور نکل گیا۔

جیری نے سر کو جھٹک دیتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک پرانا کاغذ نکالا جس کی زرد رنگت اس کی خستہ حالی کی مظہر تھی۔ وہ ضرورت کے تحت نہیں بلکہ عادت سے

مجبور ہو کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

نقشہ بالکل وہی تھا جو اس نے میں برس قبل بنایا تھا۔ یہ نقشہ اسے اچھی طرح ذہن نشین بھی تھا۔ اس نے ایک نگاہ اسٹریٹ سائین بورڈ پر ڈالی اور مسکرا دیا۔ وہ بالکل صحیح مقام پر تھا۔ وہ ففٹھ اسٹریٹ پر چلتے ہوئے کارز تک پہنچا اور پھر مشرق کی سمت سینٹ چارلس اسٹریٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

پھر جب اسے "ڈیز اینڈ" کا سائین بورڈ دکھائی دیا تو اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

پرانا ٹیکس اسٹیشن اب خستہ حال ہو چکا تھا لیکن اب بھی اسی پرانے نام سے اپنی جگہ قائم تھا۔ لیکن سروس اسٹیشن! اب اسے بائج لاکھ ڈالرز کی خوشبو بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی احساس نے کوٹ کی یہ رقم حفاظت سے لوکس دل چرچ آف کرائسٹ کے نیچے دفن ہے، اسے اب تک زندہ رکھے ہوئے تھا۔ کوئی بھی خدا کے گھر کو الٹ پٹ نہیں کر سکتا تھا۔

اس خیال سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا کہ اس کی ناجائز طریقے سے حاصل کردہ رقم کی حفاظت خدا کر رہا ہے۔

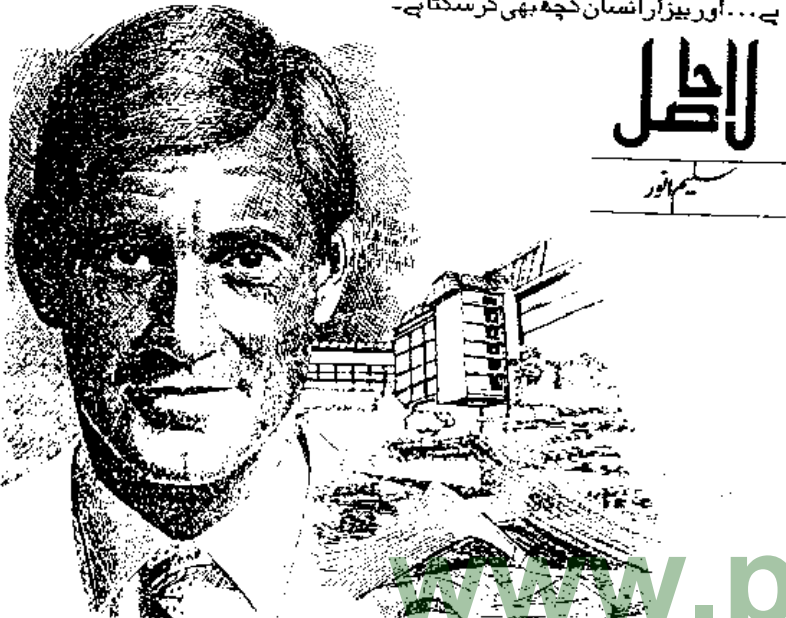
جیری سروس اسٹیشن کے عقب سے ہوتے ہوئے اس حصے میں داخل ہو گیا جہاں درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کا یہ جھنڈ اب اتنا گھنا دکھائی نہیں دے رہا تھا جیسا کہ جیری کو یاد تھا۔

"لیکن اس وقت میرے پاس اتنا نام کہاں تھا کہ دولت کے حصول کی ایک راہ گاہ کو شش... ایک بلا جاؤ مسافرت کا احوال

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت کچھ پاکر بھی انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے... اور جب ساری تگ و دو یہ سود اور تمام جستجو لا حاصل ٹھہرے تو انسان بے زاری کا شکار ہو جاتا ہے... اور بیزار انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔

لاحل

سیما نور



بہترین ویسوی حیرت انسان جاری ہم
سویات و افغانا آئندہ ماہ ماحصلہ غرضائیں

حضرت خزقل علیہ السلام

نبی اکرم

دنیا کی سب سے سرکش قوم بنی اسرائیل پر موز پر بغاوت کی اور قدم قدم پر نچو کر بھی کھائی مگر صد افسوس کہ راہ حق پر چلنا اسے بھر بھی نہ آیا۔ پکے بعد دیگر انبیاء آتے رہے اور بت پرستی کا اندھیرا جھانٹتے رہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی حضرت خزقل علیہ السلام کی ہدایات بھی ہیں... حسب روایت آپؑ کو بھی رد کیے جانے کا دکھ... سفر کی صعوبت... گنہی محبت اور کبھی نفرت سب سے جیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر انبیاء کا یہ شعار ہے کہ وہ کبھی کسی آزمائش سے منہ نہیں موڑتے۔ انہی آزمائشوں سے گزرنا ہی دراصل انبیاء کی تربیت ہے اور ان میں کامیابی پانا ہی نبوت کی معراج ہے اور اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کا امتحان ایسے ہی لیتا ہے۔

حضرت یرمیاہ کے پیغام کو بڑھانے والے ایک اور نبی کا احوال

حضرت ہارون علیہ السلام کے نسب سے تعلق رکھنے والے ایک نبی حضرت خزقل علیہ السلام کا زمانہ نبوت چھٹی صدی قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کے بعد تورات و تاریخ متفق ہیں کہ حضرت یوشع منصب نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے جہان کی جانشینی کا حق حضرت موسیٰ کے دوسرے رفیق اب بن یوحنا نے ادا کیا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمیشہ و مہمہ بنتی عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے۔ طبری کہتے ہیں کہ ان کے بعد سب سے پہلے جس اہل نبی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی قیادت کی خزقل علیہ السلام ہی ہیں۔ قرآن عزیز میں خزقل علیہ السلام کا نام مذکور نہیں لیکن سورہ بقرہ میں بیان کردہ ایک واقعے کے متعلق سلف صالحین سے جو

جبریل میں بنی اسرائیل ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود جبریل نے اسے پہچان لیا۔

وہ سراغ رساں بیڑن تھا

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ جبریل نے حیرت زدہ ہو کر میں سوال کیا۔

”تمہارا تعاقب؟“

”کیا؟“

سراغ رساں بیڑن کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص شیطانی مسکراہٹ نمودار آئی۔ ”مجھے امید ہے کہ تم نے یہی سمجھا کہ وہ تمہیں پانچ سال پہلے تمہارے اچھے روپے کی بنا پر جلدی رہا کر رہے ہیں، ہے نا؟“

جبریل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میری ریٹائرمنٹ میں کچھ نو عرصہ باقی رہ گیا ہے اور میں چاہتا تھا کہ تم اس رقم تک میری رہنمائی کرو جو تم نے اچھے کے بعد کہیں چھپا دی تھی اور ہمیں اس کے بارے میں بتانے کے بجائے تم نے طویل قید کاٹنے کو ترجیح دی تھی لیکن میں بھی اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اطمینان اور مسائل کی زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اسی لیے رہائی کے بعد میں نے تمہارا تعاقب شروع کر دیا۔ پانچ لاکھ ڈالرز کی رقم ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی آرام سے گزارنے کے لیے خاصی معقول ہوتی ہے، مجھے اندازہ تھا کہ رہائی ملنے ہی تم فوراً اس رقم کا خرچ کر دو گے جہاں تم نے اچھے میں لونی ہوئی رقم چھپائی ہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اب وہ رقم تمہاری نہیں، میری ہوگی۔ صرف میری!“

”مجھے وقت سے پہلے رہائی تم نے دلائی ہے؟“

سراغ رساں بیڑن نے اشارات میں سر ہلا دیا۔

”وہ رقم وہاں اس کے نیچے دبی ہوئی تھی؟“ سراغ

رساں بیڑن نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہاں نہیں، اس مقام سے مین مجھے عرف مشرق کی سمت

میں۔“ جبریل نے فکست خوردہ لہجے میں بتایا۔ ”اب کہا ہوگا؟“

بیڑن نے اس کی پیٹھ پر ہتھی دیتے ہوئے اسے دلاسا

دینے کے انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے کہ تم نے پندرہ سال کی قید فصول

میں کاٹی۔ تمہیں اب کچھ حاصل نہیں ہوگا اور مجھے بھی نہیں۔“

جبریل حسرت آمیز نظروں سے اس مقام کو دیکھ رہا

جہاں کبھی لوگ دل چرچ آف کرائسٹ کی عبادت گاہ ہوا

کرتی تھی اور آج وہاں سپردانی مارت کی جدید اور شاندار

عمارت کھڑی تھی۔



میں اس منظر کو ذہن نشین کرتا کیونکہ وہ پولیس والے میرا پیچھا کر رہے تھے۔“ جبریل نے بلند آواز سے کہا۔

وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا اور جب درختوں کا جھنڈ ختم ہو گیا تو اس کے زرد چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب پھر صاف ستھرا علاقہ دکھا ہوں گے سامنے تھا۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے لیے محفوظ کردہ پوشیدہ خزانے سے وہ صرف چند سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بیشتر لوگ زندگی بھر کام کرتے ہیں اور ریٹائر ہونے پر ایک فقیری رقم سوشل سیکیورٹی کی مد میں ان کے ہاتھ آتی ہے لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے ایک ہی ہاتھ مارا تھا اور اب اسے اس کی محنت کا صلہ ملنے والا تھا۔

بے شک یہ نہ بتانے پر کہ اس نے رقم کہاں چھپائی تھی اسے پچیس سال کی سزا میں سے پندرہ سال کی قید کا بھی پڑ گئی تھی۔ لیکن اس کے لیے یہ قید کا عذاب ناگاہ نہیں رہا تھا۔ دولت ہاتھ آنے کی آس نے اسے قید کی صعوبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ دے دیا تھا اور اب چند گھنٹوں کے بعد یہ دولت اس کے ہاتھ میں آ جانی تھی۔

اس تصور سے اس کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی اور اس نے گرتے پڑتے دوڑ لگا دی۔ وہ جھاڑیوں کا آخری جھنڈ عبور کر گیا تو سامنے نگاہ پڑتے ہی اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ دھیرے دھیرے گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ چلا گیا۔ ”یہ کیا؟“ اس کے حلق سے ایک کراہی نکل گئی اور وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا۔

وہ کاغذ جس پر اس نے نقشہ بنایا تھا وہ جوں کے لیے بانٹل کی سی حیثیت رکھتا تھا، اس کی انگلیوں سے پھسل کر ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے دور چلا گیا۔ اس کے اب تک زندہ رہنے کی واحد وجہ یہی نقشہ تھا۔

میں برس قبل کے سراغ رساں کی آواز اس کے کانوں میں شدت سے گونجنے لگی۔ ”میں بتا دو کہ تم کہاں ہے؟“ استغاثہ چھپاری سزا میں نرمی کی سفارش کرے گا اور زیادہ سے زیادہ دو سال قید جھگٹنا پڑے گی۔ تمہیں ذہنی کے عوض اس سے بہتر اور کوئی ذیل نہیں مل سکتی۔“

جبریل نے سراغ رساں کی بات سن کر فرش پر تھوک دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اپنی راہ لے۔

”نفرت انگیز ہے؟“ جبریل کو اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔

جبریل اس آواز پر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور محو مہم۔ گو اس کے بالوں میں اب سپیدی آگئی تھی اور چہرے کی



روایات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق حضرت حزقیل علیہ السلام کے ساتھ ہی ہے۔
 ”(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکل پھر اللہ نے فرمایا کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“ (سورہ بقرہ)
 کتب تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب ان کے بادشاہ امان کے پیغمبر حزقیل علیہ السلام نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں، دور ایک وادی میں مقیم ہو گئے۔

اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی یا قضا قدر کے فیصلے سے روگردانی سمجھ کر اظہار ناراضی کرتے ہوئے ان کے لیے بد دعا کی اور یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار مگر زیر ہر حال اس کے غضب نے ان پر موت طاری کر دی اور وہ سب کے سب موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ان پر حضرت حزقیل علیہ السلام کا کڑا ہوا تو انہوں نے ان کی اس حالت پر افسوس کیا اور دعا مانگی کہ اے اللہ! ان کو موت کے عذاب سے نجات دے تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت بن جائے۔ پیغمبر کی دعا قبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر غوثہ عبرت بنے۔ (تفسیر ابن کثیر)

توریت میں اس واقعے کو یوں بیان کیا گیا ہے۔
 ”خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے (حزقیل) اپنی روح میں اٹھالیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے چڑھتی تھی اتار اور مجھے ان کے آس پاس چوگر دھرا دیا اور کچھ وہ وادی کے میدان میں یہ کثرت اور نہایت سوگھی تھی اور اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد! کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا، اے خداوند خدا تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے فرمایا، تو ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ، اے سوگھی ہڈیو! خداوند کا کلام سنو۔ خداوند خدا ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی اور تم پر نہیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چھڑا پھیناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس اُمس (حضرت حزقیل) نے حکم کے مطابق نبوت کی اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور بلند ہوا اور زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھا ہوں کہ نہیں اور گوشت ان پر چڑھ رہا ہے۔ ان پر چڑھنے کی پوشش ہو گئی مگر ان میں دم نہ تھا۔ تب اس نے مجھے فرمایا کہ نبوت کر۔ تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد اور ہوا سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اے ”دم“ تو چاروں طرف سے آ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہو جائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور ان میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئیں ایک نہایت بڑا لشکر۔“

جب وہ زندہ ہوئے تو انہوں نے یہ الفاظ کہے تھے۔
 ”اے اللہ! تیری ذات پاک ہے اور ہم تیری ہی تعریف کرتے ہیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔“

☆☆☆

حضرت داؤد علیہ السلام نے اسرائیل کو متحد کر دیا تھا لیکن ان کے فرزند حضرت سلیمان کی وفات کے بعد سلطنت و حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان دو حصوں کو عام طور سے ”شمالی سلطنت“ اور ”جنوبی سلطنت“ کہا جاتا ہے۔ جنوبی سلطنت چھوٹی تھی۔ اس پر حضرت داؤد کے چالیسین 586 ق م تک حکومت کرتے رہے۔ اس کا دار السلطنت ”یروشلم“ تھا۔ یہ یہود اور عیسائیوں کے قبیلوں پر مشتمل تھی۔ بائبل نے ان سلطنتوں کو عام طور سے ”یہودہ“ اور ”اسرائیل“ کے نام سے پکارا ہے۔ اسرائیل شمالی سلطنت اور یہودہ جنوبی سلطنت۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اس جنوبی سلطنت کے دار السلطنت یروشلم میں پیدا ہوئے۔
 حضرت داؤد کی نسل سے کیے بعد دیگرے بادشاہ برسر اقتدار آتے رہے اور یہودہ کی اس چھوٹی سی مملکت پر حکمرانی کرتے رہے۔ بادشاہوں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے تخت نشین ہوتے رہے۔
 یہ چھوٹی سی ریاست ابتدا میں بت پرستی کا شکار ہو گئی اور مذہبی جوش و خروش ماند پڑتا گیا۔ اے ایسے بادشاہ میر آتے جنہوں نے بت پرستی کی سرپرستی کی اور گمراہی کی انتہا مگر ابلیس میں اتر گئے لیکن بعض ایسے حکمران بھی آئے جنہوں نے اس سلاطین پر بند باندھنے کی کوشش کی۔ انہی میں ایک یوساہ بھی تھا۔ اس کے باپ امون کی وفات کے بعد اسے تخت نشین کیا گیا تو اس کی عمر

صرف آٹھ سال تھی۔

مملکت میں ہر طرف بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ نو عمر بادشاہ کے لیے مذہبی لحاظ سے ترقی و اصلاح کرنے کے امکانات نہ بننے کے برابر تھے۔ عمر ایسی تھی کہ امور مملکت دوسرے لوگ چلا رہے تھے جو بت پرستی اور دوسری اخلاقی برائیوں میں مگھے تھے۔ اے یوساہ! اس کا باپ امون مانا ہوا شریر بادشاہ تھا۔ اس کے دور حکومت نے کافی موقع فراہم کر دیا کہ ملک کے لوگ بت پرستی کی راہوں پر گمراہ رہیں۔ ایسی بدترین برکتی کے بدلے میں یہودہ سوائے غضب الہی اور کس بات کی امید کر لیتے تھے جیسا کہ اس وقت کے نبی خرد دار کرتے رہے تھے۔

یہ تباہی اور پہلے آ جاتی لیکن یوساہ سولہ سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے اپنے وقت کی گناہ آلودہ حالت کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا۔ وقت کی رو میں بنے اور بت پرستی کی طرف مائل ہونے کے بجائے وہ غلو صیغیت سے خدا کا طالب ہوا اور اس نے مذہبی اصلاحات کا آغاز کر دیا۔ اس نے شاہی اختیار کو بڑی دلیری کے ساتھ استعمال کیا اور نہ صرف یہودہ بلکہ شامی قبائل سے بھی بے دینی اور بت پرستی کی رسومات کو ختم کر دیا۔ بعل کے مذبح خانے توڑ ڈالے اور بت پرستی کے لیے مخصوص ظروف کو دور کر دیا۔ مذہبی کتبوں کے حجرے ڈھا دیے، گھوڑے جو سورج دیوتا کے لیے مخصوص تھے ان کو پھاٹک سے ہٹا دیا اور انہوں کو آگ سے جلا دیا۔ بچوں کی قربانی کی ہولناکی رسم کو یک دم ختم کر دیا۔ اس نے ان کا ہنوں کو بھی نکال دیا جو بت پرستی کے لیے مخصوص تھے۔ ان کی برطرفی سے سورج، چاند اور ستاروں کے لیے بخور جلانا بند ہو گیا۔

پچھلے بادشاہوں نے یروشلم میں بیکل کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ یوساہ نے اس کی مرمت کی طرف توجہ دی۔ بیکل کی تعمیر کے دوران میں اسے توریت کی کتاب ملی جو کسی وقت دفن کر دی گئی تھی اور اب تو لوگ یہ بھی بھول گئے تھے کہ اس کتاب میں کن باتوں پر عمل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

بادشاہ کی قیادت میں یہودہ کے بزرگ، کاہن، لادی اور یروشلم کے عام لوگ ایک جگہ جمع ہوئے تو دریافت شدہ توریت کی کتاب سب کو پڑھ کر سنائی گئی۔

”میں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس شریعت کی پوری پوری پابندی کروں گا۔“ بادشاہ نے بلند آواز میں اپنی قوم کو مخاطب کیا۔

وہاں موجود لوگوں نے اس کی آواز کا ساتھ دیا۔ پورا یروشلم گونج اٹھا۔ ”ہم اس شریعت کی جو سوئی ہمارے لیے لائے تھے پوری پوری پابندی کریں گے۔“

مذہبی جوش اپنے عروج پر تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہودہ کسی مذہبی انقلاب سے دو چار ہونے والے ہیں۔ ان کا یہ مذہبی اتحاد انیس سیاسی میدان میں بھی آگے کی طرف لے جائے گا۔ ارد گرد کی قومیں ان کی مطیع ہو جائیں گی اور خداوند خدا ان کی مدد کرے گا کیونکہ وہ اس کے فرمانبردار بندے بننے والے ہیں۔

توریت میں حکم دیا گیا تھا۔

”پہلے مینے کی چودھویں تاریخ کو شام کے وقت خداوند کی ”فج“ ہوا کرے (فج کے معنی ہیں چھوڑنا۔ چونکہ بنی اسرائیل نے سال کے پہلے مینے میں مصر چھوڑا تھا لہذا یہ دن قومی تہوار کی طرح منایا جانے لگا تھا۔ توریت غائب ہوئی تو لوگ اس رسم کو بھی بھول گئے) اور اسی مینے کی پندرھویں تاریخ کو عید فطیر ہو۔ اس میں تم سات دن تک بے خمیری روٹی کھانا پہلے دن تمہارا مقدس مجمع ہو۔ اس میں تم کوئی خادمانہ کام نہ کرنا اور ساتوں دن تم خداوند کے حضور آتشیں قربانی گزارنا اور ساتویں دن پھر مقدس مجمع ہو۔ اس روز تم کوئی خادمانہ کام نہ کرنا۔“

عید منانے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ کاہن مقرر کیے گئے اور بیکل میں عبادت کو دوبارہ شروع کیا گیا۔ شمول نبی نے بعد یہ عید پھر بھی نہیں منائی کی تھی۔

☆☆☆

یروشلم کی مشرقی دیوار پر یوزی کاہن کا مکان تھا۔ کہانت کا منصب اس خاندان کو ورثے میں ملا تھا اور نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ یوزی کاہن نہایت پاکیزہ اور بت پرستی سے کوسوں دور تھا۔ اس کی زندگی میں بس ایک دیکھ تھا۔ اس کی بیوی بوڑھی ہو چکی تھی۔ اس کی ایک اولاد سے مخروم تھی بلکہ اب تو کوئی امید ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

یوشم میں عید کی تیاریاں شروع ہوئیں تو شہر کی ساری خوشیاں اس کے گھر میں مست آئیں۔ اس کی بیوی نے اسے

بتایا کہ وہ امید سے ہے۔ اس نے یہ خبر بڑے تعجب سے سنی کیونکہ اس کی بیوی اب اولاد پیدا کرنے کی عمر سے دور نکل آئی لیکن خدا پرست تھا، دوسرے ہی لمحے اسے یقین آگیا کہ خدا کی قدرت سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
 ”یہ بادشاہ کی نیک چلتی ہے کہ خدا کی رحمت نے ہمارا گھر بھی دکھ لیا۔“ کاہن نے اپنی بیوی سے کہا۔
 ”اس میں کیا شک ہے۔ گمراہی کے اندھیرے دور ہوں تو رحمت کی روشنی کو جگمگاتے جاتی ہے۔“
 ”تمہارے اس بڑے چاہے میں اللہ نے اپنا معجزہ دکھایا ہے تو آنے والا کچھ بھی غیر معمولی ہوگا۔ میرا وجدان تو یہ کہتا ہے اللہ اس بچے سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اسی لیے اس نے معجزہ دکھایا ہے۔“
 ”آپ کا قیافہ غلط نہیں ہے۔ جب سے یہ بچہ میرے پیٹ میں آیا ہے میں اپنے ارد گرد روشنی کا ایک ہالہ سانسکتی ہوں کبھی کبھی ایک پسندیدہ خوشبو مجھے اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور میں ڈر جاتی ہوں۔“
 ”بچہ واقعی بابرکت ہوگا۔“

”آپ تو مجھ سے زیادہ عبادت کرتے ہیں۔ دعا کیا کریں کہ اس بچے کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہماری عزت و توقیر میں اضافہ کرے۔“
 ”میری تو یہی دعا ہے۔ خدا اسے اچھا زمانہ دے۔“
 ”اللہ ہمارے بادشاہ کو زندگی دے۔ اس نے سب کو دین کا پابند بنا دیا ہے۔ ہمارا بچہ جب اس فضا میں آنکھ کھولے۔“
 ”یقیناً نیک سینہ گا۔“

”میں اس کے ہوش سنبھالنے ہی اسے توریث کے اسباق پڑھانا شروع کر دوں گا۔“
 ”میں اسے نماز میں اپنے ساتھ کھڑا کیا کروں گی۔“
 ”میں اسے بڑے لڑکوں کی صحبت سے بچاؤں گا۔“
 ”اب تو ہیکل میں عبادت کا آغاز ہو گیا ہے۔ اپنے ساتھ ہیکل لے جایا کیجیے گا۔“
 ”گھر سے ہیکل تک کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ وہ خود بھی دن میں دس چکر کیا کرے گا۔“
 ”میں اپنے بچے کو بہت بڑا کاہن بناؤں گی۔“
 ”اسے کیا جتنا ہے تو خدا ہی جانتا ہے۔ وہی اسے جو بنانا چاہے گا بنا دے گا۔“
 میاں بیوی میں رات گئے تک یہ باتیں ہوتی رہی تھیں اور پھر یہ باتیں روزانہ کا معمول بن گئیں۔ بے چینی سے اس دن انتظار ہو رہا تھا جب ان باتوں پر عمل کرنے کا موقع ملے۔
 بوزی کاہن اس روز سخت مضطرب تھا۔ بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا تھا۔ محلے کی عورتیں اس کی بیوی کی مدد کرنے کے لیے آگئی تھیں۔ وہ باہر کھڑی رہا تھا کہ جیسے ہی بچے کے رونے کی آواز کانوں میں آئے وہ دوڑ کر اندر چائے اور اپنی امیدوں روشن چہرہ دیکھے۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک عورت نے دروازے سے سر نکالا اور اسے بیٹے کی خوش خبری سنائی۔
 ”مبارک ہو، ہارون کی نسل میں ایک مرد کا اضافہ ہوا ہے۔“
 ”تم مجھے اجازت دو گی تو میں اندر آؤں گا۔“

”ہم جب تمہارے گھر سے نکلیں تو تم اندر چلے جانا۔ بچے کو غسل دے دیں تو پھر ہر کام شکر۔“
 کاہن کو اطمینان تو ہو گیا تھا کہ بچہ خیریت سے ہے لیکن بے تاب بن بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو جلد سے جلد دیکھ لینا چاہتا تھا۔ مختلف بچے اس کے تصور میں جگہ بنا رہے تھے۔ کبھی سوچتا تھا وہ ایسا ہوگا، کبھی سوچتا نہیں ایسا ہوگا۔ پھر سوچتا تھا، وہ ان میں کہاں۔ وہ تو سب سے مختلف ہوگا۔ پر وہ تو کیا ارد گرد کے علاقوں میں بھی کوئی اس کی طرح نہیں ہوگا۔ وہ انہی خیالوں میں غلطان دروازے کے قریب بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے گھر سے عورتوں کو نکلنے ہوئے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے اب میں اندر جا سکتا ہوں۔ وہ اندر گیا اور اپنی بیوی کے پہلو میں بیٹے ہوئے بچے کو دیکھا۔ اس کا خیال درست تھا۔ وہ اس کے تصور میں آ رہا تھا۔ تمام بچوں سے مختلف تھا۔ اس کی چوڑی پیشانی سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کر سکتا تھا کہ پورا کرا خوشبو سے بھرا ہوا ہے۔ اس نے نومولو کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔ بوزی، کاہن تھے۔ عالم کامل تھے۔ ان کا عرفان انہیں بتا رہا تھا کہ ان کی دلوں میں جو بچہ ہے وہ معمولی بچہ نہیں۔

”معلوم نہیں اس وقت تک میری زندگی وفا کرے نہ کرے جب تک یہ اپنے مقام و مرتبہ تک پہنچے۔“
 ”ہم دونوں ہی اسے جوان ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔“ ان کی بیوی نے کہا۔

نام رکھنے کا وقت آیا تو آپ کے والد نے آپ کا نام حزقی ایل (حزقیل) رکھا۔ عبرانی زبان میں ”ایل“ اسم جلالہ ہے اور حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے ہیں۔ عربی زبان میں اس مرکب نام کا ترجمہ قدرت اللہ کیا جاسکتا ہے۔
 بڑے چاہے میں بیٹا نصیب ہوا تھا اور بیٹا بھی ایسا کہ جو دیکھے پیار کرے۔ ابھی وہ بولے اور کچھ بھنے کے لائق بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ اسے اپنے پاس لے کر اسے بنی اسرائیل کی تاریخ سناتا۔ اس کی بیوی اس کی اس حرکت پر ہنسا کرتی تھی۔
 ”آپ تو اسے ایسے سبق پڑھا رہے ہیں جیسے یہ کچھ بھی رہا ہے اور یاد بھی کر رہا ہے۔“
 ”تم نہیں سمجھو گی۔ میں نے تم سے کہا تھا یہ عام بچہ نہیں ہے۔ میں جب اس سے باتیں کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے یہ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور یاد کر رہا ہے۔ یوں بھی بچہ جو کچھ سنتا ہے اسے یاد رکھتا ہے۔ بڑے ہو کر یہی باتیں اس کے ذہن میں گردش کریں گی۔ ابھی تو اپنی تاریخ اسے یاد کر رہا ہوں۔ ذرا ہوش آجائے تو مذہبی رسمیں بھی سکھاؤں گا۔ اسے اتنا علم سکھا دوں گا کہ دنیا کے کسی دیکھو! انھما کاہن جا رہا ہے۔“

باب نے کیا کیا سوچ رکھا تھا لیکن قدرت کی مٹھا کچھ اور تھی۔ حضرت حزقیل علیہ السلام ابھی چلنا اور بولنا سیکھے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ کی طرف سے کاہنوں کے لیے وظیفہ مقرر تھا اس لیے پالی پیشانی تو نہیں ہوئی البتہ والدہ کو یہ فکر ضرور تھی جو بیٹی کی اس تعلیم و تربیت کا انتظام کیا ہوگا؟ کبھی کبھی شوہر کی کمی ہوئی یہ بات یاد آ جاتی تھی کہ یہ کوئی معمولی بچہ نہیں۔
 بس اسی سے تسلی ہو جاتی تھی کہ اللہ خود کوئی بندوبست کرے گا۔

اس کا بندوبست یہ ہوا کہ جب وہ خوب چلنے پھرنے لگا تو ہیکل کے بیرونی صحن اس کے لیے کھیل کا میدان بن گئے۔ عام بچوں کی طرح گلیوں میں پھیلنے کے بجائے وہ ہیکل میں چلے جاتے۔ جب تک جی چاہتا پھیلنے پھرا کر ایک طرف چھڑ کر لوگوں کو عبادت کرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ وہاں جمع ہونے والے کاہن آپس میں جو باتیں کرتے، انہیں سنتے اور ذہن نشین کرتے۔ وہاں ادا ہونے والی رسوم کو دیکھتے اور گھر جا کر ماں کے سامنے دہراتے کہ کون سی رسم کس طرح ادا ہوتی ہے اور اس کا ہماری شریعت میں کیا مقام ہے۔ اگر ہم یہ رسم ادا نہ کریں تو خدا کا رد عمل کیا ہوگا۔ ایک روز انہوں نے ہیکل میں بادشاہ کو دیکھا تو ہیکل کی عظمت ان کی نظروں میں دوبالا ہوئی۔ وہ سوچ رہے تھے، ہیکل بس ایک عمارت نہیں ہے جہاں قیمتی ظروف رکھے ہوئے ہیں بلکہ یہ ایسا پرجہاں مقام ہے جہاں بادشاہ بھی آ کر سر جھکا تا ہے۔

یہاں صرف مذہبی باتیں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ لوگ جمع ہوتے تو ارد گرد کی اقوام کے قسے بھی چھڑ جاتے۔ ہاٹل کی دہرے لیے کیا اہمیت ہے۔ نینو اسے کیا خطرات ہیں۔ کون یروشلیم کا دشمن ہے۔ بادشاہ اپنی مملکت کو وسیع کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے یا اسے کیا کرنا چاہیے۔ کاہنوں کا کیا کام ہے۔ نبوت کو کیا کرنا چاہیے۔ غرض ہر قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آتی تھیں، کچھ نہیں آتی تھیں لیکن پھر بھی یہ مقام ان کے لیے مدرسہ بنا ہوا تھا جہاں آہستہ آہستہ ان کی تربیت ہو رہی تھی۔ جب وہ ذرا بڑے ہوئے تو کاہنوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ہر وقت کی قربت نے ان پر علم کے بہت سے دروازے کھول دیے۔ ہر جگہ اپنی پاکبازی اور واقفیت علم کی وجہ سے نگاہ عزت سے دیکھے جانے لگے۔

بیرونی حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اسرائیلیوں کے دشمن اسوریوں کو شکست ہوئی تھی۔ نینو اتباہ ہو گیا تھا۔ پراسے دشمن مٹ رہے تھے، نئے دوست بن رہے تھے۔

نینو کی تباہی کی خبریں یروشلیم میں گردش کرنے لگیں تو یوسیاہ نے بین الاقوامی امور کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ فوجی لحاظ سے وہ تیار تھا مگر اس سے ایک مہلک غلطی سرزد ہوئی جس نے اس کا چراغ عروج بجھ کر دیا۔

اسوری، وختارن میں جلاوطن حکومت کے خلاف لڑائی میں پپ ہو رہے تھے۔ شاہ مصر کو، اسوریوں کی کمک کے لیے اپنی فوجوں کو لے کر آگے بڑھا۔ یوسیاہ نے موقع غنیمت جانا۔ وہ اپنی فوجیں لے کر تیزی سے مسجد کی طرف بڑھا تا کہ مصریوں کو اٹھائے۔ اسوریوں کو شکست کھانے دے۔ یوسیاہ کو مہلک زخم لگے اور فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے ملازم کسی نہ کسی طرح اسے رتھ میں ڈال کر یروشلیم لے آئے لیکن وہ مر چکا تھا۔

”حضرت حزقیل علیہ السلام کیا، کوئی بھی اس وقت سے نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یوسیاہ کی اس مداخلت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے لیکن بعد ازاں معلوم ہو گیا۔ یوسیاہ کے بیٹے یواخز کو یروشلیم میں بادشاہ بنا دیا گیا تھا لیکن اسے صرف تین مہینے کی بادشاہت نصیب ہوئی۔ یوسیاہ کی مسجد میں شکست کے بعد مصری شاہ میں کریمین کی طرف بڑھے۔ ہاٹل کی مغرب کی طرف پیش قدمی عارضی طور پر اس کی فوجوں کو روک دیا۔ یواخز کو تخت سے اتار کر جلاوطن کر دیا اور پھر اسے مصر پہنچا دیا۔ اس کے ملک پر سو

قتل چاندی اور ایک قتل سونا خراج مقرر کیا۔ یوسیاہ کے دوسرے بیٹے یوہنیم کو باؤسہ و سرخیا میں لے کر ان کو بٹا کر لے گیا۔ یوہنیم نے ان تمام برائیوں کو دوبارہ رواج دے دیا جو یوسیاہ کے دور میں ختم ہوئی تھیں۔ بتوں کی پرستش حکم مقرر ہو گئی۔ اس دور میں یرمیاہ علیہ السلام موجود تھے جو سامنے آئے اور لوگوں کو تنبیہ کرنے لگے۔

یہ اپنے ہوش میں پہلا موقع تھا جب حضرت حزقیل علیہ السلام نے یرمیاہ نبی کا نام سنا اور ان کے پیغام سے آگاہ ہو کر وہ حسب معمول ہیکل میں تھے کہ انہوں نے یرمیاہ نبی کو دیکھا اور سنا۔

”خداوند فرماتا ہے جو قوم اور جو سلطنت اس کی یعنی شاہ باہل کی خدمت نہ کرے گی اور اپنی گردن اس کے جوئے جھکائے گی اس قوم کو میں تلوار اور کال اور باسے سزا دوں گا یہاں تک کہ میں اپنے ہاتھ سے ان کو نابود کر دوں گا۔“

”یروشلم کے لوگ باہل کی اسیری میں جائیں گے اور یروشلم کھنڈر بن جائے گا۔“

حضرت حزقیل علیہ السلام کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ نبی یروشلم کی تباہی کی پیش گوئی کیوں کر رہا ہے لیکن جلد ہی اس وقت سمجھ میں آگئی جب ہیکل میں دیوتاؤں کے بخور جلانے جانے لگے اور بتوں کی پرستش عام ہونے لگی۔ ملک میں بن گئے تھے ایک وہ جو حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے ساتھ تھا اور دوسرا ان کی مخالفت پر کمر بستہ۔ دوسرے گروہ کو چونکہ سرپرستی حاصل تھی اس لیے عام غریب لوگ جو ان کے ہم نوا تھے اس وقت کی آمد سے ٹرتے رہتے تھے جو حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی کے مطابق بہت جلد آنے والا تھا۔

یوہنیم کی حکومت کا چوتھا سال تھا کہ کرمیس کے مقام پر ایک فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں باہل کی فوجوں نے مصر شکست فاش دے دی۔ یروشلم چونکہ مصر کا باج گزار تھا اور باہل کے خلاف تھا لہذا مصر کی شکست کے بعد یہ نزلہ اس پر شاہ باہل بنوکنز جو تارخ میں بخت نصر بھی کہلاتا ہے، جنوبی فلسطین میں اتنی دور تک گھس آیا کہ یروشلم کے خزانے لوٹ ہزاروں کو پرغال بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے یہ منظر بھی دیکھا ہوگا اور شکر بھیجا ہوگا کہ وہ اس سے بچ گئے لیکن حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی پوری ہوتی ہوئی بھی دیکھی ہوگی اور یہ یقین بھی آگیا ہوگا کہ یہ سب بد اعمالیوں کی وجہ سے ہوا ہے۔

یوہنیم کے خزانے چھین گئے، اس کے لوگ پرغال بنائے گئے لیکن اس کا تخت خراج ادا کرنے کی شرط پر باقی رہا۔ سال تک شاہ باہل کا خادم بنارہا اور خراج ادا کرتا رہا لیکن پھر خرف ہو گیا۔ اس کی اس گستاخی پر بخت نصر نے کئی سال تک فوجوں کو یروشلم کی طرف نہیں بھیجا مگر وہ لوٹ مار کرنے والے کسدی جتوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا کہ یہوداہ پر حملے رہیں۔ اسی جنگ بازی کے دوران میں یوہنیم فوت ہو گیا۔

یوہنیم کے بعد اس کا بیٹا یوہا کین تخت پر بیٹھا لیکن اسے صرف تین مہینے بادشاہت کرنا نصیب ہوا، 597 ق م میں کی فوجوں نے شہر کو گھیر لیا۔ اس نے دیکھا کہ مقابلہ کرنا فضول ہے اس لیے اس نے شاہ باہل کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس مرتبہ شاہ باہل بخت نصر نے زبانی وعدوں اور خراج کی ادائی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے ہیکل کا سونا چاندی اور خزانے لوٹ لیے۔ یوہا کین اور اس کی مادر ملکہ کو گرفتار کر لیا۔

بخت نصر نے ہیکل کے محن میں دربار آراستہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ شہر میں جتنے کارگر، دستکار اور نو جوان تندرست اور افراد ہیں، سب ہیکل میں حاضر ہوں۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اس وقت پچیس سالہ نو جوان تھے اور ابھی نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ سیاست کے بنگاموں سے دور اپنے گھر میں بند بیٹھے تھے کہ منادی کرنے والے کی آواز سنی۔

”بخت نصر، شاہ باہل نے فرمان جاری کیا ہے کہ جتنے نو جوان اس شہر میں بستے ہیں اور جتنے دستکار ہیں، ہیکل کے محن میں جمع ہوں۔ اس کے بعد گھروں کی تلاشی لی جائے گی۔ خبردار، کوئی گھر میں چھپے رہنے کی غلطی نہ کرے۔“

حضرت حزقیل علیہ السلام کو ایک مرتبہ پھر حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی یاد آگئی۔ تو کیا وقت آگیا جب ہم سب امیر بنالیے جائیں گے؟ یہ سب بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے۔

انہوں نے روشن دان سے جھانک کر باہر نگاہی میں دیکھا۔ باہل کے فوجی ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ منادی کے دہانے آگے نکل گیا تھا لیکن اس کی آواز کی گونج ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ گروہوں کے دروازے دھڑکھٹکے لگے تھے۔ کچھ نو جوان باہر نکلے۔ ان کے پیچھے ان کے بوزھے، باپ کی آہیں اور سسٹیاں صاف سنائی دے

تھیں۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ بخت نصر ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ قتل کرتا ہے یا چھوڑ دیتا ہے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے شکر ادا کیا کہ ان کے والدین زندہ نہیں ہیں ورنہ مجھے رخصت کرتے ہوئے وہ بھی اسی طرح آہ و بکا کر رہے ہوتے۔ اگر میں گھر میں چھپا بیٹھا رہتا تو کچھ دیر بعد یحییٰ فوجی جو گلیوں میں گھوم رہے ہیں، گھر میں گھس آئیں گے اور مجھے جرم سمجھا جائے گا۔ اسی میں عافیت ہے کہ میں بھی دوسروں کی طرح بخت نصر کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے ہیکل پہنچ جاؤں۔ آپ گھر سے نکلے اور ہیکل کے راستے پر ہو لیے۔ آپ کا پڑوسی بھی آپ کے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔

”حزقیل! تم تو بہت سمجھ دار ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو، بخت نصر نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟“

”کیا تمہیں اور ہمیں یاد نہیں کہ یوہنیم کے دور حکومت میں بھی اسی قسم کی منادی ہوئی تھی اور کچھ لوگ اسیر بنا کر باہل لے جائے گئے تھے۔ شاید ہماری اسیری بھی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں تنبیہ کر کے چھوڑ دے۔“

”کیوں، ہم نے کیا کیا ہے جو وہ ہمیں تنبیہ کرے گا۔ جو بادشاہ اچھے منتظم نہیں ہوتے ان کی رعایا کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے کہ وہ ظلام بنا لیے جاتے ہیں۔ میرے دوست! ہم بہت جلد اپنے وطن سے بچ کر جائیں گے۔“

”یہ تو بہت برا ہوگا۔ سنا ہے ہمارا بادشاہ پہلے ہی گرفتار ہو گیا ہے۔“

”اپنی فکر کرو میرے دوست۔“

وہ ہیکل کے دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے اس لیے سلسلہ نکلام منقطع کرنا پڑا۔ اندر کا محن لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے پورا شہر یہاں جمع ہو گیا ہے۔ باہل کے فوجی ہاتھوں میں مندر لے کر گرائی پر مامور تھے کہ کوئی بھاگنے نہ پائے۔ دھوپ سروں سے گزرنے لگی تھی یہاں تک کہ بخت نصر مطمئن ہو گیا کہ مطلوبہ لوگ جمع ہو چکے ہیں۔ اس نے یوہا کین کے بیٹے صدقیاہ کو یروشلم میں بچے بچھے لوگوں کا حاکم مقرر کیا اور دس ہزار کے قریب انسانی ریز کو بھیج کر یوں کی طرح ہٹکا تا ہوا باہل کی طرف چل دیا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کا بچپن ہیکل کے محن میں کھپتے ہوئے گزرا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ سے انہیں محبت تھی اور آج وہاں یہ ہوا کہ یروشلم بھی چھوٹا اور وہ ہیکل بھی چھوٹ گئی۔ اگرچہ ہیکل تباہ نہ کی گئی مگر تنگ دل حملہ آوروں نے اس کے بہت سے مقدس ظروف کو تپا کر پا کر لیا اور انہیں بائبل نمیت کے طور پر لے گئے تاکہ اپنے بت خانوں میں استعمال کریں۔

دس ہزار اسیروں کا یہ قافلہ چپ چاپ سر جھکائے باہل کی طرف رواں دواں تھا۔ رات آئی اور اس قافلے نے پڑاؤ کیا تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے قبرستان میں دور تک سفینیں روشن ہیں۔ اس خاموشی میں بھی کئی فوجیوں کی لٹکار سنائی دیتی تھی تاکہ اسیروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے نگران جاگ رہے ہیں اور کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ قریب قریب لیٹے ہوئے یہ اسیر اپنے خوف زدہ تھے کہ آئیں میں بھی باتیں نہیں کر رہے تھے یا پھر اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ کئی کو اپنا گھر یاد آ رہا ہوگا کہ کو اپنے والدین۔ اس قید سے سب رہائی ملتی ہے؟ سوچنے کے لیے یہ بھی بڑا موضوع تھا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پکار یاد آ رہی تھی۔

”شمال کی طرف سے اس ملک کے تمام باشندوں پر آفت آئے گی کیونکہ خداوند فرماتا ہے دیکھ! میں شمال کی سلطنتوں کے تمام خاندانوں کو ملاؤں گا اور وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا تخت یروشلم کے پچانکوں کے محل پر اور اس کی سب دیواروں کے گرد گرداؤں یہوداہ کے تمام شہروں کے مقابل قائم کرے گا۔“

پھر انہیں یرمیاہ نبی کا یہ خطبہ یاد آیا۔

”تیرے بت کہاں ہیں جن کو تو نے اپنے لیے بنایا۔ اگر وہ مصیبت کے وقت تجھے بچا سکتے ہیں تو انہیں، کیونکہ اے یہوداہ جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے بت ہیں۔“

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی ہر پیش گوئی پوری ہو رہی ہے لیکن افسوس! کسی نے ان کی بات نہیں مانی۔ لوگ تو ان کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ اسی نافرمانی کا نتیجہ ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ گھر سے گھر ہوئے پڑے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب خدا ہمیں چار سو سال کی غلامی سے نجات دلا کر مصر سے نکال لایا تھا ایک یہ وقت کہ ہم غلام بن کر باہل جا رہے ہیں۔ کیا پھر چار سو سال؟ حضرت حزقیل علیہ السلام نے گھبرا کر آگاہیں بند کر دیں۔ یہ اس بے وفائی کی سزا ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے خدا سے کی ہے۔ توبہ کے سوا ہمارے لیے کوئی راستہ نہیں۔“

”ہاں میں انہی میں سے ہوں۔ اسی لیے تو تمہارا اسیر ہوں۔“ آپ نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

”میں وہ نہیں ہوں جو کسی سے بے وفا کی کروں۔ مجھے میرے خدا نے تمہارے حوالے کیا ہے۔ میں تم سے بے وفا کی کروں گا تو اپنے خدا سے بے وفا کی کروں گا۔“

حضرت حذیفہ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کول ایبیب میں شہر کسبہ کے کناروں پر بسا دیا گیا۔ ہر ایک نے اپنی ضرورت کے مطابق خطہ زمین گھیر لیا۔ زمین زر خیر بھی لہذا کھیتی باڑی بھی شروع کر دی۔

ان اسیروں میں اکثر بحث ہوتی تھی کہ وہ اپنے وطن لوٹ بھی سکیں گے یا نہیں۔ جلاوطنوں کے درمیان جموئے نئی بھی ہو جاتا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بخت نصراپنی طاقت اور سلطنت کی حدود بڑھا رہا ہے اور واپسی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

علیہ السلام کا خط اعلیٰ حبیبِ پنجاب حضرت خزیم علیہ السلام نے اس خط کی نقول کر کے نوگوں میں تقسیم کیں اور پڑھ کر سنایا۔

میں ستر برس گزر چکے تھے تو میں تم کو یاد فرماؤں گا اور تم کو اس مکان میں واپس لانے سے پہلے اپنے ایک قول کو پورا کروں گا۔“

یہاں جو تھوڑے نبی تھے، جب لوگ انہیں ٹھکرانے لگے تو یرمیاہ علیہ السلام کے خلاف ان کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ان میں سے ایک نضاری سمعیہا نے یروشلیم خط بھیجا جس میں الزام لگایا گیا کہ ہماری اسیری کا دسے دار یرمیاہ ہے اور مطالبہ کیا کہ

صغینا کا کہنا ہے کہ یہ خط بڑھ کر یرمیاہ علیہ السلام کو سنایا۔ تب خداوند کا کلام یرمیاہ پر نازل ہوا۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کا لفظ ایک مرتبہ پھر ایروں تک پہنچا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے اس خط کو بہت شہرت دی۔ جھوٹے نبیوں کی غرض سے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہونے لگے۔

آٹھ سو پانچ سو تیس سال پہلے کے ایک مذہبی تنظیم کا ذکر کرتی۔ بت پرستی کے خلاف تقریریں کرنا اور لوگوں کو خدا کی عزت کی طرف راغب کرنا آپ کا مسئلہ بن گیا تھا۔ آپ پر یہ بات پہلے دن ملی تھی۔ وہ دن ہوئی تھی کہ یہودیہ اس لیے سزا کے سزا خانے میں گھرے جس کے

لوگ جدا جدا اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتے تھے لیکن حضرت حزقیل علیہ السلام کی باتیں ان کے ذہنوں پر مرہم رکھ رہی تھیں۔ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ وطن سے دور ہیں لیکن خدا کی نظر میں تو سرخرو ہیں۔

کی رہائی قریب ہے۔ انہوں نے یہ بھی چاہا تھا کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر اس کے تھک کو کمزرتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔ ہو سکتا ہے ہمارا جوش و خروش دیکھ کر وہ ہماری رہائی کے لیے زیادہ شد و مد کے ساتھ کوشش کرے۔

گئی۔ ان کی بائیں غلط ثابت ہوئی تھیں۔ اب ان پر اعتبار کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ لوگوں کا جھکاؤ حضرت حزقیل علیہ السلام کی طرف ہونے لگا۔ ان کا گھر بیکل کے محکم کا منظر پیش کرنے لگا۔ ان اسبیروں میں جو نیک لوگ تھے، آپ کے مکان پر جمع

صدقیہ قلعہ کے چٹائی بادشاہ تھا جو باغی کے شہنشاہ کے اشاروں پر اپنا چٹا تھا۔ اس کی حکومت نہایت کمزور تھی۔ اس کی متزلزل الیساں ملک کو نہایت سے دو جا کر رہی تھیں۔ مذہبی حالت بھی بہت بری تھی۔ عبادت گاہوں میں خدائے واحد کی عبادت کرنے

[illegible]

صدیقہ کے نادان مشیر اسے اسکا تے رہتے تھے کہ بائبل کے خلاف بغاوت کر دے اور مصر کا ساتھ دے۔ جموں نے نبی

جاری تھیں۔ حضرت خزیم علیہ السلام ایک پیرکبریا کی تھے جس کی طرف لوگ آج بھی آتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کا موازیہ دوسری قوموں سے کرتے انہیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری قومیں متحرک تھیں۔ اپنی

اسیروں کو۔۔۔۔۔ ان کے ملک میں رہتے ہوئے پانچ برس ہو گئے۔ ستر برس علیہ السلام ان سر۔۔۔۔۔ کو پانچ برس داخل ہو گئی تھی۔ وہ ابھی نبی مقرر نہیں کیے گئے تھے۔

[illegible]

ہمیں لڑانے کے پرائیڈ دوسرے سے باہم دوسرے کے اندر وہ ہے جو کہ کرتا ہے۔ یہاں سے اس کے لئے کہہ سکتے ہیں۔

سیدہ الحبت 205 اکتوبر 2011

حضرت حزقیل علیہ السلام نے ان جاندار چروں کی طرف غور سے دیکھا تو معلوم ہوا ہر چہرے کے پاس زمین پر ایک پیچھا ہے۔ ان پیچوں کی شکل اور بناوٹ ایسی تھی گویا پیچا، پیچے کے بیچ میں ہے۔ وہ چلتے وقت اپنے چار پہلوؤں پر چلتے تھے اور پیچھے نہیں مڑتے تھے۔ جب وہ جاندار چلتے تھے تو پیچھے بھی ان کے ساتھ چلتے تھے اور جب وہ جاندار زمین پر سے اٹھائے جاتے تھے تو پیچھے بھی اٹھائے جاتے تھے کیونکہ جاندار کی روح پیچوں میں تھی۔ جب وہ چلتے تھے، یہ چلتے تھے اور جب وہ ٹھہرتے تھے، یہ ٹھہرتے تھے اور جب وہ زمین پر سے اٹھائے جاتے تھے تو پیچھے بھی ان کے ساتھ اٹھائے جاتے تھے۔

جانداروں کے سروں کے اوپر کی فضا بلور کے مانند درخشاں تھی اور ان کے سروں کے اوپر پھیلی ہوئی تھی۔ اس فضا کے نیچان کے پر ایک دوسرے کی سیدھ میں تھے۔

جب یہ جاندار چلے تو شور کی آواز بلند ہوئی جیسے لشکر کی آواز ہوتی ہے۔ اس فضا سے اوپر جوان کے سروں کے اوپر بھی، تخت کی صورت تھی اور اس کی صورت نیلم کے پتھر کی سی تھی اور اس تخت نما صورت پر کسی انسان کی سی شبیہ اس کے اوپر نظر آئی۔ یہ ایسے مناظر نہیں تھے جو کوئی انسان آسانی سے برداشت کر سکتا۔ کچھ خوف تھا کچھ ادب۔ حضرت حزقیل علیہ السلام اوندھے منہ زمین پر گر گئے۔ ان کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی پھر یہ آواز بلند ہوئی۔ کوئی تھا جو انہیں مخاطب کر رہا تھا، انہیں پکار رہا تھا۔

”اے آدم زاد! اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کہ میں تجھ سے باتیں کروں۔“

اس آواز کے بلند ہونے ہی حضرت حزقیل علیہ السلام کے پیروں میں جان آگئی اور وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”میں حاضر ہوں ان باتوں کو سنتے کے لیے جن کی آواز میرے کانوں میں آئے گی۔“

آواز پھر بلند ہوئی۔ ”اے آدم زاد! میں تجھے بنی اسرائیل کے پاس یعنی اس باغی قوم کے پاس جس نے مجھ سے بغاوت کی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ اور ان کے باپ دادا آج کے دن تک میرے گناہ گار ہوتے آئے ہیں۔ وہ بے حیا اور سخت دل فرزند ہیں۔ تو ان سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے۔ تیرا کام ان تک میرا پیغام پہنچانا ہے پھر وہ سنیں یا نہ سنیں۔ انہیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں ایک نبی آیا ہے۔“

”میں تو بہت کمزور ہوں، وہ میری کہاں سننے والے۔“

”تو ہر اسان کیوں ہوتا ہے۔ ان کی باتوں سے مت ڈر اور ان کا خوف دل سے نکال دے کیونکہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ تو اب بھی ڈرتا ہے تو جو میں تجھے دیتا ہوں، کھالے۔“

حضرت حزقیل علیہ السلام نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ایک ہاتھ ان کے سامنے تھا جس میں ایک کتاب کا طومار تھا۔ اس میں نو حد اور ماقم اور آہ و نالہ مرقوم تھا۔ وہ کچھ دیر اس کتاب کو غور سے دیکھتے رہے۔

”اس طومار کو نگل اور جا کر اسرائیل کے خاندان سے کلام کر۔“

حضرت حزقیل علیہ السلام نے منہ کھولا اور اس ہاتھ نے وہ طومار کھڑے کھڑے کر کے انہیں کھلا دیا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کا منہ شہد کی منھاس اور خوشبو سے بھر گیا۔

”اب تو بنی اسرائیل کے پاس جا اور میری باتیں ان سے کہہ۔ یہ لوگ تیری ہی زبان سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ سمجھتے اور سننے کو تیار نہیں ہوں گے کیونکہ وہ سننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ سب بنی اسرائیل سخت پیشانی اور سنگ دل ہیں۔ میں نے بھی ان کے چہروں کے مقابل تیرا چہرہ درشت کیا ہے اور تیری پیشانی ان کی پیشانی کے مقابل سخت کر دی ہے۔ اب تو ان سے نہ ڈر۔“

اس کے بعد کسی طاقت نے انہیں اوپر اٹھا لیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک بڑی کرکڑ کی آواز سنی۔ جان داروں کے پروں کے ایک دوسرے سے لگنے کی آواز اور ان کے مقابل پیچوں کی آواز اور ایک بڑے دھڑاکے کی آواز سنا دی۔ کچھ دیر میں انہوں نے اپنے آپ کو گل ایب میں امیروں کے درمیان دیکھا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو سونے جیسے گئے۔ جو کچھ دیکھ لیا تھا اس کے بعد سراسیمہ ہوا ملازمی تھا۔ خوف کی ایک لہری سارے بدن میں تھی۔ ڈرتے داری کا احساس الگ تھا۔ کاہن تھے، انہیں یہ معلوم تھا کہ انہیں کس بات کی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ بچھوؤں اور کانٹوں کے درمیان تھے۔ انہیں ان سب کے ہر کوڑا مل رہا تھا۔

سات دن تک اپنے گھر میں اس طرح بیٹھے رہے جیسے کوئی چھپ کر بیٹھتا ہے۔ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ نبوت پر فائز کرنے کا اشارہ ہو چکا تھا لیکن اب خاموشی تھی۔ انہیں مزید حکم کا انتظار تھا۔ آخر ایک ہفتے بعد خدا کا کلام ان پر نازل ہوا۔

”اے آدم زاد! میں تجھے بنی اسرائیل کا تمجبان مقرر کرتا ہوں۔ میں تو میرا کلام سن اور میری طرف سے انہیں آگاہ کر دے۔ تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔ ہاں اگر تو نے میرے پیغام کو نہیں پہنچایا اور کسی نے عمل نہ کیا تو اس کی باز پرس میں تجھ سے کروں گا۔“

پھر اس آواز نے آپ کو حکم دیا کہ اس مقام سے اٹھ کر کسی کھلم میدان میں پہنچ جائیں۔ آپ نے عمل کیا اور مکان سے نکل کر ایک کھلم میدان میں چلے آئے۔ یہاں انہوں نے خدا کی جلالت کا وہی سحر دیکھا جو نہر کیار کے کنارے دیکھ چکے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر منہ کے بل زمین پر گر پڑے۔

”اے آدم زاد! اٹھ اور اپنے گھر جا۔ اپنی زبان تالو سے چپکا لے۔ کسی سے کچھ نہ کہہ۔ ہاں جب میں تجھ سے ہم کلام ہوں تو اپنی زبان کھولنا۔“

اس کے بعد کچھ باتیں ان کے کان میں کہی گئیں جن پر انہیں عمل کرنا تھا۔ ان باتوں پر عمل کر کے انہیں ایک آزمائش سے گزارنا تھا تاکہ وہ اپنے آپ کو نبوت کا کامل ثابت کر سکیں۔ اس کے بعد آپ کا ہر عمل حکم الہی کے مطابق تھا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے حکم الہی کے مطابق مٹی کا ایک ڈھیر کھڑا کیا پھر وحی الہی کے الفاظ اپنے دل میں دہرائے تاکہ اس کے مطابق عمل کریں۔ وحی میں کہا گیا تھا۔

”اے آدم زاد! تو ایک کھیرالے اور اپنے سامنے رکھ کر اس پر ایک شہر ہاں بروٹلم کی تصویر کھینچ اور اس کا محاصرہ کر اور اس کے مقابل برج بنا اور اس کے سامنے دودھ باندھ اور اس کے گرد خیمے کھڑے کر اور اس کے چاروں طرف چھتھیں لگا۔ پھر تو نوے کا ایک توالے اور اپنے شہر کے درمیان اسے نصب کر کہ وہ نوے کی دیوار ٹھہرے اور تو اپنا منہ اس کے مقابل کر اور وہ محاصرے کی حالت میں ہو اور تو اس کا محاصرہ کرنے والا ہوگا۔ یہ بنی اسرائیل کے لیے نشان ہے۔“

حضرت حزقیل علیہ السلام کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ ان کی زندگی بروٹلم میں گزری تھی۔ وہ اس کے ایک ایک کونچے سے واقف تھے۔ انہوں نے مٹی پر وہی تصویر کشی کر دی جیسا کہ حکم ہوا تھا۔ ان کا یہ عمل قوم کے لیے دلچسپی کا سبب بن گیا۔ انہوں نے پانچ سال سے بروٹلم کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اور اب اس کی تصویر دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ تصویر انہوں نے کیوں بنائی ہے لیکن پھر سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ یہ شہر محاصرے کی حالت میں کیوں ہے۔ کیا بروٹلم پر تباہی آنے والی ہے؟ کیا فوجیں اس کا محاصرہ کر لیں گی؟ اس سے زیادہ تعجب انہیں یہ دیکھ کر ہوا تھا کہ حضرت حزقیل علیہ السلام لوگوں کی طرح خاموش بیٹھے ہیں۔ کوئی بات پوچھی جائے تو ان کے پاس اس کا جواب ہی نہیں۔ چلا وطن اسرائیلی جوق در جوق آ رہے تھے اور انہیں میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

”یہ نقشہ بروٹلم ہی کا ہے لیکن یہ تو حالت جنگ میں ہے۔ ہم اسے اس حالت میں تو چھوڑ کر نہیں آئے تھے۔“

”یہ مستقبل کا بروٹلم بنایا گیا ہے۔“

”انہیں کیا معلوم مستقبل کا بروٹلم کیا ہوگا؟“

”شاید انہیں کہیں سے معلوم ہو گیا ہو۔“

”ہمیں نہیں معلوم ہوا تو انہیں کیسے معلوم ہو گیا؟“

”یہ ہمیں خوفزدہ کر کے اپنی کوئی بات سنانا چاہتے ہیں۔“

”اور یہ بولتے کیوں نہیں؟“

”اس لیے کہ کوئی جواب دینا نہ پڑے۔ بہر حال نقشہ اچھا بنایا ہے۔“

حضرت حزقیل علیہ السلام ان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں خدا کا کہا یاد آرہا تھا۔ ”بنی اسرائیل تیری بات نہیں سنیں گے کیونکہ وہ میری سننا نہیں چاہتے۔“

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس نقشے کو دیکھ کر افسوس کر رہے تھے کہ ان کے پیارے بروٹلم کی یہ حالت ہونے کو بے لیکن

ہے۔ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھی کہ حضرت حزقیل علیہ السلام کو کسے کیسے ہو گئے۔ وہ بنی اسرائیل سے ناراض تھے یا انہیں

دلی بیماری لاحق ہو گئی ہے؟

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ لوگ آتے رہے۔ کچھ لوگوں کو نصیحت ہوئی کچھ نے مذاق اڑایا۔ آپ کسی کی بات کا جواب نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہی حکم تھا۔

”اب تو اپنی بائیں کروٹ پر لیٹ رہا اور بنی اسرائیل کی بدکرداری اس پر رکھ دے۔ جتنے دنوں تک تو لیٹا رہے گا، ان کی بدکرداری برداشت کرے گا۔“

حکم الہی کے مطابق 39 دن تک حزقیل علیہ السلام اپنے بائیں پہلو پر لیٹے رہے۔ یہ اسرائیل یعنی شمالی سلطنت کا نشان تھا۔ پھر چالیس دن تک دائیں پہلو پر لیٹے رہے۔ یہ یثان تھا یہوداہ یعنی جنوبی سلطنت پر آنے والے غضب کا۔ اس عرصے میں حضرت حزقیل علیہ السلام کی رسم مقرر تھی۔ یہ اس قدر تھی جتنی عام محاصرے کے دوران میں معمول کے مطابق ہوتی ہے۔ انھیں ہدایت تھی کہ پکانے کے لیے انسانی نجاست کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتا۔ اس سے اسرائیل کی ناپاکی ظاہر ہوتی ہے۔ اسیروں کے لیے آپ کا یہ عمل بھی تھا جسے ہم نہیں تھا۔ لوگ بکے بعد دیگرے ان کے گھر پہنچتے تھے تاکہ اپنی آنکھوں سے سارا ماجرا دیکھ لیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حضرت حزقیل علیہ السلام ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ نہر کیار کے کنارے ابھرنے والی آواز نہیں سن سکتے تھے جبکہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے یہ آواز سنی تھی اس لیے ان کا ایمان بڑھتا تھا۔

”اے آدم زاد!“ آواز ابھری۔ ”تو ایک تیز کموار لے اور اپنا سر منڈا اور ترازو لے اور بالوں کو تول کر ان کے حصے بنا۔ ان کا ایک حصہ لے کر آگ میں جلا۔ دوسرا حصہ لے کر کموار سے ادھر ادھر نکھیر دے اور تیسرا حصہ ہوا میں اڑا دے اور میں کموار لے کر ان کا پیچھا کروں گا اور ان میں سے تھوڑے بال گن کر لے اور ان کو اپنے دامن میں باندھ پھر ان میں سے کچھ نکال کر آگ میں ڈال اور جلا دے۔ اس میں سے ایک آگ نکلے گی جو اسرائیل کے تمام گھرانوں میں پھیل جائے گی۔ خدا ان پر ہرگز رحم نہ کرے گا سزا کا وقت آ گیا ہے۔ انہوں نے خدا کے تقدس کو کمر وہ اور نفرتی کاموں سے ناپاک کیا ہے۔

اسیروں کی ساری آبادیوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے اپنا سر مونڈ لیا ہے۔ نہ جانے ان پر کیا آفت آنے والی ہے جو انہوں نے اپنا یہ حال کیا ہے؟ ساری آبادیوں کے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ اس طرح حضرت حزقیل علیہ السلام نے علماء سب کو بتا دیا کہ خدا اپنی عدالت میں یر و علم سے کیا کرنے والا ہے۔ آپ نے حکم الہی سے انہیں باخبر کیا۔

”خداوند فرماتا ہے کہ مجھے اپنی حیات کی قسم چونکہ تو نے اپنی تمام مکروہات سے اور اپنے نفرتی کاموں سے میرے تقدس کو ناپاک کیا ہے اس لیے میں بھی تجھے ٹھانڈاں گا۔ میری آنکھیں رعایت نہ کریں گی۔ میں ہرگز رحم نہ کروں گا۔ تیرا ایک حصہ مر جائے گا اور کال سے تیرے اندر ہلاک ہو جائے گا اور دوسرا حصہ تیرے چاروں طرف کموار سے مر جائے گا۔ میں تجھ کو ان قوموں کے درمیان جو تیرے آس پاس ہیں اور ان سب کی نگاہوں میں جو ادھر سے گزر رہے ہیں اور باعش ملامت بناؤں گا اور میں تم کو قتل زدہ کروں گا۔“

یروشلم کے متعلق یہ بھیا تک تصویر کھینچ کر آپ نے اپنے لوگوں کی طرف دیکھا لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ کسی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں، یہ سب یروشلم میں رہنے والوں کے لیے ہو گا ہم تو یر و علم سے باہر ہیں۔ حضرت حزقیل علیہ السلام خود یہ سوچتے تھے کہ وہ یروشلم جاتیں سکتے وہ نہ وہاں جا کر یہوداہ کو خدا کا پیغام سناتے شاید ان پر کچھ اثر ہوتا۔

خدا کا کلام پھر نازل ہوا۔ ”اے آدم زاد! اسرائیل کے پہاڑوں کی طرف منہ کر کے ان کے خلاف نبوت کر اور یوں کہ کہ اے اسرائیل کے پہاڑوں خداوند کا کلام سنو! خداوند خدا پہاڑوں اور نیلیوں کو اور نہروں اور وادیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو میں ہاں میں ہی تم پر تلوار چلاؤں گا اور تمہارے اونچے مقاموں کو غارت کروں گا اور تمہاری قربان گاہیں اجڑ جائیں گی اور تمہاری سورج کی صورتیں توڑ ڈالی جائیں گی اور میں تمہارے متولوں کو تمہارے بتوں کے آگے ڈال دوں گا۔ تمہاری بودوباش کے تمام علاقوں کے شہر ویران ہوں گے اور اونچے مقام اجاز سے جائیں گے تاکہ تمہاری قربان گاہیں خراب اور ویران ہوں اور تمہارے بت توڑے جائیں اور باقی نہ رہیں لیکن میں ایک بقیہ چھوڑ دوں گا یعنی وہ چند لوگ جو قوموں کے درمیان توار سے بچ نکلے گئے جب تم غیر ممانک میں پراگندہ ہو جاؤ گے۔“ (جاری ہے)

خلاصہ

توبہ پیم - عبید شعیب کے نام پر بھی سفر - قصص الانبیاء - قصص القرآن - انبیاء قرآن

کبھی محبت میں انسان خود کو سنوارتا ہے تو کبھی اسی شوق کے پاتھوں تباہ ہو جاتا ہے۔ عشق ایک ایسا احساس ہے جس میں عام سنی شکل صورت بھی بڑی خاص لگتی ہے... نہایت دلکش... لیکن یہاں معاملہ ذرا الٹا ثابت ہو رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ صورت حال بدلتی جا رہی تھی... اور پھر اس کی صورت اس قدر بدل گئی کہ حالات نے ایک دم پلٹا کھپایا۔ نہ صرف یہ بلکہ جانبہ والوں کو بھی بالآخر ایک روز پلٹنا ہی پڑا۔

غیر متوازن حالات میں توازن برقرار رکھنے والوں کا قصہ

شعبان

باوزن

مائیکل جونز کی آنکھ کھلی تو صبح ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے بیڈروم کی کھڑکی سے آتی سورج کی کرنوں کا مطلب تھا کہ سورج خاصا بلند ہو چکا ہے۔ مائیکل کے پیٹ میں چرے دوڑ رہے تھے کیونکہ گزشتہ رات ڈنر کی جگہ اس نے دسکی و تریج دی تھی۔ مائیکل نے بہ مشکل اٹھ کر ایک چوہے پر چھ عدد اٹنے کے نیچے اور دوسرے پر کالی کا پانی رکھا۔ پھر پیڑے اتار کر اس وقت تک شاور کے نیچے کھڑا رہا جب تک اس کے حواس پر چھائے، غمار کے بادل نہ چھٹ گئے۔ وہ کچن میں آیا تو اٹنے سے اٹن چکے تھے اور کالی کا پانی خشک ہو گیا تھا اس نے کالی کا پانی دوبارہ رکھا اور سینڈ وچ تیار کرنے لگا۔

مائیکل جونز ادا کار تھا اور بالی ووڈ کی نصف راجن کے



قریب بڑے بجٹ کی ظلوں میں کام کر چکا تھا۔ نام کی طرح اس کے چہرے کی ساخت بھی ہیرو والی تھی اور اس نے آخری دو بڑی ظلوں میں سائڈ ہیر و کارول ادا کیا تھا۔ اس وقت لگ رہا تھا کہ جلد وہ سیزمی چہرہ کر ہیرو کی پوزیشن پر آ جائے گا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ شاید ایسا بھی نہ ہو سکے گا۔ اس کی واحد وجہ مائیکل کا حد سے بڑھ جانے والا وزن تھا۔ صرف تین مہینے میں اس کا وزن ایک سو ستر پونڈز سے بڑھ کر تین سو پونڈز ہو گیا تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ ہالی وڈ کے ایک نامور ڈائریکٹر، مائیکل شان نے مائیکل کو اپنی آنے والی فلم میں ایک اہم کردار کے لیے چن لیا۔ شان کے بارے میں تمام فلمی نقادوں کی مشترکہ رائے تھی کہ اس کی تمام فلمیں خاص اور ہر فلم کا ہر کردار خاص ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ کسی اداکار کو اپنی فلم میں کسی کردار کے لیے چنا تو وہ یہ نہیں دیکھتا تھا کہ کردار کیا ہے بلکہ وہ تو اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا تھا کہ اسے شان کی فلم میں کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

ظاہر ہے مائیکل بھی خوشی سے اچھل پڑا تھا لیکن جب اسے پتا چلا کہ اس کردار کے لیے اسے کیا کرنا ہے تو اس کا جوش و خروش کچھ دھیمّا پڑ گیا تھا۔ شان نے اسے بتایا کہ ”تمہیں اس کردار کے لیے اپنا وزن کم سے کم تین سو پونڈز کرنا ہوگا۔“

”وزن بڑھانا ہوگا۔“ مائیکل نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”کیا اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ شان نے فحش لہجے میں کہا۔ ”مجھے کردار کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ تمہارے اندر موجود ہیں لیکن تمہارا وزن تین سو پونڈز نہیں ہے۔ ہالی وڈ میں تین سو پونڈز وزن رکھنے والے کئی اداکار ہیں لیکن ان میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں جو اس کردار کے لیے لازمی ہونی چاہئیں۔ میں تین سو پونڈز رکھنے والے اداکاروں میں مطلوبہ صلاحیتیں تو پیدا نہیں کر سکتا ہوں لیکن تم اپنا وزن تین سو پونڈز تک بڑھا سکتے ہو اور اس کے لیے تمہارے پاس تین مہینے کا وقت ہے۔“

”کیا یہ مناسب ہوگا؟“ مائیکل نے ہچکچا کر کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں بھٹی دھولوں میں سائڈ ہیر و آچکا ہوں اور خاصا پند کیا گیا ہوں۔ ابھی میرے پاس ایک فلم میں ہیرو کی آفر بھی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ شان نے کہا۔ ”جو تمہیں ہیرو کی آفر کر رہا ہے وہ اوسط درجے کا فلم سکر ہے اور اس کی فلم بھی اوسط درجے کی ہے۔ جہاں تک میری فلم کا تعلق ہے تو تم

میرے نام پر کام کرنا چاہتے ہو۔“

اسکرپٹ تمہیں دے دوں گا تو تم خود فیصلہ کر لو۔“

شان نے اسے فلم اور اس کے کردار کا اسکرپٹ تھما دیا اور ایک گھنٹے میں مائیکل قائل ہو گیا کہ یہ فلم اور یہ کردار اس کے لیے زیادہ اہم ہے۔ مگر مسئلہ وہی وزن بڑھانے کا تھا اور اس میں سب سے بڑی رکاوٹ لیزا تھی۔ لیزا اس کی بہن تھی۔ دونوں نے حال ہی میں طوفانی قسم کے عشق کے بعد شادی کی تھی۔ مائیکل اور لیزا کے عشق کی شدت بعد میں بھی برقرار رہی اور اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ لیزا کا تعلق کسی طرح بھی ہالی وڈ سے نہیں تھا۔ وہ کیلیفورنیا کی ایک کسان خلی سے تعلق رکھتی تھی جس کی زمین پر امریکا کی بہترین تاریکیاں ابھرتی تھیں۔ مائیکل کی لیزا سے ملاقات، اس کی پہلی بڑی فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ہوئی تھی۔ فلم کی شوٹنگ نہ صرف لیزا کے علاقے میں بلکہ اس کے خلی باغات میں ہوئی تھی۔

فلم میں اگرچہ مائیکل کو دھوا دھوکا لیا جلتا تھا لیکن یہ سب فلمی کولیاں تھیں۔ حقیقت میں اس پر کچھ بڑا کاتیر چل کر اور وہ حسین لیزا کی سنہری زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ وہ دو دن وہاں رہا اور اس کی ہر شام لیزا کے ساتھ گزرتی اگرچہ وہ روایتی مغربی انداز میں نہیں گزرتی تھی کیونکہ عمل مند لیزا اسے خود کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔

لے ہوا کہ جیسے ہی اس کی فلم کی شوٹنگ ختم ہوگی۔ وہ شادی کر لیں گے۔ ایک مہینے بعد مائیکل اور لیزا میاں ہو چکے تھے۔ شادی لیزا کے گاؤں میں ہوئی تھی کیونکہ آدھ گاؤں اس کے رشتے داروں پر مبنی تھا اس لیے چرچ میں آدھ گاؤں موجود تھا۔ اتنا بڑا سسرال دیکھ کر مائیکل پریشان ہوا تھا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا سسرال اس انگلیس سے کوئی جاروسل دور تھا۔ وہ شادی کر کے لیزا کو اس انگلیس لے آیا کیونکہ اسے دوسری فلم میں کام کرنا تھا اس لیے ہفتی مہینوں اس فلم کے بعد تک کے لیے ملوث کر دیا گیا۔ دوسرے مہینے بعد اس فلم کی شوٹنگ مکمل ہوئی تو وہ ہفتی مہینوں منانے بہانہ مائیکل کی طرف روانہ ہو گئے۔ مائیکل کو ان دو فلموں سے اچھا خاصا معاوضہ ملتا تھا اس لیے اس نے ہفتی مہینوں میں دل کھول کر خرچ کیا اور لیزا کی تمام فرمائشیں پوری کیں۔ واپسی پر اس کا ہاتھ ٹگ ہو گیا تھا اور اسے فوری طور پر کسی فلم کی ضرورت تھی جس کا معاوضہ بھی اسے جلد مل جائے۔

شان کی فلم میں اسے کام مل رہا تھا لیکن اس کی شرط بڑی پیچیدہ تھی۔ لیزا کو مہینے آدھوں سے نفرت تھی۔ اس نے اپنے اسکول کے زمانے کے بوائے فرینڈ کو بھی صرف وہی

وجہ سے ستر وکروا دیا تھا۔ اس کا وزن ذرا سا بڑھ گیا تھا اور اس کا خوب صورت جسم بے ذوق ہو گیا تھا۔ خود مائیکل کا بھی ہیرو جیسا جسم تھا اور لیزا اسی وجہ سے اس کی طرف آئی تھی۔ اس نے مائیکل کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اسے اپنا وزن ایک حد میں رکھنا ہوگا اور اگر وہ مونا ہو تو وہ اسے برداشت نہیں کرے گی۔ مائیکل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لیزا اسے کیسے بات کرے؟ وہ اس کردار کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اس کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنا وزن بڑھا کر تین سو پونڈز تک لے آئے۔ شان نے واضح کر دیا تھا کہ یہ لازمی شرط ہے اور اس کے بغیر اسے کام لےنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چھوڑا وزن بڑھانے کی بات ہوتی تو مائیکل کے خیال میں یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تین سو پونڈز کا مطلب تھا وہ مکمل طور پر بے ذوق ہو جائے۔ اسے معلوم تھا لیزا کسی صورت اس چیز کو برداشت نہیں کرے گی۔

آخر ہمت کر کے مائیکل نے لیزا سے بات کی۔ جب لیزا کو پتا چلا کہ شان نے مائیکل کو اپنی فلم کے ایک کردار کے لیے منتخب کیا ہے تو وہ خوش ہو گئی تھی لیکن جب یہ پتا چلا کہ اس کردار کے لیے شان کی شرط کیا ہے تو اس کی خوشی غصے میں بدل گئی۔ ”شان کا دماغ خراب ہے بھلا اس کردار کا وزن سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تعلق تو ہے ڈیر۔“ مائیکل نے شیریں لہجے میں کہا۔ ”میں نے فلم اور اس کردار کا مکمل اسکرپٹ پڑھا ہے اور شان درست کہہ رہا ہے کہ کردار ادا کرنے والے کا وزن تین سو پونڈز ہونا لازمی ہے، یہ ایک بہت موٹے آدمی کا کردار ہے۔“

”تجربہ اس سے کہو کوئی مونا آدمی تلاش کر لے۔ ہانی وڈ میں تین سو پونڈز والے بے شمار اداکار ہوں گے۔“

”وہ تو ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہے جو اس کردار کو ادا کر سکے۔ لیزا تم سوچو شان کسی کو خاص طور سے اپنی فلم کے لیے منتخب کرے گا یہ کتنا بڑا انراز ہے۔“

”ہوگا۔“ لیزا بے پروائی سے بولی۔ ”تم انکار کر دو وہ کسی اور کو اس کردار کے لیے منتخب کر لے۔“

مائیکل کے ہوش اڑ گئے اس کا خیال تھا کہ لیزا اس بات پر کم سے کم خود تو کرے گی۔ لیکن اس نے تو بالکل نکاسا نکاس دے دیا تھا۔ مائیکل نے گڑ گڑا کر کہا۔ ”لیزہ جان! تم بڑا بڑا آدمی، ایسا جاس برائیک کوئیں ملے۔ اگر میں نے اس فلم میں کام کر لیا تو میرا کیریئر ختم ہو جائے گا۔“

”کیریئر ختم ہو جائے گا۔“ لیزا نے ہنریہ لہجے میں کہا۔ ”یا برباد ہو جائے گا۔ میں سو پونڈز وزنی اداکار کو ہر فلم میں کام نہیں مل سکتا مگر میں انتظار کرتا ہوں کہ کب کسی فلم میں تین سو پونڈز وزنی آدمی کا کردار آتا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں یہ عارضی ہوگا جیسے ہی میں شان کی فلم میں کام ختم کروں گا اپنا وزن واپس ایک سو ستر پونڈز پر لے آؤں گا۔“

لیزا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مائیکل میں نے دہلے آدمیوں کو مہینے تو ہوتے دیکھا ہے لیکن بہت کم مہینے آدمیوں کو دوبارہ دہلا ہوتے دیکھا ہے۔ مونا یا ایک بیماری ہے ایک بار یہ آدمی گولگ جائے تو پھر ساری عمر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔“

”میں ہو سکتا ہوں۔“ مائیکل نے دعویٰ کیا۔

لیزا نے غور سے اسے دیکھا۔ ”تو کیا تم شان کی فلم میں کام کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“

”تقریباً ڈیر، بس تمہاری طرف سے اوکے کا خطر ہوں۔ دیکھو میرے پاس جو حج پونجی تھی وہ شادی اور ہفتی مہینوں میں خرچ ہو چکی ہے اور اب میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھے کسی اچھی فلم کی اشد ضرورت ہے جس میں کام کرنے کا معاوضہ بھی اچھا ملے۔ شان کی یہ فلم میری دونوں ضرورتیں پورا کر رہی ہے۔ وہ مجھے بہت اچھا معاوضہ فرما رہا ہے۔“

یہ سن کر لیزا ابھی سوچ میں پڑ گئی۔ اسے معلوم تھا مائیکل بچا کر رکھنے والوں میں سے نہیں ہے بقیہ تاب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ مگر مائیکل مونا ہو جائے، یہ تصور اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ دوسری طرف روزی کا معاملہ بھی تھا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔ ”تین مہینے تمہیں وزن بڑھانے میں لگیں گے اور اس کے بعد تم واپس اپنے وزن پر کب آؤ گے؟“

”میرا خیال ہے تین مہینے کے اندر میں واپس اپنی فٹنس حاصل کر لوں گا۔“ مائیکل نے یقیناً سے کہا۔

اگرچہ لیزا کے خیال میں تین مہینے میں ایک سو تیس پونڈز وزن کم کرنا ممکن نہیں تھا اور مائیکل کو اس میں زیادہ ہی وقت لگتا۔ مگر وہ مائیکل کی اس یقین دہانی پر تیار ہو گئی کہ وہ بہر صورت اپنا وزن کم کر لے گا۔ لیزا کی طرف سے اجازت ملنے ہی مائیکل نے جتنی غیادوں پر اپنا وزن بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیزا نے اس سے کہا کلب کیسٹرز گراؤنڈ کی مدد سے جس اداکار کو جیسے چاہے دکھایا جاسکتا ہے۔ لعل میں اس کا تجربہ بھی کیا گیا تھا جو کامیاب رہا۔ اس میں ایک پونے چھ فٹ کے سیاہ فام اداکار کو صرف ڈھائی

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید دماغ قابل علاج مرض ہے

بین الملکی

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز
ہولڈرز
ایچمل زیدی
کیڈریجیہ اسکول کا منسٹر پرنسپل



اسلام آباد



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

ماہنامہ 82، ستمبر 2011ء
راہنما (صحیہ) پاکستان اسلام آباد
فون: 2654595 - 2255880 (051)
موبائل: 0300-8566188
فیکس: 2281636

9- اپریل 30 تا مئی
9- اگست 30 تا ستمبر
9- دسمبر 30 تا جنوری

لاہور

پشاور

پروفیشنل کلینک

14- فروری تا 27 فروری
14- جون تا 27 جون
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

پروفیشنل کلینک

11 تا فروری
11 تا جون
11 تا اکتوبر

ملتان

کراچی

پروفیشنل کلینک

28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

پروفیشنل کلینک

13 مارچ تا 27 مارچ
13 جولائی تا 27 جولائی
13 نومبر تا 27 نومبر

www.leucodermatologist.com

Email: syedajmalzaidi@hotmail.com syedajmalzaidi@yahoo.com

اس کی نظر کم سے کم پڑے۔ مائیکل اس کی کیفیت سوس کر رہا تھا اس لیے اس کی بھی یہی کوشش ہوئی تھی کہ لیزا کے سامنے کم سے کم رہے۔ ان کے تعلقات میں سرد مہری سی آگئی تھی۔ دو مہینے بعد لیزا نے اس سے کہا: "میں سوچ رہی ہوں بہت دنوں سے ماما اور پاپا کے پاس نہیں گئی ہو، وہاں سے ہوا آتی ہوں۔"

مائیکل لیزا کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی خاطر وہ مان گیا اور لیزا الہنا بڑا سا سوت کپس تیار کر کے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے مائیکل کو دانوس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ مائیکل کا خیال تھا کہ وہ جلد واپس آ جائے گی۔ مگر ایک ہفتے بعد لیزا نے اسے کال کر کے کہا کہ وہ اب اس قسم کی شوٹنگ ختم ہونے کے بعد آئے گی۔ یہ سن کر مائیکل پریشان ہو گیا تھا۔ "ڈیزر ابھی تو شوٹنگ شروع بھی نہیں ہوئی ہے اور تم جانتی ہو، شان اپنی فلم بہت سکون اور آرام سے بناتا ہے۔"

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔" لیزا نے سرد لہجے میں کہا۔ "جب شوٹنگ ختم ہو جائے اور تم اپنا وزن کم کرنا شروع کر دو تو مجھے اطلاع کرو یا میں آ جاؤں گی۔"

گویا لیزا نے اپنی واپسی اس کے کم وزن سے مشروط کر دی تھی۔ اس وقت مائیکل کے سامنے ایک مشن تھا۔ اسے ہر صورت فلم میں اپنا کردار اچھا ادا کرنا تھا کہ اس کے وزن میں اضافے کا ازالہ ہو جائے۔ وہ لیزا سے بچ بچ محبت کرتا تھا اور اس سے مددائی اسے شاق مگر رری تھی لیکن یہ اس کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی۔ اس نے اپنا ذہن شوٹنگ کی طرف کر لیا اور پوری طرح دل لگا کر کام کرنے لگا۔ شان اس کے کام سے خوش تھا۔ ابتدائی چند شائش کے بعد اس نے مائیکل کے کردار میں غیر محسوس انداز میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور اسے نمایاں بھی کر دیا۔ اب وہ فلم کی اسے ٹیکری میں شامل ہو گیا تھا، یعنی فلم میں وہ جہاں نہیں نمودار ہوتا، کیمرا اسے خاص طور سے شوٹ کرتا۔ اس سے بہت فرق پڑا تھا۔ فلم کے بیرونی شان سے اس بات پر اعتراض کیا کہ اسے اب اتنی اہمیت نہیں دی جا رہی ہے۔ شان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اس وقت مائیکل زیادہ اچھا کام کر رہا ہے اگر تم زیادہ اچھا کام کر دو تو تمہیں بھی زیادہ اہمیت مل جائے گی۔ کردار کے لحاظ سے وہ تم سے کم نہیں ہے۔"

شان کا یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنے اداکاروں کو اپنے سے اچھا کام کرنے پر اکساتا تھا۔ ابتدائی شوٹنگ کے بعد وہ آہستہ آہستہ مائیکل نے سوچا کہ وہ جا کر لیزا کو واپس لانے کی ایک نیا طرف، لیزا کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ مائیکل کے موٹاپے کو بہت مشکل سے برداشت کر رہی ہے۔ اس نے مائیکل کو اپنے قریب آنے سے تو پہلے ہی روک دیا تھا۔ اب وہ کوشش کرتی کہ اس سے دور رہے اور مائیکل پر دوسری طرف، لیزا کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ مائیکل کے موٹاپے کو بہت مشکل سے برداشت کر رہی ہے۔ اس نے مائیکل کو اپنے قریب آنے سے تو پہلے ہی روک دیا تھا۔ اب وہ کوشش کرتی کہ اس سے دور رہے اور مائیکل پر

فٹ کا بوتلا دکھایا گیا تھا۔ مائیکل نے لیزا سے کہا۔ "میں نے شان کو یہ تجویز پیش کی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی فلموں میں اس قسم کی مصنوعی ترکیبیں استعمال کرنے کے خلاف ہے۔"

"چاہے اس کے لیے کسی اداکار کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر رکھ دے۔" لیزا نے جمل کر کہا۔

"ڈیزر اسی سے تو فلم میں حقیقی پن آتا ہے اور فلم بین اسی لیے توشان کی فلموں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اس کی سابق فلم کو بے ہونے دو سال ہوئے کو آئے ہیں لیکن ابھی تک سینماؤں میں اس کے ہاؤس، فیل جا رہے ہیں۔"

لیزا ابدل تا خواست مانی تھی اور وہ مائیکل کوئی بارخبردار کر چکی تھی کہ فلم کے فوراً بعد اس نے اپنے وزن میں کمی شروع نہیں کی تو وہ اپنا سامان باندھ کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی جائے گی۔ مائیکل کی صورت لیزا سے دور نہیں رہ سکتا تھا اس لیے اس نے اس وقت صدق دل سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے آخری شوٹ کے فوراً بعد ہنگامی بنیادوں پر وزن کم کرنا شروع کر دے گا جیسا کہ اس وقت وہ ہنگامی بنیادوں پر وزن بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وزن بڑھانے کے لیے مائیکل نے سب سے پہلے وہ تمام ورزشیں ترک کر دیں جو وہ فٹ رہنے کے لیے کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے وہ تمام چیزیں کھانا شروع کر دیں جو انسان کا وزن بہت تیزی سے بڑھاتی ہیں۔ اس نے ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا تھا اور اس نے مائیکل کو کچھ تھوڑی دیر میں جن پر عمل کرنے سے اسے بھوک لگتی۔ مائیکل ایک وزن کرنے والی مشین بھی لے آیا تھا اور روز اس پر وزن کرتا تھا۔

مائیکل کا وزن حیرت انگیز طور پر بڑھنے لگا اور یہ رفتار روزانہ تقریباً ایک پاؤنڈ تھی۔ ایک مہینے میں وہ اپنی جسمانی ساخت کھو چکا تھا۔ اس کا پیٹ نکل آیا تھا اور سینہ پیٹ کے مقابلے میں کم ہو گیا تھا۔ اس کی کلاٹیاں موٹی ہو کر تقریباً بازوؤں کے برابر آگئی تھیں۔ اس کے جسم کے پچھلے چربی میں غائب ہونے لگے تھے۔ دو مہینے میں اس کا وزن بڑھ کر دو سو پانچ پونڈ ہو گیا تھا۔ شان اس کی کارکردگی سے مطمئن تھا اور اسے امید تھی کہ شوٹنگ کے آغاز تک مائیکل اپنا مارگٹ حاصل کر لے گا۔

کوشش کرے۔ وہ روانہ ہوا اور لیزا نے ماں باپ کے گھر پہنچ گیا کیونکہ اس کے سوا بچے والے کردار کی میڈیا یا بیسی نہیں کی گئی تھی اس لیے لوگ بے خبر تھے کہ اس کا وزن کتنا بڑھ گیا ہے۔ لیزا نے بھی اپنے ماں باپ کو نہیں بتایا تھا اس لیے وہ اسے دیکھ کر شاکہ رہ گئے۔ خود لیزا ادب رکھ گئی تھی کیونکہ جب وہ آئی تھی تب بھی مائیکل کا وزن اتنا نہیں بڑھا تھا۔ اب تو وہ ایک چلتا بھرتا ڈرم لگ رہا تھا۔ اس کے کمال ٹک گئے تھے۔ اس کی ساس چلائی۔

”مائیکل، میرے خدا! یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟“

مائیکل کھسکا گیا۔ ”نام میں ایک فلم میں کام کر رہا ہوں اس کے کردار کو اتنا ہی سونا ہونا چاہیے۔“

”لیکن برخورداد تم نے سوچا کہ لیزا کو سوا بچے سے کتنی چڑ ہے یہ تو ہمیں بھی اور ویت ہونے نہیں دیتی تھی تم تو اس کے شوہر ہو؟“

”جی ہاں، مجھے معلوم ہے لیکن یہ میرے کیریئر کا سوال ہے۔ مائیکل شان کی فلم میں ہر ایک کو کام نہیں ملتا ہے اور اب تو مجھے فلم کے اسے گریڈ اداکاروں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے اس فلم کی کامیابی کے بعد میں ہالی وڈ کے صوبہ اول کے اداکاروں میں شامل ہو جاؤں گا۔“

”تو کیا تم ہر مودی میں اتنے ہی سونے نظر آؤ گے؟“

”نہیں یہ تو صرف اس فلم کی حد تک ہے میں جلد اپنا وزن دوبارہ گھٹا لوں گا۔“ مائیکل نے اپنے ساس سر اور ان سے زیادہ لیزا کو یقین دلایا۔ لیزا نے اس کی بات مان لی لیکن اس کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔

”میں کہہ چکی ہوں جب تم وزن کم کرنا شروع کر دو گے تو میں واپس آ جاؤں گی۔“

”اچھا۔“ مائیکل نے سر دھبے میں کہا۔ ”ابھی تو شوٹنگ کا پہلا اسپیل ہوا ہے۔“

”باقی فلم بھی کتنی ہی منت جائے گی۔“ لیزا بولی وہ مائیکل کی طرف دیکھنے سے بھی گر بڑ کر رہی تھی۔ اس کے رویے سے مائیکل کو تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ جب وہ واپس جانے لگا تو لیزا نے اس سے کہا۔ ”پلیز اب دوبارہ اس وزن کے ساتھ یہاں مت آنا، سارا گاؤں جانتا ہے مجھے سونے لوگ اچھے نہیں لگتے اور میں نہیں چاہتی کہ میرا مذاق اڑایا جائے۔“

”ٹھیک ہے ڈیزر۔“ مائیکل نے سر دھبہ بھری اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ شوٹنگ کے پہلے اسپیل کے دوران میں اس کے وزن میں مزید اضافہ ہوا تھا اور یہ تین سو تیس پونڈ ہو گیا

تھا۔ مائیکل اب اپنا کوئی پرانا لباس نہیں پہن سکتا تھا اس نے اپنے وزن کے لحاظ سے کچھ سوٹ لے لیے تھے اور گھر میں زیادہ تر ٹیکر اور گاؤں میں رہتا تھا۔ اب وہ اپنی فراری اسپورٹس کار میں نہیں ساتا تھا۔ اس لیے آنے جانے کے لیے اس نے ایک وین لے لی تھی۔ شوٹنگ کا دوسرا اسپیل بھی بہت اچھا ہوا اور مائیکل نے جم کر کام کیا۔ شان اس سے بہت خوش تھا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔

”مجھے امید ہے پروڈیوسر تمہارے طے شدہ معاوضے سے زیادہ ہی دے گا اور اگر فلم بلاک بسٹرنگلی تو اس کے لیے میں تمہارا احقر بھی ہوگا۔“

مائیکل کو اس اطلاع سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی کیونکہ اب لیزا کے بغیر اسے زندگی بھر گلے لگی تھی۔ وہ اس سے روز ہی فون پر بات کرتی تھی لیکن جب وہ اسے واپس آنے کو کہتا تو لیزا کا موڈ بدل جاتا۔ وہ کسی صورت اس کے مونا بے کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھی۔ مائیکل پر رفتہ ورتاج ہوتا جا رہا تھا کہ اسے لیزا یا سوا بچے میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی اس نے شوٹنگ دوسرے اسپیل کے بعد شعوری طور پر وزن کم کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن جب تیسرا اسپیل شروع ہونے لگا تو شان نے اسے دیکھ کر اعتراض کیا۔

”یہ کیا تمہارے چہرے پر چمک کیوں نہیں ہے؟“

”کیونکہ میں ان دنوں کھانے پینے میں احتیاط کر رہا ہوں اور یوں سمجھ لو کہ ہر صدمہ وقت بھوکا رہتا ہوں۔“

”بالکل نہیں تمہارے چہرے پر چمک اور تازگی ہو چاہیے، تم کھانے پینے میں احتیاط ترک کر دو۔“ شان نے اسے حکم دیا۔

”میری بیوی کو سونا پسند نہیں ہے۔ میں نے صرف تمہاری فلم کی خاطر وزن بڑھایا ہے۔ کیونکہ فلم نصف ہو چکی ہے اس لیے میں اب وزن کم کر رہا ہوں۔“

مگر شان اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اس کا کہنا تھا کہ وزن کم کرنے کی کوشش میں مائیکل نے اپنا چہرہ کسی قدر زود بے جیسا کر لیا تھا۔ اس نے تجربے کے طور پر مائیکل کو ایک شاٹ لے کر دکھایا تو مائیکل حیران رہ گیا، وہ واقعی اس شاٹ میں بالکل مرجھایا ہوا اور اپنے کردار سے بہت کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پرانی شوٹنگ بھی دیکھی تھی۔ ان میں وہ واقعی اپنے کردار میں نیچے کی طرح فٹ نظر آ رہا تھا۔ مجھے اسے ڈانٹک پروگرام ترک کرنا پڑا تھا۔ اس کے چہرے رونق بحال ہو گئی اور وہ پہلے کی طرح خفک نظر آنے لگا۔

اسپیل بھی شاندار گیا اور اس بار طے ہو گیا تھا کہ اسے طے شدہ معاوضے سے کم سے کم دو گنا دیا جائے گا۔ یہی نہیں فلم میں اس کا کردار تقریباً ہیرو جیسا کر دیا گیا تھا۔ شان اپنی فلم کا اسکرپٹ خود لکھتا تھا اس لیے اسے اس کام میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

فلم کا چوتھا اسپیل بھی شاندار گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شوٹنگ مکمل ہو گئی۔ مائیکل بے تابی سے انتظار کر رہا تھا کہ شوٹنگ ختم ہو اور وہ وزن کم کرنے کا آغاز کرتے ہوئے لیزا سے واپس آنے کی درخواست کر سکے۔ شوٹنگ کے دوران میں ہی اس کے بینک اکاؤنٹ میں کئی ملین ڈالرز کی رقم منتقل ہو چکی تھی اور مالی لحاظ سے وہ اس سے زیادہ بھی مضبوط نہیں رہا تھا۔ مگر لیزا اس کے پاس نہیں گئی تھی اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آخری شوٹ کے بعد وہ گھر آیا تو اس نے توبہ کر لیا کہ اب وہی خوراک لے گا جو وہ سولے ہونے سے پہلے لیتا تھا اور ورزش شروع کرے گا۔ اس نے لیزا کو کال کر کے اطلاع دی۔ ”ڈیزر شوٹنگ ختم ہو گئی ہے میں نے آج سے وزن میں کمی کا آغاز کر دیا ہے۔“

”یہ تو اچھی خبر ہے۔“ لیزا بولی۔

”تو تم واپس آ رہی ہو؟“ مائیکل نے پر امید لہجے میں کہا۔

”ہاں میں واپس آ رہی ہوں۔“ لیزا مان گئی تو مائیکل مکمل اٹھا۔

لیزا دوسرے دن گھر آ گئی لیکن اس نے مائیکل کو دیکھ کر کسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے مائیکل کے وزن میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی تھی اور اس نے ایک دن پہلے جو وزن کیا تھا وہ تین سو اٹھارہ پونڈ تھا۔ لیزا کو گھر میں باکر مائیکل خوش ہو گیا تھا اور اس نے اسے بتایا کہ وہ ورزش بھی شروع کر رہا ہے۔ وہ مکمل سے جم جائے گا اور باقاعدہ پروگرام بنا کر وزن کم کرے گا۔ ”تم دیکھنا زیادہ سے زیادہ چار مہینے میں، میں پہلے جیسا ہو جاؤں گا۔“

لیزا کو اس کی بات پر شک تھا کیونکہ اس نے مونے افراتو بہت کم اپنا وزن گھٹاتے دیکھا تھا اور اتنا وزن تو بہت کم لوگ کم کر پاتے تھے۔ بہر حال مائیکل نے اگلے دن سے نرم جانا شروع کر دیا لیکن جب اس نے ورزش شروع کی تو اسے یہ کام بہت مشکل لگا۔ سات مہینے سے اسے ورزش کرنے کی بالکل عادت نہیں رہی تھی۔ وہ کھائے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ گھر میں خود پر جبر کر لیتا تھا لیکن جب کہیں باہر جاتا اور اسے تھیں کوئی ریستوران یا پڑا شاٹ ٹاپ کی کوئی

جگہ نظر آتی تو وہ بے اختیار گاڑی وہاں روک دیتا تھا۔ جم میں وہ کئی گھنٹے گزارتا تھا لیکن اس کا زیادہ وقت کسی ایکسرسائز مشین پر بیٹھ کر ہانپتے ہوئے گزارتا تھا۔ ورزش وہ کم ہی کرتا تھا۔

یہی وجہ تھی جب اس نے ایک ہفتے بعد اپنا وزن کیا تو وہ تین سو سترہ پونڈ نکلا۔ گویا ایک ہفتے میں اس کا وزن صرف ایک پونڈ کم ہوا تھا۔ لیزا اس وقت موجود تھی اس نے سر دھبے میں کہا۔ ”ایک ہفتے میں ایک پونڈ گویا تمہیں پہلے جیسا وزن حاصل کرنے میں کوئی ڈیڑھ سو ہفتے لگ سکتے ہیں یعنی تین سال۔“

مائیکل گزرا گیا تھا۔ ”ڈیزر یہ تو آغاز ہے جلد میں برہم پڑ لوں گا اور تم دیکھنا پھر روز ایک پونڈ وزن کم ہوگا۔“

لیزا جانتی تھی کہ یہ صرف طفل لسی ہے اور وہ طفل نہیں تھی۔ ”مائیکل تم جس طرح کوشش کر رہے ہو اس طرح تم ساری عمر بھی برہم نہیں پڑ سکو گے۔ تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ مجھے معلوم ہے تم گھر میں معمولی سا کھاتے ہو لیکن باہر جاتے ہی فاسٹ فوڈ پر ٹوٹ پڑتے ہو۔ ایکسرسائز کے نام پر تم صرف وقت ضائع کرتے ہو۔“ لیزا کو غصہ آ گیا تھا۔

مائیکل کھسکا گیا۔ ”میں کوشش تو کر رہا ہوں۔“

”تم مجھے اور خود کو بے وقوف بنا رہے ہو۔“ لیزا کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

”ایسا نہیں ہے۔“ مائیکل نے دفاعی انداز میں کہا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں ڈیزر۔“

”نہیں تم صرف اپنے کیریئر سے محبت کرتے ہو اس کی خاطر تم نے وزن بڑھایا، اگر تم مجھ سے محبت کرتے تو میری خاطر وزن گھٹانے کی کوشش کرتے۔“ لیزا کہتے ہوئے رو دی تھی۔ مائیکل نے اسے چپ کرانا چاہا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ مائیکل تھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ جب وہ وزن بڑھا رہا تھا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ دوبارہ وزن کم کرنا اتنا مشکل ہوگا۔ مائیکل کو خدشہ تھا کہیں لیزا پھر واپس نہ چلی جائے۔ اس کے جانے کا سوچ کر ہی وہ دہل گیا تھا۔ فی الحال ورزش کرنا مشکل لگ رہا تھا لیکن وہ اپنی کھانے کی عادت پر تو قابو پا سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بلاوجہ گھر سے باہر نہیں جائے گا۔ اس نے جم جانے کے بجائے ایکسرسائز کی مشینیں اپنے گھر میں منگوانے کا سوچ لیا تھا۔

دوسرے دن کبھی والے آکر شیشیں اس کے عالی شان گھر کے بیس منت میں فٹ کر گئے۔ مائیکل نے باہر جانا

کی دولت اور ہر اشارہ ہونے کی غلطی پر دائیں تھی۔ اسے تو اپنا اسرار شہر وادیں چاہیے تھا۔

لیزا واپس چلی گئی اور مائیکل اپنا سامنے لے کر وہ مینا۔ فلم کی شوٹنگ ختم ہوئے ایک مہینہ ہونے کو آیا۔ اس نے شان سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شوٹنگ ختم ہونے کے ایک مہینے کے اندر فلم ریلیز ہو جائے گی مگر ابھی تک اس نے کوئی آثار نہیں تھے۔ مائیکل نے اسے کال کی۔

”ابھی تک فلم پر پیر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔“

”اسی مہینے ایڈیٹنگ کا کام مکمل ہو جائے گا اور پیر کی تاریخ کا اعلان بھی جلد ہو جائے گا۔ لیکن تم کہاں ہو؟“

”ابھی تو میں گھر پر ہوں۔“ مائیکل نے سرد آہ بھری۔

”میں کہیں آنے جانے کے قائل نہیں رہا ہوں۔“

”فکرمست کرو۔“ شان ہنسا۔ ”فلم ریلیز ہونے دوہ اس کے بعد لوگ خود تمہارا گھر سے نکلنا محال کر دیں گے۔“

مائیکل اچھا خوب ویرہر تھا لیکن شان کی فلم میں اس نے جس حافوت میں کام کیا تھا اسے امید نہیں تھی کہ لوگ اسے اتنا پسند کریں گے۔ اس کی اداکاری اور کردار کو تو پسند کیا جاسکتا تھا لیکن ذاتی حیثیت میں عوام اسے پسند کرے گی اس کی اسے توقع نہیں تھی۔ چند دن بعد فلم کی پمپنی مہم شروع ہو گئی۔ شان نے پمپنی مہم بھی اتنے شاندار طریقے سے چلائی کہ چند ہفتوں میں پورے امریکا بلک دنیا میں اس فلم کی ریلیز کا انتظار کیا جانے لگا تھا۔ شان نے مائیکل کے خصوصی شائس جو شوٹنگ کے دوران میں ہی تیار کر لیے تھے اور فلم کا ٹریلر بھی ریلیز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میڈیا اور فلمی رپورٹرز نے مائیکل پر بیخار کر دی تھی لیکن فل الحال اس نے کسی قسم کا انٹرویو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ فلم کا پیرسینڈن میں ہوا اور پوری کاسٹ پر پیر کے سوتھے پر موجود تھی۔ مائیکل کو اندازہ نہیں تھا کہ لوگ فلم کی ریلیز سے پہلے اسے اتنا پسند کرنے لگے ہیں۔ جب وہ مووی ہال کے سامنے کار سے اترتا تو لوگ اسے دیکھتے ہی دیوانے ہو گئے اور کار وادیں توڑ کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ اس سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمام اختیارات درہم برہم کر دیتے، مائیکل خود ان کی طرف بڑھ گیا۔ لوگ اسے پاس دیکھ کر بالکل ہی پاگل ہو گئے تھے اور اگر پولیس والے آکر اسے لوگوں کے پاس سے نہ ہٹاتے تو شاید وہ اس کے پیر سے تک چھاؤ لے جاتے۔ اندر آکر مائیکل نے فلم کی ہیروئن جیسی میری سے کہا۔

کم کر دیا اور وہ دن کے بیشتر حصے میں بیٹھ منٹ ہی میں رہتا تھا۔ اگرچہ اس دوران میں وہ ورزش کم کرتا تھا بلکہ صرف اسی وقت کرتا تھا جب لیزا اسے پیچھے آتی نظر آتی تھی۔ ہاں اس نے باہر جا کر کھانا چھوڑ دیا تھا اور اب صرف گھر میں کچے معمول کے کھانے کھاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے وزن میں کوئی خاص کمی نہیں آ رہی تھی۔ وہ دن میں کئی بار وزن کرنے والی مشین پر چڑھ کر بڑی پرامید نظروں سے کانٹنے کی طرف دیکھتا کہ شاید وزن میں کوئی کمی آئی ہو لیکن وزن وہیں کا وہیں رہتا تھا۔ لیزا اسے بعض اوقات ترحم آمیز نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس کے خیال میں وہ خود کو دھوکا دے رہا تھا۔

”ڈیزیز وزن اس ورزش سے کم نہیں ہوگا جو تم دن میں کئی بار کرتے ہو۔“

”کون سی ورزش؟“

”یہی وزن کرنے والی مشین پر چڑھنے اور اترنے کی ورزش۔“ لیزا بولی۔ ”مگر شاید ایک ہفتے میں تمہارے وزن میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔“

مائیکل نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”حالانکہ تم دیکھ رہی ہو میں نے اب جنگ فوڈ بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”تب وزن کیوں کم نہیں ہو رہا ہے؟“ لیزا بولی۔

”میں نہیں جانتا۔“ مائیکل نے سادگی سے کہا۔

لیزا رونے والی ہو گئی تھی۔ ”مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ ایک بار تمہارا وزن بڑھ گیا تو تم اسے کم نہیں کر دے۔“

”میں نے ہر ممکن کوشش کر لی ہے۔“ مائیکل نے صفائی پیش کی۔

”اسے ہر ممکن کوشش نہیں کہتے ہیں۔“ لیزا کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے مانا اور پاپا کے گھر سے واپس آکر زندگی کی دوسری بڑی غلطی کی ہے۔“

”پہلی بڑی غلطی کون سی ہے؟“

”تم سے شادی کرنے کی۔“ لیزا نے تیر، منت سے جاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد مائیکل اوپر آیا تو لیزا اپنا سامان ہیک کر رہی تھی اور اس کے توجہ خطرناک لگ رہے تھے۔ مائیکل نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر لیزا رکنے کے موذ میں نہیں تھی۔ اس نے اپنا سامان سوٹ کیسوں میں بند کیا اور ٹیکسی منگوا کر چلی گئی۔ اس بار شاید ہمیشہ کے ارادے سے گئی تھی۔ مائیکل نے سوچا تھا کہ جب لیزا کو پتا چلے گا کہ وہ ایک بڑا سہرا ستار بن گیا ہے اور اس کے کاڈنٹ میں کئی ٹین ڈالرز کی رقم آگئی ہے تو شاید وہ اس سے موٹا بے کو نظر انداز کر دے۔ مگر مائیکل کا اندازہ غلط تھا۔ لیزا کو اس

اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے وہ فلم کو کیوں پسند نہیں کریں گے؟“

”تو کیا فلم کی کامیابی کی صرف یہی ایک وجہ ہے؟“

”نہیں فلم کسی ایک وجہ سے کامیاب نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ ایک نیم ورک ہے۔ تم جانتے ہو جب تک تمام لوگ اپنا کام صحیح طریقے سے نہ کریں فلم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔“

مائیکل سوچ رہا تھا کہ فلم تو کامیاب ہو گئی تھی لیکن اس کی ازدواجی زندگی ناگامی کے قریب تھی۔ وہ اپنی زندگی کو دوسروں سے شہر کرنے کا قائل نہیں تھا اسی وجہ سے اس کے قریبی دوستوں اور ساتھیوں کو بھی علم نہیں تھا کہ لیزا اس سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے اور امکان بھی یہی تھا کہ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔ شان نے اسے خوشخبری سنائی۔ ”تمہیں مبارک ہو، فلم کے منافع میں تمہارا بھی دو فیصد حصہ ہوگا اور فلم جس طرح سے بزنس کر رہی ہے یہ دو فیصد کم سے کم ایک ٹین ڈالرز تک چلا جائے گا۔“

ایک ٹین ڈالرز خاصی بڑی رقم ہوتی ہے اور اگر کوئی اور موقع ہوتا تو مائیکل شاید خوش ہو جاتا لیکن اس وقت اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شان سے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں تھک گیا ہوں۔“

شان نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”ابھی تمہارے پاس وقت ہے اس لیے تم آرام کرو۔“

مائیکل نے اس کی بات پر غور نہیں کیا تھا۔ شان نے بھی واضح الفاظ میں دوسری فلم کی بات نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اس کی عادت تھی کہ ایک فلم بنا کر درمیان میں اچھا خاصا وقفہ دے کر دوسری فلم شروع کرتا تھا، اسے لگا تار فلمیں بنانے کی عادت نہیں تھی۔ مائیکل نے اپنے ایجنٹ، مارون کو ذمے دار بنا دیا کہ وہ اس کی طرف سے میڈیا کو ذیل کرتا رہے اور اسے بالکل تنگ نہ کیا جائے۔ ابھی وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ مارون نے اس سے کہا۔

”تم غلطی کر رہے ہو ابھی تو بزنس کا وقت آیا ہے میرا خیال ہے دوسرے فلم ساز تمہیں اپنی فلموں میں لینے کے لیے بے تاب ہوں گے۔“

”مجھے فل الحال کسی دوسری فلم میں کام نہیں کرنا ہے۔“ مائیکل نے جواب دیا۔ ”مہربانی سمجھو کہ مجھے ایک مہینے تک کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔“

مائیکل گھر میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے فون بند کر دیا تھا اور صرف اس کا سیل فون آن تھا جس کا نمبر سوائے چند

”میرے خدا! لندن کے لوگ تو بالکل پاگل ہیں۔“

میرے دادا نے اچھا کیا جو یہاں سے چلے گئے تھے۔“

”صرف لندن نہیں اب تم جہاں جاؤ گے، تمہیں ایسے ہی پاگل ملیں گے۔“ جیسی نے کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ اس فلم میں شان نے تم سے کس طرح کام لیا ہے تم ایک لیجنڈ بن جاؤ گے۔“

جیسی کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ ریلیز کے پہلے ہفتے میں ہی فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا تھا اور اس کی دنیا بھر میں اگلے چھ مہینے کی غنیمت فروخت ہو چکی تھی۔ اتنا شاندار بزنس دیکھ کر شان نے اس کی ڈی وی ڈی ریلیز روک دی کیونکہ ڈی وی ڈی ریلیز کے فوراً بعد فلم انٹرنیٹ پر مفت دستیاب ہوتی ہے اور لوگ اسے ڈاؤن لوڈ کر کے فری میں لطف اٹھاتے ہیں۔

ایک مہینے کے دوران میں مائیکل کوئی نصف درجن پیرسینڈن اور فلم کے حوالے سے دوسری تقریبات میں شامل ہوا تھا اور ہر جگہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کے مقابلے میں باقی تمام کاسٹ کو مل کر بھی اتنی پذیرائی نہیں ملی تھی جتنی اس کے لیے کوئی تھی۔ مائیکل حیران تھا کہ لوگوں نے فلم میں اسے اتنا پسند کیا تھا۔ شان نے اس سے کہا۔ ”لوگوں نے سبھی نہیں بلکہ اس کردار کو پسند لیا ہے۔ لوگوں کی وابستگی کردار سے ہوتی ہے اور اداکار کو وہ اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اس نے یہ کردار ادا کیا ہوتا ہے۔“

”میں اپنی نہیں بلکہ کردار کی ہی بات کر رہا ہوں۔“

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس کردار کو اتنا پسند کریں گے۔“

”لیکن مجھے اندازہ تھا اور اس میں سب سے منفرد بات اس کردار کا مومن ہونا ہے۔ دیکھو امریکا اور تمام ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں میں مومن ہونے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ہر چار میں سے ایک امریکی اور ویت ہے۔ جب کہ فلموں میں مومن بچے کو خفی معنوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ کسی اچھے کردار کو بہت کم مومن دکھایا جاتا ہے۔ زیادہ تر اچھے کردار اسرار ہوتے ہیں، اس سے مومن لوگوں کی دل نشینی ہوتی ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ مومن ہونا اچھی بات نہیں ہے۔“

”بالکل بھی نہیں ہے۔“ مائیکل نے کہا۔ ”خود میری بوی میرے مومن بچے کو پسند نہیں کرتی ہے۔“

”لیزا خود اسرار ہے اس لیے مومن بچے کو پسند نہیں کرتی ہے لیکن تم ذرا مومن لوگوں کے نقطہ نظر سے اس کردار کو دیکھو۔ انہیں اپنے جیسا ایک وزنی شخص، فلم میں مرکزی کردار ادا کرتا نظر آ رہا ہے، اس کی اہمیت ہیرو جیسی یا

http://www.digestpk.com

”مائیک تمہارے پاس وقت ہے میرا خیال ہے تم لیزا سے بھی بات کر سکتے ہو۔ صرف دو سال کی بات ہے۔ اس کے بعد تم چاہو تو اپنا وزن دوبارہ کم کر سکتے ہو۔“

مائیک سوچ میں پڑ گیا۔ شان ذرا آگے آیا اسے خوش نہیں ہوئی کہ مائیک اس کی بات سے متاثر ہوا ہے لیکن مائیک نے کہا: ”میرا خیال ہے میں نے تمہیں کچھ نئی سے دھکا دیا ہے اسی وجہ سے تم سچ سے میری بات سمجھ نہیں پا رہے ہو اب اگر تم ایک منٹ کے اندر یہاں سے نہیں گئے تو میں باہر آ کر تمہیں گیٹ تک پہنچاؤں گا اور یہ منظر دیکھنے والے، یقیناً بہت سارے لوگ ہوں گے۔“

شان نے دانت پیسے۔ ”تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

”میں نے پہلے اچھا نہیں کیا تھا۔“ مائیک نے کہا۔ ”جب میں نے تمہاری باتوں میں آ کر اپنا وزن بڑھا لیا تھا۔“

”اس کے بدلے آج تم امریکا کے سب سے بڑے اداکار ہو۔“ شان نے اسے یاد دلایا۔

مائیک نے سرد آہ بھری۔ ”میری ساری خوشیاں اور ساری کامیابیاں میری بیوی کے بغیر ادھوری ہیں۔“

”مائیک میری بات سنو۔۔۔“ شان نے کہنا چاہا لیکن مائیک نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ تیزی سے واپس میں منٹ میں آیا اور اس نے دوبارہ وزن کرنے والی مشین پر اپنا وزن دیکھا۔ واقعی وہ دو سو تیس پونڈز کا ہو گیا تھا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”یا ہو۔۔۔“

اب وہ لیزا کو واپس بلا سکتا تھا اسے یقین تھا کہ وہ اس کے وزن میں اتنی کمی کے بارے میں سن کر ضرور واپس آ جائے گی۔ وہ اوپر آیا پہلے اس نے ایک جام بنا کر پیا اور پھر لیزا کا نمبر ملا یا۔ بتل جانے لگی۔ وہ کال ریسپونڈ نہیں کر رہی تھی۔ ایک بار بتل بند ہوئی تو اس نے دوبارہ نمبر ملا یا۔ اس بار لیزا نے خاصی دیر بعد سمیٹ لیکن کال ریسپونڈ کر لی۔

”مائیک کیسے ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو۔“ مائیک نے بے تالی سے کہا۔ ”میں تمہیں خوش خبری سنا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میں نے اپنا وزن پورے سو پونڈز کم کیا ہے۔“ مائیک نے چھوڑنے میں حرج نہیں سمجھا تھا کیونکہ عروج کے دور میں اس کا وزن تین سو تیس پونڈز بھی ہو گیا تھا۔

”واقعی۔“ لیزا نے کہا اس کے لہجے میں تعجب تو تھا لیکن خوشی نہیں تھی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو تم

پڑے گا۔“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

شان خوش ہو گیا۔ ”میری فلم آفر پر؟“

”نہیں مجھے یہ بتانے پر کہ میں اب تین سو پونڈز وزنی نہیں رہا ہوں۔“

”مائیک تمہیں میری فلم میں کام کرنا ہو گا۔“ شان کی خوشی ہوا ہوئی۔

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“ مائیک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”مائیک تمہیں اس فلم میں کام کرنا ہے اور تمہیں اس کے بدلے ریکارڈ معاوضہ دیا جا رہا ہے۔“ شان نے اس بار ٹھیک کر کہا۔

”مجھے فلم قبول نہیں ہے کیونکہ میرا دوبارہ تین سو پونڈز وزن کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ مائیک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”البتہ اب میں ایک سو ستر پونڈز وزنی ہونا چاہوں گا۔“

”مائیک یہ حماقت ہے تم اتنا بڑا چانس مس کر رہے ہو۔ ان دو فلموں میں کام کر کے اگر تم باقی ساری عمر بچتہ کرو تب بھی تم ایک فلمی لیجنڈ کے طور پر یاد رکھے جاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہے تمہیں بہترین اداکار کے آسکر نوبلیٹی دیا جا رہا ہے۔“

”مجھے فلمی لیجنڈ نہیں بننا ہے۔“ مائیک نے کہا اور شان دوبارہ سے پکڑ کر اوپر لے آیا۔ شان نے راستے میں کہا۔

”تم پاگل ہو گئے ہو ایک عورت کی خاطر تم میری فلم ٹھکر رہے ہو۔“

”تم نے درست کہا، وہ عورت میری بیوی ہے اور میری محبت ہے۔ میں باقی عمر فلم میں کام کیے بغیر تو رہ سکتا ہوں لیکن اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ مائیک کہتے ہوئے اسے مکان کے دروازے تک لے آیا۔ شان اس کے عزائم جانپ گیا اس نے مزاحمت کی۔

”اے تم مجھے اس طرح نہیں نکال سکتے تمہیں بات کرنا پڑی۔“

”میں بات کر چکا ہوں تم نے مجھے آئندہ فلم کی آفر کی اور میں اسے مسترد کرنا ہوں۔ بات ہوئی اب تم جاسکتے ہو۔“

مائیک نے اسے دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ شان گرتے پڑے تھا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ حصہ مکان کے دروازے سے نظر نہیں آتا تھا ورنہ اس کی بے عزتی کا یہ منظر بہت برا لگتا۔

مائیک نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے آخری بار اپنا وزن کب کیا تھا۔ اس نے اس میں سر ہلایا۔

”مجھے یاد نہیں ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ شان نے سر ہلایا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”آؤ میرے ساتھ مشین کہاں ہے؟“

”کون سی مشین؟“

”وزن کرنے والی۔“ شان نے کہا اور اسے احتجاج کے باوجود اسے میں منٹ میں رکھی وزن کر سنے مشین پر لے آیا۔ اس نے صرف ایک ریگی گاؤن اور اسے سپر پز پہن رکھے تھے ان کو اتارنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ایسے ہی مائیک کو مشین پر کھڑا کر دیا اور اسے کہا۔ ”ذرا کانٹے کی طرف دیکھو۔“

مائیک نے کانٹے کی طرف دیکھا اور اسے آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا سوئی دو سو تیس پونڈز پر مشین نے بڑ بڑا کر شان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ خراب ہو گئی ہے۔“

”ابھی میں دن پہلے مکمل میڈیکل چیک اپ میں وزن ہوا ہے۔“ شان نے اسے مشین سے ہٹایا۔ ”اب وزن ایک سو چالیس پونڈز ہے۔“ شان خود مشین پر کھڑا گیا۔ ”دیکھو ٹھیک ایک سو چالیس پونڈز ہے۔ یعنی مشین ٹھیک ہے۔“

مائیک نے بے یقینی سے ایک طرف دیوار میں بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس نے گاؤن اتار دیا نیچے صرف نیکر تھی۔ اس کا جسم نمایاں نظر آ رہا تھا۔ واقعی اس نے خود پر غور نہیں کیا تھا، اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں کتنا لیکن کیونکہ وہ ڈھیلا تھا اس لیے مائیک کو احساس نہیں ہوا۔ شان نے اشارہ کیا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تازہ فلمی میگزین نکالا جس میں مائیک کی بڑی سی تصویر تھی۔ اس نے وہ تصویر مائیک کے سامنے کر دی۔

”فرق تم خود دیکھ لو۔“

اس بار مائیک خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ ”واہ میرا وزن خود بخود اتنا کم ہو گیا ہے اور اب مجھے صرف پچاس پونڈز کم کرنا ہو گا اور پھر میں پہلے جیسا ہو جاؤں گا۔ جب لیزا دوبارہ سے میں سے ملے گی تو وہ یقیناً واپس آ جائے گی۔“

”ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔“ شان نے جلدی سے کہا۔ ”ہمارا موضوع وزن کم کرنا نہیں وزن بڑھانا ہے، آئے والے ڈیزہ سب سے زیادہ وزن بڑھاتا ہے۔“

مطالبہ ہے کہ فلم کا دوسرا حصہ فوراً شروع کیا جائے ورنہ وہ ہمیں کچا چھوڑ جائیں گے۔“

مائیک اس کی بات سن رہا تھا۔ شان خاموش ہوا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا دوبارہ اس کردار میں کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ میں اب وزن کم کرنا چاہتا ہوں تاکہ لیزا واپس آ جائے۔“

شان کا خیال تھا کہ مائیک اس کی پیشکش سن کر اچھل پڑے گا مگر انا مائیک کی بات نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے۔ یہ کروڑوں ڈالرز کا پروجیکٹ ہے اور تمہارا معاوضہ کم سے کم بھی پچاس ملین ڈالرز ہو گا۔“ فلم کے منافع میں حصہ لگ ہو گا۔“

مائیک اس بار بھی نہیں اچھلا تھا۔ اسے پہلی فلم کا مکمل معاوضہ تین ملین ڈالرز ملا تھا اور اس بار اسے پچاس ملین ڈالرز دیے جا رہے تھے۔ معاوضے پر اسے یاد آیا کہ ابھی تک اسے فلم کے منافع میں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ اس نے شان سے کہا تو اس نے جلدی سے ایک چیک نکال کر مائیک کے سامنے رکھ دیا۔ ”میں چیک لایا ہوں دو ملین ڈالرز ہیں اس میں کچھ بونس بھی ہے ٹیکہ جانپ سے۔“

مائیک نے کہا۔ ”تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا تھا اس فلم کو میری بڑی شکل میں بنانے کا؟“

”اس وقت ارادہ تھا بھی نہیں یہ تو ریلیز کے بعد عوام کی طرف سے آنے والے پوزیشن کے بعد خیال آیا۔ میں نے ٹیکہ کے ساتھ مل کر اگلی فلم کے اسکرپٹ پر کام کیا اور اسے مکمل کرنے کے بعد میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ اگر ہم آنے والے ایک مہینے میں شوٹنگ شروع کر دیں تو پہلی فلم کے ٹھیک ایک سال بعد دوسری فلم ریلیز کر سکتے ہیں۔“

”میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔“

”شاید اسی وجہ سے تم نے وزن خاصا کم کر لیا ہے۔“

بہر حال ایک مہینہ ہے تم دوبارہ سے کھانپ کر وزن حاصل کر سکتے ہو۔“

مائیک نے بد مزگی سے اسے دیکھا۔ ”میرا وزن اتنا ہی ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

شان نے گہری سانس لی۔ ”واقعی تم نے عرصے سے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔“

”نہیں آئینہ تو میں روز دیکھتا ہوں شیو کرتے ہوئے اور منہ دھوتے ہوئے۔“

”تم شاید غور نہیں کرتے ہو اور کتنے دن ہو گئے جب تم نے وزن کیا تھا؟“

آکر خود دیکھ لو۔" مائیکل نے کہا اور پھر پُر امید لہجے میں بولا۔ "لیز اتم آرہی ہو، میں وعدہ کرتا ہوں زیادہ سے زیادہ دو مہینے میں، میں پہلے والا مائیکل ہوں گا ایک سو ستر پونڈ زکا اور مکمل طور پر فٹ۔"

"اچھا۔" لیزا نے دستور پہلے والے لہجے میں کہا۔ "لیکن مائیکل میں نہیں آسکتی ہوں۔"

مائیکل کو دھچکا لگا تھا۔ "لیکن کیوں؟"

"وہ... میں امید سے ہوں... میں ماں بننے والی ہوں۔"

مائیکل کو اپنے کانوں پر تعین نہیں آیا تھا۔ "کیا... تم ماں بننے والی ہو اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"مجھے خود وہ مہینے پہلے بتا چلا ہے۔ اس وقت میں سمجھ رہی تھی کہ کوئی مسئلہ ہے پھر میں ڈاکٹر کے پاس گئی تو اس نے بتایا۔"

"لیز اتم مہینے بھی بہت ہوتے ہیں۔" مائیکل برہم ہو گیا۔ "تم نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ تم مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگی ہو؟"

"نہیں... نہیں۔" لیزا نے بے ساختہ کہا۔ "یہ بات نہیں ہے۔ بہر حال ڈاکٹر نے مجھے طویل سفر کرنے سے منع کیا ہے۔"

مائیکل خود پر قابو پانے لگا۔ آج اسے بیک وقت دو خوشخبریاں ملی تھیں اور وہ اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔"

لیز اتم چٹکیاٹی اور مائیکل کو یوں لگا جیسے وہ اسے آنے سے منع کر دے گی لیکن پھر وہ مائی۔ مائیکل نے اسے شان کی آمد کے بارے میں بتایا۔ "وہ کیوں آیا تھا یہ میں تمہیں آکر بتاؤں گا۔"

"تم کب آرہے ہو؟"

"میں دو دن بعد یہاں سے نکلوں گا۔" مائیکل نے کہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی روانہ ہو جائے لیکن وہ دو دن ڈرا ایکس سائز اور سوئمنگ کر کے اپنے آپ کو تھوڑا فٹ کرنا چاہتا تھا تاکہ کم وزن نظر بھی آئے۔ اس نے اپنے منصوبے پر فوری عمل درآمد شروع کر دیا۔ وہ کئی گھنٹے تک بیس منت میں ایکس سائز مہینوں کے ساتھ لگا رہا اور جب تھک کر چور ہو گیا تو اس نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر سوئمنگ پول میں آ گیا۔ اگلے دو دن تک اس کا مہکی معمول رہا۔ اس دوران میں وہ صرف سیب اور گھٹے سے کا جوس لیتا رہا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لیے وہ صرف باب کارن ہا رہا تھا۔ دو دن میں

اس نے خاصا فرق محسوس کیا تھا اس کے جسم کی ڈھیلے پر والے حصے پھر سے سخت ہونے لگے تھے اور وہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ روانہ ہونے سے ایک رات پہلے وہ طرح سوچا تاکہ اگلے دن روتا زہ نظر آئے۔ سچ وہ افراط کو کچھ فٹ فریش محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ہکا بھکا ہاتھ اپنا ایک بہترین سوٹ نکالا۔ یہ اسے اگرچہ تنگ تھا لیکن اس میں وہ اسارت لگ رہا تھا۔

ہائی وے سے راستہ پانچ گھنٹے کی ڈرائیو کا تھا۔ اس کے پاس جلد از جلد پہنچنے کی گھنٹن میں اس نے یہ فاصلہ ساڑھے چار گھنٹے میں طے کر لیا۔ اس کا سسر اپنے فریکسٹر چلا رہا تھا۔ وہ مائیکل سے گرم جوشی سے ملا اور لیزا کے بارے میں بتایا کہ وہ مکان میں اوپر اسے سے پہلے والے بیڈ روم میں موجود ہے۔ سسر نے کہا۔ "کی طبیعت اچھی نہیں ہے ڈاکٹر نے اسے زیادہ سے آرام کرنے کو کہا ہے۔"

مائیکل سسر اور پھر ساس سے منت کراد پر آیا۔ لیزا کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ "کون ہے؟"

مائیکل دروازہ کھول کر اندر آیا تو پہلے اسے نیم کمرے میں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ پھر اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو لیزا اسے آرام کر رہی دکھائی دی۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ "اوہ کیسی ہوتی؟"

مگر لیزا نہ تو ابھی اور نہ ہی اس نے کوئی گرمی دکھائی تھی۔ "میں ٹھیک... نہیں ہوں۔"

مائیکل رک گیا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں؟... یہاں اس اتنی کم کیوں ہے۔" اس نے دروازے کے قریب کھڑا ٹولا اور اس سے پہلے کہ لیزا اسے منع کرتی اس نے ہاتھ دیا۔ فوراً ہی کمراروں ہو گیا تھا۔

"نہیں۔" لیزا نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپایا۔ مائیکل اسے دیکھ کر دم بہ خود رہ گیا تھا۔ "میرے بھائی لیزا یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

لیز اتم کا پیٹ تو بڑھا ہوا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے پورے جسم پر موٹاپا طاری تھا۔ چہرہ اور گردن جیسے سونے تھے۔ بازو اور ٹانگیں بھی موٹی ہو رہی تھیں۔ وہ کہیں سے پہلے والی لیزا نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ مائیکل اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے زری سے لیزا کا ہاتھ چرے بنایا۔ "لیز اتم مجھے بتاؤ یہ کیا ہوا ہے؟"

وہ بے رویہ تھی۔ "مجھے خود بھی نہیں معلوم، یہاں

کے کچھ عرصے بعد میرا وزن جیسے خود بہ خود بڑھنے لگا۔ حالانکہ میں وہی کھاتی رہی تھی اور ایکس سائز بھی کر رہی تھی۔ تم تعین کر دو گے صرف تین مہینے میں میرا وزن ایک سو دس پونڈز سے بڑھ کر ایک سو ساٹھ پونڈز ہو گیا اور تب میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں امید سے ہوں اور اس وجہ سے کچھ پر سوچنا پڑا ہے۔ اب میرا وزن ایک سوای پونڈز ہے۔" مائیکل پریشان ہو گیا۔ "اس میں تمہارے یا بچے کے لیے کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں... نہیں ڈاکٹر کا کہنا ہے سب بالکل ٹھیک ہے۔ بعض عورتیں ایسے وقت میں موٹی ہو جاتی ہیں اور میں ان میں سے ایک ہوں۔ میں اور بچہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ہر تیسرے دن چیک اپ کرانے جاتی ہوں اور اب وزن بڑھنا رک گیا ہے لیکن کم نہیں ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے یہ بچے کے بعد ہی کم ہوگا۔"

"دو چھٹس گاؤ۔" مائیکل نے سکھ کا سانس لیا۔ "میں تو ڈری گیا تھا۔"

"تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"نہیں ناراض تو تم مجھ سے ہو کہ میں اپنا وزن کم نہیں کر پا رہا تھا لیکن دیکھو میں نے کتنا کم کر لیا ہے۔" مائیکل نے اٹھ کر اسے دکھایا۔ "میں دو سو تیس پونڈز کا ہوں اور مجھے اب صرف پچاس پونڈز وزن کم کرنا ہوگا۔"

"واقعی تم پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو گئے ہو۔"

لیز اتم سانس لیجے میں کہا۔ "لیکن اب میں موٹی اور بھتیجی ہو گئی ہوں۔"

مائیکل دوبارہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "ایسا مت کہو تم ایک وجہ سے ایسی ہوئی ہو اور ہمارے لیے تو یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔"

لیز اتم نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں برا نہیں لگ رہا کہ میں موٹی اور بھتیجی ہو گئی ہوں۔"

مائیکل نے اسے گود میں اٹھا کر بستر پر لٹایا اگرچہ اس کام میں اسے مشکل پیش آئی تھی۔ پھر وہ خود اس کے برابر میں نیم دراز ہو گیا۔ "لیز اتم میری بیوی ہو۔ اگر تم خوب صورت اور اسارت ہو تو مجھے اچھی لگی ہو لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ تم میری بیوی ہو۔ اگر تم اسارت اور خوب صورت نہ رہو تب بھی مجھے اچھی لگے گی۔"

"یعنی میں تمہیں اب بھی اچھی لگ رہی ہوں۔" لیزا نواب بھی شک تھا۔ مائیکل اس کی طرف جھک گیا تھا۔ "اب تم مجھے زیادہ اچھی لگے ہو کیونکہ تم میرے

بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

"مجھ کو دیر بعد جب ان کے جذبات اعتدال پر آئے تو لیزا کو یاد آیا۔" تم نے بتایا کہ شان تمہارے پاس آیا تھا۔"

"ہاں وہ پیش کش لے کر آیا تھا۔"

"ایسی پیش کش؟"

"وہ اپنی فلم کے مزید دو پارٹ بنانا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس بار مرکزی کردار میرا ہو۔ اس نے مجھے اگلی فلم کے لیے پچاس ملین ڈالر نفع میں حصے کی پیش کش کی ہے۔"

"پچاس ملین ڈالر؟" لیزا چونک کر اٹھ بیٹھی۔ "یہ تو ریکارڈ معاوضہ لگ رہا ہے۔"

"ہاں یہ ریکارڈ معاوضہ ہے۔"

"سب تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے انکار کر دیا۔" مائیکل نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"کیونکہ میں تم کو کھونا نہیں چاہتا۔ شان کی شرط وہی پرانی تھی کہ میں تین سو پونڈز وزن کم کر دوں۔"

"تم نے صرف میری خاطر شان کو منع کر دیا؟"

"اگر تمہیں تعین نہیں آ رہا ہے تو اسے کال کر کے معلوم کر لو۔" مائیکل نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ "میں نے تو اس بے چارے کو تقریباً دھکا دے کر گھر

Monthly Digest

SUSPENSE

سپنس

SARGUZASHT

سرگزشت

PAKEEZA

پاکیزہ

JASOOSI

جاسوسی

مکتبہ اہلا وسہلا

Sole Distributor:

WELCOME BOOK SHOP

JD Group of Publications

223

اکتوبر 2011

پیٹ کے بل پاؤں پھیلا کر رینگ رہے تھے۔ ان پلیٹ فارمز پر پتلے گدے بچے ہوئے تھے جن پر ہلکی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ ایک پلیٹ فارم پر ایس اور بیٹی ایئر سائز کر رہی تھیں جبکہ دوسرے پلیٹ فارم پر ایک کے ساتھ ایک مرد تھا۔ اسی لیے وہ دونوں عورتیں جن کی عمر ستر سال سے زیادہ ہی ہوگی، ایک کورٹک سے دیکھ رہی تھیں۔ نام کے جڑے مضبوط، بال

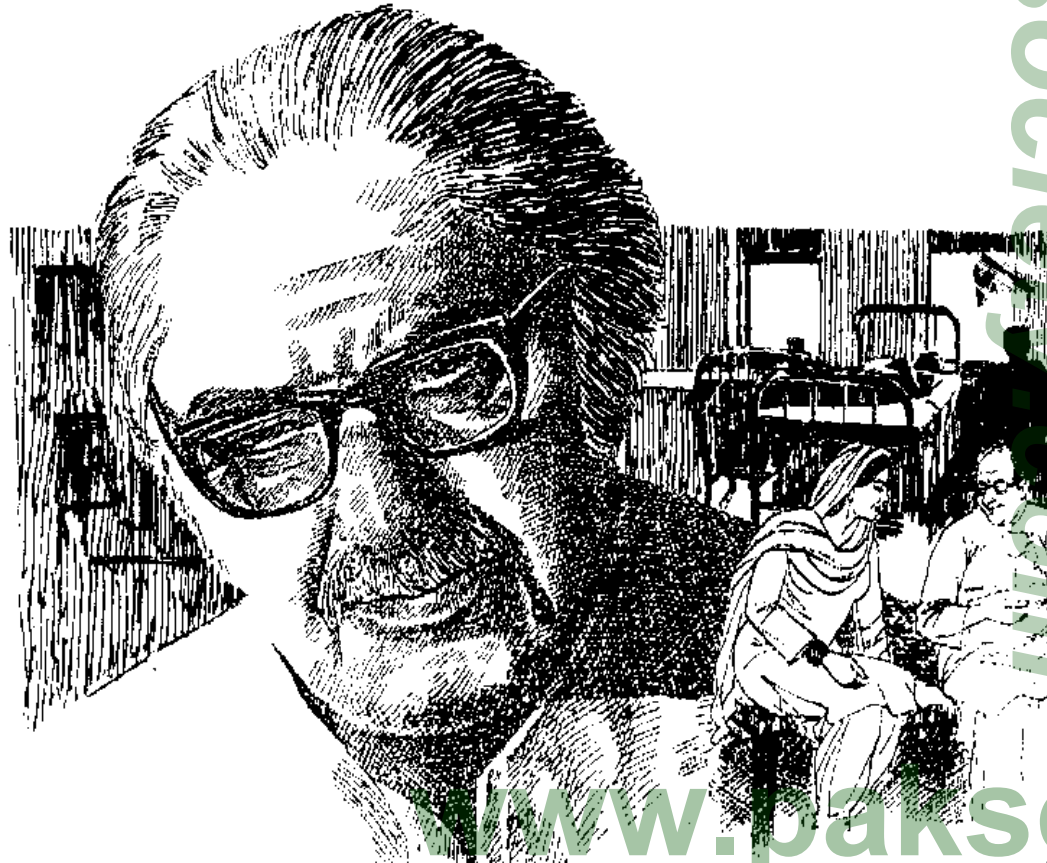
ہیلری نے مسہر معمول چلاتے ہوئے ہدایات دے دی تھیں تو ایک سوچنے لگی کہ بھائی کے مرکز میں ایسی سخت تیز، جرجراج اور جرجرج عورت کو کیوں رکھا گیا ہے؟ وہ فزینہ خراپٹ کے بھائے کی ڈرل ماسٹر کے انداز میں ان چار عمریدہ مریضوں کو جسمانی مشقیں کروا رہی تھی جن کے اعضا نان سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ چاروں مریض پلیٹ فارم پر

گزر رہے تھیں کی فکر سے آزاد ایک پریمی جوڑے کا نظریہ

خزاں پیلے

رضوانہ بیگم

کبھی تدبیر سے تقدیر بنتی ہے اور کبھی تقدیر پر تدبیر پر ہانی پھیر دیتی ہے۔ کوئی لاکھ روکنا چاہے، ہانی کے بہاؤ کو نہیں روک سکتا۔ یہ اور بات کہ رخ بدل جائے مگر... ہانی کو ہر حال میں بہنا ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں بھی محبت کا ایک سمندر موجزن تھا جس میں اٹھنے والی لہریں انہیں آگے بڑھنے پر اکسارتی تھیں۔ پھر وہ کیسے آگے نہ بڑھتے۔



کرنے کی اجازت دے رہی ہو؟“
”پائل، بلکہ اب میری خواہش ہے تم اس فلم کے دونوں پارٹس میں کام کرو۔“ لیزا نے جوش سے کہا۔
”تمہیں معلوم ہے ان دونوں کی شوٹنگ آنے والے دو سال تک جاری رہے گی اور اس دوران میں مجھے اپنا دل تین سو پونڈ زر رکھنا ہوگا۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اب مجھے سمجھ آگئی ہے، مجھے تم سے محبت ہے تمہارے جسم سے نہیں۔ اس لیے اگر تم ایک سو ستر پونڈ زر کے ہو یا تین سو پونڈ زر کے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مائیک تم نے میری محبت میں اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ آج امریکا کا کوئی اداکار اپنی بیوی کے لیے اتنا بڑا چانس نہیں چھوڑ سکتا ہے لیکن میں غر سے کہہ سکوں کہ میرے شوہر نے میرے لیے چانس چھوڑا ہے۔ اب میری باری ہے میں چاہوں گی کہ تم یہ چانس حاصل کرو۔“
”کیا تم سچ بول رہی ہو؟“

ایسا کہہ رہی ہو؟“
اس پر لیزا نے اسے عملی طور پر بتایا کہ وہ دل سے کہہ رہی ہے۔ مائیکل ہنسنے لگا۔ ”بس... بس ڈیر مجھے یقین آگیا۔“

لیزا خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ ”تو تم شان کی فلموں میں کام کرنے کے لیے تیار ہو؟“
”ہاں میں تیار ہوں۔“ مائیکل نے سر ہلایا۔ لیکن وہ اب مجھے کام دے گا خاص طور سے اس بے عزتی کے بعد جو میں نے اس کی اسے گھر میں کی تھی؟“
”وہ سچا پریویشنل ہے۔“ لیزا نے یقین سے کہا۔ ”وہ سوائے تمہارے کسی کو نہ کرے گا۔“
”لیزا! تو وہ فلم ہی نہیں بنائے گا۔“

”پھر کبھی میری ہمت نہیں ہو رہی کہ میں اس سے بات کروں۔“ مائیکل بستر پر دراز ہو گیا۔

”کیل فون دو میں اس سے بات کرتی ہو۔“ لیزا نے اس سے کیل فون کیا اور شان کا نمبر دیا۔ ”ہیلو شان... ہاں میں لیزا بات کر رہی ہوں... شان میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ مائیکل تمہاری آنے والی دونوں فلموں میں کام کرے گا... ہاں باڈیمن سو پونڈ زر وزن کے ساتھ کرے گا... اس کے بغیر وہ بچے کا کیسے؟“

لیزا شان سے بات کر رہی تھی اور مائیکل آسمیں ہلکے سے مسکراتا تھا۔ بہت عرصے بعد وہ دل سے مسکرایا تھا۔

سے نکالا ہے۔“
”میرے خدا! یہ تم نے کیا کیا۔“ لیزا اضطرابی انداز میں بولی۔ ”مائیکل مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ شان کتنی شاہکار مووی بنانے جا رہا ہے اور تمہارا کردار تو اتنا بدست ہے کہ میں جانتی نہیں۔“
”تم نے مووی دیکھی ہے لیکن کیسے؟ ابھی تو ڈی وی ڈی پر بھی نہیں آئی ہے۔“ مائیکل کو لیزا کی بات سن کو خوشی... ہوئی تھی۔

”اگرچہ ڈاکٹر نے مجھے منع کیا ہے لیکن میں تین بار جا کر یہ مووی، تھیٹر میں دیکھ چکی ہوں۔“
”تو میں تمہیں فلم میں برا نہیں لگا؟“
”نہیں تم اس کردار میں یوں فٹ تھے جیسے انگوٹھی میں گھینے فٹ ہوتا ہے۔“ لیزا نے جوش سے کہا۔ ”میرے خاندان میں سب کو یہ فلم بہت پسند آئی ہے۔ جب میں تیسری بار دیکھنے گئی تو ہمارے گاؤں کے لوگوں نے پورا تھیٹر بک کر لیا تھا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس دن مجھے تم پر کتنا فخر محسوس ہوا تھا۔“

مائیکل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو لگا تھا کہ لیزا اس کی فلم دیکھنا گوارا نہیں کرے گی۔ ”تم سچ کہہ رہی ہو یا میرا دل رکھ رہی ہو؟“

”نہیں ڈیر میں نے سچ سچ تمہاری فلم کو دیکھا ہے اور پسند کیا ہے۔“ لیزا نے کہا اور پھر اس نے فلم کے کئی سین اتنی وضاحت سے بتائے کہ مائیکل کو یقین آگیا کہ اس نے واقعی فلم کو پسند کر کے دیکھا ہے۔ ”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا مائیکل لوگ تمہیں اس کردار میں اتنا پسند کریں گے۔ تم اس وقت کریز بن چکے ہو۔ ہر طرف تمہاری دھوم مچی ہے۔“

مائیکل نے سر ہلایا اور سرد آہ بھری۔ ”ہاں لیکن یہ دھوم بس اتنی ہی رہ جائے گی۔“

”نہیں اگر تم اس فلم کے اگلے پارٹ میں کام کرو تو...“
مائیکل کو ایک بار پھر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ”یہ تم کہہ رہی ہو لیزا...؟“

”ہاں مائیک! یہ میں کہہ رہی ہوں۔ اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ اصل اہمیت انسان کی ہوتی ہے اس کے جسم کی نہیں۔ مجھے انہوں نے میں نے سخت خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ فلم کی شوٹنگ اور اس کے بعد کامیابی میں تمہارے ساتھ شامل ہونے کے بجائے میں تم سے دور رہی۔ ڈیر! میں اپنی اس غلطی اور خود غرضی کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔“

مائیکل نے اطمینان سے چاہی۔ ”تم مجھے اس فلم میں کام

چمکنے سفید اور آنکھیں پال نیوسن جیسی تھیں۔ ایسی نے سوچا کہ جب وہ ستر سال کی عمر میں ایسا نظر آتا ہے تو جوانی میں کیا قیامت ڈھاتا ہوگا۔

”تم سب اپنے گالوں کو دباؤ۔“ ہیلری نے اپنے مریضوں کے سامنے اکثر کرچلے ہوئے کہا۔ اس لئے ایسی کو اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے آگ کے شعلوں میں جھونک دیتی۔ وہ کہتے بے ہودہ انداز میں اپنے مریضوں پر حکم چلا رہی تھی۔ جو فالج کے حملے سے پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے انہیں وہیل چیئر کے ذریعے وہاں لایا جاتا تھا۔

”ایسی؟“ ہیلری چلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم اپنے گالوں کو دبا رہی ہو؟“ ایسی شرمائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہیلری، نام جیسے پرکشش شخص کی موجودگی میں ایسی بات کرے۔ نام نے اسے دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ایسی سوچنے لگی کہ اس شخص کو میرا کتنا خیال ہے۔

”ایسی کیا تم سو رہی ہو؟“ ہیلری ایک بار پھر چلائی تو ایسی نے سوچا کہ اس کی بات کا جواب دے دینا ہی بہتر ہے ورنہ وہ اس سے بھی زیادہ بد صورت جملہ کہہ سکتی ہے۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ بہت لڑاکا ہوا کرتی تھی اور اب اس اسپتال میں فزیوتھراپسٹ بن کر اپنے اختیارات سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ایسی اسے پیچانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تم ہو۔ ہیلری نام؟“

ایسی نے جان بوجھ کر اپنی آواز میں کپکپاہٹ طاری کر لی۔ وہ کسی تو کسے بچے کی طرح بول رہی تھی۔ فالج کے حملے کے بعد اسے بولنے میں گفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی تین انگلیاں اور دایاں جبرائیل متاثر ہوا تھا۔ اس کے نیورولوجسٹ نے یقین دلایا تھا کہ اگر ایسی باقاعدگی سے ایکسرسائز کرتی رہی تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی غذا اور دواؤں کا بھی خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ایسی گھر نہیں جاسکتی تھی جب تک اس کا نیورولوجسٹ اس کی پروگریس سے مطمئن نہ ہو جائے اور اس کا انفصاری ہیلری کی رپورٹ پر تھا۔ اس طرح ایسی اپنے فزیوتھراپسٹ کی اسیر ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی طرف سے کلینکس ملنے کے بعد ہی وہ گھر جاسکتی تھی۔

قسمت بھی کیسے کیسے رنگ دکھائی ہے۔ اسکول کے زمانے کی لڑاکائی پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ایسی پر حکومت کر رہی تھی۔ اس کے طور طریقے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو اسکول کی طالبہ ہی سمجھتی ہے۔

”ہاں، یہ میں ہی ہوں۔“ ہیلری نے جواب دیا۔ ”تمہاری یادداشت اب بھی بہت اچھی ہے، البتہ تمہارے جسم پر چربی چڑھ گئی ہے جسے کم کرنے کی ضرورت ہے۔ چلو، اب جلدی سے گالوں کو دباؤ۔“

سفید بالوں والا نام ایک بار پھر ایسی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

ہیلری ٹپکتے ہوئے بولی۔ ”ہائی اسکول چھوڑنے کے بعد سے لے کر اب تک میرے وزن میں ایک پونڈ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔“

ایسی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہیلری کا وزن پہلے سے کم ہوا ہے۔ اسکول کا ڈھلاؤ حالاً یونیفارم بھی اس کے جسم میں روتا ہونے والی تبدیلیوں کو چھپانے سے قاصر تھا لیکن اب اس کا جسم ڈھلک گیا تھا اور ستواں بازوؤں پر شکستیں پڑ گئی تھیں۔

”یہ ابھی تک اپنے آپ کو تیس کی ہی سمجھ رہی ہے۔“ نام نے سرگوشی کی۔ ایسی نے زور زور سے کھانسا شروع کر دیا تاکہ اس کھانسی میں نام کی سرگوشیاں دب جائیں۔ ہیلری نے ایسی کو گھورا۔ اس کی نظریں ایسی کے بالوں پر جم گئیں۔ پھر وہ نام سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”اگر تمہارے اندر بولنے کی طاقت ہے تو تم زیادہ سخت مشقیں بھی کر سکتے ہو۔“ ہیلری نے کہا۔ ”اپنی داغوں کو اس طرح حرکت دو جیسے سائیکل چلا رہے ہو۔ ایسی تم بھی کوشش کرو۔“

”بہتر ہوگا کہ تم زبان کے بجائے اپنے پیروں کو حرکت دو۔“ ہیلری ناگوار سے بولی۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی زیادہ اتھانے اور آرام کرنے کی وجہ سے اس مرض میں مبتلا ہوئے ہو۔“

نام کا پیٹ تھوڑا سا نکلا ہوا تھا لیکن اس سے اس کی مردانہ وجاہت پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ایسی نے سوچا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے لگی۔

ہیلری سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ غصے سے بولی۔ ”تم دونوں اپنی ایکسرسائز جاری رکھو۔ میں یہاں تمہاری زندگی پر سکون بنانے کے لیے نہیں بیٹھی ہوں۔“

ایسی کہنا چاہ رہی تھی کہ اسے زندگی میں کبھی سکون نہیں ملا۔ اسے کسی سے اتنی محبت نہیں ملی کہ وہ شادی کر لیتی، شاید اتنی فرصت بھی نہیں ملی۔ پہلے وہ اپنی ماں کی چار داری کرتی رہی پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے گھر کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ وہاں اس نے اپنی ماں کے نام پر ایک پارک بنا دیا اور خود ایک شیم خانے میں رضا کارانہ طور پر کام کرنے لگی۔ اس نے کچھ بہت اچھے دوست بھی بنالے تھے ورنہ وہ تنہا مر جاتی۔ جس دن فالج کا حملہ ہوا، اس روز بھی بار بار کافون آیا تھا جب اس نے جواب نہیں دیا تو وہ سمجھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

ناراضہ آئی اور اسے اسپتال پہنچایا اور نہ وہ بچ نہ پائی۔ اب بھی وہ اس کی بلی کسی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ہیلری نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا ہو۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا جس میں شادی کی انگلی بھی پہنی ہوئی تھی اور تحقیر آمیز لہجے میں بولی۔ ”تمہیں کبھی یہ انگلی بھی پہننا نصیب نہ ہوئی۔ میری تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی بھی شادیاں ہو گئی ہیں، میرے پانچ نواسے نواسیاں ہیں لیکن تمہارے مرنے کے بعد کون تمہارا وارث ہوگا؟“

”میں نے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ لوگوں کو میری یاد دلانا رہے گا۔“ اس بار ایسی کا لہجہ قدرے تیز تھا۔ ”جب بھی ہمارا موسم آئے گا اور بچے اس پارک میں کھیلنے گئے۔“

”کیا؟“ ایسی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں ابھی تک پچاس سال پہلے کا وہ نورمانٹ یاد ہے؟“

”بالکل۔“ وہ فخریہ انداز میں بولی۔ ”میں ایتھلیٹ ہوا کرتی تھی اور میری الماری ٹرافیوں اور میڈلز سے بھری ہوئی ہے۔ ہم وہ نورمانٹ بھی جیت جاتے مگر تم نے گولی کرنے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔“

ایسی کا دل چاہا کہ اس کی پشت پر زوردار لات رسید کرے۔ وہ اسے پچاس سال پہلے کی بات یاد دلا کر نام کی نظروں میں گرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے بے دھیانی میں اپنا ہاتھ زور سے اوپر اٹھالیا تو اس کی پیچ نکل گئی۔ نام جلدی سے اس کے قریب آیا اور آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے وہ مسکرا دی۔ اسی وقت جیسے اس کی وہیل چیئر کے کرا گیا اور بولا۔

”مس ایسی کے کمرے میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔“ جیسے نے سہارا دے کر ایسی کو پلیٹ فارم سے اتارنے کی کوشش کی لیکن ہیلری نے اسے منع کر دیا اور بولی۔ ”تمہیں مدد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے خود سے کوشش کرنے دو۔“

ایسی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کے کنارے تک آئی اور درد سے کراہتے ہوئے وہیل چیئر پر بیٹھ گئی۔ اس نے نام کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب جواب میں نام نے بھی ایسی ہی کیا۔ جیسے اس کی وہیل چیئر کھینچنے ہوئے ہیلری کی نظروں سے دور ہو گیا۔ راستے میں اس نے ایسی سے پوچھا۔ ”یہ بڑھایا کیا کمرہ رہی ہے؟“

”بہ ظاہر تو یہ بڑی نامعقول سی بات ہے۔ میں ہائی اسکول کے بعد اس سے بھی نہیں ملی۔ وہاں بھی وہ مجھ سے اسی طرح لڑتی تھی۔ وہ ابھی تک یہ سوچ کر پاگل ہو رہی ہے کہ پچاس سال پہلے وہ میری وجہ سے ہائی نورمانٹ ہار گئی تھی۔“

چاندنی



2011

خطی

سچائی اور ایمانی کاراستہ شخص کا منتظر رہتا ہے لیکن اس راستے کو بہت کم لوگ منتخب کرتے ہیں۔ سچ اور جھوٹ کا ٹکڑا متروک

لکار

جان لکار۔ عمران کی زندگی کے گمشدہ اور اوراق جس کی ہر سطر میں جوش جستجو اور سنسنی پنہاں تھی

گرداب

ماہ بانو کی نہ ختم ہونے والی مشکلات۔ جو ہر دفعہ اسے ایک نئے دورا ہے پر لا کھڑا کر دیتی ہیں۔

مرد و زن

مدفن۔ مریحہ کے خاتم ظلم اور جبر کا دورانیہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ مکافات عمل ایک دن ضرور آتا ہے

مسافرتیں

زندگی کی اونچی نیچی چمکندیاں جہاں ہر قدم لغزش کی زد میں تھا

جرم کھائیں

بر جرم کے چپکے کوئی نہ کوئی واقعہ مضمر ہوتا ہے۔ انہی تغیرات سے جنم لینے والی۔ ناقابل فراموش کہانیاں

چنی رکتہ چینی

آپ کے تہرے۔ مشورے۔ محبتیں۔ شکایتیں۔ اور نئی دلیپ باتیں۔ آپ کے کلمے

2011

کی ملاقاتوں میں گپ شپ کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ کوشش کروں گی کہ اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔

دوسرے دن ایسی کلاس میں گئی تو ایس اپنے پیٹ فارم پر موجود نہیں تھی اور اس کی ماگھی بیٹی اکیلے ہی مشقیں کر رہی تھی۔ اس نے بٹری سے پوچھا۔ ”کیا ایس گھر چلی گئی؟“

”نہیں۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”کیا اس کی تکلیف بڑھ گئی ہے؟“

”جہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔“ بٹری نے ناگواری سے کہا۔ ایسی کا دل چاہا کہ اس کا منہ لوج لے۔ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا بھتی ہے لیکن نام کے اشارہ کرنے پر وہ خاموش رہی۔ اس شام نام جب اس سے ملنے آیا تو کافی پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے ایسی کو بتایا۔

”میرے روم میٹ مسٹر ویم کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر ان کا مسئلہ معائنہ کر رہے ہیں۔“

”خدا خیر کرے۔“ ایسی بھر دی سے بولی۔ ”میں ان کے لیے دعا کروں گی۔“

”میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔“ نام اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اتنی جلدی کیا ہے، تجھو اس انتظار کر لو۔“

دوسری صبح بار بار اس سے ملنے آئی تو اس کا چہرہ خوش سے دمک رہا تھا۔ وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ”میں نے نام کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ وہ حج معنوں میں ایک نفیس اور وفادار انسان ہے۔ اس نے جہاں تک ممکن ہو سکا اپنی بیوی کی آخر وقت تک خدمت گزاری کی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی بیوی کی بیماری کے دوران میں مکمل کی کچھ عورتوں نے نام پر زور سے ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے انہیں بالکل بھی منہ نہیں لگایا اور ہمیشہ اپنی بیوی کا وفادار رہا۔ بیوی کے مرنے کے بعد اس کا کچھ عورتوں سے ہلکا سا تعلق رہا لیکن یہ کوئی اتنی سنجیدہ بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوگا۔“

”میں جانتی ہوں۔“ ایسی بولی۔ ”اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے۔“

”میرے پاس اور بھی بہت سی معلومات ہیں۔ تم سونگی تو میرا رہ جاؤ گی۔“ بار بار پرجوش لہجے میں بولی۔

”بٹری کا شوہر میں دس سال پہلے اسے چھوڑ کر اپنی سیریز کی کے ساتھ میکسیکو چلا گیا تھا۔ اب بٹری اپنی

نام ان سب کا جواب دیتا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ بھی نہ تھا اور شاپ سے آخری گپ کا بھی چلا گیا۔ بیروں نے ساری میز صاف کر دی تھیں اور فرش پر پوچھا جا رہے تھے۔ نام نے اس سے پہلے ایک بار بھر کہا۔

”ایسی اہم دونوں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ کیوں نہ بقیہ عمر سے پوری طرح لطف اندوز ہوئیں۔ پلیر سے شادی کر لو۔“

ایسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اتنی عمر صورت انگوٹھی کہاں سے خریدی؟“

”میرا دوست جیک کا روم، جیولری شاپ کا مالک یہ انگوٹھی اسی نے منتخب کی ہے، کیا تمہیں پسند نہیں آتی؟“

”نہیں، بہت اچھی ہے لیکن یہ سب کچھ اچانک ہو گیا۔ مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔ یہ کہہ کر اس نے انگوٹھی کی دنیا اپنی جیب میں رکھ لی بہت خوش تھی اور اپنے آپ کو آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ نام اسے کمرے کے دروازے تک چھوڑنے آیا اور اس کی جانب جھٹکتے ہوئے بولا۔

”اس خوب صورت شام کے لیے تمہارا شکر یہ دیر ہو گئی ہے۔ اب مجھے اپنے کمرے میں جانا چاہیے۔“

ایسی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی جب اس کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تو وہ بھی اپنے بستر پر آگئی اور سر ہانے وہ گلاب رکھ لیا جو نام نے اسے دیا تھا۔

اس رات وہ ٹھیک طرح سے سونے لگی۔ اس کے بعد میں امیدیں، امکانات، دوسرے اور خدشات سب کچھ گل ہو رہا تھا۔ صبح جب بار بار ملنے آئی تو اس نے یہ خیر اسے بھی دی۔ وہ خوشی سے اچھلتے ہوئے بولی۔

”واہ، تو بڑی زبردست خبر ہے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ یہ ہولناک بیماری تمہیں ایک نئی زندگی کی طرف لے جائے گی۔ اگر میں پریشان ہونے والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ ایسی بولی۔ ”لیکن میں نام کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتی۔ گو کہ وہ ہمارے ہی علاقے میں رہتا ہے لیکن میں پہلے بھی اس سے یا اس کی مرنے والی بیوی سے نہیں ملی۔ نہ جانے اس کا نام کیا ہے؟ وہ اب تک کیا کرتا رہا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بس وہی کچھ جانتی ہوں جو اس نے خود بتایا ہے۔“

”میں آج ایک میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے تہیج جا رہی ہوں۔“ بار بار بولی۔ ”تم تو جانتی ہو کہ اس طرح

لیں جو بار بار اس کے لیے لاتی تھی۔ نام نے بھی کچھ کم تیاری نہیں کی تھی۔ اس نے اپنا وہی نیوی بیورنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جو ایسی کو بہت پسند تھا۔ ان دونوں نے اپنے دائرہ کافی شاپ کی میزوں کے نیچے رکھے۔ ہوش انہیں ایک کونے کے کین میں لٹکی ہوئے پیلے سے ان کے لیے مخصوص تھا۔ اس کی میز پر ایک شمع اور گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔

”یہ پھول تمہارے لیے ہے۔“ نام نے وہ گلاب اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

اس ملاقات میں ایسی نے نام کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ماں کی بیماری اور دیکھ بھال میں جتنا عرصہ گزارا، دوستوں کے ساتھ رہ کر اس نے کس طرح اپنی تہائی دور کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں کی بھلائی کے لیے رضا کارانہ خدمات انجام دیں اور آخر میں اس نے اپنی بی بی کیسے کے بارے میں بھی بتا دیا۔

”تمہیں بھی بلیاں پسند ہیں۔“ نام نے پوچھا۔ ”میرے پاس بھی ایک بلی ہے، میں اسے دلیر کہہ کر بلاتا ہوں۔ ان دنوں میری بیٹی کیرن اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔“

”لگتا ہے کہ تمہارے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔“

”بالکل۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔“ نام نے کہا اور اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نیکی ڈیبا نکالی جس میں ایک ہیرے کی انگوٹھی جکڑا رکھی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ایسی! کیا تم میری بیوی بننا پسند کرو گی؟“

”تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“ ایسی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ جلد بازی کیسے؟ میں تم سے کبھی اس اسپتال کے باہر نہیں گئی۔ کبھی تمہارے گھر نہیں گئی اور نہ ہی تم میرے گھر آئے۔ ہم تو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں۔“

”ہم یہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد شادی کر سکتے ہیں۔ ہم نے مشکل حالات میں ایک دوسرے کو کچھ لیا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، مجھے تمہارے ساتھ رہ کر خوشی ہوگی۔“

”تم جانتے ہو کہ میری عمر بہت زیادہ ہے۔“

نام نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”ہوگی لیکن میرے لیے بالکل مناسب ہے۔“

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

اس نے بعد اچھی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور

”میں اسے چتے رہوں گی۔“ انہی نے جواب دیا۔ وہ

العدد 1 لسنة 2011


 پیدا ہوا تھا
 محقول نہیں میر
 SMS

جب وہ دونوں واپس آئے تو انہوں نے غام کے کمرے میں ڈاکٹر اور نرسوں کا ہجوم دیکھا۔ نام بولا۔ ”جے چارہ ولیم انرس کہہ رہی تھی کہ اسے اسٹیشن ہو گیا ہے۔“ اس کا جملہ ختم ہوتا ہی نرس باہر آئی اور بولی۔ ”جسٹین

2011年1月1日

کچھ دیر باہری انتظار کرنا ہوگا۔ ہم مسٹر ولیم کو انٹرنیشنل روم میں منتقل کر رہے ہیں۔

”میں نے کسی میگزین میں پڑھا تھا کہ یہ جراثیم مریضوں میں ایک دوسرے سے منتقل ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہر سال دس لاکھ لوگوں کی موت واقع ہوتی ہے۔ جتنے دن تم یہاں رہو گے۔ خطرہ بڑھتا ہی جائے گا۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔“ ایسی خوف زدہ لہجے میں بولی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میرے بس میں کچھ نہیں۔“

نام بولا۔ ”صرف ہیلری ہی مجھے اس خطرے سے نجات دلا سکتی ہے۔“

اس رات ایسی ٹھیک طرح سو نہ سکی۔ اسے ہر طرف موت نظر آ رہی تھی۔ یہ جراثیم کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ نام کی میز کے نیچے فرش پر، بغیر دھلے برتنوں میں۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر چلی آئی۔ اس کا رخ نام کے کمرے کی جانب تھا، وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ ایسی واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے محبوب کی زندگی بچائے گی۔

دوسری صبح وہ وقت سے پہلے ہی مشقوں کے لیے چلی گئی۔ ہیلری اسے دیکھ کر حیران تو ہوئی لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایسی بول پڑی۔ ”میں تم سے نام کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اس کا گھر جانا بہت ضروری ہے۔“

”جب تک اس کا علاج مکمل نہیں ہو جاتا وہ گھر کیسے جا سکتا ہے؟“

”تم جانتی ہو کہ اسپتال کے مریضوں میں انفیکشن پھیل رہا ہے جو نام کے لیے بھی خطرناک ہے۔“

”ایسے مریضوں کو علیحدہ رکھا جاتا ہے، نام بالکل محفوظ ہے۔“

”یہاں کوئی محفوظ نہیں۔“ ایسی بولی۔ ”بھئی، ایس اور مسٹر ولیم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔“

”تم اتنی مایوس کیوں ہو رہی ہو؟“ ہیلری طنز آ بولی۔

”ویسے بھی تم نے چھ ماہ سال مزد کے بغیر گزار لیے۔ چند برس اور اسی طرح رہو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

نام کلاس میں آیا تو خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے ایسی کو بتایا کہ مسٹر ولیم کا رات میں انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر ایسی خوفزدہ ہو گئی۔ نام کا ستر بھی تو مسٹر ولیم کے برابر میں ہی تھا۔ اسی طرح کلاس میں بھی بیٹی اور ایس اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ایسی کا دل مشقوں میں بالکل نہیں لگا اور وہ سارا وقت یہی سوچتی رہی کہ نام کی زندگی کس طرح بچائی جائے؟

وہ بدحواسی کے عالم میں کلاس سے لگی اور بے مقصد

اسپتال میں ٹھہرنے لگی۔ گفت و شنید کے برابر میں نصیب اسے ایسی مشین پر اس کی نظر پڑی تو اچانک ہی اسے نام کی زندگی بچانے کا طریقہ سوجھ گیا۔ اس نے گہری پر نظر ڈالی۔ ہیلری کی کلاس ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ آہستہ آہستہ لفٹ کی طرف گئی اور اس کی کلاس ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ہیلری اس وقت اپنے کمرے میں تباہی اور چادر میں سمیٹ کر لائڈری بیگ میں رکھ رہی تھی۔ ایسی کو دیکھتے ہی بولی۔

”تم کل جا رہی ہو؟“

”میں اسی سلسلے میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔“

ایسی بولی۔ ”میرا امکان اونچائی پر واقع ہے اور مجھے سیزمیا چڑھنے کے لیے مزید مشق کی ضرورت ہے۔“

”تم نے پہلے ہی کلاس میں سیزمیا چڑھنے کی کالی مشق کر لی ہے۔“ ہیلری لکڑی کی سیزمیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تم محض اپنے دوست کے ساتھ رہنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہو۔ بہر حال کل صبح گیارہ بجے تمہاری رواجی سے“

”میں خود بھی جانا چاہتی ہوں۔“ ایسی نے کہا۔ ”لیکن“

میرے مکان کی بیس سیزمیا ہیں۔ اس لیے مجھے کسی بڑی سیزمیا پر مشق کی ضرورت ہے جیسی کہ آگ بجھانے والوں کے پاس ہوتی ہے۔“

”یہ اسپتال کے قوانین کے خلاف ہے۔“ ہیلری بولی۔ ”ہمارے پاس ایک ایسی سیزمیا ہے لیکن میں تمہیں اس پر مشق نہیں کروا سکتی۔ ویسے بھی وہ سیزمیا سارا دن اسپتال کے عملے کے استعمال میں رہتی ہے۔“

”میں اپنے گھر کی سیزمیا سے گرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“ ایسی نے کہا۔ ”اگر تم مجھے پرائیویٹ طور پر مشق کروادو تو میں تمہیں سو ڈالرز دوں گی۔“

ہیلری لالچ میں آگئی۔ جیسا ہمیشہ سے اس کی کمزوری اور ضرورت رہا تھا۔ اس نے اپنا بھاء بڑھانے کے لیے کہا۔

”اس کام میں خطرہ بہت ہے۔ اس لیے دو سو ڈالرز دوں گی۔ یہ مشق صبح چار بجے ہوگی، اس وقت یہ سیزمیا فارغ ہوتی ہے کیونکہ رات میں لوگ زیادہ تر لفٹ کا استعمال کرتے ہیں۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ ایسی بولی۔ ”اس طرح میں صبح چھ بجے ٹرس کے آنے سے پہلے اپنے کمرے میں جاؤں گی۔“

”مجھے نقد رقم چاہیے۔“ ہیلری نے کہا۔

”مل جائے گی۔“

وہ اپنا دکر گھسیٹتے ہوئے اسے فی ایمینٹین تک مٹی اور وہاں سے دو سو ڈالرز نکالے پھر اس نے گفت و شنید سے

کے لیے ایک نیا جاسوسی ناول خریدا۔ جب ایسی نے یہ ناول اسے دیا تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم ناراض ہو، اسی لیے کسی کو خدا حافظ کہے بغیر کلاس سے چلی آگئی۔“

”میں یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی کہ مزید لوگ اس انفیکشن میں مبتلا ہو گئے ہیں، کچ پوچھو تو میں تمہارے بارے میں فکرمند ہوں۔“

نام نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کوئی میرے لیے بھی فکرمند ہوتا ہے۔“

ایسی اور نام دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب نام کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو ایسی نے چپکے سے اس کا گٹ بیگ اٹھا لیا اور اپنے واکر کے خانے میں رکھ لیا پھر وہ ہال کے آخری سرے تک گئی جہاں ایک کوزے دان میں پلاسٹک کی استعمال شدہ ٹیوبیں رکھی جاتی تھیں۔ اس نے ایک لمبا پلاسٹک کا ٹکڑا اٹھا لیا اور اسے رول کر کے گٹ بیگ میں رکھ لیا پھر وہ اپنے کمرے میں گئی اور اپنی دراز سے چپکانے والا ٹیپ اور ایک چھوٹی پینچی نکال کر بیگ میں رکھ لی۔ وہ دو جوزی دستاؤں کا پہلے ہی انتظام کر چکی تھی۔

ایسی کو ڈر تھا کہ کہیں وہ سوئی نہ رہ جائے لیکن وہ ایشوری طور پر سناڑھے تین بجے ہی جاگ گئی اور وقت گزاری کے لیے ہال میں پڑی بیچ پر بیٹھ کر پڑنے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اچانک ہی لاؤڈ اسپیکر پر ہنگامی صورت حال کا اعلان ہو گیا اور تمام ڈاکٹرز، نرسیں ایک کمرے کی جانب لپکے۔ شاید کسی مریض کی حالت بگڑ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں بالکل سناٹا ہو گیا۔ ایسی نے موقع غنیمت جان کر سیزمیا کی طرف والا دروازہ کھولا۔ دستاں پہنے، پلاسٹک کی ٹیوب کو سیزمیا کے آ پار پھلایا اور اس کے دونوں سروں پر ٹیپ چسپاں کر دیا گوکہ اسے ٹھکان تو نہیں ہوئی لیکن اس کا سانس ضرور پھول گیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر ایسی واپس ہال میں آگئی اور دوبارہ پڑنے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ چار بجنے میں پانچ منٹ پر ہیلری بھی آگئی۔ اس نے پہلا سوال پتیسویں کے بارے میں کیا۔ ایسی نے فوراً ہی اپنی جیب سے وہ رقم نکال کر اسے پکڑادی۔ ہیلری نے اسے اشارہ کیا اور وہ آہستہ آہستہ آگ بجھانے والی سیزمیا پر چڑھ گئی۔ جب وہ واپس آ رہی تھی تو ایک سیزمیا پر پہلے لکڑی لگی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

”تم نے ایک بار پھر اپنا دھیان ہٹا دیا۔“ ہیلری بولی۔

”تم اسکول میں بھی اسی طرح کیا کرتی تھیں۔ میں بتاتی ہوں کہ سیزمیا کس طرح اترتی چاہئیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ایسی کے ہاتھ سے واکر لے لیا اور نیچے جانے والی سیزمیا کی طرف قدم بڑھایا۔ واکر کا پتلا حصہ پلاسٹک کی ٹیوب میں چسپاں کیا جو ایسی نے سترمیں کے آ پار چپکار رکھی تھی۔ ہیلری اڑکھڑا کر گری۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا۔ ایسی نے جلدی سے واکر باسٹ میں سے دستاؤں کی دوسری جوزی نکالی۔ پلاسٹک کی ٹیوب اور ٹیپ کوریٹنگ سے علیحدہ کیا اور دونوں چیزیں باسٹ میں ڈال دیں۔

ہیلری بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کی گردن ہاکی اسٹک کی طرح ایک خاص زاویے سے مڑ گئی تھی۔ ایسی نے اس کی جیب سے دو سو ڈالرز نکالے اور گٹ بیگ میں رکھ لیے۔ اگر یہ ڈالرز ہیلری کی جیب سے برآمد ہوتے تو لوگوں کے ذہنوں میں کئی سوالات جنم لے سکتے تھے۔ چھ بجے کے قریب ٹرس اس کے کمرے میں آئی اور معمول کے مطابق اس کا بلڈ پریشر اور نمبر پچر وغیرہ چیک کیا۔ تھوڑی دیر بعد بار بار بھی آگئی اور اس کا سامان چیک کرنے میں مدد کرنے لگی۔ رخصت ہوتے وقت وہ نام سے ملنے لگی اور وعدہ کیا کہ وہ روز انداز سے ملنے آیا کرے گی۔

ہیلری کی جگہ دوسری فزیو تھراپسٹ آگئی۔ یہ ایک جوان اور خوش اخلاق لڑکی تھی جس نے حال ہی میں کالج سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ صاف دلی اور نرم مزاج تھی اور ہیلری کی طرح لوگوں سے بغض اور کینہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے نام کا معائنہ کیا اور دو دن بعد اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ایسی کو اپنے کیے پر کوئی افسوس نہیں تھا بلکہ وہ مطمئن تھی کہ اس طرح اس نے نام اور دوسرے فانی زدہ مریضوں کی زندگی بچا لی تھی۔

ایسی اور نام نے خزاں کا موسم شروع ہوتے ہی شادی کر لی۔ تقریب کے دوران میں ایسی ہاتھوں میں گلدستہ لیے اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ باربرائے اس سوختے پردہن کی سبکی کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ نام نے اپنی دہن کے کان میں سرگوشی کی۔

”ایسی کہ اس بار ہمارے لیے خزاں بھی بہار بن کر آئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے ہیلری کا کرخت چہرہ آگیا۔ وہ پتے لگی کہ کیا اس کی زندگی میں ایسا ممکن تھا؟



پارسائی

محی الدین نواب

سچ ہی کہا ہے ”آنکھ دھوکا ہے... کیا بھر وسا ہے... آدمی ٹھیک سے دیکھ پاتا نہیں اور پردے پہ منظر بدل جاتا ہے...“ وہاں بھی جو کچھ ہو رہا تھا، ایسا کب ہوا تھا جیسا دکھائی دے رہا تھا... کسی مظلوم کی آہوں اور سسکیوں کو ایک بے چس خاموشی نے اپنے اندر اتار لیا تھا۔ یہ شمار تماشائی تھے مگر کان سن رہے تھے... نہ آنکھ دیکھ رہی تھی اور نہ ہی دلوں میں کوئی احساس کروتا رہا تھا... پھر کچھ لمحے بیتے... موسم بدلا... کسی کا حال ماضی میں ڈھل گیا۔ پھر وقت کی رفتار میں کسی کی آہٹ سنائی دی... کچھ گنگنائی سرگوشیاں دلوں میں چٹکیاں لینے لگیں... سرد مہری سے بھنچے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ کھیلنے لگی کہ اچانک ماضی اٹھنے بن کر سامنے آگیا... اور پھر ساری صورتیں گڈمڈ ہو گئیں... ایسا تو ہونا ہی تھا... جب ٹھیک سے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو تو فیصلے صادر نہیں کئے جاتے... کیونکہ جب پارسا نظرانے والے نارسائی کے بھنور میں پھنستے ہیں تو اپنی ذات، اپنی سچائی کو ثابت کرنا کس قدر آزمائش میں ڈال دیتا ہے اس کا اندازہ کرنا اگرچہ مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔ مگر مقدر کی آزمائش پر پورا اترنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات بھی نہیں۔



جسب رات اپنا کلام چھانے کو ہو اور دن کا اجالا پوری آب و تاب کے ساتھ بھیلنے کو ہو تب اس ہونے اور نہ ہونے کے دوران ایک صدمہ گونجتی ہے۔

ایک پیغام ابھرتا ہے۔ وہ مقدس پیغام کھلے عام دعوت دیتا ہے غفلت کی خیند سونے والوں کو بکار بکار کر کہتا ہے۔ ”آؤ صوم و صلوة کی طرف... آؤ اپنی فلاح اور کامیابی کی طرف... نماز خیند سے بہتر ہے... نماز خیند سے بہتر ہے...“

جو بہتر سمجھتے ہیں وہ اپنی بہتری کے لیے بستر چھوڑ دیتے ہیں۔ فلاح پانے کے لیے اس صدمائے مقدس کی سمت چل پڑتے ہیں اور جو عاقبت نااندیش ہوتے ہیں وہ بستر کی راحت میں جبر سے کاسکون بھول کر اوندھے پڑے رہ جاتے ہیں۔

مولانا فضل کریم آٹھ کر بیٹھ گئے۔ فجر کی اذان جیسے ان کے خوابیدہ دماغ میں آکر صبح بکھر گئی تھی۔ نئے سورج کے ابھرنے کی نوید سنائی تھی۔ یہ ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ معمولات زندگی میں کہیں ایک ذرا سا بھی فرق آجائے تو وہی بات غیر معمولی ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ بھی کچھ غیر معمولی ہو گیا تھا۔ وہ روز کی طرح آٹھ کر بیٹھے تھے۔ مگر اس کی وجہ اذان نہیں تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے اب تک عشا کی نماز کے بعد انکی گہری خیند آتی تھی جیسے

ماں نے لوری سنائی ہو اور فجر کی اذان انہیں گہری خیند سے آپ ہی آپ اٹھا کر بخدا بتا دیتی تھی۔ لیکن اس روز کیا ہوا تھا؟ وہ بستر پر بیٹھے کمرے میں ادھر ادھر ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہوں۔ انہیں اپنی الجھن سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر ہوا کیا تھا؟

اذان نے دستک نہیں دی تھی، پھر آنکھوں کی کھڑکیاں کیسے کھلی گئی تھیں؟ خود بخود دیکھ نہیں ہوتا۔ کچھ ہونے کے لیے پہلے سے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔

چند لمحوں بعد ہی اذان گونجنے لگی مگر ان کے دماغ میں چوڑیوں کی کھٹک گونج رہی تھی۔

ہاں... وہ چوڑیوں کی کھٹک ہی تو تھی۔ الجھن اسی لیے تھی کہ اس گھر میں کسی عورت کا وجود نہیں تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد کوئی عورت کسی رشتے سے اس گھر میں نہیں آئی تھی۔ پھر چوڑیاں کہاں سے آجائیں؟

چوڑیاں سر میں ہوتی ہیں۔ مگر ان کے لیے جو محبت کے سرنال اور جذبوں کی چال ڈھال کو سمجھتے ہوں اور یہ سوچ بوجھ تب ہی آتی ہے جب انسان جذبوں میں ڈوب کر کھٹکتا ہے۔

مولانا فضل کریم نے زندگی کے بہت سے اسباق پڑھے تھے۔ مگر ابھی وہ... آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا

ہے... کے سبق سے قطعی نا آشنا تھے۔ اسی لیے چوڑیوں کی سرگم نے انہیں چونکا دیا تھا اور وہ بڑا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ وہی کھٹکتی ہوئی آواز پھر کہیں سے لہرائی ہوئی آئی۔ وہ

فورا ہی بستر سے اتر گئے۔ اب تک اس نے جذب میں تھے کہ کسی خواب کے باعث آنکھ کھل گئی تھی۔ اب پورے ہوش و حواس میں رہ کر انہوں نے سنا تھا۔ چوڑیوں نے نہیں سرگوشی کی تھی۔

مگر کہاں...؟ وہ حلاشاً نظروں سے کمرے کو دیکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے۔ ان کا گھر سوئی کلائی جیسا تھا۔ چوڑیوں کی کھن کھن ریشمی آنچل کی سن سن اور پائوں کی چھن چھن سے نامانوس... پھر وہ آواز...؟

انہوں نے بڑے کمرے میں اور جاتی ہوئی سیڑھیوں کو دیکھا۔ دراز کرک سننے کی کوشش کی۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ باہر آگن میں آگئے۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔

وہ بھی کسی عورت کے پیچھے نہیں بھاگے کسی کو اپنی زندگی میں نہیں لائے۔ مگر اب کوئی تھی جو چوڑیوں کی دستک دے کر انہیں جانے انجانے میں اپنے پیچھے لگا رہی تھی۔

وہ کون تھی؟ کہاں تھی؟ وہ گھر کے نچلے حصے کا کونا کونا دیکھنے کے بعد پچھلے حصے میں نصب کیے گئے کھڑکی کے زینے سے اوپر آگئے۔ وہاں کھلی چھت کے چھوٹے چھوٹے کمرے میں اترتا تھا اور ایک طرف پختہ زینہ تھا جو نیچے بڑے کمرے میں اترتا تھا۔ وہ دے قدموں چلتے ہوئے چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے کمرے کے دروازے کے پاس آئے پھر اس کے پینڈل کو دھیرے سے

گھما کر ایک جھٹکے سے پوری طرح کھول دیا۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ وہ کمرہ ایک طرح کا استور روم تھا۔ وہاں گھر کی غیر ضروری اشیاء اور دیگر کا کٹھ کباڑ رکھا جاتا تھا۔ اس کمرے سے ملحقہ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ

مقاطع انداز میں چلتے ہوئے وہاں آئے۔ گھر کے دوسرے حصوں کی طرح وہ بھی خالی تھا۔

انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ پختہ زینے سے اترتے ہوئے نیچے بڑے کمرے میں آگئے۔ یہ چوڑی والی ملی تھی اور نہ ہی اب چوڑیوں کی کھٹک مل رہی تھی۔ معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ آواز ان کا وہم و گہم تھی۔

انہیں سمجھ جانے تو دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ مگر وہ اچھے

ہوئے تھے۔ کیونکہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایسے ہی وقت بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ ”مولانا صاحب...!“

مولانا فضل کریم نے ذریعہ کہا۔ ”اوہ۔ قادر جان...“ انہوں نے فوراً ہی باہر آکر دروازہ کھول دیا۔ قادر جان چائے کی دو پیالیاں اور تھرماس لیے کھڑا تھا۔ اندر آتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا دروازہ بند دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ تو اذان سننے ہی بستر سے نکل کر سب سے پہلے دروازے کی چنجی گراتے ہیں۔ پھر فجر کے بعد

یہ دروازہ بند ہوتا ہے۔ مجھے بھی دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پھر آج کیا ہوا؟“

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ”ہاں۔ آج کیا ہو رہا ہے؟ میں قادر جان سے کیسے کہوں...؟“

انہوں نے کہا۔ ”نہیں، کچھ نہیں ہوا۔“

”آپ کو دیکھ کر ایسا بھی نہیں لگ رہا کہ میری دستک سن کر جاگے ہیں اور ابھی بستر سے نکل کر آئے ہیں۔“

”کیونکہ میں جاگ رہا تھا۔“

”جاگ رہے تھے پھر بھی دروازہ بند تھا؟“

”ارے... بھی کیا معمول سے بہت کچھ نہیں ہو سکتا؟“

”بے شک ہو سکتا ہے مگر ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے نا...؟“

سنا اور متاثر ہوتا تھا۔ ان کی ہدایات کے مطابق اب کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتا تھا مگر مولانا کے خلاف کوئی بات سنا گوارا نہیں کرتا تھا۔

اس نے اچھوپان والے سے کہا۔ ”بولو کیا بات ہے؟“ وہ ذرا ڈرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ابھی ایک کھٹکا پہلے مولانا صاحب کی چھت پر ایک عورت کو دیکھا ہے۔“

قادر جان نے اسے ٹھوکر کر دیکھا۔ پھر پلٹ کر مولانا صاحب کے مکان کی چھت پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ ”وہاں تو اندھیرا ہے۔ تم نے کسی کو کیسے دیکھا؟“

وہ بولا۔ ”میں نے صاف طور پر نہیں دیکھا۔ اس کا دوپٹا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ بس وہ ذرا دیر کو دکھائی دی تھی۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔“

”مولانا صاحب کی چھت کے ساتھ تین مکانوں کی چھتیں ملی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان چار چار فٹ کی منڈیریں بنائی گئی ہیں۔ کوئی بھی مرد ہو یا عورت... کسی ضرورت سے ان کی چھت پر آ جاتی ہوگی۔“ قادر جان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ”میں یہاں برسوں سے پاں لگا رہا ہوں۔ رات کے ایک بجے تک دکان کھلی رکھتا ہوں۔ آج سے پہلے کبھی کسی عورت کا سایہ تک وہاں نہیں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار دیکھا تو سمجھیں بتا رہا ہوں۔“

”کیا رات کو کوئی عورت کسی ضرورت کے تحت چھت پر نہیں آ سکتی؟ مولانا صاحب کا یہ سامنے والا دروازہ بھی صبح اذان کے بعد سے رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ کسی کے لیے آنے جانے کی ممانعت نہیں ہے۔“ قادر جان اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

وہ پھر پچھتاہٹے ہوئے گویا ہوا۔ ”ہاں۔ مگر وہ عورت... اور رات کے وقت چھت پر...؟“

وہ غصے سے بولا۔ ”ابے تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“ وہ کم کر بولا۔ ”کچھ نہیں، میں نے جو دیکھا وہی تم سے کہہ دیا۔ اسے میری غلطی سمجھ کر بھول جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔“

قادر جان نے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اسی صورت میں معاف کروں گا کہ اب یہ بات کبھی تمہاری زبان پر نہیں آئے گی۔ کسی کے سامنے مولانا صاحب کی چھت پر کسی عورت کی موجودگی کا ذکر نہیں کرو گے۔“

وہ کان پکڑتے ہوئے بولا۔ ”میری توبہ... میرے باپ کی توبہ... سمجھو میں یہ بات بالکل بھول گیا ہوں۔“

قادر جان نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ لیکن اچھوکی باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ پچھلے دس برسوں میں پہلی بار ان کا دروازہ اندر سے بندھا تھا۔

وہ مولانا صاحب سے ایسی عقیدت رکھتا تھا کہ اس سلسلے میں ان سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ذرا سی بے ادبی کا بھی مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مولانا فضل کریم وضو عمر کے آگے۔ پھر اس کے ساتھ مسجد کی طرف جانے لگے۔ اس وقت انہیں یوں لگا جیسے وہ اپنے پیچھے اس گھر میں کسی کو چھوڑ کر جا رہے ہوں۔ وہ گھر ہمیشہ کی طرح ان کے جانے کے بعد خالی نہیں ہے بلکہ وہاں کوئی ہے۔

کون ہے...؟ جس طرح وہم کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح شاید وہ بھی بے وجود تھی مگر بے آواز نہیں تھی۔

مولانا صاحب نے پوری توجہ سے نماز پڑھنے کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاے تو وہ پھر جھم سے خالیوں میں آگئی۔ سوال بن کر ابھری۔ ”بولو! میں کون ہوں؟“

وہ دعا مانگتے مانگتے سوچ میں پڑ گئے۔ ”آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ اگر مجھے وہم بھی ہوا ہے تو کیوں ہوا...؟ لیکن میں نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر سنا ہے۔“

قادر جان نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مولانا صاحب! دعا مانگتے مانگتے آپ کے ہاتھ نیچے ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے ایک ذرا چونک کر اسے دیکھا۔

”آں...“ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ زانو پر دھرے ہوئے تھے جیسے مانگتے مانگتے تھک گئے ہوں۔ انہوں نے قادر جان کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

وہ خاموشی سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے لگے۔ وہ ٹوٹتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا جب انہوں نے آئینہ کبہہ کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ”آپ دعا مانگتے مانگتے رک کیوں گئے تھے؟“

انہوں نے کہا۔ ”کچھ نہیں۔ بس ذرا دھیان کہیں اور چلا گیا تھا۔“

”بات کیا ہے مولانا صاحب! آج وہ بوریا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ کا دروازہ بند دیکھ کر تعجب ہوا۔ مگر اب یہ سن کر اور دیکھ کر شاید حیرانی ہو رہی ہے کہ عبادت کے دوران میں آپ کا دھیان بٹ گیا تھا۔“

انہوں نے بے چینی سے پہلو ہلایا اور بات بناتے ہوئے کہا۔ ”ارے میں کوئی ولی اللہ تو نہیں ہوں۔ ماہر سائنس ہوں... میرے خیالات بھی بھٹک سکتے ہیں۔ کوئی سوچ

دماغ میں آ سکتی ہے۔“

”پھر تو یقیناً کوئی خاص معاملہ ہے جس کی وجہ سے یہ گزربوریا ہے۔“

انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے قادر جان کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”نہیں کبھی کسی طرح کا وہم ہوا ہے؟“

”وہم...؟ کیا وہم...؟“

”وہم کی طرح کے ہوتے ہیں۔ جیسے تنہا ہوتے ہوئے کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا۔“

اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں انہیں دیکھا۔ وہ بولے۔ ”یوں سمجھو کہ تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے مگر اچانک ایسا لگے جیسے کسی کی آواز سنائی دی ہے۔“

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ ”مولانا صاحب! یہ وہم تو نہ ہوا۔ یہ تو کسی جگہ کے آسیب زدہ ہونے کی نشانیوں ہیں۔“

انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔“

اس نے ٹوہ لینے کے انداز میں پوچھا۔ ”تو یہی بات ہے؟ کیا آپ کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے؟“

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔ میں نے اپنے گھر میں ایسی آواز سنی ہے جس کی توقع کبھی نہیں کر سکتا تھا۔“

”آپ نے کسی آواز سنی ہے؟“

وہ بولے۔ ”سب جانتے ہیں کہ میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے، پھر بھی میں نے چوڑیوں کی آواز سنی ہے۔“

قادر جان نے کہا۔ ”آپ کے مکان میں ایک زینہ اندر سے اور ایک زینہ آگن سے چھت کی طرف جاتا ہے۔ اوپر کوئی دروازہ نہیں ہے۔ کوئی بھی عورت چھپ کر مکان کے اندر آ سکتی ہے۔“

انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ میرے مکان کی چھت سے جن پڑوسیوں کی چھتیں ملتی ہیں وہ سب انتہائی شریف ہیں۔ ان کی خواتین میری بہت عزت کرتی ہیں۔ میرا دروازہ صبح سے رات لگے تک کھلا رہتا ہے۔ کسی کو آنا ہوتا وہ دروازے سے آ سکتی ہے۔ پھر بھلا چھپ کر کیوں آئے گی؟“

”آپ نے وہ آواز سننے کے بعد اسے مکان میں تلاش کیا تھا؟“

”ہاں۔ میں نے پورا مکان جھان مارا۔ اسی لیے تو صبح اٹھتے ہی دروازہ نہ کھول سکا اور تم انجمن میں پڑ گئے کہ خلاف معمول ایب کیوں ہوا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”انجمن وہاں کوئی نہیں تھا۔“

”نہیں۔ کسی کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔“

”مولانا صاحب! یہ جن اور شیطان کی باتیں تھیں کہنا یا تو نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔“

”یشک، ہماری دنیا جن و انس اور شیطان سے آباد ہے۔“

”تو اگر ہمارے ساتھ کوئی غیر معمولی بات یا واقعہ ہو جائے تو ہم اسے صرف وہم نہیں کہہ سکتے۔“

وہ سوچنے لگے۔ قادر جان نے کسی حد تک پراسرار لہجے میں پوچھا۔ ”یہ جن بھوت ہی رہتے ہیں ناں...؟ ہمارے ساتھ ہمارے آس پاس نا دیدہ بن کر۔“

اس نے ذرا اور پراسرار انداز میں پوچھا۔ ”اور کبھی طرح طرح کی آوازیں سناتے ہیں۔ جیسے کہ آپ نے سنی ہیں۔“

انہوں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا مگر اب اس کی یہ باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ چوڑیوں کی وہی کھٹک یاد آ رہی تھی۔ یہ سوال بھی تھا کہ آج گھر سے نکلے ہوئے انہیں ایسا کیوں لگا جیسے وہ اپنے پیچھے کسی کو چھوڑ کر آئے ہیں؟

قادر جان نے پوچھا۔ ”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں، میں نے تم سے وہم کے بارے میں پوچھا اور تم جن بھوتوں کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔“

”کچھ تو ہے مولانا صاحب! اگر وہاں کسی کا کوئی وجود نہیں ہے تو پھر یہ آپ کا وہم ہی ہے۔ ورنہ اولیاء کے گھر میں بھوتوں کا کیا کام؟ آپ تو ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ کم سے کم آپ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہم جیسے نگاہ دار بندے ہیں جنہیں جن بھوت اپنے شر سے پریشان کر سکتے ہیں۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولے۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ میں بھی گناہ گار بندہ ہوں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔“

ان کے درمیان تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر قادر جان نے انہیں بڑی عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کی صحبت سے فیض حاصل ہوتا ہے، پھر احسان مندی سے ڈوبے بیچے میں کہا۔ آپ کی باتوں سے اور قربت سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ آپ کی خدمت کر کے روحانی سکون ملتا ہے۔ جی پوچھیں تو میں بہت خوش نصیب ہوں۔“

”یہ تمہاری عقیدت مندی ہے۔“

”ایک مہی می کیا پورا علاقہ آپ کا عقیدت مند ہے۔“

اسی وقت مسجد کے امام صاحب ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”آپ نے دیکھا مولانا صاحب! اگلے آپ کی ایمان افزہ تقریر کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ روز کی طرح آج بھی نماز پڑھ کر تعداد ہی کی وی رہی۔ یہ مشکل دوکا ختم ہوا ہے۔“

مولانا فضل کریم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”اذان کی صدا فلاح کی طرف بلاتی ہے، صبح و شام بلاتی ہے لیکن ہم غفلت میں پڑے رہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے وہ تو میں تباہ و برباد ہو گئیں جنہوں نے غفلت برتی اور اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا۔“

قادر نے کہا۔ ”یہ حقیقت کون نہیں جانتا؟“

امام صاحب نے کہا۔ ”ہم جان بوجھ کر انجان بننے ہیں۔ خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے۔“

مولانا فضل کریم نے کہا۔ ”آپ حوصلہ نہ ہاریں۔ یہ نہ سوچیں کہ ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔ کل کی تقریر سے اگر دو افراد کے دلوں میں بھی ایمان تازہ ہوا ہے تو یہی ہماری کامیابی ہے۔“

امام صاحب نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”بے شک، جس طرح قطرہ قطرہ رہا بناتا ہے۔ اسی طرح ہم ایک ایک کر کے لوگوں کو مسجد کی راہ دکھائیں گے۔ ذرا وقت تو لگے گا مگر یہ سچ ہے کہ جو کامیابی دیر سے ملتی ہے وہ دیر تک قائم رہتی ہے۔“

”خدا ہماری کامیابی کو دائمی بنائے۔“

انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”آمین...“

دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ وہ قادر جان کے ساتھ مسجد سے باہر آ گئے۔ سورج نے پوری طرح نکلنے سے پہلے ہر چیز کو آسانی رنگ کی چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔

قادر نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”صبح کا یہ وقت کتنا پرسکون دکھائی دیتا ہے۔ کوئی الجھن نہیں کوئی بھگدڑ یا افراتفری نہیں۔“

وہ بولے۔ ”اصل میں یہ سکون نہیں ہماری بدبختی ہے۔ لوگ عبادت کے وقت بھی غفلت کی نیند میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ہم سے اچھے تو یہ چند پرند ہیں۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے ایک کھلی میں داخل ہوئے تو قادر جان نے دور ایک گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب کھلی وہ کھڑی...“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مطلوبہ گھر کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کھڑکی کے پاس سے گزرے تو وہاں کھڑی ہوئی لڑکی نے کہا۔ ”شکریہ مولانا صاحب! آپ کے فیض کا احسان میں ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔ مجھے جس بدنی کی والدہ میں پھینکا گیا ہے اس والدہ کی ایک چہیت بھی اگر آپ کے واسن پر لگ جائے تو آپ کو معلوم ہو کہ میں کس اذیت میں

ہوں؟ کاش! آپ حقیقت کو جاننے کے بعد مجھے گناہ گار ٹھہراتے۔“

وہ دونوں چپ چاپ وہاں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی آواز اب بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”او زمین کے خدا! میرا معاملہ میری حقیقت، میرا رب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے وہ سب جانتا ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔“

آنسوؤں میں زندگی ہوئی آواز دور ہوتے ہوئے آخر خاموشی میں وصل ہوئی۔ قادر جان سے سر جھٹک کر کہا۔ ”یہ پلیسریسلیان کی بیٹی تو بہت ہی ذہین اور بے حیا ہے۔ روزِ جمعہ بائیں دھڑائی ہے۔ گلی سے گزرتا دیکھ کر دیا ہے۔ ٹھیک پچھنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ خدا کی قسم! آپ نے میری زبان بند نہ کرائی ہوتی تو میں اسے اس کی اوقات یاد دلا دیتا۔“

”گالی کے جواب میں گالی دے کر اپنی زبان کو ادھر کچڑ میں پھیر مار کر اپنے لباس کو گندائیں کرنا چاہیے۔“

”لیکن مولانا صاحب! حد ہوتی ہے۔“

”درگزر کرنے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کیا تمہیں وہ تاریخی واقعہ یاد نہیں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزِ ایک گلی سے گزرتے تھے اور ایک عورت روزِ آپ پر پھرا پھیکا کرتی تھی جس کی وجہ سے آپ کا لباس مبارک ناپاک ہو جایا کرتا تھا۔“

اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”جی اچھی طرح یاد ہے۔“

”آپ نے اس عورت سے کبھی شکایت نہیں کی۔ آخر وہ دن آیا جب وہ اپنی کافرانہ حرکتوں سے باز آگئی اور دین اسلام قبول کر لیا۔“

”وہ کچرا پھیکا کرتی تھی اور اس نے اپنے والدین سمیت پورے محلے کی عزت کا پھرا کر دیا ہے۔ ایک خالی گھر میں اس جوان لڑکے کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ کس کس نے نہیں دیکھا؟ ایسی سراسر کاری کے بعد بھی آپ کو الزام دیتی ہے کہ آپ نے حقیقت کو سمجھے بغیر اسے آبرو باختہ قرار دیا ہے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ مولانا فضل کریم نے آنگن میں قدم رکھتے ہوئے گہری نظروں سے پورے گھر کا جائزہ لیا اور کچھ الجھتے ہوئے قادر جان کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔

قادر جان نے قہر ماس اٹھا کر بایلوں میں چائے اٹھاپتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی بھی معاملے میں بھی کوئی غلط فیصلہ نہیں بناتے۔ ہمیشہ حقائق کو سمجھنے کے بعد رائے دیتے

ہیں۔ اسی لیے پورا علاقہ آپ کی قدر کرتا ہے، جب بھی کسی کو کوئی الجھن پیش آتی ہے تو وہ اپنے مسائل حل کر دینے آپ کے پاس دروازہ چلا آتا ہے۔“

انہوں نے چائے کی پیالی اٹھا کر ایک چسکی لی۔ پھر کہا۔ ”میں باقاعدہ کوئی منصف تو نہیں ہوں لیکن جب کسی معاملے میں رائے دینے یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے تو میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں دینی احکامات کے مطابق معاملے کو سمجھوں اور فیصلہ دوں۔ ہمارا دین یہی حکم دیتا ہے کہ کانوں کی بات نہ لیں، آنکھوں دیکھی حقیقت پر یقین کرو۔“

”اور پلیسریسلیان کی بیٹی ایتلا نے جو گل کھلایا ہے وہ تو سب ہی نے دیکھا تھا۔ یوڑھے باپ کا سر جھٹک گیا ہے۔ اس نے تو لوگوں سے ملنا جلتا تک چھوڑ دیا ہے مگر وہ اور اس کی ماں آنکھوں دیکھی حقیقت کو بھی جھٹلاتی ہیں۔ یعنی ہم سب جھوٹے ہیں! بس وہ ماں بیٹی بچی ہیں۔“ قادر جان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

انہوں نے دو چار گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ”جس طرح پاگل بھی خود کو پاگل نہیں کہتا اسی طرح مجرم بھی خود کو مجرم نہیں کہتا۔ ایتلا بھی یہی کر رہی ہے۔“

”بے شک کرتی رہے لیکن جب وہ یہ کہتی ہے کہ آپ کے فیصلے نے اس کے صدر میں بدنامی لکھی ہے تو بہت غصہ آتا ہے۔ کبھی اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ کے فیصلے نے اسے گناہ گار بنادیا ہے۔“

وہ چائے کی خالی پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

”تم کیا سمجھتے ہو؟ جب کوئی رنج کسی قاتل کو سزائے موت کا حکم سناتا ہے تو کیا وہ قاتل اس رنج کو درست تسلیم کرتا ہے؟“

وہ ذرا ٹھہر کر بولے۔ ”ہرگز نہیں۔ تجھے، دارنک پچھنے کے بعد بھی وہ اس رنج کو غلط ملامت کرتا رہتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ اس کے مقدر میں ابھی سانسیں تھیں مگر رنج کا غلط فیصلہ انہیں وقت سے پہلے پھینک رہا ہے۔ موت سے پہلے اسے موت دے رہا ہے۔“

وہ آجائت میں سر ہلا کر بولا۔ ”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”فیصلہ حیات میں ہو تو منصف چاہتا ہے۔ لیکن فیصلہ خلافت میں ہو تو وہی منصف جھوٹا اور فریبی بن جاتا ہے۔ ہمیں جذبات اور رشتے داری سے بالاتر ہو کر فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ کوئی ہمیں جھوٹا سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے لیکن ہمارے دل میں یہ یہ کامل یقین ہوتا چاہیے کہ ہم دینی احکامات کے مطابق فیصلہ سنارہے ہیں۔“

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ایتلا جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے۔ دل ہی دل میں اپنے گناہ کو مانتی ہے مگر آپ کے دل و دماغ پر یہ بوجھ ڈالنا چاہتی ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ نا انصافی کی ہے۔“

مولانا فضل کریم بیٹھے بیٹھے چونک گئے۔ اس کی بات کانٹے ہوئے بولے۔ ”تم نے یہ آواز سنی؟“

”کبھی آواز مولانا صاحب!...“

”ابھی تو سنائی دی تھی جیسے کوئی کلکا ہوا ہو۔“

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”شاید ہوا ہوگا۔ میں بات کر رہا تھا اس لیے نہ سکا۔“

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے کمرے کی چھت کو دیکھ رہے تھے۔ قادر جان نے ایک نظر چھت کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا اوپر سے آواز آتی تھی؟“

”ہاں۔ شاید۔۔۔“

”پھر تو ہمیں اوپر جا کر دیکھنا چاہیے۔“

وہ دونوں اٹھ کر کمرے ہو گئے۔ قادر جان نے پوچھا۔ ”آواز کس سمت سے آئی تھی؟“

انہوں نے پختہ زینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر سے آئی تھی۔ میں ادھر سے اوپر جا رہا ہوں۔ تم لکڑی والے زینے سے اوپر آؤ۔“

وہ ادھر جاتے ہوئے بولا۔ ”جلدی اوپر آئیں۔ ایسا نہ ہو وہ کسی دوسری چھت پر جا کر گرہم ہو جائے۔“

مولانا بڑے کمرے سے گزر کر پختہ زینے کی طرف آئے۔ پھر تیزی سے ایک ایک پاندان پر قدم رکھتے ہوئے اوپر پہنچے۔ قادر جان لکڑی والے زینے کے ذریعے اوپر آ گیا تھا۔ وہ دونوں چاروں طرف دیکھنے لگے۔ مولانا نے چھت والے کمرے کے اندر جا کر دیکھا۔ وہ کمرہ اور ہاتھ روم خالی تھا۔ باقی تین چھتیں بھی دور تک دیران دکھائی دے رہی تھیں۔ انسان تو کیا وہاں ایک پرندہ بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں نیچے آ گئے۔ قادر جان نے کہا۔ ”پہلے آپ نے چوڑیوں کی آواز سنی۔ پھر ایک کلکنا۔ بار بار آوازیں آرہی ہیں تو یہ وہم نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ مکان آسب زدہ ہو گیا ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”میرے پاس جنات اور ایلیس سے متعلق کچھ کتابیں ہیں۔ میں ابھی ان کا مطالعہ کروں گا۔“

وہ بولا۔ ”آپ تو شرسے بننے کے ذریعے جانتے ہیں۔“

”ہاں، میں ایک وظیفہ کا دروگر ہوں گا۔ اگر کسی جن یا شیطان کی شہ پندی ہے تو انشاء اللہ جلد ہی دُفع ہو جائے گی۔“

”تو پھر ہم اللہ پڑھ کر فوراً شیطان کو بھاگائیں۔“ قادر

جان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے کہا۔ ”میں کچھ دیر بعد بسم اللہ کروں گا۔ ابھی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔“

وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پیچھے گاؤں کیے رکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں پاؤں دباؤں ہوں۔“

”ارے نہیں۔ چروں میں درد نہیں ہے۔ بس ذرا تھکی

تھکن ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔“

اس نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا۔ پھر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تو میں سر دباؤں ہوں۔“

وہ چار پائی پر لیٹتے ہوئے بولے۔ ”نہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تھوڑی سی نیند آ جائے گی تو طبیعت سنبھل جائے گی۔ پھر میں وظیفہ پڑھوں گا اور کتابوں کا مطالعہ کروں گا۔ ذرا طبیعت سنبھلے دو۔“

”مولانا صاحب! آپ نے تو مجھے پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔۔۔؟“

”ہاں بھئی۔ سب ٹھیک ہے۔ تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ آرام سے گھر جا کر ڈیوٹی پڑ جانے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ رات کو ملاقات ہوگی۔“

انہوں نے بولتے بولتے آنکھیں بند کر لیں جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”اب چلے ہی جاؤ۔“

قادر جان کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رک گیا۔ چپ چاپ کمرے سے نکل گیا پھر اس نے باہر آ کر دروازے کو الجھی طرح بند کر دیا۔ وہاں سب ہی جانتے تھے کہ مولانا فضل کریم جب گھر میں ہوتے ہیں تو کبھی اپنے دروازے کو اندر سے بند نہیں کرتے۔ دن بھر وہ دروازہ کھلا رہتا تھا۔

قادر جان کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سوچتی ہوئی نظروں سے چھت کو دیکھنے لگے۔

محلے کی تمام خواتین ان کی عزت کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ایسا کوئی مذاق کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ اگر ایسی کوئی عورت نہیں تھی اور وہ چھت کے ذریعے وہاں نہیں آتی تھی تو کیا آسمان سے اترتی تھی؟

تب ہی انہیں بیرونی دروازے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے وہاں آ کر دیکھا۔ قادر جان دروازہ کھلا کر گیا تھا مگر کوئی بھی اسے کھول کر آ سکا تھا۔

انہوں نے چلتی چڑھا دی۔ ہوئی آہٹ پر خواہ مخواہ کسی کی آمد کا گمان ہوا تھا اور گمان تب ہی ہوتا ہے جب کوئی دھیان میں تسلط بخمار ہا ہو۔

شاہی

بہترین نشوونما

بھرپور توانائی

عمل صحت

پُر جوش زندگی

80 سال سے آزمودہ

شاہی

شاہی دواخانہ (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی پاکستان

شاہی میں موجود نشوونما دہندہ اجزاء سے تیار کردہ صحت بخش ٹانک، ہر عمر کے مردوں، عورتوں، بچوں کے لئے کمال مفید ہے۔

محبوبہ شاہی دواخانہ، شاہی دواخانہ سے تیار کردہ شاہی نشوونما دہندہ مندرجہ ذیل کے افراد پر بہترین اثر ہے جو نشوونما کو بڑھانے اور جسم کو تھکا ہونے سے بچانے کے لئے۔

شاہی میں موجود نشوونما دہندہ اجزاء

- فولک اسام
- فولک اسام
- فولک اسام

کمرے سے گزرتے ہوئے زینے کے پاس پہنچے تو خوشبو کچھ اور تیز ہو گئی۔ وہ اوپر جانا چاہتے تھے لیکن ٹھک گئے۔

زینے کے درمیانی پاندان پر ایک رومال پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اس کے ایک گوشے میں گلاب کا پھول کڑھا ہوا تھا۔ خوشبو اسی رومال سے آ رہی تھی۔ وہ کوئی عود یا عطر یا عطری خوشبو نہیں تھی۔ اس رومال کو جیسے کسی اپورٹ پر بیوم میں ڈبو کر وہاں پھینک دیا گیا تھا۔

وہ اسے ایک چٹائی میں پکڑ کر اوپر لائے۔ پھر اسے چھت پر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ کسی ناختم کا تھا۔ رومال کا حاشیہ اور کڑھا ہوا پھول کبہ رہا تھا کہ وہ کسی لڑکی کا ہے۔

وہ کسی عورت کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ پھر بھلا کسی کا رومال چھوٹا کیسے گوارا کرتے؟ وہاں چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگے۔ دن کے وقت دھوپ میں کوئی چھت پر نہیں آتا تھا۔ کہیں بھی اس رومال والی کا وجود نہیں تھا۔

ویسے جو کچھ ہو رہا تھا اس کے نتیجے میں مولانا کے اندر ایک نئی سوچ ابھر رہی تھی۔ ایک فطری تقاضا جو ان کے اندر خوابیدہ تھا اب اس کی آنکھ کھل رہی تھی۔ یوں بھی دین اسلام میں رعبانیت کی اجازت نہیں ہے۔ شادی اور ازدواجی زندگی لازمی ہوتی ہے۔

وہ چھت والے کمرے کے ایک طرف سے ہوتے ہوئے دوسری طرف آئے تو ٹھک گئے۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا صبح انہوں نے دروازے کو کھٹک سے بند کیا تھا مگر ابھی وہ کھلا ہوا تھا۔ ہوا کتنی ہی تیز کیوں نہ چلے مگر اس سے دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔

انہوں نے فوراً ہی کمرے کے اندر آ کر دیکھا۔ پھر واش روم میں بھی دیکھا۔ وہ تو خوشبو بھی ہوا ہو گئی تھی۔

وہ سوچتے سوچتے ایک دم سے چونک گئے۔ تقریباً دوڑتے ہوئے چھت کی دوسری طرف آئے۔ وہاں سے لکڑی کا زینہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر انہیں واضح طور پر اس کی چڑچڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چوڑیوں کی ٹھٹھک بھی سنائی دی تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے وہاں آئے۔ پھر اسی تیز رفتاری سے خیر عیاں اترتے ہوئے نیچے آ گئے۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سائے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں لیکن اسے سائے بھی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ سایہ تو دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کی ایک جھمک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انہیں ٹھٹھک باندھ رہا تھا جیسے وہاں سے آ رہے ہوں۔

صحت مند جوان تھے۔ پانچویں وقت کی نمازیں پڑھتے تھے۔ تہجد گزار تھے۔ دن رات دینی کتب کے مطالعے میں مصروف

وہ کبھی کسی عورت کی طرف نہیں دیکھتے تھے لیکن نہ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ جلوے تو خود زور ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر لاشعور میں پہنچتے رہتے ہیں۔ ہوا دکھائی نہ دے پھر بھی اُس کا احساس بتا دیتا ہے کہ وہ سر وہاں ہے یا گرم...؟

اور وہ گمراہی تھی۔ بیٹھے بٹھائے کھلبلی پیدا کر رہی تھی۔ خواہ مخواہ اپنے پیچھے لگا رہی تھی۔ سوچا جائے تو وہ خواہ مخواہ پیچھے نہیں لگ رہے تھے۔ کوئی تو بات تھی۔

عورت کی کشش بڑی ہی غلغلہ مانی ہوتی ہے۔ دکھائی نہ دینے کے باوجود بھائی دیتی ہے۔

وہ عورتوں سے کتراتے تھے۔ سوچتے تھے نہ جانے لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے؟ کیوں خواتین کے پیچھے بھاگتے ہیں؟ جبکہ ان لمحات میں وہ خود یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ کسی نامعلوم کی کشش کیسے چلے بھانے سے انہیں اپنے پیچھے لگا رہی ہے؟

وہ اس کمرے میں آ گئے جہاں دستی معلومات کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ وہ جنات اور انہیں سے تعلق رکھنے والی کتابیں تلاش کرنے لگے۔ دھیان اب بھی ادھر ہی تھا۔

لاکھ کتراتے کے باوجود وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ان کے خیالوں میں آج تک کوئی نہیں آئی تھی۔ ایک فطری تقاضا سمجھا تا تھا کہ حیات کو گزارنے کے لیے ایک شریک حیات ضروری ہے۔ مگر وہ صبح ہوتے ہی اس تقاضے کو محض ایک خواب سمجھ کر بھول جایا کرتے تھے اور یہی اُن کی سب سے بڑی بھول تھی۔ ضرورت دہانے سے دب جاتی ہے۔ چھپانے سے چھپ جاتی ہے لیکن ٹالنے سے ٹکی نہیں ہے۔ اندر ہی اندر رہتی رہتی ہے۔

اُن کی مطلوبہ کتابیں مل گئیں لیکن انہیں پڑھنے سے پہلے وہ ایک دقیقہ پڑھنے لگے۔

وہ تھوڑی دیر تک ڈوب کر پڑھتے رہے پھر جنات سے متعلق ایک کتاب کھول لی۔ کہا جاتا ہے جو جنات شریک نہیں ہوتے ان کے آنے سے گھر میں ایک عجیب طرح کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ انہوں نے کتاب کو کھولا تو اچانک ہی انہیں خوشبو کا احساس ہوا۔

کیا وہاں کوئی عبادت گزار جن ہے؟ لیکن جنات چوڑیاں تو نہیں پہنتے؟

انہوں نے کتاب بند کر دی۔ اس کے باوجود بھی کمرے کی محدود فضا میں خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔ دروازے کے پاس آ کر وہ خوشبو کچھ اور قریب محسوس ہوئے گی۔

وہ پختہ زینے کی طرف سے آ رہی تھی۔ مولانا بڑے

رہتے تھے۔ پاکیزگی عبادت گزاری اور پارسائی نے ان کی شخصیت میں ایک نامعلوم ہی روحانی کشش پیدا کر دی تھی۔

قادر جان امام صاحب اور کئی بزرگ انہیں سمجھاتے تھے کہ اب شادی کر لینی چاہیے اور وہ بھی چاہتے تھے کہ ایک شریک حیات آجائے۔ مگر..... وہ شادی کرتے نہیں تھے۔

اندرونی اندر بیوی کے خیال سے خوف کھاتے تھے۔ آئے دن بدیکھتے تھے کہ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں جتنی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ وقیدیوں کی طرح گزارا کرتے ہیں۔

مخلے کی بچپائی میں وہ سرخ تھے۔ جب کبھی طلاق کے مسئلہ کا فیصلہ کرتے تو یہی دیکھتے تھے کہ مرد بیویوں کو دھوکا دے ہیں اور بیویاں شوہروں کے اعتماد کو نہیں بچھاتی ہیں۔

فی الحال یہی کہا جاسکتا تھا کہ شریک حیات بنانے کے سلسلے میں وہ کسی عورت پر غور و نامیں کر رہے تھے۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے؟ یہاں کون ہے؟“

وہ ایک ایک کمرے میں جاتے ہوئے بولے۔ ”جھپٹی کیوں ہو؟ سامنے آؤ۔ کیا تم انسان نہیں ہو؟ بے وجود ہو؟ بھوت پریت ہو؟ آخر کیا ہو؟“

اسی وقت قادر جان ایک محلے دار کے ساتھ وہاں آیا۔ وہ ۱۰۰ واڑہ کھول کر اندر جانا چاہتا تھا مگر بند دروازے نے ایک بار پھر اسے چونکا دیا۔ محلے دار نے بھی ذرا تعجب سے پوچھا۔ ”ارے یہ کیا؟ مولانا صاحب کا دروازہ بند ہے؟“

”صبح بھی یہی انہونی ہوئی تھی۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے میں نہیں سوتے چھوڑ کر گیا تھا۔ بھلا وہ خاص طور پر آٹھ کمرے اندر سے بند کرنے کیوں آئیں گے؟“

”وہ کبھی اسے اندر سے بند نہیں کرتے۔“

قادر نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر دروازے کو دیکھا۔ اسی وقت ایک اور شخص نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟“

”مولانا صاحب سے ملنے آئے ہیں۔“

”تو اندر جاؤ۔“

قادر نے کہا۔ ”کیسے جائیں؟ دروازہ بند ہے۔“

اس شخص نے دروازے کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”باہر تالا نہیں ہے پھر دروازہ کیسے بند ہو سکتا ہے؟“

اس شخص نے قریب آ کر دروازے کو ہولے سے دھکا دیا۔ پھر کہا۔ ”یہ تو اندر سے بند ہے۔“

قادر نے کہا۔ ”ہم یہی تو کہہ رہے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”مولانا صاحب کا گھر تو ہمیشہ مسجد کی طرح کھلا رہتا ہے۔“

مخلے دار نے کہا۔ ”قادر بھائی بتا رہے ہیں کہ دروازہ صبح کے وقت بھی بند تھا۔“

اس نے قادر سے پوچھا۔ ”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“

قادر جان نے سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کو دیکھا۔ مسئلہ ایسا تھا کہ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے انجان بن کر کہا۔ ”شاید مولانا صاحب کے معمولات میں فرق آگیا ہے۔ اب وہ دروازے کو اندر سے بند رکھنا چاہتے ہوں گے۔ اسی لیے یہ بند ہے۔“

ایک شخص نے کہا۔ ”وہ تو کہتے تھے ان کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ نہ ہی چور ڈاکو ان کے گھر میں آئیں گے۔ اسی لیے وہ اسے کھلا رکھتے تھے۔ اب کیا بات ہوگئی؟“

ایک نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ذرا خاموش رہو۔“

وہ دروازے سے لگ کر کچھ سننے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ابھی لگا تھا جیسے مولانا صاحب کچھ بول رہے ہیں۔“

قادر نے دروازے سے کان لگاتے ہوئے کہا۔ ”وہ اکیلے کیوں بولیں گے؟“

اس کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔ ”ضرور ان کے ساتھ کوئی ہوگا۔“

”ایسا کون ہو سکتا ہے جس سے وہ دروازہ بند کر کے بات کر رہے ہیں؟“

قادر جان کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چوڑیوں والی انہیں مل گئی ہے اور وہ اس سے بول رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مولانا صاحب بدنام ہو جائیں گے۔

پھر اسے یاد آیا۔ مولانا صاحب نے کہا تھا وہ وظیفہ پڑھیں گے۔ شاید اونچی آواز میں پڑھ رہے ہیں۔ لیکن وہ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ وظیفہ کیوں پڑھ رہے ہیں؟ طرح طرح کے سوالات کرنے والے وہاں ایک ایک دو دو کر کے جمع ہو رہے تھے۔ دوسرے لوگ بھی سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”عجب بات تو یہ ہے کہ صرف مولانا صاحب بول رہے ہیں اور جواب میں کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔“

کسی نے کہا۔ ”ذرا توجہ سے سننے کی کوشش کرو۔ اندر کوئی تو ہوگا جس سے وہ بول رہے ہیں۔“

یہ شخص دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا اس نے

کہا۔ ”ہاں۔ اندر کوئی نہیں ہے۔ دوسری کوئی آواز نہیں آرہی صرف وہی بول رہے ہیں۔“

”ان کے پاس تو کوئی فون بھی نہیں ہے۔ کیوں قادر بھائی؟“

قادر جان نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”انہیں فون پسند ہی نہیں ہے۔“

پیچھے سے امام صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ پلہر سلیمان کے ساتھ ان کی طرف آتے ہوئے کھڑے تھے۔

”کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ مولانا صاحب کے دروازے کے باہر کیا کر رہے ہو؟“

قادر جان کان لگا کر سن رہا تھا۔ فوراً ہی سیدھا ہو کر دایرے سے اترتے ہوئے بولا۔ ”وہ دراصل... میں۔ یہ مولانا صاحب کا دروازہ بند ہے۔“

”تو...؟“

ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ امام صاحب نے کہا۔ ”کسی کا دروازہ بند ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کان لگا کر وہاں کی خبری کی جائے؟“

قادر جان نے کہا۔ ”ہم خبری نہیں کر رہے۔ دراصل ہم حیران ہیں کہ...“

مولانا فضل کریم نہیں جانتے تھے کہ ان کے گھر کے باہر لوگوں کے درمیان کیسی کھلی بکلی ہوئی ہے؟ وہ تو بس اپنی آنکھوں کا سراغ لاش کر لیتا جاتے تھے۔ جانا چاہتے تھے کون ان کے ساتھ آگے بڑھ کر کھیل رہا ہے؟

اور باہر والے بھی یہی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مولانا صاحب کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

وہ وظیفہ پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ بیرونی دروازے پر دستک سنائی دے رہی تھی اگرچہ اس وقت وہ کسی کی مداخلت نہیں چاہتے تھے۔ دروازہ کھولنے سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے دروازہ کھولا تو لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر پشیمان ہو گئے۔

ادھر یہ حیران و پریشان تھے۔ ادھر آئے والے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے قادر جان سے پوچھا۔ ”بات کیا ہے؟“

امام صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ ایلا کا باپ سلیمان آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ باقی سب یہ جاننے کے لیے یہاں پہلے سے موجود ہیں کہ آپ کا دروازہ بند کیوں ہے؟“

مولانا نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آئے کو کہا۔

امام صاحب نے لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ سب نے دیکھ لیا ہے مولانا صاحب خیریت سے ہیں۔ دروازہ بند رکھیں یا کھلا چھوڑ دیں۔ یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔“

قادر جان نے کہا۔ ”آپ لوگ دروازے کے بند ہونے پر مسئلہ نہ اٹھا کر میں بلکہ اپنے اپنے گھر جائیں۔“

ایک نے کہا۔ ”ہم جارہے ہیں لیکن یہ تجس تو ہے گا کہ مولانا صاحب تنہائی میں کس سے باتیں کر رہے تھے؟“

مولانا کے یہ کہنے پر کہ میں ایک وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ سب کو چپ لگ گئی۔ وہ ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ مولانا نے قادر جان سے پوچھا۔ ”تم تو ڈیوٹی پر جانے والے تھے، اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“

وہ اپنے ساتھ آئے ہوئے محلے دار کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”الیاس بھائی اپنے بیٹے کے لیے پانی دم کروانے آپ کے پاس آ رہے تھے۔ میں آپ کے لیے پریشان تھا کہ صبح سے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ چلا آیا۔“

وہ سب ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ امام صاحب نے پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت کو کیا ہوا مولانا صاحب؟“

وہ بولے۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس ذرا نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے داغ بوجھل سا ہے۔“

”پھر تو آپ آرام کریں۔ ہم بعد میں آجائیں گے۔“

امام صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

انہوں نے امام صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”میری طبیعت اب تسکین مل گئی ہے۔“

پھر انہوں نے الیاس سے کہا۔ ”تم یہ پانی کی بوتل یہاں چھوڑ جاؤ۔ میں ظہر کے بعد انشا اللہ دم کروں گا۔ آکر لے جانا۔“

وہ بوتل رکھ کر چلا گیا۔ ایلا کا بوڑھا باپ پلہر سلیمان سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مولانا نے قادر جان کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”میں بھی چلتا ہوں۔ آپ کو دیکھ کر اطمینان ہو گیا ہے۔ اب شام کو ملاقات ہوگی۔“

وہ ان سے مصافحہ کر کے وہاں سے چلا گیا۔ مولانا نے سلیمان سے پوچھا۔ ”ہاں اب بولو کیا بات ہے؟“

اس نے پہلو بدل کر امام صاحب کو دیکھا۔ وہ بولے۔ ”دراصل یہ اپنی بیٹی کے سلسلے میں پریشان ہے۔ اس لڑکی نے اپنے مقدر میں جو بدنامیاں لکھی ہیں وہ منہ والی نہیں ہیں۔“

مولانا نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”بے شک۔ اس کی جذباتی گمراہی نے بوڑھے باپ کا سر جھکا دیا ہے۔“

سلیمان نے بڑے ہی شکستہ انداز میں کہا۔ ”اب نہ تو یہ سرائھ سکے گا اور نہ ہی اس بد بخت کی ڈولی اٹھ سکے گی۔ اس کی بدنامی میری چھوٹی بیٹیوں کو بھی سہاگن بننے نہیں دے گی۔ ابھی تو یہی آثار نظر آرہے ہیں کہ میری دوسری بیٹیوں کو بیاہنے بھی کوئی میری دلہیز پر نہیں آئے گا۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر قہم کر بولا۔ ”یہ سوچ کر ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ میں آخری سانس تک اس بدنامی کا بوجھ اٹھاتا رہوں گا۔ اگر میری گھر والی اور بچے بیچ میں نہ آتے تو میں اس تم بخت کو اسی دن مار ڈالتا اور خود سولی چڑھ جاتا۔“

”یہ اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ تم اپنے خاندان کے واحد کفیل ہو۔ کیا دوسرے بچوں سے ان کا سہارا چھیننا چاہتے تھے؟ باپ کا سایہ سر پر نہ رہے تو بچے خوار ہو جاتے ہیں۔ زمانے کی ٹھوکروں میں آ جاتے ہیں اور پھر تمہاری بیٹیوں کا کیا ہوتا؟ بیٹا ایک ہی تو ہے اور وہ بھی سب سے چھوٹا ہے۔“

سلیمان نے کہا۔ ”اس مسئلے کو ختم کرنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ ایلا جس کے ساتھ بدنام ہوئی ہے وہی اس کا ہاتھ قہم لے۔“

مولانا فضل کریم نے کہا۔ ”یہ مشورہ تو ہم نے پہلے بھی دیا تھا۔ وہ لڑکا کوئی غیر تو نہیں ہے۔ تمہاری بہن کا بیٹا ہے۔ گھر کا معاملہ گھر میں ہی منت جاتا۔“

اس نے کہا۔ ”اُس وقت معاملہ گرم تھا اور اس سے بھی زیادہ میری بہن کا دامغ گرم ہو رہا تھا۔ تب میں یہ بات نہیں چھیڑ سکتا تھا۔ سوچا تھا تھوڑا وقت گزر جائے پھر بات کروں گا، مگر وہ تو اب بھی ناراض ہے۔ ایلا کے طے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔“

”ناراض ہے تو اسے منانے کی کوشش کرو۔“ مولانا فضل کریم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ”بہن کی ڈولی اٹھانے اور بدنامی پر مٹی ڈالنے کے لیے میں اس کے دروازے پر گیا تھا۔ خیرات کی طرح رشتہ مانگا تھا۔ مگر وہ کہتی ہے چونکہ بہو کے رشتے ختم نہیں ہو سکتے۔ لہذا اس کا رشتہ اب صرف مجھ سے ہے۔ میرے گھر سے اور بیوی بچوں سے نہیں ہے۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”اگر وہ مان جائے گی تو بدنامی یکسر ختم ہو جائے گی۔“

مولانا فضل کریم نے کہا۔ ”اور وہ نکاح... کیا نام ہے اس کا۔؟“

سلیمان نے کہا۔ ”نیم۔“

”ہاں۔ نیم... وہ کیا ہوتا ہے؟“

”وہ تو اسی دن سے غائب ہے، پلٹ کر نہیں آیا لیکن ماں ضرور جانتی ہوگی کہ کہاں ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لیے وہ اسے بلائے گی تو وہ گھر لوٹ آئے گا۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”یہ ہمارے پاس اسی لیے آیا ہے کہ ہم اس کی بہن زردانہ سے بات کریں۔ بچے بہک گئے تھے انہیں بزرگ سدھار سکتے ہیں۔ بہت کچھ بڑنے کے باوجود بات بن سکتی ہے۔“

سلیمان نے کہا۔ ”زردانہ میری نہیں سن رہی ہے مگر آپ حضرات اس علاقے کے معزز ہیں۔ وہ آپ کے سامنے ہٹ دھرمی نہیں دکھائے گی۔ جو کہیں گے اسے مان لے گی۔“

مولانا نے سوالیہ نظروں سے امام صاحب کو دیکھا۔ وہ بولے۔ ”اس سلسلے میں ہمیں کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ ایک بیٹی کا کیا دھرا اس کی ساری اولاد کو بھگتنا پڑے گا۔“

وہ تقریباً روتے ہوئے بولا۔ ”میں تو جیتے جی مر چکا ہوں۔ ایلا گھرانے لگے گی تو کچھ دن کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کم سے کم میری دوسری بیٹیوں کے لیے شادی خاندان آبادی کے راستے حل نہیں گئے۔“

مولانا نے کہا۔ ”میں تمہاری حالت سمجھ رہا ہوں مگر برا نہ ماننا۔ غلطی تمہاری بیٹی سے ہوئی ہے لیکن وہ بڑی ڈھٹائی سے آج بھی انکار کر رہی ہے بلکہ میں تمہارے گھر کے پاس سے گزرتا ہوں تو مجھے یوں باتیں سناتی ہے جیسے میں نے کوئی غلط فیصلہ کیا ہو جبکہ سارے حقائق سب کے سامنے تھے۔“

سلیمان نے تائید میں سر ہلایا۔ مولانا نے کہا۔ ”خود تم نے سب کے سامنے کہا تھا کہ غلطی تمہاری بیٹی کی ہی ہے۔“

اس نے پھر سر ہلایا۔ مولانا نے کہا۔ ”وہ ہونے کے ناطے تمہاری گواہی سب سے اہم تھی۔ میں نے کوئی ذاتی فیصلہ نہیں دیا تھا۔“

سلیمان نے ناگواری سے کہا۔ ”میری بیٹی پر لعنت بھیجیں۔ بس مجھ غریب کی بات مان میں۔ زردانہ کو کسی طرح راضی کر لیں۔“

وہ گڑبڑانے کے انداز میں بول رہا تھا۔ مولانا فضل کریم نے کہہ۔ ”میں صرف تمہارا لحاظ کرتا ہوں ورنہ تمہاری بیٹی کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اس پر کچھ زچہالی ہے۔ دراصل میں اس معاملے میں پھر سے الجھنا نہیں چاہتا۔“

وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر عاجزی سے بولا۔ ”خدا کے لیے مولانا صاحب انکار نہ کریں۔ آپ اور امام صاحب مل کر میری بگڑی بنا سکتے ہیں۔“

”بگڑی بنانے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔“

وہ بولا۔ ”مگر ویسے تو زمین پر پیدا کرتا ہے۔ آپ دونوں میرے لیے وسیلہ بن سکتے ہیں۔“

پھر وہ امام صاحب کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”آپ میری سفارش کریں۔ بڑا احسان ہوگا۔ میری بیٹیاں آپ کو دعا میں دیں گی۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”مان جائیں مولانا صاحب ایہ بے چارہ تو بھنور میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ خدا ہمارے نو جوانوں کو ہدایت دے۔ ان کی ایک غلطی پورے خاندان کو لے ڈالتی ہے۔“

مولانا نے تائید میں سر ہلایا۔ سلیمان نے کہا۔ ”آپ کا یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔“

وہ بولے۔ ”بات ہماری نہیں ہے؟ زردانہ بہن کی ہے۔ اب دیکھنا یہی ہے کہ وہ ہماری بات مانے گی بھی یا نہیں۔؟“

”مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائے گی۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔“

مولانا نے امام صاحب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ابھی چلنا ہوگا؟“

سلیمان نے جلدی سے کہا۔ ”جی مولانا صاحب! زردانہ گھر پر ہے۔ آپ ابھی چلیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔“

مولانا نے کن اکھیوں سے بڑے کمرے کی طرف دیکھا۔ امام صاحب نے کہا۔ ”ایک اجڑی ہوئی بیٹی کا گھر بسانے کی بات ہے۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ابھی بات ہے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔ پھر چلتے ہیں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر آئین میں آگئے۔ سر اٹھا کر صحت کی سمت دیکھا۔ یہ تو یقین ہو چکا تھا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ پہلے چوڑیوں کی کھٹک سنائی دی تھی۔ اب ان لوگوں کے آنے سے پہلے اس خوشبودار دروازے اور نیرھیوں کی چرچاہٹ نے چونکا دیا تھا۔

وہ ان باتوں کو محض وہم سمجھ کر فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ جلد سے جلد اس حقیقت کی تدبیر پہنچا چاہتے تھے۔

ان کا ذہن بڑی حد تک الجھا ہوا تھا پھر بھی وہ سلیمان کا معاملہ سلجھانے کے لیے اس کے ساتھ زردانہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔

زردانہ اپنے کئی مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ برس پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ جوان بیٹا نہ حرام تھا۔

اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہیرا بھیری کرتا تھا۔ دو نمبر کے دھندے سے پانچ دس ہزار روپے کماتا پھر میسے دو میسے تک آرام کرتا تھا۔

زردانہ نے گھر کا چولہا گرم رکھنے کے لیے ایک مرد کو پھانس لیا تھا۔ اس شرط پر اس سے نکاح پڑھوایا تھا کہ وہ ماہانہ پندرہ ہزار روپے ادا کیا کرے گا۔ جوان بیٹے نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ اسے گھر کی ذمہ داریوں سے نجات مل گئی تھی لیکن جوان بیٹی یعنی نے کہا۔ ”آپ کو اس عمر میں شادی نہیں کرنی چاہیے۔“

ماں نے جج کر جواب دیا۔ ”کیا میں عمر والی ہوگی ہوں؟ کیا تم مجھے بوڑھی کہہ رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”جوان بیٹے اور بیٹی کے ہوتے ہوئے سب یہی کہیں گے۔“

”جو کہے گا اس کا منہ توڑ دوں گی۔ دنیا والے کیا جانیں کہ میرے سوتیلے باپ نے کیا ہیرا برس کی عمر میں میری شادی کر دی تھی۔ ایک برس کے اندر ہی نیم پیدا ہو گیا۔ آج وہ میں برس کا ہے۔ میں پورے تیس برس کی جوان عورت ہوں۔“

یعنی نے کہا۔ ”مجھے آپ کی عمر سے کیا لینا لیکن آپ مجھ پر سوتیلے باپ لاکر وہی غلطی کر رہی ہیں جو آپ کی امی نے کی تھی۔ سوتیلے پھر سوتیلے ہوتا ہے۔ اس پر مجرم سائیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے میری بیٹی نے اچانک ہی ایک دن کے اندر آپ کی شادی کر دی تھی۔“

زردانہ نے صدمہ کی۔ ”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ فضول باتیں نہ کرو۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ کچھ ہوا تھا۔ ایک بار آپ نے ہی بتایا تھا۔ مگر یہ اچھی طرح سن لیں کہ اگر وہ آپ کی غیر موجودگی میں آئے گا تو میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔“

”تم یہاں رہتی ہی کب ہو؟ تمہارا تو اپنے چچا کے گھر میں دل لگتا ہے۔“

”مگر اب میں آپ ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

وہ اپنے بچا کے گھر میں چلی پڑی تھی۔ ابھی کھانا پانی اور بھائی سے ملنے کے لیے آ جاتی تھی۔ زردانہ اسے سمجھاتی تھی کہ اب اسے اپنے گھر آ جانا چاہیے۔ وہ ماں کے کہنے پر بڑے عرصے بعد وہاں رہنے چلی آئی تھی۔ مگر اس سوتیلے باپ کی وجہ سے آئے دن ماں بیٹی کے درمیان تو تو میں میں ہوتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جوان بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔ اس نے فون پر کہا۔ ”میں اپنی سہیلی کے گھر میں ہوں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ بیٹی گھر آ جائے تو

بہکاوے میں آگیا۔

”تم اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو تو مجھڑی ہوئی بات بن سکتی۔“

اس نے انگلی اٹھا کر اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔
”بات بتانے کی کوشش بھی مت کرو۔ جاؤ جا کر اندر بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”جاتا ہوں مگر یاد کرو ہمارے خاندان میں ایسی غلطی تم سے بھی ہو چکی ہے۔“

وہ تڑخ کر بولی۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“
”سچ بول رہا ہوں اور تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں۔ امی نے

ایک رات ہمارے سوتیلے باپ کے ساتھ تمہیں بچھا کر اٹھا اور پھر دوسرے ہی دن اپنے پیچھے سے تمہارا نکاح پڑھوا دیا تھا۔“

وہ غصے سے ٹھٹھکیا۔ ”سچ کر بولی۔“ امام صاحب اور مولانا صاحب ابھی یہاں نہ ہوتے تو میں تمہارا منہ توڑ دیتی۔

کیا تمہارے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت ہے کہ میں نے یہ گناہ کیا تھا؟“

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ”جب تک ثبوت اور گواہ نہ ہوں تب تک کوئی گناہ گار نہیں کہلاتا۔ میں پارسا ہوں

اور پارسی رہوں گی۔ تمہاری بیٹی کا کالا منہ سب نے دیکھا ہے۔ اس لیے وہ گناہ گار کہلا رہی ہے اور کہلاتی رہے گی۔“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں نے یہ بات تم پر کچھ اچھالنے کے لیے نہیں کہی ہے۔ بس اتنی سی التجا کرتا ہوں کہ

اپنی غلطی کو یاد کرو اور میری بیٹی کو اس لیے اپنا لو کہ وہ تمہارے ہی بیٹے کے ساتھ گناہ گار ہو چکی ہے۔“

”یہاں آکر مجھ پر کچھ اچھال رہے ہو۔ میں خوب جانتی ہوں۔ اگر ابھی تمہارے پاس ثبوت اور گواہ ہوتے تو تم

میری کمزوری سے ضرور فائدہ اٹھاتے۔ زبردستی اپنی بیٹی کو میرے بیٹے کے سر پر لا کر بٹھا دیتے اور میں چپ چاپ دیکھتی رہ جاتی۔“

”میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ امی نے تمہاری غلطی پر پردہ ڈالا تھا۔ تم میری بیٹی کی غلطی پر پردہ ڈالو۔ خاندان میں یہی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی پردہ پوشی کر کے ہی گھرانے کی عزت رکھی جاتی ہے۔“

”میں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ نیک مشورہ دیتی ہوں کسی دوسرے شہر میں جاؤ۔ وہاں بیٹی کو پارسا بنا کر اسے کسی کے

پلے باندھ دو۔ یہی ایک راستہ ہے۔“
مجھ وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ”اب جاؤ یہاں

سے۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ بڑی بے بسی سے سر جھکا کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ امام صاحب نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ بولا۔ ”مجھے لگتا ہے آپ لوگوں کو سچ میں ڈالنے سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔“

”کیا دردناک بہن نے نہ چاہا ہے؟“
”اس کی تو وہی ایک ضد ہے۔ کبھی ہے کسی بھی حال میں نہیں مانتے گی۔“

مولانا فضل کریم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”بات کرنے کا اور منوانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے تم حوصلہ کھو۔“

امام صاحب نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تھیر کو کون نہیں جانتا؟ ایک نمبر کا ٹھنڈا ہے۔ کوئی ہیرا نہیں ہے۔ لیکن ہاں۔ اس وقت تمہاری بیٹی کے لیے پارس ثابت ہو سکتا ہے۔“

مولانا نے کہا۔ ”اور اس مجبوری کو دردناک بہن ابھی طرح سمجھ رہی ہے۔“

سلیمان نے کہا۔ ”افسوس تو اسی بات کا ہے۔ مجبوری کھینچنے کے باوجود وہ راضی نہیں ہو رہی ہے اور اسے منانے کے لیے میں تو اس کے پاؤں پکڑنے کو بھی تیار ہوں۔“

امام صاحب نے اس کے شانے کو حوصلہ دینے کے انداز میں سنبھٹایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

برے حالات کی مار ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب پڑتی ہے تو انسان نہ چاہنے کے باوجود مگر تپا پڑتا رہتا ہے۔ پھر اسے اپنے

اور سنبھلنے کا سہارا نہیں ملتا۔
وہ بیٹی کو نیک نامی دینے کے لیے بہن کے قدموں میں

گرنے آتا تھا اور وہ اسے ٹھوکر دینا شروع کر دیتی تھی۔
تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹرے میں چائے کی پیالیاں

لے کر وہاں آئی۔ امام صاحب نے مولانا صاحب کو یوں دیکھا جیسے اشارہ کر رہے ہوں کہ بات شروع کی جائے۔ وہ

پہلو بدل کر بولے۔ ”دردناک بہن! بات یہ ہے کہ۔۔۔“
وہ سر پر آچھل درست کرتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ

کے آنے کا مقصد سمجھتی ہوں۔“
”اور ہم بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمہارے لیے سلیمان کا

یہ مطالبہ مان لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔“
وہ چائے کی پیالیاں ان کی طرف بڑھاتے ہوئے

بولی۔ ”مشکل نہیں مولانا صاحب! ناممکن ہے۔ میں ایک ناقابل اعتماد کی کو اجنبی بہو تسلیم نہیں کر سکتی اور میں نے تو ابھی

ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔“
”مگر اب حالات سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں تو سوچنا

بھنسا جائے۔“

وہ شانے پر جھکا کر بولی۔ ”میری کوئی مجبوری نہیں ہے۔“
”اپنے بھائی کی طرف دیکھو۔ تمہارا خون کا رشتہ ہے۔“

وہ بولی۔ ”خون کا رشتہ ہے اسی لیے جڑا ہوا ہے ورنہ ایلا نے تو اسے شتم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔“

”قصود صرف ایلا کا نہیں بلکہ نسیم بھی شریک گناہ رہا ہے۔ دو گناہ گاروں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دینا دانشمندی ہوگی۔ پورے خاندان کی نیک نامی بحال ہو جائے گی۔“

”میں اپنے بیٹے کی حمایت نہیں کروں گی۔ اگر حمایت کرنی ہی ہوتی تو اس روز اپنے بیٹے کو گھر سے کیوں نکالتی؟

پورا حملہ جانتا ہے میں نے اسے سزا دی ہے۔ گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔ نہ جائے میرا بچہ کہاں سڑوں پردوں رات گزار رہا ہوگا؟“

اس نے ڈرائنگ کرچرے کو آچھل سے یوں صاف کیا جیسے آئینہ ہو کر رہی ہو پھر بولی۔ ”بے شک۔ اس سے غلطی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ کوئی فرشتہ نہیں تھا مگر آپ یہ دیکھیں

کہ ابتدا کہاں سے ہوئی تھی؟“
وہ اپنا ہاتھ ان کے سامنے کرتے ہوئے اٹھیوں پر

مٹھنے لگی۔ ”ایک۔۔۔ میرا بیٹا اسے اٹھا کر نہیں لایا تھا۔ دو۔ وہ اپنے قدموں سے چل کر یہاں آئی تھی۔ تین۔۔۔ صبح آپ

سب کے سامنے اس گھر سے برآمد ہوئی تھی۔ چار۔ وہ اس رات میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر بے حیائی کے لیے آئی

تھی۔ پانچ۔ سب کو ایلا کے حلیے سے معلوم ہو گیا تھا کہ نسیم نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ اب اس سے

زیادہ میں کیا بولوں؟ آپ لوگ تو گواہ ہیں۔“
وہ دھڑکنے کو کرید رہی تھی۔ اگرچہ چچ بول رہی تھی مگر وہ

چچ بہت ہی کڑوا تھا۔ سلیمان کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے یوں بچھڑا رہا تھا جیسے اس

شرمناک حقیقت کا منہ نہ چو رہا ہو۔
مولانا نے اسے دیکھا پھر دردناک سے کہا۔ ”ہم اس قصے

کو دہرائے نہیں آئے ہیں مسئلہ کا حل نکالنے آئے ہیں۔ سلیمان بہت پریشان ہے۔ ایلا کی بدنامی اس کی دوسری بیٹیوں کو بھی

تباہ کر ڈالے گی۔ بچوں نے گناہ کیا ہے۔ تم سنبھلی کرو۔“
وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”غلطی کی سزا دی جاتی ہے۔ اس پر

پردہ نہیں ڈالا جاتا اور یہ باتیں تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔“
مولانا نے امام صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹیوں کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے پردہ پوشی سے کام لیا جاتا ہے۔ دردناک بہن! ہم بڑی امیدیں لے کر یہاں آئے

ہیں۔ سوچا تھا تم اپنے بھائی کی نہیں تو کم از کم ہماری بات

ضرور مانو گی۔“

وہ بولی۔ ”آپ دونوں علاقے کے معزز افراد ہیں۔

میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔“

اس نے بھائی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ ”لیکن ذرا سوچیں! اگر اسی طرح گناہوں کی پردہ پوشی کی جاتی رہی تو

آئندہ دوسری لڑکیوں کو بھی شہ طے کی۔ یہ حوصلہ ملے گا کہ گھر سے باہر رات گزارنے اور منہ کالا کرنے کے باوجود

انہیں ذولی نصیب ہو جائے گی۔ آپ صرف ایک پہلو سے سوچ رہے ہیں۔ نہ انجانے میں ایک گناہ گار کو بچانے کے لیے

کتنے ہی نادان ذہنوں کی بہت افزائی کر رہے ہیں۔“
مولانا نے کہا۔ ”تم میرا سر غلط سوچ رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”بیرادہ منائیں مولانا صاحب! مجھے لگ رہا ہے آپ میری سنے نہیں بلکہ صرف اپنی کہنے آئے ہیں۔

چاہتے ہیں کہ میں بھی طرح میں آپ کی بات مان لوں۔“
مولانا فضل کریم نے امام صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ

بات سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ ضد کی چکی ہے۔ جو ٹھکان چکی ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹے گی بلکہ جاہلانہ انداز میں اتنی سیدھی

بلیں دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوششیں کرتی رہے گی۔
مولانا نے امام صاحب کو ہنسنے کا اشارہ کیا۔ انہوں

نے سلیمان کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی شگفتگی سے بچوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہاں سے اٹھے گا تو بکھر جائے گا۔ کبھی سمٹ نہیں

پائے گا۔ اس کی نگاہوں میں ایک بوزھے اور مجبور باپ کی التجا تھی ایک بے بسی بھائی کی فریاد تھی کہ بہن اسے سمیٹ لے۔

امام صاحب نے آخری بار سمجھنے کی کوشش کی۔
”دردناک سے کہا۔ ”تم سے کم اپنے بھائی کے لیے ہمدردی سے

سوچو۔۔۔ یہ بے جا رہ تو جیتے جی مر گیا ہے۔“
اس نے ایک نظر بھائی کو دیکھا پھر کہا۔ ”جس کی قسمت

میں جو ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ تقدیر کے کھکھے کو کون بدل سکتا ہے؟“

وہ بولے۔ ”تدبیر سے تقدیر بھی بدلی جاسکتی ہے۔“
اس نے پہلو بدل کر کہا۔ ”جی بے شک۔ تدبیر سے

تقدیر بدلتی ہے۔ اب میں صاف صاف کہہ دوں کہ میں اپنے بیٹے کی تقدیر بدلنا چاہتی ہوں۔ وہ بے روزگار ہے۔ کبھی کام

دھند سے لگتا ہے تو ماہانہ چار پانچ ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ شادی کرے گا تو کیا کماے گا اور بیوی بچوں کو کیا

کھلائے گا؟“

سلیمان نے کہا۔ ”میں اسے پان سکرپٹ کی دکان

کیا آپ لیوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لیوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لیوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لیوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی سی منگوائیں فون نمبر 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)
(دیکھی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک
لیوب مقوی اعصاب ہم پہنچی میں گے

یعنی نہیں کرتا تو کسی سے کیا کہوں؟“ وہ بولے بولے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اس بدنامی نے ری خندیں اڑادی ہیں۔ بھوک پیاس مرگئی ہے۔ آخر اس کے کا کوئی تو حل ہوگا؟“

”حل تو میں بھی نہیں جانتی مگر مجھ سے ایک بار دشمنی کی جلی ہے۔ اب آپ مجھے نصیحت کے لیے باندھ کر اس دشمنی کی انتہا نہ کریں۔ وہ دشمن بھی مسیحا نہیں بن سکتا۔ نہ ہی میں اس کی مسیحا بن چاہتی ہوں۔“

”بات صرف تمہاری نہیں ہے۔ تمہاری بہنوں کی بھی ہے۔ ان کے بارے میں سوچو گی تو راضی ہو جاؤ گی۔“

اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے ماں کو دیکھتی رہی پھر چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ قسمت کے ہیر پھیر سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ کیا ہو چکا تھا؟ کیا ہو رہا تھا اور آئندہ کیا ہونے والا تھا؟

حالات نے اچانک ہی اسے یوں اٹھا کر کچھڑ میں پھینکا تھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ جب تک نامی نہ رہی تو پھر کیا رہ گیا؟ بدنامی اسے مرجانے کا مشورہ دے رہی تھی۔

آخر حقیقت کیا تھی؟

وہ رینگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد خود کو پاکیزہ یوں کھد رہی تھی؟ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا۔ پھر بھی وہ تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کر رہی تھی۔

کیوں انکار کر رہی تھی؟

اس ”کیوں“ کا جواب اس کے اندر چھپ کر کہتا تھا کہ اس رات کوئی گناہ نہیں ہوا تھا۔ وہ گناہگار نہیں بنی تھی، اگرچہ شیطوں کے درمیان رہی تھی مگر اس نے دامن پر کوئی گناہ نہیں آنے دی تھی۔

ان دنوں وہ ایک شادی کی تقریب میں گئی تھی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شادی خانہ آبادی اس کی زندگی میں کسی بربادی لانے والی ہے؟

وہ اپنی سہیلیوں اور کزنز کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ اب ہی نعیم چندر شے دار لڑکوں کے ساتھ ان کے پاس چلا آیا۔ اس وقت وہ سب شادی اور محبت کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

انٹلا کی ایک کزن نے شرارت بھری نظروں سے نعیم کو دوسرے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے خاندان میں تو بصورت لڑکیوں کی کمی نہیں ہے مگر ہمارے یہ کزن بڑے ناگھرے ہیں۔ گھر کی بریائی چھوڑ کر باہر کی وال ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔“

اس کی نہیں تو ان معزز افراد کی ضرورت سے گی مگر اب یہ امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ امام صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو سلیمان!“

سلیمان کی حالت قابل دید تھی۔ اس کے اندر جیسے کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ سناٹی نہیں دے رہا تھا۔ وہ امام صاحب کے سہارے اٹھ کر اس گھر سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

عبادت کے لیے جانے نماز اور دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے جاتے ہیں۔ انٹلا کی ماں رضیہ بیگم نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے زریاب بولنے لگی۔ ”یا خدا! ہماری بگڑی بناوے۔ دردانہ کے دل میں رحم ڈال دے۔ وہ نعیم کے لیے انٹلا کو قبول کر لے گی تو اس گھر کی عزت رہ جائے گی۔“

وہ بڑے کرب سے بولی۔ ”اے رب العزت! ہمیں عزت دے۔ ہمیں بدنامی سے بچالے۔ نعیم اور دردانہ کے دلوں میں گنجائش پیدا کر دے میرے مالک!۔ وہ انٹلا کو قبول کر لیں۔“

انٹلا دوسرے کمرے میں تھی۔ اس نے وہاں آتے ہوئے ماں کی فریادی تو تڑپ کر کہا۔ ”امی! یہ کیا کر رہی ہیں؟ ماں تو اپنی اولاد کے لیے دعا میں مانگتی ہے آپ بددعا کیوں کر رہی ہیں؟“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”کیا کریں؟ علاج کے لیے کڑوی گولی اٹھنی پڑتی ہے۔ اچھی طرح جانتی ہوں نعیم کسی طور تمہارے لائق نہیں ہے۔ میں نے بھی اسے داماد بنانے کے بارے میں نہیں سوچا مگر اب حالات سمجھا رہے ہیں کہ وہی درد کی دوا بن سکتا ہے۔“

”جس نے زخم دیا ہے اُسی سے مرہم مانگ رہی ہیں؟“

”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو نہ چاہو مجبوراً وہی چیز مانگنی پڑتی ہے۔ درد دینے والے سے ہی دوا لینا پڑتی ہے۔“

وہ ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”امی! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ابو مجھے گناہ گار سمجھتے ہیں۔ میری صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مگر آپ تو سب سمجھتی ہیں۔ سچائی کو جانتی ہیں۔ پھر یہی سی باتیں کر رہی ہیں؟ نعیم اور چھپو نے مجھ سے دشمنی کی ہے۔ مفت میں بدنام کیا ہے۔“

”یہ میں جانتی ہوں، تم جانتی ہو اور ہمارا خدا جانتا ہے۔ مگر دنیا والوں کو کیسے سمجھایا جائے کہ وہ نہیں ہوا جو وہ سمجھ رہے ہیں۔ تم سے دشمنی گئی تھی ہے۔ سازش کے طور پر بدنام کیا گیا ہے۔ سب کو چھوڑو تمہارا اپنا سگا باپ تمہاری بات پر

کر وادوں گا۔“

”میں ایسی دکان کرا چکی ہوں۔ بی بی اور فونو اسٹیٹ کا پی کی مشین بھی لگوائی تھی۔ وہ دکان نہیں چلی۔ میرا بیٹا ایک بہت بڑا جزل اسٹور کرنا چاہتا ہے۔“

”میری اوقات دیکھ کر جو کہو گی میں وہ کروں گا۔ جزل اسٹور میں تو لاکھوں روپے لگانے پڑتے ہیں۔“

”اپنا مکان نعیم کے نام کر دو۔ میں انٹلا کو بہو بنا کر لے آؤں گی۔“

ان بیٹیوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ بھتیجی کی عزت رکھنے کے لیے اس نے بہت بڑا مطالبہ کیا تھا۔ سلیمان نے عاجزی سے کہا۔ ”میں نے تین بیٹیوں کو دہن بنانے کے لیے وہ مکان رکھا ہے۔ اس کا ایک ایک پورشن بیچ کر ان کی شادیاں کروں گا۔ اگر ایک ہی بیٹی کو پورا مکان دے دوں گا تو باقی بیٹیوں کا کیا ہوگا؟“

وہ بولی۔ ”یہ تمہارا مسئلہ ہے تم سمجھو۔ میں تو اسی طرح تمہارا مسئلہ حل کر سکتی ہوں اور کوئی صورت نہیں ہے۔“

مولانا نے کہا۔ ”وہ تمہارے بھائی کی بیٹی ہے۔ انسانیت سے اور لوہے کے رشتے سے اسے گھراؤ۔ یہ لیکن دین کی شرط نہ رکھو۔“

”کیا میرے گھر سے کرم کا لاکر کرنے والی لڑکی کو مفت میں اپنے گلے کا پھندا بٹالوں؟“

”اس گناہ میں تمہارا بیٹا بھی برابر کا شریک رہا ہے۔“

”یہ میں پہلے بھی مان چکی ہوں۔ عقل کی بات یہ ہے کہ سلیمان اپنا مکان نعیم کے نام لکھے گا تو اس میں انٹلا کی بھلائی ہے۔ میرا بیٹا وہ مکان بیچ کر بڑا جزل اسٹور کرے گا۔ انٹلا یہاں آکر راج کرے گی۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”تم سلیمان کو اور اس کے بیوی بچوں کو بے گھر کر دینا چاہتی ہو۔“

”آپ جو بھی سمجھیں۔ مجھے جو کہتا تھا کہہ دیا۔ آپ حضرات کا وقت بہت قیمتی ہے۔ یہاں ضائع نہ کریں۔“

اس نے یہ کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی۔ اب آگے کچھ بھی کہنے کو نہیں رہ گیا تھا۔ وہ واضح الفاظ میں انکار کر چکی تھی۔ مولانا فضل کریم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے امام صاحب سے کہا۔ ”میں چلتا جا رہا ہوں۔“

سلیمان نے سراٹھا کر انہیں دیکھا پھر امام صاحب کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں بے جا رنج اور بے بسی تھی۔ سوال تھا کہ اب کیا ہوگا؟

وہ اس امید کے سہارے بہن کے پاس آیا تھا کہ وہ

دوسری نے کہا۔ ”دراصل ان کی آنکھیں خراب ہیں۔“
ایک اور نے شوق سے کہا۔ ”آنکھیں خراب نہیں ہیں۔
ہمارے حسن کی آپ وہ تاب کے سامنے چندھیا جاتی ہیں۔
بے چارے دیکھ نہیں پاتے۔“

وہ سب ہنسنے لگیں۔ نعیم نے کہا۔ ”خوش فہمیاں تو دیکھوان
کی؟ ارے محترمہ! ابھی آئینہ دیکھنے کی فرصت ملے تو ذرا غور کرنا
کہ ہم آپ کے حسن کو دیکھ نہیں پاتے یا دیکھنا نہیں چاہتے۔“
وہ اور اس کے ساتھی لڑکے ہنسنے لگے۔ ایک لڑکے نے
کہا۔ ”ہمارے خاندان میں ہے ہی کیا جسے دیکھنے کے لیے ہم
اپنا وقت برباد کریں۔“

ایک لڑکی نے کہا۔ ”وقت برباد کر کے تو دیکھو۔ ہم
تمہاری زندگی آباد کر دیں گی۔“

انیلا نے اپنی کزن سے کہا۔ ”رہے دو، ہم جیسے
بیرے کسی جوہری کے ہاتھ لگیں تو ہی اچھا ہے۔“
نعیم نے کہا۔ ”اوہو، تو محترمہ خود کو بھراکتی ہیں؟“
وہ ایک ذرا تن کر بولی۔ ”بے شک۔“

وہ سر جھاتے ہوئے بولا۔ ”سنائے، میرا چاچا کر لوگ
مر جاتے ہیں۔ میں اس بات کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ کیا
آزمائے دوگی؟“

اس نے یہ کہتے ہوئے اس کی کھائی تمام لی۔ انیلا کے
تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کے دماغ میں جیسے دھواں سا
بھرا گیا تھا۔ کچھ بھائی نہ دیا تو اس نے نعیم کے منہ پر ایک لمبا نچہ
بز دیا پھر ایک جھکے سے کھائی چھڑا کر وہاں سے چلی گئی۔

دور گھڑی ہوئی دردانہ نے بیٹے کو طمانچہ کھاتے ہوئے
دیکھا تو کھوپے سے سر تک سلگ گئی۔ جو آگ انیلا کے اندر لگی
تھی اس سے کہیں زیادہ شعلے دردانہ کے اندر بھڑک اٹھے
تھے۔ جس بیٹے کو اس نے بھی پھول کی چمڑی سے بھی نہیں مارا
تھا اسے بالشت بھری لڑکی نے بھری محفل میں طمانچہ مارا تھا۔
اُدھر بیٹا تھلا کر رہ گیا تھا، ادھر ماں تھلا رہی تھی۔ جی تو
کر رہا تھا ابھی جا کر اس کا مزاج ٹھکانے لگا دے۔ اینٹ کا
جواب پتھر سے دے کر بھگاد دے کہ اس کا بیٹا گیا کرنا نہیں
ہے کہ اس پر یوں ہاتھ اٹھایا جائے۔

جواب تو دینا تھا۔ وہ بغیر کلمے میں ٹھنڈ پڑنے والی
نہیں تھی۔ اس محفل میں تو وہ بات آئی ہی ہوئی۔ نازک سے
تھپڑ نے نعیم کے چہرے پر کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا مگر وہ دل
پر نقش ہو گیا تھا اور اسے مٹانے کے لیے وہ انیلا کو بوجھ کھسوت
کر رکھ دینا چاہتا تھا۔

دردانہ نے کہا۔ ”وہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ بڑا بھاد کھایا ہے“

اسے دو کوڑی کا بیٹا کر رکھ دیا تو میرا نام بھی ڈروانہ بیگم نہیں۔“
وہ بولا۔ ”آخر آپ کب کچھ کریں گی؟ بہت دن گزر
گئے ہیں۔ میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے جب
تک بدلہ نہیں لوں گا تب تک سکون نہیں ملے گا۔“

”سکون تو اب اس کا برباد ہوگا اور ایسا ہوگا کہ وہ تمام
عمر سر پکڑ کر روتی رہے گی۔“

”آخر آپ سوچ کیا رہی ہیں؟ کیا کرنا چاہتی ہیں؟
میں اپنے طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں تو روک دیتی ہیں۔“
وہ بڑی مکاری سے مسکرا کر بولی۔ ”اب رکنا نہیں ہے
بلکہ گزرنا ہے۔“

پھر وہ اسے سمجھانے لگی کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔
دوسرے روز بچے کے ایک گھر میں قرآن خوانی کی
محفل تھی۔ دردانہ جاتی تھی انیلا وہاں ضرور آئے گی اور انیلا
آئے گی کیونکہ اس کی ماں دائمی مریض تھی۔ گھنٹوں کی ایک
جگہ بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ کمر اور گھنٹوں کا درد بار بار اسے بستر
پہنچا دیتا تھا اور چھوٹی بیٹنیں سیکند شفت میں اسکول جا
تھیں۔ دوپہر ایک بجے کی گئی ہوئی شام کو پانچ ساڑھے پانچ
بجے لوٹی تھیں۔

جب دردانہ وہاں پہنچی تو اس کا اندازہ درست لگا۔
انیلا تھا آئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے برابر کر بیٹھ گئی۔ انیلا اسے
سلام کر کے سپارہ پڑھنے میں مصروف ہوئی۔ وہ بھی ایک
سپارہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔

دھیرے دھیرے عورتوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔
دردانہ نے سپارہ ختم کر کے رکھ دیا۔ اس گھر کی ایک خانوالہ
سے کہا۔ ”آپ نے بہت تائید کی تھی اس لیے چلی آئی، مگر
محفل کے افتتاح تک رک نہیں سکوں گی۔“

وہ بولی۔ ”آپ وقت نکال کر آئیں۔ یہی بہت بڑی
بات ہے۔ ویسے نازک رک جائیں تو اچھا ہوتا۔ مغرب سے
پہلے قرآن خوانی مکمل ہو جائے گی۔ تبرک چھک کر ہی جاتیں۔“
”یہ کھانا پینا تو چلتا ہی رہتا ہے۔ اصل بات تو وہاں
کی ہے۔ اس محفل میں شریک ہوئی۔ میرے لیے یہی کافی
ہے۔ اب چلتی ہوں۔“

خاتون نے کہا۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔۔۔“
دردانہ نے انیلا کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔
”یہاں سے فارغ ہو کر میرے گھر چلی آؤ۔ کچھ ضروری
باتیں کرنی ہیں۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے پھولی کو دیکھا۔ یہ سن کر
تعب ہوا تھا کہ اسے نیچگی سے کچھ ضروری باتیں کرنی

ہیں۔ لیکن وہ باتیں کیا ہو سکتی تھیں؟
اس نے آجمل درست کرتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں
یہاں کتنا وقت لگے گا؟ ابھی تو پڑھنے کے لیے اچھے خامے
سپارے رکھے ہیں۔“

”جتنا بھی وقت لگے۔ یہاں سے سیدھی میرے پاس
آ جانا۔ میں انتظار کروں گی۔“

اس نے کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے سر ہلا دیا۔
”ٹھیک ہے۔“

دردانہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ کر رکھ دیا ڈالتے ہوئے
تائیدی۔ ”بھول نہ جانا۔ کہیں میں انتظار کرتی ہی رہ جاؤں۔“

”نہیں نہیں۔ مجھے یاد رہے گا آ جاؤں گی۔“

وہ چلی گئی۔ انیلا پھر سے سپارہ پڑھنے میں مصروف
ہوئی مگر دھیان پھولی کی طرف تھا۔ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
آخر اس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟

ایسی کوئی کام ضروری باتیں ہیں جنہیں وہ تنہائی میں کرنا
چاہتی ہے؟ اس کا بار بار تائید کرنا بھار ہاتھ یقیناً کوئی خاص
بات ہے۔ وہ تجسس ہوئی تھی۔ سامنے کلام پاک کے الفاظ
تھے۔ وہ انہیں پڑھ رہی تھی مگر ابھی ہوئی تھی۔ کئی ہفتے گزر گئے
تھے۔ اس نے پھولی کے گھر جانا آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں
جائے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔

شام کے سامنے گھر سے ہو رہے تھے۔ وہ قرآن خوانی
کی محفل سے فارغ ہو کر دردانہ کے گھر چلی آئی۔ یقین تھا کہ
پھولی دردانہ کو ملے گی مگر جب اس نے کال تیل بجائی تو
خلاف توقع نعیم نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ شادی کی
تقریب میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد سے وہ اس سے
کترانے لگی تھی۔ کوشش کرتی تھی کہ ان کا سامنا نہ ہوا کرے۔

بہت دنوں بعد اب سامنا ہوا تو وہ ڈھیٹ بن کر مسکرا رہا تھا۔
وہ ذرا جھجکی گئی۔ کترانے کے انداز میں نظریں جھکا
کر بولی۔ ”مجھے پھولنے بلایا تھا، کہاں ہیں وہ؟“

اسے دیکھ کر ٹھنڈی سنسنی یاد آئی۔ وہ اپنے گال کو
سہلاتے ہوئے بولا۔ ”گھر میں ہی ہیں۔ اندر آ جاؤ۔“

وہ ہچکا کر بولی۔ ”اندر۔۔۔؟“

”ہاں۔ کیوں اندر نہیں آؤ گی؟ کیا زندگی میں پہلی بار
پھولی کے گھر آئی ہو؟“

”آں۔ ہاں۔ نہیں میں وہ۔۔۔“

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اسے اندر آنے کا راستہ دے
کر دوسری طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولا۔ ”ای ای ای
تمہاری بیٹی صاحبہ آئی ہیں۔“

وہ جھپکتے ہوئے اندر آ گئی۔ بچے کی توہین کے باوجود
پھولی بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئی تھی۔ اسی لیے جب اس
نے گھر آنے کو کہا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ پھولی پر احماد کر کے
چلی آئی۔

وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے
ایک کمرے میں آ گئی۔ دردانہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پھولی کہاں ہیں؟“
”واش روم میں ہیں۔ تم بیٹھو۔ میں بلاتا ہوں۔“

وہ ماں کو پکارتے ہوئے جھپک کی طرف چلا گیا۔ وہ
بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ انتظار طویل
ہوتا چلا گیا۔ اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ بار بار دروازے
کی طرف دیکھ رہی تھی۔

گھر میں بدستور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شام گہری
ہو کر رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اب تک نہ پھولی آئی تھی نہ
ہی نعیم پلٹ کر آیا تھا اور بیٹی کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا تھا۔

اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
کمرے سے نکل کر واش روم کی طرف آئی۔ وہ خالی تھا۔ اس
نے چکن میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس
نے پریشان ہو کر دردانہ کو پکارا۔ ”پھولی! پھولی!“

وہ جب سے آئی تھی تب سے دردانہ کی ایک جھلک
بھی دیکھنے کو نہیں ملی تھی اور اب نعیم بھی دکھائی نہیں دے رہا
تھا۔ عجیب پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے اندر
جیسے کوئی انجانا خطرہ شور مچانے لگا۔

وہ پھولی کو پکارتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف
آئی تو دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹھک گئی۔ شدید جمرانی سے دیکھنے
لگی۔ سامنے ہی ایک صوفے پر نعیم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آگے
سینئر نیل بر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور وہ ایک گلاس سے
اُس لعنت کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے بڑی
خفاست سے مسکرا رہا تھا پھر لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں بولا۔
”کیا ہوا، پھولی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہو؟“

اسے اس حالت میں دیکھ کر دماغ کو جھٹکا سا لگا تھا۔ یہ
تو سب ہی جانتے تھے کہ وہ ڈروانہ کا بگڑا ہوا شہزادہ ہے مگر
اس کی آوارگی کس حد تک بڑھ چکی ہے؟ اس کا اندازہ ابھی ہو
رہا تھا۔

اب اسے پھولی کا انتظار نہیں تھا۔ وہ کہاں تھی؟ اسے
کیوں بلایا تھا اور بلا کر اب تک سامنے کیوں نہیں آئی تھی؟
کچھ جاننے کا تجسس نہیں رہا تھا۔ وہ بس وہاں سے نکل جانا

چاہتی تھی۔
وہ کسی بات کا جواب دے بغیر تقریباً دوڑتے ہوئے
بیرونی دروازے کی طرف آگئی۔ چیچے سے اس کا قبضہ سنا
دیا۔ دروازے پر پہنچ کر کچھ میں آیا کہ وہ ایسے شیطانی انداز
میں قبضہ کیوں لگا رہا ہے؟

وہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ صرف کڑی لگی ہوئی تو وہ
ایک جھٹکے سے کھول کر پلک جھپکتے ہی باہر نکل جاتی مگر وہاں تو
بھاری بھر کم تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کی تو جیسے سانسوں پر تالے
پڑ گئے۔

اس نے شدید پریشانی سے پلٹ کر فیم کو دیکھا پھر اس
تالے کو دیکھا۔ بات سمجھ میں آ بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔
ذہن تسلیم کر بھی رہا تھا اور بے بسی بھی تھی کہ گئے خون
کے رشتے اس کے ساتھ کوئی گناہ نہ تھا تو کھیلنا چاہتے ہیں۔
اس نے تالے کو سمجھوڑ کر دیکھا۔ وہ مضبوط تالا تھا اس
کے نازک ہاتھوں کی زور ازوری سے کھلے والا نہیں تھا۔ وہ
قریب آتے ہوئے بولا۔ ”یہ چابی کے بغیر نہیں کھلے گا اور چابی
میرے پاس ہے۔“

اس نے پریشانی کو چھپاتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔
”یہ کیا مذاق ہے؟ اسے کھولو۔ مجھے جانے دو۔ کیس تو۔“
وہ اور قریب آ گیا۔ وہ چیچے بچتے ہوئے دروازے
سے لگ گئی۔ وہ بولا۔ ”نہیں تو کیا...؟ چوکی...؟ چلاؤ گی؟
شور مچاؤ گی؟“

اس نے اچانک ہی اور قریب ہو کر اسے ایک بازو
کے حصار میں جکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ کو تختی سے اس کے منہ پر
جما کر کہا۔ ”لو... اب چکو۔“

وہ ”اؤں۔ اؤں۔“ کی آوازیں نکالتے ہوئے خود کو
چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ شراب کی بواس کے منہ میں بھری
ہوئی تھی۔ سانسوں کے پھیلنے سے تھک کر ایلا کا دم گھٹ رہا تھا۔
وہ غصے سے بولا۔ ”ایک کلائی پکڑنے پر اتنا غصہ دکھایا
تھا۔ بہت برا لگا تھا نا؟ اب تو پوری کی پوری میری گرفت
میں ہو۔ اب کیسا لگ رہا ہے؟“

وہ خود کو چھڑانے کے لیے اس کے ہاتھوں کو توجہ رہی
تھی۔ اسے خود سے دور رکھنے کے لیے دھکے دے رہی تھی۔
اس کے سینے پر اور بازوؤں پر گھونے مار رہی تھی۔ وہ نشتے کے
باعث ڈر لگا رہا تھا پھر بھی اسے جھکا دیتے ہوئے بولا۔ ”میں
کبھی کسی کا ادھار نہیں رکھتا۔ جلدی اتار دیا ہوں۔ تمہارا وہ
تھپڑ مجھ پر ادھار ہے۔ مگر نہ کرو۔ آج سو دست لوناؤں گا۔“
وہ اس کے گلے سے نجات کے لیے چل رہی تھی۔ کسی

اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہا۔ ”چلو اچھا ہے۔ فیم پھر کہیں
کام سے لگ جائے گا۔“

تھوڑی دیر پہلے ہی سلیمان نے سوچا تھا کہ بہن کے گھر
جا کر ایلا کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے مگر اس کی آمد نے
تجسبات دیا تھا کہ بیٹی وہاں بھی نہیں ہے۔
وہ بولا۔ ”اچھی بات ہے۔ تمہیں آپا کے پاس جانا
چاہیے۔ وہ تو اپنی تیاری کی وجہ سے گھر کی ہو کر رہ گئی ہیں۔
میں بھی کسی روز ان سے ملنے جاؤں گا۔“

دردانہ کے ہونٹوں پر وحشی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ
بوڑھے دادا والدین سمجھ نہیں سکتے تھے کہ اس مسکراہٹ کے
پیچھے کیسی کینٹکی چھپی ہوئی ہے؟ اس نے ادھر ادھر دیکھتے
ہوئے پوچھا۔ ”ایلا کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی؟“

رضیہ بیگم نے ہچکچا کر شوہر کو دیکھا۔ پھر بات بتاتے
ہوئے کہا۔ ”وہ قرآن خوانی میں لگی ہے۔“
وہ بڑے تعجب سے بولی۔ ”اس وقت کہاں قرآن
خوانی ہو رہی ہے؟“

اس نے نہیں بتایا کہ اس محفل میں وہ بھی شریک ہوئی
تھی۔ رضیہ بیگم نے کہا۔ ”اصل میں وہاں رات کا کھانا بھی
ہے۔ کہہ کر گئی تھی کہ دیر ہو جائے گی۔“

وہ بولی۔ ”ہاں اب تو نیاز نذر کی مخفلیں بھی شادی بیاہ
جیسی ہو گئی ہیں۔ رات گئے تک چلتی رہتی ہیں۔ ویسے جوان
لڑکی کو یوں تھما دیتی رہیں گے رہنا چاہیے۔ آزاد ہی بھی
ایک حد تک ہوتا اچھی لگتی ہے۔“

رضیہ نے کہا۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں اپنی بیٹیوں
پر پورا بھروسہ ہے۔“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کے انداز میں
بولی۔ ”بے شک۔ بھروسہ کرو مگر اندھا اعتماد نہ کرو۔“

رضیہ نے ناگوار سی سے پوچھا۔ ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“
وہ بولی۔ ”کہنا نہیں، سمجھانا چاہتی ہوں۔ وہ میرے
بھائی کی بیٹی ہے۔ بھروسہ میرا کیا اس کی بھلائی کے لیے کچھ
بول نہیں سکتی؟“

بہن نے ایک ذرا اپنا تے جتا کی تو بھائی کی شکل
گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں؟ ضرور بول
سکتی ہو بلکہ سمجھانے کے لیے ان بچیوں کو ڈانٹ بھی سکتی ہو۔
آخر کو تمہاری بیٹیاں ہیں۔ تمہاری بیٹی بھی ہیں۔“

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک بیٹی کے
سر پر ہاتھ بھیر کر بولی۔ ”ویسے مجھے بھی ان پر پورا بھروسہ
ہے۔ ماشاء اللہ۔ بہت سمجھدار بچیاں ہیں۔ سب اپنے ماں

باپ اور خاندان کا سر نچا نہیں لیں گی۔ ہمیشہ ہمارا فخر بن کر
رہیں گی۔“

سلیمان اور رضیہ بیگم نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ بیک
اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”اچھا تو میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ...!“
وہ باتیں بنا کر اپنا بیت جتا کر رخصت ہو گئی۔ ایک ذرا
شب نہیں ہونے دیا کہ اپنے گھر میں کیسا شیطانی کھیل رچا کر جا
رہی ہے؟

☆☆☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، تشویش بڑھتی جا رہی
تھی۔ ایلا نہ خود آئی تھی نہ کہیں سے اس کی کوئی خبر مل رہی
تھی۔ رضیہ بیگم نے پریشانی سے کہا۔ ”گھر گھر جا کر جوان لڑکی
کے بارے میں پوچھنا بھی مناسب نہیں ہے۔ لوگ سوال
جواب شروع کر دیں گے۔ بات کو پر لگتے دیر نہیں لگے گی۔“

سلیمان نے کہا۔ ”میں کروں تو کیا کروں؟ جہاں جہاں
اس کے جانے کی توقع کی جا سکتی تھی وہاں تو میں نے کسی نہ کسی
بہانے سے معلوم کر لیا ہے۔ یا خدا! وہ کہاں جا سکتی ہے؟“

اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھ کر کہا۔ ”سوچا تھا شاید
دردانہ کی طرف لگی ہوگی۔ جا کر پوچھنا ہی چاہتا تھا تو وہ خود ہی
یہاں چلی آئی۔“

ایک بیٹی نے کہا۔ ”پتا نہیں۔ آپ کہاں لگی ہیں؟ کبھی
ماتے بغیر گھر سے باہر نہیں رہیں۔“

دوسری بیٹی نے رونے کے انداز میں کہا۔ ”آپ کہاں
گم ہو گئی ہیں؟ میرے دل میں تو ہول اٹھ رہے ہیں۔ عجیب
عجیب سے خیالات آرہے ہیں۔“

ان بیٹیوں کے ماں باپ نے ایک دوسرے کو پریشان
ہو کر دیکھا۔ باپ نے کہا۔ ”مجھے میں نہیں آتا کیا کروں؟
تھانے میں رپورٹ درج کراؤں گا تو معاملہ اور بڑا جائے
گا۔ بدنامی الگ ہوگی۔“

رضیہ نے جلدی سے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”خدا
کے لیے تھانے کا نام نہ لو۔ خاموشی سے اپنے طور پر تلاش
کرنے کی کوشش کرو۔“

وقت گزر رہا تھا اور وہ اپنی جان سے گزر رہے تھے۔
ادھر وہ محفوظ تو ہو گئی مگر یہ سوچ سوچ کر لگان ہو رہی تھی کہ
اس کی گمشدگی بوڑھے والدین کو نہ جانے کیسے اندیشوں
میں مبتلا کر رہی ہوگی؟

اس کے دل میں ایک امید تھی کہ والدین اسے تلاش
کرتے ہوئے ادھر ضرور آئیں گے۔ آپ نے سوچ لیا تھا
بیرونی دروازے کی کانگ نکل سائی دے گی تب ہی وہ اس

رہی۔ بند دروازے کو اور اپری کی کوڑھی رہی۔ سوچا اچھا تھا وہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔
مگر یہ سوچ کر مایوسی ہو رہی تھی کہ بیرونی دروازے پر تالا بڑا ہوا ہے۔ وہ اس کمرے سے تو نکل جائے گی لیکن کمرے سے کیسے نکلے گی؟ نہ جانے نعیم نے چابی کہاں رکھی ہوگی؟
اس نے پھر ایک بار دروازے کے نیچے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بدستور گہری نیند میں تھا۔ خزانوں کی آواز بھی ذرا تیز ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے بسم اللہ پڑھ کر دھیرے سے چٹنی کو نیچے کیا پھر آہستگی سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دھکا پڑھنے لگی۔ اس وقت دل تیزی سے یوں دھڑک رہا تھا جیسے دروازہ کھلتے ہی سینے کی دیوار توڑ کر اٹھلا سے پہلے باہر نکل بھاگے گا۔

اس نے اللہ کا نام لے کر دروازے کو ایک ذرا سا کھولا پھر وہاں سے آٹھ لگا کر فرش پر پڑے ہوئے نعیم کو دیکھا۔ سونے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے کچھ ہوش نہیں ہے۔ وہ بے ہوش کی نیند سو رہا تھا۔

وہ دروازے کو ذرا اور کھول کر دے قدموں باہر آگئی۔ سینڈل کھٹ پٹ کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں اتار کر ایک ہاتھ میں لے لیا۔ خوف کے مارے جان نکل رہی تھی۔ اگرچہ وہ بے سدھ پڑا ہوا تھا، پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی اٹھ کر حملہ کرنے والا ہے۔

وہ دیوار سے لگ کر قحط انداز میں ایک طرف بڑھ رہی تھی۔ ایسے وقت اس کی نظریں نعیم کے چہرے پر پڑی ہوئی تھیں۔ اٹھلا کو ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کسی فلمی سین کی طرح وہ بھی اچانک ہی جاگ جائے گا۔ اس پر حملہ کرے گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے ذرا دور آ کر سوچنے لگی۔ چابی کہاں ہو سکتی ہے؟

عقل نے سمجھایا، یقیناً اس کی جیب میں ہوگی۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ”اے خدا! کیا اس کے لباس کی تلاشی لینا پڑے گی؟ اس طرح تو میں اپنی شامت کو خود ہی دعوت دوں گی۔“

اس نے بیرونی دروازے کو دیکھا۔ ”کروں تو کیا کروں؟ تالا کھولنے کے لیے چابی ضروری ہے۔“
نعیم کو چھوڑ کر لباس کی تلاشی لینا تو دور کی بات تھی، اسے تو دیکھ کر ہی وحشت ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا۔ ”پچھو کھر کی تمام چابیاں ایک کی بولڈر میں رکھی ہیں۔ پہلے مجھے وہاں دیکھنا چاہیے۔“

وہ تیزی سے چلتے ہوئے نالغ میں آئی۔ وہاں ایک

کمرے سے نکلے گی۔
اس نے نعیم کی گرفت سے نکلنے کے بعد سوچا تھا، شور مچا کر وہ پڑوس والوں کو بلائے گی لیکن اسے ایک کمرے میں بند ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ نعیم اب اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ مطمئن تھی۔ خواجہ شور مچا کر تالا بنائیں چاہتی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نعیم کے سر پر انتقام کا بھوت سوار تھا۔ اسے بدنامی کی پروا نہیں تھی لیکن وہ شور مچا کر محلے والوں کو بلا کر اپنے پورے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بند کمرے کے باہر وہ جھنجھلا رہا تھا۔ جو سوچا نہ تھا، وہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کے کھٹنے میں رچے ہوئے بھی اس کی پٹخی سے دور ہو گئی تھی۔ محفوظ ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے کیسے اس پناہ گاہ سے باہر نکالے؟

فی الحال تو وہ دروازے سے لڑ رہا تھا۔ کسی بھی طرح اسے کھول لینا چاہتا تھا مگر شراب کا نشہ اب سر چڑھ رہا تھا۔ وہ ڈمگ رہا تھا، سنبھل رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی جھانے لگی تھی۔ دروازہ کھولتے ہوئے لگ رہے تھے۔

وہ ہاتھ آتے آتے بند دروازے کے پیچھے جیسے ٹھیکہ دکھا رہی تھی اور وہ جھنجھلا رہا تھا۔ شراب اور شباب کے کھیل کا مزہ کر رہی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے بیزار ہو کر دروازے کو ایک ٹھوکر ماری۔ پھر لڑکھڑاکر دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک دیوار سے پشت لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔

حسن کی چوکھٹ پر ہوس سوالی بن گئی تھی لیکن ایک کوڑی کی بھی خیرات ملنے والی نہیں تھی۔

وہ اندر سے سنبھلی ہوئی تھی۔ بند دروازے سے یوں لگی کھڑی تھی جیسے در بے گئی تو وہ اسے ایک جھٹکے سے کھول کر اندر آ جائے گا۔ نعیم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ نئے اور غصے کی حالت میں خرافات بک رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی آواز ذہنی چلی گئی۔ اٹھلا نے توجہ سے سننے کی کوشش کی۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی۔

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کو دیکھا پھر نیچے بیٹھ گئی۔ بند ہے کے انداز میں جھک کر فرش سے چہرہ لگا کر دروازے کی چٹاری سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ بیزار ہو کر وہاں سے چلا گیا ہے مگر وہ گپا نہیں تھا۔ بلکہ وہیں ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اس کے دھیمے دھیمے سے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر ایک ذرا حوصلہ ملا کہ شکاری گہری نیند میں ڈوب چکا ہے۔ وہ ٹھوڑی دیر تک سوچتی

تھی۔ ایسے ہی وقت اس نے پکارا۔ ”اٹھلا! ارک جاؤ۔“
اس نے تیزی سے اندر جا کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ نعیم نے لپک کر دروازے پر ایک ہاتھ جھکا دیا۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر وہ بھی زور لگا رہی تھی۔ کسی بھی طرح اسے بند کر کے چٹنی چڑھانا چاہتی تھی لیکن سوچ نہیں مل رہا تھا۔

دروازے کے پٹ اور چوکھٹ کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ تھا۔ اٹھلا کے دھکیلنے سے وہ فاصلہ کبھی کم ہو رہا تھا، کبھی نعیم کی زور آزمائی سے وہ دروازہ کھلتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اگرچہ نکلنے کی دھند چھٹ چکی تھی پھر بھی اس کا سر گھوم رہا تھا۔ شاید اسی لیے پوری قوت لگانے کے باوجود کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر وہ ایک ہاتھ فرش پر ٹیک کر دوسرے ہاتھ سے دروازے پر دباؤ ڈالتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قدم ذرا ڈمگائے تھے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ بس یہی وہ وقت تھا جب باہر سے دھکیلنے جانے کی شدت میں ایک ذرا کی آئی تھی۔ وہ کمزور پڑ گیا تھا۔ اٹھلا نے فوراً ہی اسے بند کر کے اپری چٹنی چڑھادی۔

ادھر نعیم نے سنبھلنے کے بعد دروازے کو دھکا دینا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ اندر سے بند ہو چکا ہے۔ وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔

خواتین حوصلہ بھر پور بیٹھے داخلہ لین

انجمن اسلامیہ کورس	پہلی کلاس	پہلی کلاس	پہلی کلاس
انجمن اسلامیہ کورس	دوسری کلاس	دوسری کلاس	دوسری کلاس
انجمن اسلامیہ کورس	تیسری کلاس	تیسری کلاس	تیسری کلاس
انجمن اسلامیہ کورس	چوتھی کلاس	چوتھی کلاس	چوتھی کلاس
انجمن اسلامیہ کورس	پانچویں کلاس	پانچویں کلاس	پانچویں کلاس
انجمن اسلامیہ کورس	ششماہی کورس	ششماہی کورس	ششماہی کورس
انجمن اسلامیہ کورس	ایک سالہ کورس	ایک سالہ کورس	ایک سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	دو سالہ کورس	دو سالہ کورس	دو سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	تین سالہ کورس	تین سالہ کورس	تین سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	چار سالہ کورس	چار سالہ کورس	چار سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	پانچ سالہ کورس	پانچ سالہ کورس	پانچ سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	شش سالہ کورس	شش سالہ کورس	شش سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	ساتھ سالہ کورس	ساتھ سالہ کورس	ساتھ سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	ہفت سالہ کورس	ہفت سالہ کورس	ہفت سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	آٹھ سالہ کورس	آٹھ سالہ کورس	آٹھ سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	نہیں سالہ کورس	نہیں سالہ کورس	نہیں سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	دس سالہ کورس	دس سالہ کورس	دس سالہ کورس
انجمن اسلامیہ کورس	ایک سو سالہ کورس	ایک سو سالہ کورس	ایک سو سالہ کورس

اسلام آباد اکیڈمی

1237

دروازے کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”دروازہ کھولو ایلا!“
وہ اسے دھکے دے رہا تھا۔ ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اندر
اُس کا دل بول رہا تھا۔ یہ خوف طاری ہو رہا تھا کہ ہو سکی
منہ زوری کہیں اس دروازے کو توڑتے ہوئے اندر نہ ہستی
چلی آئے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”ضمیم! میں مر جاؤں
کی مگر اسے نہیں کھولوں گی۔“
”میں بھی دیکھتا ہوں“ کب تک نہیں کھولو گی؟ کب
تک اندر چھپی رہو گی؟ یاد رکھو! اُس وقت تک یہاں قیدی بن
کر رہو گی۔ جب تک خود کو میرے حوالے نہیں کر دیتیں۔“
اسے نجات کا کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھ
میں نہیں آ رہا تھا وہاں سے نکلنے کے لیے کیا تدبیر کرے؟ یہ
بات بھی سچی تھی کہ کب تک اس کمرے میں بند رہے گی؟
اسے گھر والوں کا خیال آ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے
پریشان ہوں گے۔ اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ نہ
جانے پھوپھی کہاں مر گئی تھی؟ کب تک وہاں آنے والی تھی
اور وہاں آنے کے بعد بیٹے کو ناکام دیکھ کر نہ جانے کیا
ردعمل ظاہر کرنے والی تھی؟
اسے جو بھی آیات یاد آ رہی تھیں انہیں پڑھ رہی تھی۔
کسی بھی طرح اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے
خدا کے حضور گڑ گڑا کر دعا میں مانگ رہی تھی۔

اس گھرانے پر تو بیٹھے بھائے ایک افتاد آن پڑی
تھی۔ رضیہ بیگم اور سلیمان سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی
عزت پر شب خون مارنے والے غیر نہیں ہیں۔ جوان بیٹی کسی
دشمن کے نہیں بلکہ سگے رشتوں کے غلبے میں پھنسی ہوئی ہے
شکار بنی ہوئی ہے اور وہ شکاری کسی بھی وقت اُس پر دھاوا بول
سکتا ہے۔

اُن کی امیدوں کے ساتھ رات بھی ڈھلتی جا رہی تھی۔
سلیمان نے کہا۔ ”یوں گھر میں خاموش بیٹھے رہنے سے کچھ
حاصل نہیں ہوگا۔“

”تو کیا کرو گے؟ کیا باہر نکل کر پورے محلے میں
ڈھنڈورا پیٹو گے؟ ہماری بیٹی شام سے غائب ہے؟ آدمی
رات گزر چکی ہے اب تک لوٹی نہیں ہے؟“

وہ غصے سے بولا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں نے
ایسا کب کہا ہے؟ کیا میں باپ ہو کر بیٹی کے بارے میں ایسی
باتیں کرتا پھر دوں گا؟ تمہاری گھوڑی الٹ گئی ہے کیا؟“

دوسری بیٹیاں بھی پریشان تھیں۔ بڑی بہن کی واپسی
کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ماں باپ کو یوں جھگڑنے
دیکھ کر اور پریشان ہو گئیں۔ ایک نے کہا۔ ”ای! کیا ہو گیا

ہے آپ کو؟ ابو سے پوچھ تو لیں وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ انہیں
بات تو پوری کرنے دیجیے۔“
وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”یہ تمہاری ماں کی پرانی عادت ہے۔“
وہ دونوں ہاتھوں سے سر قہام کر بولی۔ ”خدا کے
لیے... اس وقت مجھ سے مت الجھو۔ میں بحث نہیں کر سکتی۔
اپنی بیٹی کے لیے پریشان ہوں۔“
وہ بولا۔ ”ہاں اور میں تو جیسے خوشی میں بھٹکے ڈال
رہا ہوں۔“

ایک بیٹی نے کہا۔ ”خدا کے لیے ایلا! آپ ہی اس
بات کو ختم کر دیں۔ آپس میں الجھنے سے بہتر ہے آپنی کو
ڈھونڈنے کی کوئی راہ نکالیں۔ سوچیں کہ اس سلسلے میں ہمیں کیا
کرنا چاہیے؟“

”وہی سوچ رہا تھا مگر کچھ کہنے سے پہلے تمہاری ماں
نے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔“

وہ بولی۔ ”ہاں تو اب بول دو ناں... پریشانی میں اللہ
سیدھا حانہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ جوان بیٹی کی گمشدگی نے
عقل خراب کر دی ہے۔“

وہ جواباً سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ایک بیٹی نے کہا۔ ”ایلا!
پلیز۔ جانے دیں۔ آپ بولیں کیا کہنا چاہتے تھے؟“

اس نے ایک گہری سانس لی پھر ذرا توقف سے کہا۔
”میں تھانے کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن وقت گزرنے
کے ساتھ اس کی گمشدگی جان نکال رہی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی
سے مشورہ کرنا ہوگا کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے؟“

اس نے بیٹیوں کو دیکھا پھر بولی سے کہا۔ ”سوچ رہا
ہوں“ مسجد کے امام صاحب اور مولانا فضل کریم کے پاس
جاؤں، انہیں اپنی پریشانی بتاؤں۔“

رضیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی،
مگر ایک بیٹی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ابو کو
بولنے دیں۔“

سلیمان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ
علاقے کے معزز افراد ہیں۔ معاملات کو سمجھانا جانتے ہیں۔
یقیناً ہمیں کوئی بہتر حل دے سکیں گے۔“

رضیہ نے کہا۔ ”بہنیں گہری بات باہر نکل کر ہی رہے گی۔“
وہ بولا۔ ”نکلے گی مگر نکل کر بھی مجھو گھر میں ہی رہے
گی۔ وہ لوگ بات کا جتنکڑ بٹانے والوں میں سے نہیں ہیں۔
قابل اعتماد ہیں۔ اسی لیے ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ بولا۔ ”اس کے سوا اور کوئی
چارہ نہیں ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ہم کب تک ہاتھ پر

ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں گے؟“
وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ”ٹھیک کہتے ہو۔ ان
سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ویسے...“
وہ بولتے بولتے ہچکچانے لگی پھر بولی۔ ”کہتے ہوئے
دل ڈوب رہا ہے مگر مجھے یہ غواہی واردات ہی لگ رہی ہے۔“
وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”اس ملک خدا داد
میں یہی ہو رہا ہے۔ غربت اور مہنگائی کے ساتھ ساتھ جرائم
میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب لوٹنے والے یہ نہیں دیکھتے
کہ بندہ غریب ہے یا امیر... ڈر کے لیے نہ سہی ہوں کے لیے
واردات کرتے ہیں۔“

رضیہ نے کہا۔ ”پہلے کروڑ پتی اور صاحب جاکدا افراد کو
اغوا کیا جاتا تھا۔ اب تو یہ دردندے ہم غریبوں کو بھی محاف
نہیں کرتے۔ ہمیں بھی ایسی وارداتوں کا نشانہ بنارہے ہیں۔“
وہ آجکل پھیلا کر روتے ہوئے بولی۔ ”خدا کرے
ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوں۔ یا اللہ! میری بیٹی کی حفاظت
فرما۔ اس مصوم کو اپنی پناہ میں رکھنا میرے پروردگار...!“
وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر میں جاتا ہوں۔“

”اس وقت...“
”ہاں۔ ایک گھنٹے بعد فجر ہونے والی ہے۔ وہ تہجد کے
لیے پہلے ہی اٹھ جاتے ہیں۔ اگر سوچی رہے ہوں گے تو میں
وہیں مسجد میں بیٹھ کر انتظار کرتا رہوں گا۔ تنہائی میں بات
کرنے کا یہی موقع ہے۔“

وہ چلا گیا۔ رضیہ بیگم کے دماغ میں آنندھیاں سی چلی
رہی تھیں۔ چشم تصور سے دیکھ رہی تھی کہ بیٹی کو ہوس پرستوں
نے اغوا کیا ہے اور وہ اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کر رہے
ہیں۔ وہ چٹخیں مار رہی ہے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ اسے
یاد آ رہا تھا کہ وہ کبھی چوہے اور لال بیک کو دیکھ کر ڈر جاتی تو
ماں کو پکارتی تھی۔ ”ای!... ای!... ای!“

اس وقت ماں کو بیٹی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ
دردندوں کے حصار میں ای! ای! کہہ کر ہلا رہی تھی۔
اگر چندہ دردندوں کے حصار میں تو نہیں تھی لیکن پھوپھی
زاد کے غلبے میں تھی۔ اکثر شرمناک جرائم خاندان کے اندر
ہی چار دیواری میں ہوتے ہیں۔

ماں سر ہلا کر سوچ رہی تھی۔ ”وہ واپس آ بھی گئی تو کیا
ہوگا؟ لوگ اسے آبرو یا خند نہیں گے۔“

اس نے شدید مایوسی سے سوچا۔ ”بدنامی کی شروعات
تو ہو چکی ہے۔ رات سے صبح ہونے والی ہے۔ کئی گھنٹے گزر
چکے ہیں۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟ کیسے حالات نے گزر رہی

ہوگی؟ اگرچہ امام صاحب اور مولانا صاحب قابل بھروسا
ہیں۔ بدنامی کو ہوائیں دیں گے مگر پھر بھی یہ بات دوسروں
سے کب تک چھپی رہ سکے گی؟“
اس کے دماغ میں دردانہ کی باتیں گونجنے لگیں۔
”جوان لڑکی کو یوں تنہا اتنی دیر تک باہر نہیں رہنا چاہیے۔ آزادی
بھی ایک حد تک ہو تو ابھی لگتی ہے۔ اولاد پر اندھا اعتماد نہیں
کرنا چاہیے۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”دردانہ بڑی چالاک ہے۔ پلک
جھپکتے میں معاملات کی بو پالتی ہے کہ کہاں کیا چل رہا
ہے؟ اب غور کر رہی ہوں تو اس کی باتوں سے ایسا ہی لگ رہا
تھا جیسے وہ ہماری پریشانی کو بھانپ گئی تھی۔ میری بیٹی کی
آزادی پر لیچکر دے رہی تھی گویا ہمیں چوکنا کر رہی تھی کہ ایلا
اس آزادی کا غلط فائدہ اٹھا سکتی ہے۔“

وہ جائے نماز بچھاتے ہوئے بولی۔ ”یا خدا! رحم کر۔
ابھی سب کچھ اندھیرے میں ہے۔ اگر اصل معاملہ دردانہ
کے کانوں تک پہنچ گیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو اشتہار لگا دے گی۔“
وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”اللہ کے
ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ وہ
بڑی آپا کے پاس گئی ہے۔ اللہ کرے ایلا اس کی واپسی سے
پہلے گھر آجائے۔“

وہ نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ عجیب پڑھتے ہوئے
دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ بے شک۔ اللہ سب سے بڑا
ہے۔ وہی عزتوں کا رکھوالا ہے۔ مگر زمین پر بسنے والے ناخدا
دوسروں کی زندگی اور عزت کو کھلوتا بھگتے ہیں۔ دردانہ اپنے
بیٹے کو بھلانے کے لیے ایک کھلونا دے کر گئی تھی۔ بھائی کی
نیک نامی کو سبھی میں ملانا چاہتی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ مارنے
والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔

بعض اوقات قدرت گہری خاموشی اختیار کر لیتی
ہے۔ سن مانی کرنے والوں کو چھوٹ دیتی ہے اور صبر کرنے
اور تحمل سنبھالنے والوں کا امتحان لیتی ہے۔ ابھی تو امتحان کی ابتدا
ہوئی تھی۔

امام صاحب مسجد سے ملحقہ ایک کوارٹر میں اپنی فیملی
کے ساتھ رہتے تھے۔ سلیمان جب وہاں پہنچا تو وہ جاگ چکے
تھے۔ مسجد کے ایک حصے میں تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔ وہ
خاموشی سے آکر ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ انہوں نے سلام
پھیرنے اور دعا مانگنے کے بعد اٹھنا چاہا تو اس پر نظر پڑنے ہی
رک گئے۔ سلیمان نے انہیں سلام کیا۔

وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولے۔ ”تم کبھی نماز

نہیں پڑھتے۔ آج پہلی بار تمہیں مسجد میں دیکھ رہا ہوں۔“ اس بات نے اسے کڑا دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر بولا۔ ”مجھے بے نمازی کو سزا مل رہی ہے۔ منہ چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ بس یہی ایک مسجد ہے۔“ پیش امام صاحب نہیں جانتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے مگر اس کے آنسوؤں نے اور اس کے بے نمازی ہونے کے احساس نے سمجھا دیا کہ وہ کسی جان لیوا مصیبت میں گرفتار ہے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”قبلہ رو بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ کے سامنے اللہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری عزت رہ جائے گی، میری بچیوں کے سر پر حیا کا آئینہ رہے گا تو میں پانچوں وقت کی نماز پڑھنے مسجد میں آیا کروں گا۔“ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ کیوں رورہے ہو؟“

وہ قیص کے دامن سے آنسو پونچھنے لگا۔ سوچنے لگا، کن الفاظ میں اپنا دکھ بیان کرے؟ اس نے کہا۔ ”یہ میرے گھر کا، میری چار دیواری کا راز ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ بات میرے گھر سے اور مسجد سے باہر نہ جائے۔“

”بھلے خدا پر بھروسہ کرو پھر مجھ پر اعتماد کرو۔ یہاں جو بھی کہو گے وہ بات میرے سینے میں محفوظ رہے گی، باہر نہیں نکلے گی۔“

وہ سر جھکا کر، ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ وہ پوری روداد سننے کے بعد بولے۔ ”یہ تو واقعی تشویشناک بات ہے۔ ویسے تم نے تمھارے نہ جا کر غلطی کی ہے۔“

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟ اسی لیے آپ کے پاس چلا آیا۔ ایسا لگ رہا ہے بدنامی کا مغربیت مجھے اپنے قبیلے میں جھڑنے ہی والا ہے۔ میرے تو چہروں تلے سے زمین نکل رہی ہے امام صاحب۔۔۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بولے۔ ”مصیبت نکتی ہی جان لیوا کیوں نہ ہو جب سر پر آتی ہے تو اسے سہتا ہی پڑتا ہے۔“

”مصیبت جانین لینے والی ہو تو پروا نہیں مگر نیک نامی ایک بار خاک میں مل گئی تو میرے خاک میں لٹ جانے کے بعد بھی واپس نہیں آئے گی۔ میں چاہتا ہوں کسی کو خبر نہ ہو۔ ہم چپ چاپ اسے تلاش کرتے رہیں۔ آپ مجھے صلاح دیں میں اس سب سے کیا کروں؟“

”فی الحال بات چھپائی جا سکتی ہے۔ ابھی کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ہر والوں کو بھی سمجھا

دو۔ کوئی بھی ایذا کا پوچھو تو کہہ دیا جائے کہ وہ کسی رشتے دار کے گھر رہنے لگی ہے۔ دس پندرہ دن کے بعد لوٹے گی اور خدا کرے وہ جلدی لوٹ آئے۔“

وہ اپنے کانوں کو چھو کر بولے۔ ”خدا مجھے معاف کرے۔ میں ایک گھرانے کی عزت اور نیک نامی قائم رکھنے کے لیے مصیبت جھوٹ بولنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔“

سلیمان نے کہا۔ ”مکھے والوں سے یہ معاملہ چھپانا مشکل نہیں ہوگا لیکن میری بہن دردناک توبال کی کھال لگاتی ہے۔ اسے ٹالنا آسان نہ ہوگا۔ فی الحال اس کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے۔ وہ بڑی بہن کے پاس گئی ہے۔“

”اوپر والا پریشانی کے ساتھ ساتھ بولتیں بھی دیتا ہے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ”ویسے مجھے یہ انوکھی واردات لگتی ہے۔“

”مجھے بھی یہی اندیشہ ہے۔ خدا سے دعا مانگ رہا ہوں یہ اندیشہ غلطی ہو۔“

وہ اس کے شانے کو تھک کر بولے۔ ”خدا پر بھروسہ رکھو۔ انشاء اللہ سب بہتر ہو جائے گا۔ ویسے اگر تم کو تو اس سلسلے میں مولانا صاحب سے بھی بات کی جا سکتی ہے۔“

”میں آپ دونوں سے ہی مشورہ کرنے آیا تھا۔“ ”تو پھر ٹھیک ہے۔ وہ فجر کی نماز کے لیے آئیں گے۔“

تم بھی یہیں رہنا۔ تنہائی تلے ہی ان سے ذکر کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے تب تک تمہیں جینی کے سلسلے میں کہیں سے کچھ سن کن بھی مل جائے۔“

فجر کی نماز کے بعد وہ مولانا فضل کریم سے بات کرنا چاہتے تھے مگر قادر جان کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ امام صاحب نے اسے دیکھتے ہوئے مولانا سے کہا۔ ”مجھے تنہائی میں آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

آخر ایسا ہوتا تھا لوگ اپنے مسائل بیان کرنے اور ان کے حل تلاش کرنے کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ ابھی کبھی رازداری ضروری ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں وہ قادر جان کو رخصت کر دیتے تھے۔ ان لحاظ میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ قادر جان ان کی مصروفیات کو سمجھتے تھے۔ ایسے معاملات میں ناگہب نہیں اڑاتا تھا۔ لہذا ہمیشہ کی طرح چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی امام صاحب انہیں بتانے لگے کہ سلیمان کیسی مصیبت سے دوچار ہے؟ وہ تمام باتیں سننے کے بعد بولے۔ ”اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں اور آپ مل کر اس بارے میں سوچ تو سکتے ہیں اس

کے پہلوؤں پر غور بھی کر سکتے ہیں مگر عملی طور پر کچھ کر نہیں سکتے۔ کچھ بھی کرنے کے لیے یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ اسے واقعی انوکھا کیا گیا ہے یا اصل معاملہ کچھ اور ہے۔“

سلیمان نے پوچھا۔ ”کچھ اور کیا ہو سکتا ہے؟ میری تو کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔“

مولانا نے کہا۔ ”ذہن تو خود وہ ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کرو تب بھی اپنے آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”برانہ مانو تو کچھ ذاتی سوال کر سکتا ہوں؟“ مولانا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ”میں نے تو اتنا بڑا عہد آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے، اب ذاتی کچھ نہیں رہا۔ آپ پوچھیں؟“

”ہماری نوجوان نسل ذرا سر پھری سی ہوتی ہے۔ ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گھر میں کوئی کھٹ پٹ ہوئی ہو اور۔۔۔“

وہ ان کی بات کاٹ کر بولا۔ ”نہیں مولانا صاحب! میری وہ بیٹی تو بہت ہی سمجھدار اور سلجھے ہوئے ذہن کی مالک ہے پھر مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسہ ہے۔ چاہے گھر کے اندر اس پر قیامت ہی کیوں نہ تو پڑے وہ کبھی فرار کا راستہ نہیں ڈھونڈے گی۔“

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولے۔ ”اچھی بات ہے۔ اپنی تربیت پر اور اولاد پر ایسا ہی اعتماد ہونا چاہیے۔ لیکن میرے اس سوال سے یہ مطلب ہرگز نہ نکالنا کہ میں خدا خواستہ اس پر کوئی الزام لگا رہا تھا۔ وہ تمہاری ہماری اور سارے مکھ کے عزت ہے۔“

اور وہ مکھ کی عزت گھر کی چار دیواری میں داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ تینوں آپس میں بول رہے تھے۔ علاج مشورے کر رہے تھے۔ مولانا کا کہنا یہی تھا کہ تمھارے جانے سے بہتر ہے، تمھوڑا اور انتظار کر لیا جائے۔

اگر اسے انوکھا کیا گیا ہے تب بھی اس کی واپسی تک انتظار کرنا ہی ہوگا ورنہ تمھارے جا کر رپورت درج کروانا۔۔۔ فی الحال تماشا بننے اور تم شایع کرنے والی بات ہوگی۔

امام صاحب نے کہا۔ ”اور حقیقت یہ ہے کہ پولیس والوں نے نہ کرنا کچھ نہیں ہوتا مگر وہ لوگ ایسے معاملات کو یوں اچھالتے ہیں کہ عزت کی دھجیاں کھڑ کر رہ جاتی ہیں۔“

ہو چکی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود کہیں سے بیٹی کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہونے لگا تھا کہ کہیں کسی ظالم نے اسے ہلاک نہ کر ڈالا ہو۔

اس دنیا میں وحشی درندوں کی کمی نہیں ہے۔ لوگ خواہ وہ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنے پھرتے ہیں۔

فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد امام صاحب نے سلیمان سے کہا۔ ”تم نے اللہ سے وعدہ کیا ہے پانچوں وقت کی نماز پڑھنے مسجد میں آیا کرو گے۔“

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا کر بولا۔ ”یشک۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔“

”اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ نمازیں پڑھتے ہی عجز ہو جائے اور تمہاری بیٹی اچانک ہی مل جائے گی تو اس خیال کو دماغ سے نکال دو۔ رشوت دینے کے طور پر نمازیں نہ پڑھو بلکہ خدا سے ڈرو۔“

مولانا نے کہا۔ ”اکثر دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور انسان خدا سے یابوس ہو جاتا ہے۔ ہفتوں مہینوں اور برسوں کے بعد وہ دعائیں اثر دکھاتی ہیں۔ عبادتوں اور دعاؤں کی قبولیت کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ سمجھ میں آتا ہے۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”آج تم مصیبت میں ہو، بڑے نقصان میں ہو لیکن میری یہ بات ذہن میں نقش کر لو کہ راہ راست پر چلتے رہو گے تو مسلسل نقصان اٹھانے کے باوجود در پردہ تمہارے لیے بہتری کے راستے ہموار ہوتے رہیں گے۔ یہ تمہیں آج نہیں تو کچھ عرصے بعد ضرور معلوم ہوگا۔“

وہ دونوں سلیمان کو ہدایات دے رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے کہ وہ مجبور وکل سے خدا پر بھروسہ کرے اور نماز قائم کرے پھر دیکھے کہ پردہ غیب سے کیا سامنے آتا ہے؟

☆☆☆

صبح کی روشنی پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ زبانے میں اجالا ہو رہا تھا مگر ایلا کے اندر جیسے اماوس ٹھہر گئی تھی۔ اسے اس سیاہی سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اندیشے کہہ رہے تھے یہ اندھیرے اب چھٹنے والے نہیں ہیں بلکہ اس کی زندگی میں اندھیرا بھانے والے ہیں۔ کوئی طوفان لانے والے ہیں۔

پھر جیسے طوفان آگیا۔ بیرونی دروازے پر یوں دستک سنائی دی جیسے آسے جھنجھوڑا جا رہا ہو۔ دروازہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے بول رہی تھی۔ ”ارے بہن! کب سے ٹھکنے لگی ہو۔ نیل بھی بجائی ہے۔ پتا نہیں کیا بات ہے؟“ نیم دروازہ کیوں نہیں کھول رہا ہے؟ مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔“

وہ سرا سر جھوٹ بول رہی تھی۔ اس پاس کے گھروں میں جا کر بتا رہی تھی کہ اندر نعیم ہے مگر دروازہ نہیں کھول رہا۔ اس پر دوس کی غور نہیں اور مرد وہاں جمع ہو رہے تھے۔ وہ تماشا شروع کرنے سے پہلے تماشا نیوں کی بھیڑ لگا رہی تھی۔ پھر اس نے دروازے کو دھڑا دھڑا پٹینا شروع کیا تھا۔ اور بیٹے کو پکارا تھا۔ ”نعیم! دروازہ تو کھولو۔ کب سے آواز پس دے رہی ہوں؟“

نعیم ماں کی طوفانی دستک سن کر ہڑبوا گیا۔ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ باں کو اپنی ناکامی کی رپورٹ دینی ہوگی پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے رہا تھا کہ ناکامی کے باوجود کامیابی ہوگی۔ ایلا اس کے ساتھ بند کمرے سے نکلے گی تو خودی بدنامی کی کہانی فنی چلی جائے گی۔

دوسری طرف ایلا کمرے کے دروازے سے کان لگائے ان کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ پھوپھی واپس آگئی ہے۔ خیال تھا شاید ماں باپ بھی اس کے ساتھ ہوں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا جب نعیم بیرونی دروازے کا تالاکھولے گا تب ہی وہ اس کمرے سے باہر نکلے گی۔

وہ دروازے پر ہاتھ رکھے انتظار کر رہی تھی۔ باہر تالا کھلے اور پھر ایک جھٹکے سے کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی جیسے برسوں کے قیدی کو کال کوغری سے نکلنے کی نوید ملی۔ ادھر گیٹ کھل چکا تھا۔ ادھر یہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آگئی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پھوپھی تنہا نہیں آئی ہے برات کے ساتھ آئی ہے۔

شادی کے موقع پر ایجاب و قبول کے بعد نکاح نامے پر دستخط لیے جاتے ہیں۔ اسے بے حیائی کا شعلہ لٹنے والا تھا۔

ڈہن کو قرآن کے سائے میں چٹیاں نچھاور کرتے ہوئے رخصت کیا جاتا ہے مگر وہاں چار کاغذوں پر آبرو کا جنازہ نکلنے والا تھا۔

مگر ابھی کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور دردانہ سمجھانے کے لیے انہیں وہاں لائی تھی۔ وہ بیٹے سے پوچھ رہی تھی کہ وہ دروازہ کیوں نہیں کھول رہا تھا؟ انکی کیا بدھونگی کی نیند سو رہا تھا کہ آنکھیں کھل رہی تھی؟

پھر وہ اس کے پیچھے ایلا کو دیکھ کر یوں چپ ہوگئی جیسے ٹھنک گئی ہو۔ انجان بن کر بولی۔ ”تم... اس وقت یہاں؟“

ایلا کے بچانے نعیم نے جواب دیا۔ ”یہ تو کل رات سے یہاں ہے۔“

اس نے ہانے کے انداز میں بیٹے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”کل رات سے یہاں ہے؟“

اس نے بیٹے کے الفاظ کو یوں دہرایا جیسے ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو پھر کہا۔ ”لیکن میں تو کل سے گھر پر نہیں ہوں پھر یہ میری غیر موجودگی میں یہاں تمہارے ساتھ کیا کر رہی تھی؟“

نعیم نے جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سر جھکا دیا۔ اس کی بھرمانہ خاموشی سے محلے والوں کے درمیان چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

ایلا نے قریب آ کر اسے حثارت سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں کہ رات سے مجھے یہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔“

”قیدی...؟“

ایلا نے دردانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پچھو! جب آپ کو نہیں جانا تھا تو مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟“

اس نے انجان بنے ہوئے پوچھا۔ ”کیا...؟ میں نے تمہیں بلایا تھا؟“

”ایسے انجان کیوں بن رہی ہیں؟ کیا زبیدہ آگئی کے مگر قرآن خوانی میں آپ کے پاس چلی آؤں؟ کچھ ضروری باتیں سے فارغ ہو کر آپ کے پاس چلی آؤں؟ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اور جب میں یہاں آئی تو آپ گھر میں نہیں تھیں۔“

وہ بولی۔ ”میں یہی تو بول رہی ہوں کہ گھر میں نہیں تھی۔ بڑی آپا کے پاس رہنے لگی تھی۔ سب کے سامنے لگی تھی۔ اور دیکھو! ابھی سب کے سامنے ہی آئی ہوں۔ اور آکر یہ تماشا دیکھ رہی ہوں۔“

ایلا نے کہا۔ ”یہ تماشا آپ کے بیٹے نے رچایا ہے۔ کل شام سے مجھے تالے میں بند کر کے رکھا ہے۔“

وہ بولی۔ ”یعنی زبردستی بند کر کے رکھا تھا؟“

”ہاں۔“

دردانہ نے ایک خاتون سے کہا۔ ”اے بہن! جب کوئی کسی کے ساتھ زبردستی کرتا ہے۔ خاص طور پر جب کسی کو قیدی بنا کر رکھتا ہے تو مار پیٹ بھی کرتا ہے۔ تم لوگ خود ہی دیکھو! اس کے کپڑوں سے یا طے سے ایسا لگ رہا ہے کہ اسے یہاں زبردستی جس سے جامیں رکھا گیا تھا؟“

وہاں موجود لوگ اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ ایلا نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

”وہ تو بول ہی رہی ہو۔“

وہ سب کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”بند

دروازے کے پیچھے کی باتیں میں نہیں جانتی کہ رات بھر یہاں کیا ہوتا رہا؟ مگر یہ بھی تو جھوٹ ہی ہے کہ میں نے تمہیں بلایا تھا جبکہ میں تو کل شام سے یہاں تھی ہی نہیں۔“

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا اعلان کر رہی تھی کہ بند دروازے کے پیچھے کچھ ہوتا رہا تھا۔ یہ محلے والے جھکیں اور اس کا محاسبہ کریں۔

ایلا نے کہا۔ ”آپ نے جانے سے پہلے مجھے بلایا تھا۔ میں بول تو رہی ہوں کہ قرآن خوانی میں...“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”تم اپنے گھر میں تو بتا کر آئی ہوگی کہ میری طرف جارہی ہو؟“

”اتنا موقع ہی کہاں ملا؟ میں تو قرآن خوانی سے سیدھا ادھر چلی آئی تھی۔“

”اور کل شام میں تمہارے گھر گئی تھی۔ تم وہاں نہیں تھیں۔“

”کیونکہ میں یہاں تھی نعیم نے مجھے بند کر کے رکھا تھا۔“

”یہ کیا تم نے بار بار بند کر کے رکھا تھا بند کر کے رکھا تھا کہ رات لگائی ہوئی ہے؟ ارے کوئی مجھے زبردستی بند کر کے تو دیکھے۔ میں تو بنگام کر دیتی دروازے تو زدی دیوار سے کود کر جان دے دیتی۔“

ایک خاتون نے کہا۔ ”مگر تم کیسی ہو؟ تم نے پوری رات چپ چاپ گزار دی۔ اگر کوئی چلا تھا شور مچا تھا تو کوئی نہ کوئی آکر دروازہ ضرور کھلواتا اور نعیم کا محاسبہ کرتا۔“

ایک محلے والے نے کہا۔ ”بے شک پھر تو ہم یہ پروا بھی نہ کرتے کہ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ محلے میں بے حیائی پھیلانے والے کو کسی صورت معافی نہ ملتی۔“

دردانہ نے اس کی تائید میں کہا۔ ”میں تو خود اسے معاف نہیں کروں گی مگر ابھی کیا کروں؟ یہ کم بخت اسے زبردستی اٹھا کر نہیں لایا ہے۔ یہ تو خود چل کر آئی ہے۔“

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ایک خاتون نے پوچھا۔ ”جب تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ دردانہ گھر میں نہیں ہے تو تم نے اندر قدم ہی کیوں رکھا تھا؟“

وہ بولی۔ ”کیونکہ نعیم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ پچھو گھر میں ہیں۔ تب ہی میں اندر آئی تھی۔“

”اور جب یہ دیکھا کہ وہ یہاں تنہا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے تو واپس کیوں نہیں چلی گئی تھیں؟“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”جانا چاہتی تھی مگر اس نے واپسی کا راستہ بند کر دیا تھا۔ دروازے پر تالا ڈال دیا تھا۔“

”تو شرمچا دیتیں۔ تمہاری بیوی کا روبرو محلے تک نہ سکی... کم سے کم پڑوسیوں تک تو ضرور پہنچ جاتی۔“

اس نے آنکھیں سے چہرے کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ لوگوں کو یہ دکھانا نہیں چاہتی تھی کہ میرا پھوپھی زاد اس حد تک گر چکا ہے۔ اسی لیے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔ خاموشی سے پچھو کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تھا گھر کا مسئلہ ہے۔ ہمارے گھر کے اندر ہی منت جائے گا۔“

دردانہ نے کہا۔ ”ذرا اس لڑکی کی باتیں سنو۔ کتنی جلدی جلدی بیان بدل رہی ہے؟ ابھی کہہ رہی تھی نعیم نے تیرے کر کے رکھا تھا اور اب بول رہی ہے کہ خود ہی یہاں بند ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ارے! اسے عزت کی پروا ہوتی تو یہاں تک آتی ہی کیوں؟“

پھر وہ وہائی دینے کے انداز میں بولی۔ ”اری ایلا! یہ تو نے کیا کیا؟ نعیم پسند تھا تو مجھ سے کہتی۔ میں خود تیرا ہاتھ مانگنے بھائی کے گھر جاتی مگر...“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”یہ آپ کیا بولتی چلی جا رہی ہیں؟ میں تو حق ہوں آپ کے بیٹے پر... اور یہ بھی ابھی طرح کچھ رہی ہوں کہ آپ نے اختتام مجھے یہاں پھنسا لیا ہے۔“

وہ اس کی بات سن کر ان سنی کرتے ہوئے بیٹے کو وہ ہنر بارتے ہوئے بولی۔ ”یہ تیرے عشق میں اندھی ہو کر چلی آئی تھی مگر تجھے تو ہوش کے ناخن لینے تھے۔ تو ہی گھر سے باہر آ جاتا تو یہ ابھی تجھے بدنام نہ کرتی۔“

وہ بھی بکاؤ دارے باز تھا۔ بھرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولا۔ ”میں کیا کرتا؟ اس نے جھکی دی تھی اگر میں اسے زبردستی یہاں سے نکالوں گا تو یہ شور مچا دے گی۔ محلے والوں کو یہی بتائے گی کہ میں اس کے ساتھ زبردستی کر رہا ہوں۔“

ایلا کا دماغ گھوم رہا تھا۔ وہ ماں بیٹا جھوٹ پر جھوٹ بولتے جارہے تھے اور ہر جھوٹ سچ ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اپنی پارسانی کا کیسے یقین دلائے؟ کیسے سمجھائے کہ وہ بے گناہ ہے؟ خدا نے اس کی آبرو کو محفوظ رکھا ہے۔ سننے والے اسی بات کو توجہ سے سنتے اور دوسروں تک پہنچاتے ہیں جس میں کچھ خاص ہو۔

اور یہ بات سب ہی محلے والوں کے لیے انوکھی تھی کہ ایک لڑکی کسی لڑکے کے عشق میں خود اس کے گھر چلی آئی تھی اور تنہا اس کے ساتھ پوری رات گزار چکی تھی۔

لوگ باتیں بنا رہے تھے۔ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ آنکھوں کی بھی بات کو جھکا کون جھلا سکتا تھا؟ اور اگر جھلا یا جاتا تو اس کی پسمندانہ آلود معائنے کا نشانہ بن کر رہ جاتا۔

ان لحاظ میں ایلا کو یوں لگ رہا تھا جیسے چاروں

درد چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟

گروٹال

جو ہے!



ایک ماہ کی پالی صرف /Rs.495



اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

ملک بھر کے ہر ایٹھ میڈیکل سنٹر، ہومیو پیتھک سنٹر اور دو خانہ پر دستیاب
 HELPLINE 042-35789145 & 6, 0334-4266255
 Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net
 دیکھنے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے



ہونے والی ہے۔ وہ لوگوں کے جہنم کو چرتے ہوئے وہاں پہنچا تو سب سے پہلے اپنی بیٹی پر نظر پڑی۔ اس نے شہید حیرانی سے کہا۔ ”ایٹلا...!“
 اس نے باپ کی آواز سنی تو دوڑتے ہوئے آکر اس سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے بولی۔ ”ابو! مجھے یہاں سے لے چلیں۔“

معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

اُس کے بجائے دردانہ نے جواب دیا۔ ”خاندان کی ناک کنوار سی تھی۔ کسے باپ ہو؟ جوان بیٹی رات بھر غائب رہی اور تمہیں کوئی فکر نہیں تھی؟“

اس نے ہلکی کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ جس بات کو کل سے چھپا تا پھر رہا تھا وہ اچانک ہی کھل گئی تھی۔

دردانہ نے کہا۔ ”دیکھو! اس کلہوٹی نے کیا تمنا کیا ہے؟ یہاں نعیم کے ساتھ منڈلا کر نہ آئی تھی۔“

بوڑھا باپ یہ سن کر لرز کر رہ گیا۔ ادھر ایٹلا صدے سے غمناک تھا۔ اب تک نہ جانے ان الزامات کو کیسے برداشت کرتی رہی تھی؟ باپ کے سامنے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ سہ نہ کی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کے بازوؤں میں جموتے ہوئے فرش پر گر کر رہے ہوش ہو گئی۔ نیک نامی اس کے بوڑھے ہاتھوں سے پھسل کر مٹی میں مل رہی تھی۔

مولانا فضل کریم اور امام صاحب حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ دو خواتین ایٹلا کو سنبھالتے لگیں۔ سلیمان کے جسم سے تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ بت بنا کھڑا تھا۔ مولانا نے پوچھا۔ ”آخر معاملہ کیا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

دردانہ انہیں پوری زور واد سناتے گئی۔ سلیمان کے کانوں میں جیسے سیسہ اُڑایا جا رہا تھا۔ وہ سن رہا تھا اور زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ ایٹلا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تھے۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی۔

اس نے باپ کو دیکھ کر فوراً ہی اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ابو! یہ... یہ پھوٹ بول رہی ہیں۔ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“

ایک ہلکے دار سننے کہا۔ ”مگر یہ جھوٹ بول رہی ہیں تو یہ کیا ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں؟“

ایک خاتون نے کہا۔ ”اگر تمہارا ساتھ زبردستی کی گئی ہو تو تمہارا علیہ اس بات کی گواہی دیتا۔ تم نے اس

طرف سے بدنامی کا پتھراؤ ہو رہا ہے۔ وہ لہو لہان ہو رہی ہے۔ اگر چہ وہ ایسی ہی کوری تھی جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ تاہم اسے جبراً اُدھار بنایا جا رہا تھا۔

وہ چیخ کر بولی۔ ”خدا کے لیے نعیم کی باتوں میں نہ آئیں۔ یہ جھوٹ بولی رہا ہے۔“

دردانہ نے اسے ٹھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بچی آواز میں بات کرو۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری...؟“

پھر وہ بیٹے کے سینے پر دو ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”دفع ہو جا یہاں سے... میں تیری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ غلطی صرف ایٹلا سے نہیں ہوئی، تجھ سے بھی ہوئی ہے۔ نکل جا میرے گھر سے... چلا جا...“

وہ دھکا کھا کر باہر آ گیا۔ یہ بھی سوچی سمجھی بلا تک کے مطابق کیا جا رہا تھا۔ ماں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ بیٹے کو معاملے سے دور کرنے کے لیے بڑے ہی جذباتی انداز میں اسے گھر سے نکال دے گی۔ یوں ایک ماں کی بات میں وزن پیدا ہو گا اُس نے بیٹے کو غلطی کی سزا دی ہے۔ اسے بے گھر کر دیا ہے۔

صورت حال اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی کہ ایٹلا کو سنبھالنے کی بھی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ نکلے والے ”تھوڑو“ کر رہے تھے۔ اُس نثار خانے میں کوئی اس کی سننے والا نہیں تھا۔ اسے اس ماحول سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ایسی ٹھٹھکی جیسے سانسیں رک رہی ہوں۔

”میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مجھے موت آ جائے۔ یہیں گر کے مر جاؤں۔“
 موت آسانی سے آ جاتی ہے لیکن ایسے وقت گڑبڑا کر مائعوتب بھی نہیں آتی پھر مرنے کا فائدہ ہی کیا تھا؟ وہ موت کے بعد بھی نیک نام رہنے والی نہیں تھی۔

وہ بھاگ جاتا چاہتی تھی، لیکن جا کر منہ چھپا لیتا چاہتی تھی مگر منہ چھپانے سے کیا ہونے والا تھا؟ وہ معاملہ تو پڑھتے سورج کی طرح تھا جسے پوری دنیا دیکھ رہی تھی۔

سلیمان امام صاحب اور مولانا فضل کریم کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک گلی میں بہن کے دروازے پر ہجوم دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ مولانا نے پوچھا۔ ”وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

امام صاحب نے کہا۔ ”وہ تو سلیمان کی بہن کا گھر ہے۔“

سلیمان نے اس طرف بڑھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ ”خدا خیر کرے، یہ ہجوم کیسا ہے؟“

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس بیٹی کو پچھلی رات سے ڈھونڈتا پھر رہا ہے وہ بہن کے گھر سے... تو کیا فضل سے برآمد

چھت کے نیچے نعیم کے ساتھ پوری رات گزاری ہے۔ تمہارے پاس بھاگنے کے لیے راستے تھے مگر بھاگا تو وہاں جاتا ہے جہاں مرضی شامل نہ ہو۔

وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔ ”بس کریں۔ خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔“

پھر وہ باپ کا بازو تھام کر بولی۔ ”ابو! آپ تو مجھ پر یقین کریں۔ میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔ آپ گویا وہ نہیں ہے جس کو کھینچ مارا تھا؟ پچھو اسی بات کا بدلہ لے رہی ہیں۔“

وہ تو جیسے پتھر بن گیا تھا۔ وہ اس کے بازو سے لگ کر روئے لگی۔ ”میرا اعتبار کریں ابو! مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہے۔“

مولانا نے پوچھا۔ ”نعیم کہاں ہے؟“

کسی نے کہا۔ ”دردانہ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔ یہ دونوں گناہ گار ہیں، مجرم ہیں۔ اگرچہ وہ اسے اٹھا کر نہیں لایا تھا مگر ایک دھکے والی کے ساتھ اس نے مجھے ہٹانے کی غلطی کی ہے۔“

اسی وقت انیلا کی ماں اور چھوٹی بہنیں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ وہ ماں سے لپٹ کر روئے لگی۔ اپنی پارسائی کا یقین دلانے لگی۔

مولانا نے کہا۔ ”آپ تمام خواتین انیلا کو لے کر اندر کمرے میں جائیں۔“

وہ سب ایک کمرے میں چلی گئیں۔ مرد حضرات بیٹھک میں آگئے۔ مولانا فضل کریم نے ایک محلے دار سے کہا۔ ”جا کر نعیم کو تلاش کرو۔ اس وقت اس کی موجودگی ضروری ہے۔“

چند محلے والے اس کی تلاش میں نکل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ علاقے کی کسی دکان پر یا کسی ٹمپرے پر بیٹھا ہوگا مگر وہ تو سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے مطابق وہاں سے رفو چکر ہوا تھا۔ آسانی سے ملنے والا نہیں تھا۔

مولانا فضل کریم نے کہا۔ ”گناہ گار کبھی اپنا گناہ قبول نہیں کرتا۔“

ایک شخص نے کہا۔ ”انیلا اور نعیم بھی سچی کر رہے ہیں۔ اگرچہ دونوں ہی گناہ گار ہیں مگر ایک دوسرے پر الزام ٹھوپ رہے ہیں۔ جس طرح انیلا نے جتنا چاہتی ہے کہ سارا قصور نعیم کا تھا اسی طرح وہ بھی ایسا ہی بیان دے رہی تھی۔ حقائق کو سامنے رکھ کر دیکھا اور سوچا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انیلا کو زبردستی یہاں نہیں لایا گیا تھا۔“

دوسرے شخص نے کہا۔ ”اور اس کا بیان بھی سچی ہے۔“

”اگر یہاں اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی جا رہی تھی تو

اسے چھینا چلا نا چاہیے تھا۔ کسی کو مدد کے لیے پکارنا چاہیے تھا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”کسی بھی لڑکی کے لیے اس کی آبرو سے زیادہ کوئی شے قیمتی نہیں ہوتی اور اس کا کہنا ہے کہ وہ اس لیے خاموش رہی تاکہ دوسرے تماشائے بن جائیں۔ کبھی کہتی ہے کہ نعیم نے اسے تالے میں بند کر کے رکھا تھا اور کبھی کہتی ہے اس نے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔“

ایک شخص نے کہا۔ ”وہ اپنی پارسائی بنانے کے لیے باتیں بدل رہی ہے۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہہ رہی ہے۔“

مولانا نے سوچتی ہوئی نظروں سے سلیمان کی طرف دیکھا۔ وہ تو محکم بنم یا ہوا تھا۔ مولانا نے کہا۔ ”انیلا کہتی ہے دردانہ نے اسے یہاں بلایا تھا۔ تم کیا کہتے ہو؟ حقیقت کیا ہو سکتی ہے؟“

وہ بہت ہی غصہ سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”انیلا جھوٹ بول رہی ہے۔“

تمام افراد نے چونک کر اسے دیکھا۔ امام صاحب نے پوچھا۔ ”کیا جھوٹ بول رہی ہے؟ کیا دردانہ نے اسے نہیں بلایا تھا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”دردانہ کل شام میرے گھر آئی تھی اور وہیں سے بڑی آہ کی طرف چلی گئی تھی۔“

مولانا نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ یاد آیا کہ مسجد میں جب وہ انیلا کے بارے میں باتیں کر رہے تھے تو سلیمان کو یہ فکر تھی کہ بیٹی کی گمشدگی بہن سے کبھی نہیں رہ سکے گی پھر اس نے کہا تھا۔ ”یہ بھی شکر ہے کہ فی الحال دردانہ بڑی آپا کے گھر گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے دردانہ نے بھی یہی کہا تھا“ محلے والے بھی اس بات کی تائید کر رہے تھے کہ وہ کل شام وہاں نہیں تھی۔

یعنی جو بات سچ لگ رہی تھی وہ چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھی۔

باپ نے اس معاملے میں بیٹی کو جھوٹا قرار دے دیا تھا۔ اب وہ ہر معاملے میں جھوٹی پڑنے والی تھی۔ سلیمان کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہاں موجود سب ہی افراد کو چپ سی لگ گئی تھی۔

باپ کی گواہی سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی؟

مولانا فضل کریم اور امام صاحب آپس میں صلح مشورے کرنے لگے۔ محلے کے دیگر معززین بھی اپنی اپنی رائے پیش کر رہے تھے۔ کوئی انیلا کے بیان کو دہرا رہا تھا۔ کوئی نعیم کی باتوں سے متنی اخذ کر رہا تھا۔ سب کی تان یہاں آ کر ٹوٹ رہی تھی کہ انیلا اس گھر سے برآمد ہوئی تھی۔

مولانا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”خدا ہمارے بچوں کو نیک ہدایت دے۔ جس معاشرے میں بے باکیاں حد سے تجاوز کر جاتی ہیں حرام حلال کا فرق مٹ جاتا ہے گناہ کرنے میں کوئی شرم جھجک نہیں رہتی وہاں ایسے ہی قصے جنم لیتے ہیں۔“

سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ انہوں نے ذرا غصہ کر کہا۔ ”سلیمان کی بات سننے اور تمام حقائق پر غور کرنے کے بعد حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے۔ اگرچہ غلطی کی ابتدا لڑکی کی طرف سے ہوئی ہے مگر لڑکا بھی برابر کا شریک گناہ ہے۔“

ایک شخص نے کہا۔ ”مگر لڑکی تو مسلسل انکار کر رہی ہے۔“

مولانا نے کہا۔ ”گناہ گار فوراً ہی اپنا گناہ قبول نہیں کرتا۔ رنکے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود اپنی سیدی دلیس پیش کر کے اپنی پارسائی بنانے کی کوششیں کرتا رہتا ہے مگر ہم چھوٹی دلیلوں سے قائل نہیں ہوتے۔“

وہ ذرا غصہ کر کے بولے۔ ”یہ ماننے والی بات ہی نہیں ہے کہ جو ان لڑکا لڑکی ایک چھت کے نیچے تمہارا رات گزاریں اور گناہ سے بچے رہیں۔ شیطان ایسے ہی موقعوں کی تاک میں رہتا ہے۔“

امام صاحب نے بڑے انفسوس کے ساتھ کہا۔ ”جو بھی ہوا بہت برا ہوا۔ اب یہ سوچیں کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟“

سلیمان غصے سے لرزے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ”اس کا ایک ہی حل ہے کہ میں بے حیائی کا گلا دبا کر مار ڈالوں۔ اس نے میری عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

مولانا اور دوسرے افراد نے اسے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ”اپنے غصے پر قابو رکھو۔ کیا قاتل بن کر چھانسی چڑھنا چاہتے ہو؟ ایک جی کے گناہ کی سزا پورے گھرانے کو دینا چاہتے ہو؟“

سب ہی اسے سمجھانے لگے۔ علاقے کا جیڑ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ”آئے دو نعیم کو۔ ابھی کے ابھی دونوں کا نکاح چڑھا دوں گا۔“

جو اس کی تلاش میں نکلے تھے۔ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ اس کا کہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟

ایک نے کہا۔ ”وہ سر پھرا ہے۔ اکثر کئی دنوں اور ہفتوں تک محلے سے غائب رہتا ہے۔“

ایک عورت نے کہا۔ ”آخر وہ مرد ہے۔ کھایا پیا کلي کر کے چلا گیا۔ اسے کون پکڑے گا؟“

امام صاحب نے کہا۔ ”دردانہ نے اسے گھر سے نکال کر غلطی کی۔ ابھی وہ یہاں ہوتا تو بگڑی ہوئی بات سنبھال لی جاتی۔“

دردانہ نے وہاں آتے ہوئے کہا۔ ”جو بات بگڑ چکی ہے وہ اب کبھی نہیں بنے گی۔ نہ میں ایسی بے حیالڑکی کو اپنی بہو بناؤں گی اور نہ بچے کو صاف کروں گی۔“

انیلا دوسرے کمرے میں ماں کے ساتھ ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ وہاں موجود دیگر خواتین بھی اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔ بات کچھ ایسے اعزاز میں بگڑی تھی کہ وہ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی پارسائی کا یقین نہیں دلا سکتی تھی۔

ایک خاتون نے کہا۔ ”کسی کی سچائی کو سمجھنے کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ تم اتنی ہی جلدی ہو تو قرآن پر ہاتھ رکھ کر اپنی پارسائی کا یقین دلاؤ۔ ساری بات صاف ہو جائے گی۔“

اس نے ذرا جھجک کر اسے دیکھا پھر ماں کو دیکھا۔

ایک اور خاتون نے کہا۔ ”ہاں انیلا! اپنی سچائی ثابت کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔“

رضیہ بیگم نے اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا۔ ”تمہاری پچھو ادھر الماری پر قرآن رکھی ہیں۔ جاؤ لے کر آؤ۔“

وہ جانا چاہتی تھی۔ انیلا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”میں فی الحال کلام پاک پر ہاتھ نہیں رکھ سکتی۔“

اس کی یہ بات سن کر سب ہی عورتیں چونک گئیں جیسے چور نے اپنی چوری کا اعتراف کر لیا ہو۔ ماں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیوں نہیں رکھو گی ہاتھ؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”وہ دراصل... میں پاک نہیں ہوں۔“

ماں نے ٹھٹھک کر پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

کئی عورتیں منہ پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز لگا ہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ایک نے طنز بھرا انداز میں کہا۔ ”ہاں تو نہانے کا موقع ہی کہاں ملا ہے جاری کو۔“

وہ تڑخ کر بولی۔ ”اسکی ناما کی ہر مینیسٹ آپ کبھی ہوئی ہے؟“

انیلا نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”چلیں امی! یہ جو سمجھنا چاہتی ہیں انہیں سمجھنے دیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں اب اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گی۔ انصاف کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ مجھے یقین ہے وہی میری پارسائی ثابت کرے گا۔“

وہ ماں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ بیٹھک کے دروازے پر مولانا فضل کریم دردانہ سے کہہ رہے تھے۔

”بیٹھک۔ دونوں نے انتہائی شرمناک غلطی کی ہے لیکن اب اس بات کو زیادہ نہ اچھا لگا جائے تو بہتر ہے۔“

ایٹلا ان کی بات سن کر رک گئی۔ سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ”خدا بہتر جانتا ہے۔ اب بھی میرے سر پر جیا کا آنچل ہے۔ سب ہی آپ کو جہاں دیدہ اور عالم و فاضل مانتے ہیں لیکن آپ بھی وہی کہہ رہے ہیں جو سب کہہ رہے ہیں۔ پھر آپ میں اور سب لوگوں میں کیا فرق رہا؟ آپ کا علم اور دانشوری کہاں چلی گئی؟“

مولانا صاحب کی نظریں عورتوں کے سامنے جھکی رہتی تھیں۔ وہ اس کے قدموں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”زہرا، خلق کو تھارہ خدا سمجھو لیکن ایسا بھی ہوتا ہے، کبھی تمام لوگ کسی معاملے کو غلط سمجھ لیتے ہیں۔ خدا ہمیں غلطیوں سے بچائے۔“

مولانا نے امام صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا علم ہماری دانائی ثبوت اور گواہوں کو مانتی ہے۔ ثبوت ہے کہ تمہیں یہاں لایا نہیں گیا بلکہ تم خود یہاں آئیں اور ایک نامحرم کے ساتھ رات گزار دی۔ صبح تمہیں یہاں سے نکلنے ہوئے دیکھا جا رہا ہے اور اس بات کے ایک نہیں بے شمار گواہ ہیں تو پھر وہی ماننا پڑتا ہے جو حالات کہہ رہے ہیں۔“

”مولانا صاحب! حالات نہیں تو لوگوں کے خیالات میرے خلاف ہیں۔ اگر سب لوگ ابھی یہ طے کر لیں کہ ان کی بہن ان کی بیٹی پر کچھ اچھالی جا رہی ہے تو سب ہی اپنی شرافت اور پارسانی ثابت کرنے کے لیے جی جان لگا دیں گے لیکن میں کسی کی بہن، بیٹی نہیں ہوں۔ دوسروں پر کچھ اچھالنے میں جرمہ آتا ہے وہ بھی، کبھی مٹتا ہے۔ یہاں مردوں سے زیادہ عورتیں مرے لے رہی ہیں۔“

اس نے دروازے اور کھڑکیوں سے جھانکنے والیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تک سنی آئی تھی آج دیکھ بھی رہی ہوں۔ کسی عورت کی توین پر عورتیں ہی زیادہ خوش ہوتی ہیں۔“ وہ ہال کے ساتھ جاتے ہوئے مولانا فضل کریم سے بولی۔ ”اللہ نے آپ کو علم دیا ہے ایمان دیا ہے۔ اس پہلو سے سوچیں کہ کبھی بھی آنکھوں دیکھی سچائی بھی غلط ہو جاتی ہے۔ حضرت یوسف کو بھی اسی طرح بدنام کیا گیا تھا جبکہ وہ زینجی کی تنہائی میں رہ کر بھی اس کی ہوس اور ترغیب کے باوجود پارسا تھے۔“

مال نے کہا۔ ”میری بہنی کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔“ ایٹلا نے کہا۔ ”ہم کسی کو سمجھا نہیں سکتے مگر کسی روز اوپر والا انہیں سمجھائے گا کہ وہ کیسے کسی مظلوم کی نیک نامی بحال کر دیتا ہے؟“

سلیمان بیٹی کی آواز سن کر غصے سے قابو ہو رہا تھا مگر قادر جان اور دوسرے افراد نے اسے روک لیا تھا۔ دھڑ دھڑ

مال کا ہاتھ تمام کر بہنوں کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اس دن کے بعد سلیمان نے بیٹی سے بات نہیں کی۔ ساری دنیا کی طرح اسے آبرو باختہ ہی سمجھتا رہا۔ بیوی نے کئی بار سمجھانا چاہا کہ اسے اپنی بیٹی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ مگر اس کی تو کسی ایک ہی خواہش تھی ایک ہی کوشش تھی کہ کسی بھی طرح اسے تعلیم کے لیے ہاتھ کر اس بدنامی کو ختم کر ڈالے۔ یہ اندیشہ تھا کہ ایک کی بدنامی دوسری بیٹیوں کو بھی ہیٹ کے لیے بدنامی بنا دے گی۔

کبھی کبھی قسمت کا کٹھنہ بدلنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے خدا نے دیکھا، سنتا اور دعاؤں کو قبول کرنا چھوڑ دیا۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ قدرتی عوامل درپردہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ایٹلا کو اعتماد تھا کہ خدا دیکھ رہا ہے اور ہماری لاعلمی میں ہمارے پاس ہے۔

☆☆☆

سلیمان کے سامنے صرف یہی ایک راستہ تھا کہ بہن مان جائے اور ایٹلا کو بہو بنا لے۔ تمام بدنامیاں فکر و پریشانی ختم ہو جائیں گی۔ وہ سفارش کے لیے امام صاحب اور مولانا فضل کریم کو بہن کے پاس لے گیا تھا لیکن بات نہیں بنی تھی۔

دردانہ کے رویے نے سمجھا دیا تھا کہ وہ تب مانے گی جب بھائی کا مکان اپنے بیٹے کے نام لکھوا لے گی اور اس کے پورے خاندان کو بے گھر کر دے گی۔

ایٹلا کو بدنام کرنے کے بعد دردانہ کی ان سے یہ دوسری بڑی دشمنی ہوئی۔ وہاں سے مایوس ہو کر واپس آتے وقت امام صاحب نے کہا۔ ”بے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ بھائی سے دشمنی کر رہی ہے۔ کوئی شرط منوائے بغیر کسی نیکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی۔۔۔۔۔ ایٹلا اس کے بیٹے کے ساتھ بدنام ہوئی ہے۔ دونوں کی شادی ہوگی تو اس بدنامی پر مٹی پڑ جائے گی۔“

مولانا صاحب نے کہا۔ ”ایک طرف وہ جتنی ہے ایٹلا بے حیا بدکار ہے۔ اسے بہو نہیں بنائے گی پھر کبھی بے مکان بیٹے کے نام ہو جائے تو اسے قبول کر لے گی؟ یعنی بھائی کا مکان حاصل کرنے کے لیے اسے بے حیا اور بدکار کہہ رہی ہے۔“

سلیمان نے کہا۔ ”میری گھر والی ٹھیک ہی جتنی ہے ہماری بیٹی بے حیا نہیں ہے۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ دردانہ کوئی سازش کر رہی ہے۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”اب میں سمجھ رہا ہوں ایک بار ایٹلا نے نیم کی بدتمیزی پر اسے طمانچہ مارا تھا۔ دردانہ اس طرح کے انتقام لے رہی ہے اور ہم سے ہمارا گھر بھی جھین لینا چاہتی ہے۔“

مولانا فضل کریم اور امام صاحب اس کی باتیں سن رہے تھے۔ پہلی بار یہ سوچ رہے تھے کہ شاید ایٹلا گناہگار نہیں ہے۔ اسے بدنام کرنے کے لیے دردانہ نے کوئی کھیل کھیلایا ہے۔

کیسا کھیل ہے؟ یہ ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن ہوا کا رخ بدل گیا تھا۔ سلیمان اور اس کی بیٹی کے لیے دل میں نرم گوش بن گیا تھا۔ اب حالات کو دوسرے پہلوؤں سے جانچنے کے لیے خیالات میں جھک پیدا ہو سکتی تھی۔

امام صاحب نے کہا۔ ”مبرا کرو۔ خدا صبر کا بیٹھا پھل دیتا ہے اور جبر کرنے والوں کو ان کے برے انجام تک پہنچاتا ہے۔ تم نماز پڑھ رہے ہو۔ ہم بھی تمہاری بہتری کے لیے دعا میں مانگ رہے ہیں۔“

مولانا نے کہا۔ ”نماز تمہیں محفوظ دے رہی ہے۔ ذرا غور کرو پہلے جو اندیشہ تھا کہ بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے۔ وہ غلط ثابت ہو گیا۔ یہ گھر کی بات تھی۔ باہر کے دردمنوں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔“

وہ ذرا غصہ کر بولے۔ ”سمجھو تو سمجھ میں آئے گا۔ اللہ نے ایٹلا کو سلامتی دی ہے۔ اگر وہ بدنام ہو رہی ہے تو اپنے عمل کے باعث ہو رہی ہے۔ وہ خود ہی بدنام ہونے وہاں گئی تھی۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”اگر ایٹلا کا اور تمہارا دعویٰ درست ہے کہ دردانہ نے کسی طرح کی سازش کی ہے تو اللہ عالم الغیب ہے۔ تم اور تمہارے بچے دینی ہدایات پر عمل کرتے رہیں گے تو انشاء اللہ ایک دن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ تمہاری بیٹی اگر بے دماغ ہے تو اس کی نیک نامی ضرور بحال ہوگی۔“

مولانا نے کہا۔ ”ہم ایٹلا کے معاملے میں نظر ثانی کریں گے۔ حقیقت کیا ہے اپنے طور پر جھان بین کریں گے۔ آج دردانہ کے رویے نے سمجھا دیا کہ وہ تم سے انتقام لے رہی ہے۔ تمہارا مکان اپنے نام کرنے کی چالیں چل رہی ہے۔“

دیکھا جائے تو سلیمان کے لیے کچھ اچھا ہونے والا تھا کیونکہ مولانا صاحب اور امام صاحب غیر چند بار ہو کر ایٹلا کو اگر اچھا نہیں سمجھ رہے تھے تو برا بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ سلیمان کو حوصلہ دے رہے تھے کہ بہتری ہوگی۔

مولانا فضل کریم کے دروازے پر سلیمان اور امام صاحب مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ مولانا صاحب کے ایک نہیں کرتے تھے لیکن اب ان کے بھی حالات بدل گئے تھے۔ کوئی نادیہ ہستی اپنے وجود کا بتا دے رہی تھی۔

انہوں نے پہلی بار گھبرا کر سوچا۔ ”اگر واقعی کوئی ہے

اور مجھے والوں نے اسے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟“ سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوا۔ ”کیا میں اپنی پارسانی کا یقین دلا سکتا ہوں؟“

کون یقین کرے گا اگر وہ میرے گھر سے نکلے گی جیسے ایٹلا عجم کے گھر سے نکل گئی۔ انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”کوئی خواہوا یہاں سے کیوں نکلے گی؟ کیوں یہاں آئے گی؟“

اپنے اندر سے جواب ملا۔ ”ایٹلا خواہوا وہاں نہیں گئی تھی۔ جو ثبوت اور گواہ اس کے خلاف تھے وہی اس نادیہ ہستی کے سلسلے میں ہوں گے۔“

انہوں نے گھبرا کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ دسے قدموں چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے۔ کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔ انہوں نے ایک بار پھر پورے مکان کو اندر سے جھان مارا۔ اب تو ان کا نفسیاتی تجزیہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ لاشعوری طور پر دل کے مکان میں تھی۔ اس لیے چار دیواری میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ لیٹ کر ذرا کمر سیدھی کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے غسل خانے میں آئے۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر بالوں پر دوغول ہاتھ بچیرے پھر کبھی اٹھائی تو دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ کبھی میں دو چار بال اچھے ہوتے تھے۔

اور وہ انہیں الجھا رہے تھے۔ ان کے اپنے بال اتنے لائے نہیں تھے۔ غسل خانے میں اچھی خاصی روٹی تھی پھر بھی انہوں نے لائٹ آن کی۔ ان بالوں کو غور سے دیکھا۔ وہ کسی حسد کی الجھی ہوئی نظر تھیں۔ انہوں نے ہڑ بڑا کر کبھی کوداں تین میں جھینک دیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مکان کی چار دیواری میں کوئی نادیہ بلا نہیں ہے۔ کسی عورت کا وجود ہے۔ وہ کمرے میں آ کر چھت کو تکتے ہوئے سوچنے لگے۔ ”جب میں نیچے تلاش کر کے ایک زینے سے اوپر جاتا ہوں تو دودھ دوسرے زینے سے نیچے آ جاتی ہے۔“

انہوں نے فوراً ہی ایک زینے پر جانے والے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر دوسرے زینے سے چھت پر آ گئے۔ چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد چھت والے کمرے میں آئے۔ وہ کمرہ اس کے وجود سے خالی تھا۔ وہاں سب نے اپنی اپنی چھت پر چار فٹ کی اونچی منڈیریں بنائی ہوئی تھیں۔ ان منڈیروں پر سے کوئی بھی ایک دوسرے کی چھت پر آ سکتا تھا۔ اگرچہ کوئی ایسا کرتا نہیں تھا لیکن وہ یہی کرتی ہوئی۔

سب ڈائجسٹ 273 اکتوبر 2011

گھر بیٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ سینیٹس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(شہول رجسٹرڈ اک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، انڈیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے لیے 6,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 5,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ ہم اسی حساب سے
ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ اک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین
کے ذریعے بھیج سکتے ہیں۔ مقامی حضرات دفتر
میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

راہنہ شریعہ (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیروز ٹریڈنگ ہاؤس، قادیان میں کوئی روڈ، کراچی
فون: 35802551 35895317 فکس

ساتھ ان کی چٹ پٹی کہانی گھر پہنچ جاتی۔
وہ بولی۔ ”میرا نام نور الحسن ہے، سب یہی کہتے ہیں۔
آپ نے پہلے مجھے دیکھا ہے؟“
”نہیں۔ پہلی بار دیکھا ہے۔“
”دیکھ کہاں رہے ہیں؟ جب سے آئی ہوں منہ پھر کر
کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی گھر میں آتا ہے نقصان پہنچاتا
ہے تو آپ اسے کیسے پہچانیں گے؟“
”ہاں۔ یہی پریشانی ہے۔ اسی وجہ سے میں بدنام
ہو جاؤں گا۔“
اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”بدنام؟ کسی چور کے
آنے سے آپ کیوں بدنام ہوں گے؟“
بڑا آسان سوال تھا لیکن جواب بہت مشکل تھا۔ وہ بات
بدلتے ہوئے بولے۔ ”بدنامی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ ہم
نامحرم ہیں، مہلی چھت پر باتیں کر رہے ہیں۔ تمہیں جانا چاہیے۔“
وہ ذرا قاصدے پران کے رو پر دھکی۔ ان کے درمیان
چارفٹ اوپن میڈر بھی۔ شاید وہ زندگی میں پہلی بار تنہائی میں
کسی نامحرم کے اس قدر قریب ہوئے تھے۔ انہیں متاثر ہوتا
چاہیے تھا اس کے شوق میں جھلا ہوجانا چاہیے تھا۔ لیکن ان
پر ایک دم سے گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ کوئی دیکھے گا تو کیا ہوگا؟
وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔ شوق و محبت کے فیض تراشے
جائیں گے کہ مولانا صاحب چھت پر عشق فرماتے ہیں۔
اتنے میں وقت ظہر کی اذان سنائی دی۔ انہوں نے
سوچا۔ ”ایک عورت کے پیچھے بھاگتے ہوئے صبح سے یہ وقت
ہو گیا ہے۔ خدا عورت کے شر سے بچائے۔ لاجول والا تو ہے۔“
وہ نماز کے لیے جا رہے تھے۔ یعنی انہیں جاتے ہوئے
دیکھتی رہی جب وہ سیز حیاں اترتے ہوئے نظروں سے
اوجھل ہو گئے تو اس نے زیر لب کہا۔ ”واہ مولانا صاحب!
آپ کو کچھ یقین ہوتا ہے کہ انہی ہماری دنیا میں فرشتہ صفت
انسان موجود ہیں۔ خدا آپ کو سلامتی اور نیک نامی دے۔“
اسی وقت فون کی گنگ ٹون سنائی دی۔ وہ فون
دھلے ہوئے کپڑوں کے گھڑ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر کان
سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں۔ امی! اوولہ کا کچھ مل گیا؟“
جواب میں دردناک کی آواز سنائی دی۔ ”میری جان نہ
جلاؤ۔ گھر آؤ۔ میں تمہاری شادی کراؤں گی۔ کم سے کم رقم
میں تمہارا گھر آباد کروں گی۔“
”آپ میری شادی عرفان سے بھی نہیں کرائیں گی۔
میں اپنا معاملہ خود ختم کروں گی اگر آپ نے ایک لاکھ نہ دیے تو
میں محلے والوں کے سامنے کھوں گی کہ میں گھر سے بھاگ کر

وہ ایک لڑکی سے براہ راست ایسی بات کر رہی تھیں
سکتے تھے۔ ان کے اندر بے چینی تھی کہ اگر بات نہ کی، کچھ نہ
ہو چھا تو وہ کسی لمحے بھی چلی جائے گی پھر وہی اضطراب وہی
جس رہے گا کہ کون آتی ہے؟ کیوں آتی ہے؟
انہوں نے اپنی دیر میں بس ایک نظر اس پر ڈالی تھی پھر
منہ پھر کر کھڑے ہو گئے تھے مگر دھیان ادھر ہی تھا۔ وہ کچھ
رہے تھے کہ ابھی وہ چھت پر ہے اور چوڑیوں کی گھون پر لگتی
سے ایک ایک کپڑا اتار رہی ہے لیکن کب تک؟ آخر وہاں
سے چلی جائے گی۔
خدا کی شریف آدمی کو ایسے معاملات میں نہ ڈالے۔
اگر وہ کوئی فریاد نہیں کر سکتے تھے مگر اپنے سینے سے ایک آواز
نکال سکتے تھے۔ کھائیں کر یا کھار کر یہ اشارہ دے سکتے تھے
کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔
کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ وہ خوشبو چھت سے اڑ جانے
والی تھی۔ جب ہی اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ ”السلام
علیکم!“
انہوں نے گھوم کر دیکھے بغیر کہا۔ ”علیکم السلام!“
”آپ یہاں صوب میں کھڑے ہیں۔ کوئی پریشانی ہے؟“
”جی نہیں، پریشانی تو نہیں ہے۔ ہاں۔ مگر ہے۔“
”یہ کیا بات ہوگی؟ پریشانی نہیں ہے مگر ہے؟“
”ہاں۔ وہ۔۔۔ دراصل ایک انجمن ہے۔“
”آپ تو بہت ہی ذہین اور عالم فاضل ہیں۔ موٹی
موٹی کتابیں پڑھتے ہیں۔ لوگوں کی انجمنیں دور کرتے ہیں۔
بھلا آپ کیسے انجمن میں پڑھتے ہیں؟“
”مجھ بھی ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ بیٹھے
بٹھائے سکون پر باد ہوجاتا ہے۔ مجھے آج صبح سے ایسا لگ رہا
ہے جیسے میرے گھر میں کوئی گھس آتا ہے۔“
”ہاں۔ سنا ہے۔ آپ باہر کا دروازہ اندر سے کھلا
رکھتے ہیں۔ اسے بند رکھا کریں، کوئی نہیں آئے گا۔“
”وہ دروازے سے نہیں اس چھت سے آتا ہے۔“
”آپ یہ نیچے جانے والے زینے کا دروازہ کیوں
نہیں لگواتے؟ دروازہ بند رہے گا تو کوئی نہیں آئے گا۔“
”میرے گھر میں کوئی قیمتی سامان نہیں ہے۔ چور
بد معاش بھی میری عزت کرتے ہیں۔ کوئی مجھے نقصان
پہنچانے نہیں آتا۔“
”تو پھر کیوں آتا ہے؟“
وہ کیسے کہتے کہ وہ آتا نہیں آتی ہے۔ کسی آنے والی کی
بات کرتے تو اس بات کو پر لگ جاتے۔ ایک ناک یاد لڑکی کے

آسان سا طریقہ یہی تھا کہ وہ ان تین مکانات والے
پڑوسیوں سے ملنے اور معلوم کرتے کہ کسی مکان میں رہنے والی
کوئی خاتون ان کی چھت کے ذریعے اس مکان میں آتی ہے؟
لیکن یہ طریقہ آسان ہونے کے باوجود نامناسب
تھا۔ وہ کسی کے دروازے پر جا کر یہ کہنے کہ اس کی ماں بہن یا
بہن چھت پر ان کے گھر آتی ہے تو یہ چادر اور چادر دیواری میں
رہنے والیوں پر الزام ہوتا۔ وہ کسی کو صورت سے پہچان کر یہ
نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہی آتی ہے۔
ایسی الزام تراشی پر لوگ مارنے مرنے پر تہل جاتے۔
کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اوپر سے یہ بھید کل جاتا کہ مولانا صاحب
کے گھر میں کوئی چھپ کر آیا کرتی ہے۔
اب وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ وہ کوئی آسیب
یا چھلاوہ نہیں ہے۔ وہ آتی ہے ضرور آتی ہے اور اب بھی
وہاں موجود ہے۔
وہ نیچے کمرے میں جانا چاہتے تھے کہ رک گئے۔
دوسری چھت پر ایک لڑکی کی جھلک دکھائی دی۔ الٹی پر کپڑے
سوکھ رہے تھے اور وہ ان کے پیچھے تھی۔ صورت نظر نہیں آ رہی
تھی۔ اگر نظر آتی تب بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ وہی ہے جو
اپنے پیچھے لگا رہی ہے۔
اور وہ اس سے یہ اتنا نہ سوال نہیں کر سکتے تھے۔ ”کیا
تم ہی میرے گھر میں آتی ہو؟“
پھر اچانک ہی ایک سراغ ملا۔ کلائیوں میں چوڑیاں
بج رہی تھیں۔ وہ مترنم چمن چمن جیسے کہہ رہی تھی۔ ”ہاں۔ میں
ہی ہوں۔ بولو کیا ارادہ ہے؟ کیا کرو گے؟ مجھے الزام دو
گے؟ اونچہ۔۔۔! میں ایسا نہیں ہوں۔“
الٹی سے کپڑے اتارتے وقت چوڑیاں گھٹنا رہی
تھیں۔ وہاں پڑے ہوئے پردے ہوا سے اڑ رہے تھے۔ وہ
صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اچھی پرکشش لڑکی تھی۔ چوڑیوں
کی چمن چمن جیسے مولانا صاحب سے کہہ رہی تھی۔ ”لڑکی گھر
میں آگئی ہے۔ اس نے تمہیں جنی لیا ہے۔ تم بھی اسے چنو گے
تو بات آگے بڑھے گی۔“
وہ نظریں نیچی رکھنے والے ایک شریف آدمی تھے۔ محبت
کیسے کی جاتی ہے یہ نہیں جانتے تھے۔ عورت ہر مرد کے لیے
ضروری ہوتی ہے۔ ان کے لیے بھی وہ ضروری ہو سکتی تھی۔
اور ضروری ہوتی تب بھی وہ عشق کرنے والے نہیں
تھے۔ محض ایک انداز میں اس کے گھر رشتے کا بیجام بھیج سکتے
تھے لیکن ابھی یہ تو معلوم ہو کہ یہ وہی لڑکی ہے یا نہیں؟ کیسے
معلوم کریں؟

آئی ہوں۔ اور نکاح کے بغیر ایک شخص کے ساتھ رہتی ہوں۔“

”اپنی ماں کو نادان نہ سمجھنا۔ میں معلوم کر چکی ہوں تمہاری سبکی مولانا فضل کریم کے پیچھے والے مکان میں رہتی ہے۔ تم بھی وہیں ہو۔ میں تم پر لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دینا نہیں چاہتی۔ چپ چاپ گھر آ جاؤ۔“

”چپ چاپ اپنے مجازی خدا کے ساتھ آؤں گی لیکن ایک لاکھ سترہ سو روپے لے کر آؤں گے۔“

”تم میری طرح خدی ہو لیکن میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ تم دیکھو کہ کس طرح میں تمہیں وہاں سے لاؤں گی؟“

”ماں نے فون بند کر دیا۔ اس کی سبکی نے آکر پوچھا۔“

”اتنی دیر سے یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”وہ مسکرا کر بولی۔“مولانا صاحب سے سامنا ہو گیا تھا۔“

”سبکی نے ہنسنے ہوئے کہا۔“کیوں بیچارے مولانا کے پیچھے پڑ گئی ہو؟“

”عرفان سے شرط لگی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا مولانا صاحب صبح معنوں میں فرشتہ ہیں اور میں نے کہا تھا عورتوں کے معاملے میں کوئی مرد فرشتہ نہیں ہوتا۔“

”اب تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں نے آج فجر سے انہیں مجلس میں مبتلا رکھا۔ میرا خیال تھا اچانک مجھے دیکھیں گے تو ہزار جان سے عاشق ہو جائیں گے۔“

”تو پھر ہو گئے؟“

”انہوں نے صرف ایک بار مجھے دیکھا پھر اس خدا کے بندے نے میرے پاؤں کے انگوٹھے پر بھی نظر نہیں ڈالی۔ میں مان گئی! ابھی اس دنیا میں نیک اور پارسلوگ موجود ہیں۔“

”بس بہت ہو چکا یہ ڈراما۔ اب اسے ختم کرو اور نیچے چلو۔“

”ڈراما تو تب ختم ہو گا جب امی سے اپنے حصے کی رقم وصول کر لوں گی۔ وہ فیہم پر سب کچھ لٹائی رہتی ہیں۔ کل تک ان سے ایک لاکھ روپے وصول کر لوں گی۔ یہاں مولانا صاحب کے پاس آکر عرفان سے اپنا نکاح پڑھاؤں گی پھر تمہارے گھر سے چلی جاؤں گی۔“

”وہ باتیں کرتے ہوئے نیچے جانے لگیں۔ اسی وقت فون نے پھر مخاطب کیا۔ اس نے خوش ہو کر فون کان سے لگا کر کہا۔“ہائے عرفان! میں کب سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”میں نے کال کی تھی۔ تمہارا فون بڑی جارہا تھا۔“

”ہاں۔ امی سے بات کر رہی تھی۔“

”کیا بات بن گئی ہے؟“

”ضرور بنے گی۔ ابھی تو وہ دنانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔“

”فرض کرو انہوں نے رقم نہ دی تو کیا کرو گی؟“

”میں سمجھی ان کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ رشتہ تو زودوں گی۔ انہیں بدنام کروں گی کہ ان کی سبکی ایسا تو ایک رات کے لیے گھر سے گئی تھی۔ میں تو دونوں سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔“

”یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا خود کو بدنام کرو گی؟“

”میں تمہاری عمرانی میں ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے گھر سے نکل کر کسی پرانے مرد کا منہ نہیں دیکھا۔ جب تم مجھے شریک حیات بناؤ گے تو پھر بدنام کرنے والی انگلیاں بھی میری طرف نہیں اٹھیں گی۔“

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ میری بیٹی صرف میرے لیے ہے۔ ویسے تم نے مجھ سے شرط لگائی تھی کہ مولانا صاحب تم پر ہزار جان سے عاشق ہو جائیں گے۔ کیا ایسا کچھ ہوا؟“

”نہیں۔ تم جیت گئے۔ وہ واقعی قابل احترام ہیں۔ انہوں نے صرف ایک مختصری نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ اس کے بعد ایسے منہ پھیر لیا جیسے میں کوئی چیز نہیں ہوں۔“

”وہ ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔“پہلے تو مجھے اپنی توجہ کا احساس ہوا جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہ ہو پھر خیال آیا کہ ہم عورتیں بھی عجیب ہیں جب مرد دیکھتے ہیں تو برا لگتا ہے اور جب کوئی نہ دیکھے تو لگتا ہے ہماری ذات صفر ہو کر رہ گئی ہے۔“

”ایسے ہی دیکھے جانے اور نہ دیکھے جانے کی شکایتوں کے دوران چاہئے اور چاہئے جانے کی ہوں پروان چڑھتی ہے۔ ایک ہوں نے مولانا فضل کریم کے دروازے پر دستک دی۔ وہ مسجد سے آکر ہسٹر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ذرا کمر سیدھی کر رہے تھے کہ گناہ کر رہے تھے۔“

”دروازہ کھلی۔“

”وہ سب ہی شکا۔“

”تو ایک جوان پڑوسن ان کے سامنے کھڑی تھی۔ زبردست مسکرا رہی تھی۔“

”پوچھا۔“اندر آئے؟“

”انہوں نے گارڈی سے پوچھا۔“یہ کیا بول رہی ہو؟ کسی ضرورت سے آئی ہو تو اپنے گھر کے کسی مرد کے ساتھ آؤ۔ میں تمہاری عورت سے نہیں ملتی۔“

”سچت پڑتی ہیں۔“

”ان کے ذہن کو ایک جھوکا سا لگا۔ وہ بولی۔“میں اپنی سچت پر چھپ کر سب پر جھڑپ کر رہی تھی۔“

”یاد رکھو رہی نہیں؟“

”اس سے دور تھا، منہ پھیر کر کھڑا ہوا تھا۔“

”مگر اس سے بول رہے تھے۔ اسے سمجھا رہے تھے کہ جب آپ دونوں مکان کے اندر مکمل کر ملتے ہیں تو چھت پر فاصلہ رکھنا چاہیے۔ ورنہ بدنام ہو جائیں گے۔“

”یہ سراسر بہتان ہے۔ وہ میرے گھر میں نہیں آتی ہے۔“

”نماز پڑھنے والوں کو چھت نہیں بولنا چاہیے۔ میں نے آج ہی دن کے دس بجے اسے آپ کی چھت پر دیکھا تھا پھر وہ بیڑھیاں اتر کر مکان کے اندر گئی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی وہ پورے ایک گھنٹے بعد واپس آئی تھی۔“

”وہ پریشان ہو کر یہ باتیں سن رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ امام صاحب اور مسلمان کے ساتھ دردناک کے گھر گئے تھے۔ انہوں نے واپس آکر کھڑکی میں اٹکے ہوئے بال خود بھی دیکھے تھے۔“

”بڑوسن کہہ رہی تھی۔“میں چاہتی تو سارے محلے والوں کو اکٹھا کر لیتی مگر جانتے ہیں میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

”تم۔۔۔ تم جیسا سمجھ رہی ہو۔ وہ بات نہیں ہے۔“

”بات جو بھی ہو کیا دروازے پر ہی ہوتی رہے گی؟“

”اندر آئے نہیں دیں گے؟“

”وہ بری طرح پھنس گئے تھے۔ ایک طرف ہٹ کر بولے۔“اندر آؤ۔ بس یہیں دروازے کے پیچھے رہ کر میری بات سنو۔ میرے گھر میں کوئی نہیں آتی ہے۔ میں کسی سے نہیں ملتا ہوں۔“

”آپ اقرار نہ کریں۔ اب تو وہ جیسے ہی آئے گی میں محلے والوں کو یہاں لے آؤں گی۔“

”ان پر گھبراہٹ طاری ہوئی۔ وہ اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ محلے والے اسے دیکھیں گے تو پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”وہ ان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔“

”اگر چاہیں تو میں آپ کی راز دار بن سکتی ہوں۔ گھر کی بات باہر نہیں جانے کی۔“

”فی الحال وہ یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا۔“یہ تمہارا احسان ہو گا۔ وہ جو یہاں آتی ہے اس کے بارے میں سچ بتاؤں گا۔ تب تمہیں یقین ہو گا کہ۔۔۔“

”وہ آگے نہ بول سکے۔ وہ بالکل قریب آکر گویا ہوئی۔“

”مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں سننا ہے۔ میں آپ کا راز دل میں چھپا کر رکھوں گی۔ بس آپ مجھے اس کا صلہ دیں۔“

”وہ پیچھے ہٹ کر بولے۔“نت۔ تم چاہتی کیا ہو؟“

”بھولے نہ نہیں۔ اسے خوش کرتے ہیں تو مجھے بھی کریں۔“

”وہ غصے سے بھنا گئے۔“کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ ایسی بات کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔“

”جب آپ کو مولوی ہو کر شرم نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے گی؟ مجھے دیکھیں۔۔۔! جوان ہوں خوبصورت ہوں۔ سب مجھے کنواری لڑکی سمجھتے ہیں جبکہ چار بیٹوں کی ماں ہوں۔“

”وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر بولے۔“یا اللہ! ہمارا دین ایمان ہمارا تہذیب شرافت زوال کی طرف جا رہی ہے۔ اپنے بندوں پر رحم فرما میرے مالک۔! مگر انہوں کو راز راست پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔“

”وہ بولی۔“مولانا صاحب! یہ دعائیں مسجد میں مانگے گا۔ چوری پکڑی گئی تو ناک تک کر رہے ہیں۔“

”بس زیادہ نہ بولو۔ تم کیا سمجھتی ہو میں گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار بن جاؤں گا؟“

”وہ ہاتھ نچا کر بولی۔“وہ کنواری چھو کر رہی ہے اس کے ساتھ جیسے کوئی گناہ نہیں ہوتا اور میرے ساتھ ہو جائے گا۔“

”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ میرا رب جانتا ہے۔ اپنی والدہ مرحومہ کے بعد میں نے کبھی کسی عورت کو نظر بھر کے نہیں دیکھا۔“

”خدا کو گواہ بنانے سے کیا ہوتا ہے؟ جب ثبوت اور چشم دید گواہوں کے ساتھ پکڑے جائیں گے تو لوگ آپ کی عزت اور پارسانی پر پھوکیں گے۔“

”تمہاری ہوس تم سے درست کہتی ہے کہ مجھے خواہواہ بدنامی مول نہیں لینی چاہیے۔ تمہاری بات مان لوں گا تو بھید نہیں کھلے گا۔ میری پارسانی کا بھرم رہ جائے گا۔“

”وہ خوش ہو کر بولی۔“آپ بہت سمجھدار ہیں۔“

”میری سمجھداری میرا ایمان کہتا ہے کہ یہ آزمائش کی گھڑی ہے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ اگر حانات میرے موافق نہیں ہیں تو اس میں کوئی قدرتی مصلحت ہوگی۔ میرا اللہ مجھے آزما رہا ہے۔ انشاء اللہ۔۔۔ میں آزمائش پر پورا اتروں گا۔ تمہیں بھی سمجھانا ہوں تو یہ کرو اور یہاں سے جاؤ۔“

”انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ انہیں گھورتے ہوئے دانت چیں رہی تھی پھر وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔“ارے اوڑاؤں راکھ کر مولانا بننے والے! بہت چھچھتاؤ گے۔“

”اس کے باہر نکلے ہی انہوں نے دروازے کو بند کر دیا۔ اس سے ٹیک لگا کر سوچنے لگے۔“یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ چھت پر اس لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا جاؤں گا اور وہ وہی لڑکی ہے جو میرے گھر میں کھس آتی ہے۔ ابھی یہ کہہ رہی تھی کہ اس نے آج صبح دس بجے اسے میری

چھت پر دیکھا تھا مجھ پر وہ سبز جلیاں اتر کر یہاں اندر آئی تھی۔
یا خدا! جس نے مجھے جس میں جلا کر رکھا تھا میں اسی
کے ساتھ چھت پر باتیں کر رہا تھا اور اسے پہچان نہیں کر رہا
تھا۔ اس نے اپنا نام بتائی بتایا تھا۔ یہ پڑوسن تو اب رانی کا
پہاڑ بنادے گی۔ میں کیا کروں؟ سیدھی سی بات یہ سمجھ میں
آئی ہے کہ پیچھے والے مکان میں جاؤں اور بیٹھی سے کہہ دوں
کہ پڑوسن نے اسے میرے گھر میں جاتے آتے دیکھ
لیا ہے۔ آئندہ میری چھت پر بھی قدم نہ رکھے ورنہ میں مفت
میں بدنام ہو جاؤں گا۔

لیکن میں یہ بات ایک تہا جو ان لڑکی ہے کیسے کہوں گا؟
اس گھر میں اور بھی افراد ہوں گے وہ بھی نہیں مانیں
گے کہ ان کی لڑکی چھت پر میرے گھر میں آئی ہے۔ یوں ایک
لڑکی کو بدنام کرنے والی بات کوئی نہیں مانے گا۔
ابھی اس بات کی ذرا سلی گئی تھی کہ جب تک بیٹھی ان کے
گھر میں نہیں آئے گی جب تک پڑوسن کھلے ثبوت کے ساتھ
انہیں بدنام نہیں کر سکے گی۔
اب بھی کوشش کرتی تھی کہ بیٹھی ان کی چھت پر کبھی قدم
نہ رکھے۔ کسی نہ کسی طرح اس سے ملنا اور اسے سمجھانا ضروری
ہو گیا تھا۔

وہ بے چینی سے ہلنے لگے۔ سوچنے لگے۔ ”تہا بیٹھی اور
اس کے گھر والوں کے پاس جا کر بات کرنا مناسب نہیں
ہے۔ امام صاحب کو ساتھ لے جانا چاہیے۔“
وہ فوراً مکان سے باہر آگئے۔ اچھو پان والے نے
اپنی دکان سے انہیں دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیسے جا رہے ہیں؟“
وہ بولے۔ ”ہاں۔ پیش ماہ صاحب سے ملنے جا رہا ہوں۔“
”آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

انہوں نے دکان کے سامنے آکر کہا۔ ”ہاں۔ بولو؟“
وہ راز دارانہ لہجے میں بولا۔ ”یہ آپ کی پڑوسن بڑی
الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہے۔ آپ کو بدنام کر رہی ہے۔“
انہوں نے سر کھٹا کر پڑوسن کے دروازے کو دیکھا۔
اچھو نے کہا۔ ”ادھر گلی کے کنارے پر دیکھیں! وہاں تین عورتوں
کے ساتھ کھڑی ہے۔ ضرور آپ کے خلاف بول رہی ہے۔“
وہ پریشان ہو کر اس طرف دیکھنے لگے۔ ان کے گھر
سے نامراد ہو کر جانے والی ہاتھ نچانچا کر عورتوں سے کچھ بولی
رہی تھی۔ انہوں نے پریشانی سے کہا۔ ”یا خدا! ہم سب کو جھوٹوں
سے اور شر پھیلانے والوں سے محفوظ رکھ۔ ثوبی عزت دیتا
ہے تو ہی ذلت دیتا ہے۔ ہمارے لیے خیر کثیر فرما۔“
اچھو نے کہا۔ ”آمین۔“

وہ ذریعہ ایک آیت پڑھتے ہوئے امام صاحب کے
کوڑھ میں آئے۔ وہ مولانا صاحب کو اپنے دروازے پر دیکھ
کر حیرانی سے بولے۔ ”آپ اس وقت... خیریت تو ہے؟“
وہ پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے بولے۔ ”ابھی تک
تو خیریت ہے۔ اگر رحمت نہ ہو تو ذرا میرے ساتھ چلیں۔“
”رحمت کیسی...؟ ابھی چلا ہوں۔“

وہ گھر کے اندر گئے پھر دستار پہن کر آگئے۔ مولانا نے
اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے انہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کیا
ہو رہا ہے؟ امام صاحب نے حیرانی سے کہا۔ ”وہ پچھلے مکان
میں رہتی ہے اور چھت کے راستے آپ کے مکان میں آ جاتی
ہے۔ یہ تو سراسر بدنام کرنے والی بات ہے۔“
مولانا نے کہا۔ ”ہم دین ایمان کی باتیں سمجھاتے
ہیں۔ نیک ہدایات کے پھول پیش کرتے ہیں پھر ہمیں کیوں
پتھر مارے جائیں؟“

”اور مولانا صاحب آپ کی شخصیت تو ایسی ہے کہ
سب ہی آپ کو انسانِ غافرشت کہتے ہیں۔ یہ بیٹھے بٹھائے دو
عورتیں آپ کے پیچھے کیوں پرگتی ہیں؟“
”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ خود ہی کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔“
”میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا وہ لڑکی چھت پر آپ
کے گھر میں کیوں آتی ہے اور وہ دوسری پڑوسن آپ کے
خلاف کیوں ہوئی ہے؟ آخر چاہتی کیا ہے آپ سے؟“
”میں کیا بتاؤں؟ کھل کر کہہ نہیں سکتا۔ وہ تہذیب اور
شرافت کے خلاف اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی تھی۔“
وہ کالوں کو چھو کر بولے۔ ”لاحول ولا قوۃ... وہ تو کئی
بچوں کی ماں ہے۔“

”ہاں۔ چار بچے ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
ایسا بھی ہوتا ہے ہوں غالب آتی ہے تو ایک عورت ماں اور متا
کا تقدس بھی بھول جاتی ہے؟ یا اللہ! ہم سب پر رحم فرما۔!“
امام صاحب آئین کہتے ہوئے بولے۔ ”ہم پہلے اس
لڑکی کو سمجھائیں گے وہ آپ کی چھت پر نہیں آئے گی۔ پڑوسن
اسے نہ دیکھ سکے گی نہ آپ کو بدنام کر سکے گی۔“
وہ دونوں پچھلے مکان کے دروازے پر آئے تو وہاں تالا
پڑا ہوا تھا۔ امام صاحب نے کہا۔ ”یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے۔“
”ظہر سے پہلے وہ لڑکی اس مکان میں تھی۔ اچانک یہ
لوگ کہاں جا سکتے ہیں؟“

انہوں نے دوسرے مکان کے دروازے پر دستک
دی۔ وہاں سے ایک عمر خاتون نے نگل لرائیں سلام کیا۔
امام صاحب نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”یہ آپ کے

پڑوسی کہاں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”نسیبہ کی زوجگی کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے
اسپتال لے گئے ہیں۔“
”کیا گھر کے تمام لوگ گئے ہیں؟“
وہ بولی۔ ”یہاں تو صرف میاں بیوی رہتے ہیں۔ اس
کا خاوند اسے اسپتال لے گیا ہے۔“

مولانا اور امام صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر
مولانا نے پوچھا۔ ”یہاں اور کوئی لڑکی نہیں رہتی؟“
”ہاں۔ نسیبہ کی ایک سہیلی یہاں رہنے آئی ہوئی ہے۔
کہہ رہی تھی سو تیلے پاپ سے بھنگ کر آئی ہے۔“
”کیا وہ اسے گھر واپس چلی گئی ہے؟“

”نہیں۔ وہ بھی نسیبہ کے ساتھ اسپتال گئی ہے۔“
عصر کی اذان گونج رہی تھی۔ وہ اس خاتون سے
رخصت ہو کر مسجد کی طرف جانے لگے۔ مولانا نے کہا۔ ”وہ
سہیلی کے ساتھ اسپتال گئی ہے۔ شاید آج کی رات وہیں
گزارے گی۔“

”پھر تو اطمینان ہے۔ وہ صبح تک چھت پر نہیں آئے
گی۔ نہ وہ پڑوسن دیکھے گی نہ آپ کو بدنام کرے گی۔“
مولانا نے کہا۔ ”پھر بھی مجھے محتاط رہنا ہو گا۔ میں آج
رات قادر جان کو اپنے ساتھ رکھوں گا اس طرح مجھ پر کسی
تنہائی میں ملنے کا الزام نہیں آئے گا۔“

”اگر ایسا ہوتا ہے جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے“ انہیں
طرح طرح سے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اگر مولانا کے پاس
کوئی عورت کسی ضرورت سے آئی تو وہ کہتے تھے ”میں کسی نا
محرم سے بات نہیں کرتے گھر کے کسی مرد کو ساتھ لاؤ۔“

وہ اپنے آس پاس سے گزرنے والی عورتوں کو بھی نہیں
دیکھتے تھے۔ ان کا سر جھکا رہتا تھا۔ اس کے باوجود ایک
طرف یعنی اور دوسری طرف پڑوسن کے لیے بدنامی کے
راستے ہموار کر رہی تھیں۔

کیوں خواہ وہ ایسا کیا جاتا ہے اگر کیا جاتا ہے تو ایلا
کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اسے بھی ثبوت اور واہوں کی طرف
سے گناہ کا زخم لگایا گیا تھا جبکہ وہ بے گناہ اور بے داغ تھی۔
پھولی نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ مولانا کے
خلاف سازش نہیں ہو رہی تھی۔ بیٹی شائہ، چیل اور کھنڈر سے
مزاج کی لڑکی تھی۔ اس نے عرفان سے کہا تھا ”مرد بڑے
برائی ہو تے ہیں۔ ایک سے دل بھر جائے تو دوسری پر نیت
غراب کرتے ہیں۔“

عرفان نے کہا۔ ”سب ایسے نہیں ہوتے۔ میں بھی ایسا

نہیں ہوں۔“

وہ بولی۔ ”یہ تو شادی کے بعد پتا چلتا ہے کہ میاں کیسے
رنگ بنگیلے ہیں؟ میں نے آج تک کوئی شریف مرد نہیں دیکھا۔“
”صرف دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کو پرکھنے سے
سمجھ میں آتا ہے۔ کیا تم نے مولانا فضل کریم کو نہیں دیکھا؟
عورتوں کے سامنے سر جھکا لیتے ہیں۔ کبھی نظریں ملا کر بات
نہیں کرتے۔“

”ایسے مولانا بگلا بھگت ہوتے ہیں۔ اوپر سے کچھ اور
اندر سے کچھ۔ اگر میرے جیسی کوئی لڑکی تنہائی میں ملے تو
رال ٹپکنے لگے گی۔“

”یہ تنہا رہی بھول ہے۔ کوئی حسینہ عالم بھی آجائے تو
وہ بھی اپنی کافرانہ اداؤں سے انہیں گمراہ نہیں کر سکے گی۔“
وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”دیکھو! عورت کو کبھی چیخ نہ
کرو۔ یہ بادشاہ کے سر سے تاج اور سیاحی کے ہاتھ سے
تھیہار گر سکتی ہے۔ میں چاہوں تو چنگی بجا کر انہیں اپنا دیوانہ
بناسکتی ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں تنہا رہی خوش فہمی ختم کرنا چاہتا
ہوں۔ انہیں اپنا دیوانہ بنا کر دکھاؤ۔“
”شرط لگاؤ اگر کامیاب ہوگی تو کیا انعام دو گئے؟“
”میں ایک مہینے کی پوری تنخواہ تنہا رہے ہاتھ پر رکھ
دوں گا اور اگر ناکام ہو گئیں تو...؟“

”تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں اپنی پوری زندگی
تنہا رہے نام کر رہی ہوں۔ ہاں۔ اگر مولانا صاحب واقعی
فرشتہ ثابت ہوں گے تو یہ طے کر لو کہ ہم ان سے ہی اپنا نکاح
پڑھوائیں گے۔“

”یہ تو میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ انشا اللہ وہی
ہمیں رعیت از دواج میں منسلک کریں گے۔“
یوں دیکھا جائے تو بیٹھی ان کے خلاف سازش نہیں کر
رہی تھی۔ اپنے ہونے والے جیون ساتھی کو اپنے اعتماد میں
لے کر ایک تراش کر رہی تھی اور ان کی شرافت اور نیک نیتی کو
بھی آزمایا تھی۔

اسی طرح وہ پڑوسن بھی اپنی دانست میں ان پر جھوٹا
الزام لگنے والی نہیں تھی۔ جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا
تھا اسی کا اشتہار لگانے والی تھی۔

مولانا نے اسے اذکار انہیں تھا۔ ”ہاں۔ ایمان کے
جوانے سنا رہے تھے۔ گناہ نے باز رکھا جانا تھا۔ لیکن اسے
یہ سختیں نہ پہنچیں۔ اس لیے وہ مولانا کو اپنی نگرانی میں لے
جو ہو رہا تھا اس کے پیش نظر یہ حقیقت سامنے آ رہی تھی

کہ کوئی کسی کا برا چاہے یا نہ چاہے اس کے باوجود بھی برائی آسکتی ہے۔

انیلا نے بھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا مگر اس پر برائی تھوپ دی گئی تھی۔ ابھی مولانا ایک بدنام ہونے والی لڑکی کے حوالے سے اپنے حالات کا جائزہ نہیں لے رہے تھے۔ آگے چل کر یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ وہ بھی ویسے ہی برے حالات سے گزر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اسی معبود کی رضا سے ہو رہا تھا۔ لیکن ایک نیک اور صالح کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟

ایسی بات نہیں تھی کہ مولانا سے جانے انجانے میں کوئی غلطی ہوئی تھی جس کی سزا انہیں ملنے والی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔

ایسے وقت میں ایمان ڈگمگائے تو بندہ سوچتا ہے کہ اوپر والے نے دیکھنا سنا اور دعاؤں کو قبول کرنا چھوڑ دیا ہے۔ خدا مجھے بھول گیا ہے۔۔۔۔۔۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔

انسانی مایوسی کے باوجود وہ عانی انسان کی آخری دوا ہوتی ہے۔ اور دعا جب قبول ہوتی ہے جب نماز قائم کی جاتی ہے۔

یہ مجرب نسخہ کوئی بھی آزمائے۔ نماز پڑھے اور اپنی ذات کو دوسروں کی بہتری کے لیے وقف کر دے۔ ان دو باتوں پر عمل کرنے والے کے دن ضرور پھرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ نماز پڑھتے ہی اور نیکیاں کرتے ہی دن پھر جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔ خدا سے کاندھاری نہیں ہوتی کہ ہم جتنی رقم دے رہے ہیں اتنے کا مال بھی ہمیں دو۔

خدا سب کچھ ہے۔ دکاندار نہیں ہے۔ وہ فوراً صلہ نہیں دیتا۔ اس کی حکمت وہی جانتا ہے۔ کبھی برسوں بعد خوب صلہ دیتا ہے۔ کبھی پلک جھپکتے ہی وارے نیارے کر دیتا ہے۔

اس روز قادر جان نے اور دو نام ڈیوٹی کی۔ عشا کی نماز کے وقت مسجد میں مولانا سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نماز کے بعد اسے اپنے موجودہ حالات بتائے۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ”ٹھیک ہے آج رات آپ کو تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ میں ابھی گھر والوں سے کہہ کر آتا ہوں۔ میری موجودگی میں نہ بیٹنی آسکے گی نہ پڑوین بدنام کر سکے گی۔“

وہ اپنے طور پر بدنامی کی راہیں مسدود کر رہے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ قدرت کی مشا کے مطابق اگر ہوتی ہے تو ہو کر رہے گی۔ اس کے باوجود انسان کوشش کرتا ہے کہ اس کی طرف برائی نہ آئے اور قدرت کی مشا کے مطابق یعنی عشا کی نماز کے وقت ہی اسپتال سے واپس آگئی تھی۔ اس کی سبکی

نسیہ نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ اسے اپنے گھر سے ضرورت کا کچھ سامان منگواتا تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”آصف! آپ کو نائٹ ڈیوٹی کے لیے جانا ہے۔ آپ بیٹی کے ساتھ گھر جائیں۔ یہ ضرورت کی چیزیں وہاں سے لے آئے گی۔“

یعنی ایک رکشے میں آصف کے ساتھ گھر آئی۔ اسے نسیہ کی ضروری چیزیں لے کر اسپتال واپس جاتا تھا لیکن نہ جاسکی۔ اس نے عرفان سے کہا تھا۔ ”میرے جیسی خوبصورت اور جوان لڑکی مولانا کو تنہائی میں ملے گی تو مال چکھنے لگے گی۔“ اس کی یہ بات آصف پر صادق آئی۔ اس نے گھر میں آتے ہی دروازے کو اندر سے بند کر دیا پھر بیٹی سے کہا۔ ”تم بہت حسین ہو۔ بہت ہی پرکشش ہو۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”تم نے بھی نسیہ کے سامنے میری تعریف نہیں کی۔“

”وہ سنی تو حسد کرنے لگتی۔ اس گھر میں تمہیں رہنے نہ دیتی۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے اس کے بازو کو تھام لیا۔ وہ خود کو ایک جھپٹکے سے پھڑا کر دور ہوتے ہوئے بولی۔ ”مرد اپنی حیوانیت سے باز نہیں آتا۔ بہتر ہے کہ مجھ سے فاصلہ رکھو۔“

”پلیز بیٹی! مجھے حیوان نہ کہو۔ تم میرے دل و دماغ میں سما گئی ہو۔ میں تمہارے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔“

”یعنی مجھے حاصل نہ کر سکتے تو پاگل ہو جاؤ گے اور میں بھی تمہیں خوش کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکوں گی۔“

”پلیز۔ میری محبت کو اور شدت طلب کو مجھو۔ مجھ سے دور نہ جاؤ۔“

”دور کہاں جاؤں گی؟ ہر نکلنے کا راستہ بند ہے۔ تمہاری بات ماننا ہی پڑے گی۔ میں ابھی واش روم سے آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر گئی۔ اسے پلٹ کر بڑی بیٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی پھر دروازے کو بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔

وہ چونک گیا۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آیا۔ اسے کھولنا چاہا تو وہ باہر سے بند ہو چکا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”انیلا کو دعائیں دے رہی ہوں۔ اس نے بیان دیا تھا کہ اس نے عیم سے بچنے کے لیے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ابھی اچانک ہی اس کی یہ بات یاد آگئی۔ میں مانتی ہوں واقعی اس نے یہی کیا ہوگا۔“

اس نے دروازے کو ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”فضول بکواس نہ کرو۔ دروازہ کھولو ورنہ میں اسے تو زبردستی آجاؤں گا۔“

”میرے بھائی نے بھی انیلا سے یہی کہا ہوگا۔ خود پر بیت رہی ہے تو وہ بیٹھے کئی لگ رہی ہے۔“

”تم کیا سمجھتی ہو کہ یہاں سے نکل پاؤ گی؟ یاد رکھو! تم میرے گھر میں ہو۔ اپنے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہو۔“

”ہاں۔ یہاں میں بیٹھنے چلانے کی حماقت کروں گی تو بدنام ہو جاؤں گی۔ مدد کو آنے والے یہی کہیں گے کہ تم میرے گھر نہیں گئے ہو۔ انیلا کی طرح میں تمہارے گھر آئی ہوں۔“

”تو پھر عقل سے کام لو اور دروازہ کھولو۔“

”کھولتی ہوں۔ ذرا صبر کرو۔“

وہ وہاں سے چلتے ہوئے موبائل فون نکال کر نمبر شیخ کرنے لگی۔ بیڑھیاں پڑھتے ہوئے اوپر آگئی۔ رابطہ ہونے پر عرفان کی آواز سنائی دی۔ ”ہائے بیٹی! ابھی میں کال کرنے والا تھا۔ نسیہ کیسی ہے؟“

”ہاں۔ وہ خیر بیت سے ہے۔ بچہ بھی ٹھیک ہے مگر بچے کا باپ بگڑ گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

وہ اسے مطلب سمجھانے لگی۔ عرفان نے تمام واقعہ سننے کے بعد کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آصف تم پر نیت خراب کرے گا۔“

”میں نہ کہتی تھی کہ مرد کسی بھی عورت کو تنہائی میں پا کر انسان سے حیوان بن جاتا ہے۔“

”میں آ رہا ہوں لیکن میرے آنے تک آصف خود نیک نام رہنے کے لیے تم پر کسی اور طرح کا الزام لگا کر بدنام کر سکتا ہے۔ تم چھت پر چلی جاؤ۔“

”میں اوپر ہی ہوں۔“

”مولانا صاحب کے پاس جاؤ۔ میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔“

”رات کا وقت ہے۔ کیا وہاں جانا مناسب ہوگا؟“

”تم وہاں جا کر انہیں بتاؤ کہ اب تک ان کے گھر میں جا کر کیسی شرارتیں کرتی رہی ہو؟ میں پہنچ رہا ہوں۔ ان سے گزارش کروں گا ہمارا نکاح پڑھا دیں۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”پھر تو میں ابھی جاتی ہوں۔ جلدی آنے کی کوشش کرو۔“

یہ دینا قیسے کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اوپر والا ہر انسان کے ساتھ ایک کہانی بناتا ہے۔ مولانا فضل کریم انیلا دردانہ یعنی اور پڑوس کے الگ الگ معاملات تھے لیکن وہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ایک کہانی بنا رہے تھے۔

مشیت ایزدی کے مطابق دردانہ والے صاحب کے دروازے پر آئی تو وہ گھر میں نہیں تھے۔ عشا کی نماز پڑھنے

مسجد گئے ہوئے تھے۔ وہ وہیں انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں پہنچے تو اسے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ ”تم...؟“

میرے دروازے پر کیا کر رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟“

سامنے اچھوکی دکان پر دو آدمی کھڑے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک عورت رات کو بھی ملنے آئی تھی۔ یہ بات دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔

وردانہ نے لپکپکاتے ہوئے کہا۔ ”میرا ایک مسئلہ ہے۔ آپ دروازہ کھولیں۔ میں اندر چل کر بات کروں گی۔“

انہوں نے دروازے کو پوری طرح کھول دیا۔ وہ اندر چلی آئی۔ وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ ”اندز کمرے میں چلو۔ یہ دروازہ پوری طرح کھلا رہے گا۔“

وہ دونوں کمرے میں آگئے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میری بیٹی مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے چلی گئی ہے۔“

انہوں نے پوچھا۔ ”کہاں گئی ہے؟“

”میں آپ کے پیچھے والے مکان میں اپنی کیمپلی کے پاس ہے۔“

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا نام ہے اس کا...؟“

”نورا امین... ہم اسے بھی کہتے ہیں۔“

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ تمہاری بیٹی ہے؟“

”کیا آپ اسے جانتے ہیں؟“

”ہاں۔ تم بولو! مسئلہ کیا ہے؟ میرے پاس کیوں آئی ہو؟“

میں ایک اچھا کمانے والے، شریف آدمی سے اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں مگر عرفان نامی ایک لڑکا اسے بہکا رہا ہے۔“

”میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”وہ... بات یہ ہے کہ شام کو اس نے فون پر کہا ہے کل کسی وقت وہ عرفان سے نکاح پڑھوانے والی ہے۔“

”اگر لڑکا لڑکی راضی ہیں تو تم بھی راضی ہو جاؤ۔“

”کیسے ہو جاؤں؟ وہ میری بیٹی کو بہکا رہا ہے اور میری بیٹی مجھ سے ایک لاکھ روپے مانگ رہی ہے۔ میں اسے لڑکے پر لہا لٹائے نہیں دوں گی۔“

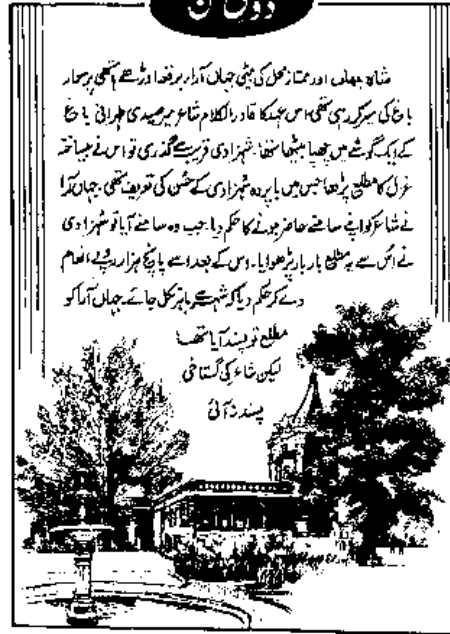
”مگر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”اس نے فون پر بتایا ہے کہ وہ کل آپ کے پاس آئے گی۔“

انہوں نے بے اختیار زبے کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ”وہ میرے پاس کیوں آئے گی؟“

”عرفان کے ساتھ نکاح پڑھوانا چاہتی ہے۔“

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ اطمینان ہوا کہ چھت کے راستے آنے والی سے توجہات ملے گی ان کی نیک



اگر کسی نے مولانا صاحب پر شرما کر تہمت لگائی تو میں اسے چیر پھاڑ کر دکھوں گا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ قد آور باڈی بلڈز تھا۔ غصے میں کسی کا لئی کا نہیں کرتا تھا۔ کسی بھی مخالف کی اچھی خاصی پٹائی کر دیتا تھا۔ صرف مولانا سے محبت اور عقیدت کی وجہ سے سب کے سامنے سر جھکانے رہتا تھا۔ بد معاشی چھوڑ دی تھی۔

انہوں نے کہا۔ ”قادر جان! غصہ نہ دکھاؤ۔ کسی کو دھمکی نہ دو۔ دماغ ٹھنڈا رکھو۔ اللہ پر بھروسہ کرو۔ وہ جانتا ہے میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔“
 یعنی نے کہا۔ ”اور میں بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کب کبھی ہوں“ میں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ اس چار دیواری میں پہلی بار مولانا صاحب سے سامنا کر رہی ہوں۔ انہوں نے کہا۔ ”کل اتوار ہے۔ چھٹی کا دن ہے۔ آپ حضرات کے ساتھ فجر کی نماز پڑھوں گا اور خدا کے گھر میں کلام پاک کو سینے سے لگا کر کب کب بولوں گا۔“
 ایک شخص نے کہا۔ ”مسجد میں کوئی گناہ گار قدم نہیں رکھے گا۔ اگر رکھے گا تو ہم مسجد میں نہیں جائیں گے۔“
 وہاں کھڑے ہوئے کئی نمازیوں نے کہا۔ ”ہم مسجد میں کیوں نہیں جائیں گے؟ ضرور جائیں گے لیکن مولانا

طرح دوسروں کو بدکار نہ سمجھو۔“
 ایک اور شخص نے کہا۔ ”بدکار تو وہ ہوتے ہیں جو کھلے ثبوت کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔“
 ایک عورت نے پوچھا۔ ”تم چھت کے راستے چھپ کر کیوں آتی ہو؟“
 دوسری نے کہا۔ ”کیا یہاں مولانا صاحب کے ساتھ نمازیں پڑھنے آتی ہو؟“
 عورتیں اور مرد ایک کے بعد ایک بولتے جا رہے تھے۔ یعنی کو کچھ بولنے کا موقع نہیں مل رہا تھا اور مولانا تو بولنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ ایسا شرما کر الزام تھا کہ وہ زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ ان کا سر گھوم رہا تھا۔
 ایک شخص نے کہا۔ ”یہ تو سب ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ماں باہر سے دروازہ کھلو کر آتی ہے اور بیٹی پہلے سے گھر کے اندر موجود تھی۔“
 ایک بوڑھے پوچھا۔ ”مولانا صاحب! چپ کیوں ہیں؟ کچھ تو فرمایا؟ اسے کتنے دنوں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے؟ جب آپ جیسے دیندار اور معزز حضرات ایسا کریں گے تو معاشرے میں بہتری کیسے آئے گی؟“

وہ زرب کلام پاک کی آیتیں پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کلمہ پڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں اللہ رسول ﷺ کا نام لے کر کلمہ پڑھ کر کچ بولوں گا تب بھی جھوٹا کہلاؤں گا۔“
 انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ ”ایسے وقت ایلا کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اس نے کہا تھا۔ کبھی کبھی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی سچائی بھی غلط ہوتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی اسی طرح بدنام کیا گیا تھا جبکہ وہ زلیخا کی چٹائی میں رہ کر اس کی ہوس اور ترغیب کے باوجود پارہ سارے تھے۔“
 ایک عورت نے ناگواری سے سر جھٹک کر کہا۔ ”جیسے دیکھو گناہ کرنے کے بعد پیغمبروں کے قصے سنانے لگتا ہے۔ ارے وہ سچے دیندار بندے تھے۔ اللہ کے پیغمبر تھے۔ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کا حوالہ کیوں دیا جا رہا ہے؟“
 وہ ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے بولے۔ ”یہ سچ ہے ہم کسی کو سمجھا نہیں سکتے مگر کسی روز اوپر والا سمجھا دیتا ہے۔ آج ایلا کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ خدا کرے میری بات کل آپ لوگوں کی سمجھ میں آ جائے۔“
 ایسے وقت قادر جان وہاں آیا۔ اچھو نے اسے بتایا کہ مولانا صاحب کے گھر سے دردانی جوان بیٹی برآمد ہوئی ہے۔ سب پوچھ رہے ہیں کہ گناہ کا یہ کھیل کب سے کھلایا جا رہا ہے؟ قادر جان غصے سے گرجتے ہوئے اندر آیا۔ ”خبردار!

تھا۔ وہ محلے کے کئی لوگوں کے کانوں میں یہ بات پھونک چکی تھی۔ دھوکا کیا تھا کہ جلد ہی بہرہ دہ مولانا کا اصلی چہرہ دکھائے گی۔“
 اور وہ عورتوں اور مردوں کو اکٹھا کر کے وہاں پہنچ گئی تھی۔ پہلے دو آدمیوں نے کہا۔ ”ہم اچھو کی دکان کے سامنے تھے۔ مولانا صاحب دروازہ کھول کر دردانہ کے ساتھ اندر آئے تھے پھر یہ جوان لڑکی کہاں سے آئی ہے؟“
 یعنی اپنے بچا کے پاس دوسرے علاقے میں رہتی تھی۔ اس محلے کے لوگ اسے دردانہ کی بیٹی کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے۔ ایک عورت نے پوچھا۔ ”یہ ہے کون...؟ کہاں سے آئی ہے؟“
 دردانہ نے تقریباً دو ہفتے پہلے ایلا کو بدنام کیا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ اپنی بیٹی کی بات گھر سے باہر نہ جائے۔ اب وہ بیٹی ایلا کی طرح پکڑی گئی۔ محلے کے لوگ اس کا محاسبہ کرنے پہنچ گئے تھے۔
 دردانہ اپنے منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ ایک عورت نے کہا۔ ”یہ دردانی کی بیٹی یعنی ہے۔“
 ”کیا...؟“ سب ہی نے چونک کر دردانہ کو دیکھا۔ عورتوں نے حیرانی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ ”ہائے دردانہ! یہ تمہاری بیٹی ہے۔“
 وہ ان عورتوں سے نظریں چرا رہی تھی جنہوں نے ایلا پر کچھ اچھا لنے کے لیے اس کا ساتھ دیا تھا۔
 اب وہی عورتیں کہہ رہی تھیں۔ ”پہلے بھتیجی نے گل کھلایا اب بیٹی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔“
 ایک عورت نے کہا۔ ”سچ خاندانوں میں ایسے ہی تماشے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں بھاگ جاتی ہیں اور ماںیں بیوہ ہوتے ہی دوسری شادی کر لیتی ہیں۔“
 دردانہ غصے میں انہیں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر موقع کہاں مل رہا تھا سب اپنی اپنی بولیوں بول رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ ”چائیں مولانا صاحب نے اسے سب سے یہاں چھپا کر رکھا ہے؟“
 پڑوں نے کہا۔ ”میری گناہ گارا آنکھوں نے اس لڑکی کو آج صبح اس گھر میں گھستے دیکھا تھا۔ یہ چھت کے راستے یہاں آئی ہے۔“
 ایک شخص نے پوچھا۔ ”کیوں مولانا صاحب! کب سے رنگ لیا ہوا ہوتا ہے؟“
 مولانا تو جیسے کتے طاری ہو گیا تھا۔ یعنی نے صبح کر کہا۔ ”بکواس مت کرو۔ مولانا صاحب فرشتہ ہیں۔ اپنی

نامی قائم رہے گی۔ انہوں نے کہا۔ ”وہ دونوں بالغ ہیں۔ اپنے ساتھ وکیل اور گواہ لائیں گے تو میں ان کا نکاح پڑھا دوں گا۔“
 وہ پہلو بدل کر بولی ”برگز نہیں۔ میں آپ سے یہی کہنے آئی ہوں کہ میری مرضی کے بغیر آپ نکاح نہیں پڑھائیں گے۔ وہ یہاں آئیں تو ان کے لیے دروازہ بھی نہ کھولیں۔“
 اندر ایک کمر سے سے یعنی کی آواز سنائی دی۔ ”دروازہ بند ہو نہیں سکتی چلی آتی ہوں۔ آپ مجھے کیسے روکیں گی؟“
 مولانا ایک دم سے اچھل کر گھر سے ہو گئے۔ دردانہ کے دماغ کو بھی جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر ان کے سامنے آ گئی۔ وہ عرفان کے مشورے کے مطابق مولانا کی پناہ میں آئی تھی۔
 دردانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیسے آ گئیں؟“
 ”جیسے بھی آ گئی۔ نکاح تو مولانا صاحب ضرور پڑھائیں گے۔ انکار کریں گے تو سب سے کہہ دوں گی کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں اور یہاں چھپ کر رہتی ہوں۔“
 مولانا نے بولکھلا کر پوچھا۔ ”یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا مجھے بدنام کر دگی؟“
 وہ بولی۔ ”میرا نکاح عرفان سے پڑھائیں گے تو نیک نام رہیں گے۔ عرفان کو ای دے گا کہ میں بے وارغ ہوں اور آپ فرشتہ ہیں، یہ کچھ نہیں سکتے کہ ہماری نظروں میں کیسے عظیم ہیں؟“
 ”تفصیل تو صرف اللہ ہے۔ اس معبود نے مجھے جو عزت دی ہے اس کا خیال کرو اور ابھی اپنی ماں کے ساتھ جاؤ۔“
 ”عرفان یہاں آ رہا ہے۔ آپ ابھی اس سے میرا نکاح پڑھائیں۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔ امی کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔“
 اس بات پر ماں بیٹی میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ ماں نکاح کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اگر وہ دردانہ کی بات مانتے تو یعنی ماں کو دھمکی دے چکی تھی کہ اعلا نے خود کو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کہے گی اور یہ بھی کہے گی کہ بھاگنے کے بعد مولانا صاحب کے گھر میں تھی۔
 وہ بے چارے نہ کسی کے لینے میں تھے نہ دینے میں تھے۔ نہ ہی ان کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچا تھا کہ وہ سب اپنے اپنے مفادات کی خاطر ان کے لیے عذاب جان بن رہے تھے۔
 دوسری طرف بھی حالات بگڑ چکے تھے۔ پڑوں نے یعنی کو پھت کے راجے ان کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھ لیا

صاحب کو وہاں قدم نہیں رکھتے دیں گے۔“
 قادر جان نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کون مائی کا
 لعل انہیں مسجد میں جانے سے روکے گا؟ جس نے ماں کا
 دودھ پیا ہے وہ سائے آئے۔“
 مولانا نے کہا۔ ”قادر جان! کسی کو نہ لاکارو، طاقت کا
 مظاہرہ نہ کرو۔“

”کیوں نہ کروں؟ یہی لوگ تو آپ کی شرافت کی قسمیں
 کھاتے تھے۔ کیسے طوطا چشم ہیں؟ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں پھیر
 رہے ہیں؟ آپ کا ایک ذرا سال کا نہیں کر رہے۔“
 ایک شخص نے کہا۔ ”کوئی بندہ کتنا ہی عالم فاضل اور
 عبادت گزار کیوں نہ ہو اگر اس سے گناہ سرزد ہوگا تو خدا اسے
 معاف نہیں کرے گا۔ بندے بھی اس محاسبہ کریں گے۔“
 مولانا نے قادر جان سے کہا۔ ”تم میرے سامنے
 اونچی آواز میں نہیں بولتے ہو۔ میری ہر بات مان لیتے ہو
 اب بھی خاموش رہو۔“

اس نے ان کے حکم پر سر جھکا دیا۔ انہوں نے کہا۔
 ”ان سب کو محاسبہ کرنے کا حق ہے۔ حالات میرے موافق
 نہیں ہیں۔ ایک جوان لڑکی میرے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔
 کوئی اندھا بھی یہی کہے گا کہ میں گناہ گار ہوں جبکہ خدا کی قسم!
 ایسا نہیں ہے۔“

وہ قادر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”مجھے صبر و تحمل
 سے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ میرا ایمان ہے میری بہتری
 کے لیے اللہ مجھے آزمائے گا۔ میں جب تک اپنی بے گناہی
 ثابت نہیں کروں گا مسجد میں نہیں جاؤں گا۔“

ایسے وقت پیش امام صاحب دوڑے دوڑے آئے۔
 انہوں نے کہا۔ ”مجھے ابھی معلوم ہوا کہ آپ کی ذات پر کچھ
 اچھالی جا رہی ہے۔ میں مرتے دم تک یقین نہیں کروں گا کہ
 آپ بھول سے بھی ایسی شرمناک غلطی کریں گے۔ کون ہے
 وہ لڑکی؟“

یعنی نے کہا۔ ”آپ حضرات اسے میری شوخی اور
 شرارت کہہ لیں یا میری حماقت سمجھ لیں۔ میں مولانا صاحب
 کی موجودگی میں چھپ کر آتی تھی۔ طرح طرح سے شرارت
 کر کے جھٹ کے راستے بھاگ جاتی تھی۔ یہ پریشان ہو کر
 مجھے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ مجھے برا مزہ آتا تھا۔“

مگر افسوس! میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ میری
 شرارت اتنی مہنگی پڑے گی۔
 میں جانتی ہوں۔ یہاں کوئی یقین نہیں کرے گا کہ شخص
 میری حماقت سے ایک فرشتہ صفت انسان بدنام ہو رہا ہے۔

میں اپنے باپ کے لہو اور ماں کے دودھ کی قسم کھا کر
 کہتی ہوں یہ گناہ ہوں سے پاک ہیں۔ روشنی میں کھڑے
 ہوں گے تو میں ان کے سائے میں نماز پڑھوں گی۔ اس سے
 زیادہ ان کی پاکیزگی اور پارسائی کا اور کیا ثبوت دوں؟“
 اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ روتے ہوئے
 بولی۔ ”میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یہ میری
 وجہ سے بدنام ہو رہے ہیں۔“

ایک عورت نے ہاتھ بچا کر کہا۔ ”مولانا صاحب کی آڑ
 میں اپنی پارسائی جتانے کے لیے باپ کے لہو اور ماں کے
 دودھ کی قسمیں کھا رہی ہو۔“
 وہ فخر سے بولی۔ ”میں بدنام ہو کر بھی نیک نام رہوں
 گی۔ مجھے نام دینے والا مجھے تحفظ دینے والا میرے سر پر چا
 کا آچل رکھنے والا میرا معیتر موجود ہے۔ وہ ابھی مجھ سے
 یہاں نکاح پڑھوائے گا۔“

کسی نے کہا۔ ”جب ایک گناہ گار کو مسجد میں جانے کی
 اجازت نہیں تو اسے نکاح پڑھانے کا بھی حق نہیں ہے۔“
 عرفان وہاں آگیا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ میں کھڑا ان
 سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔
 ”یعنی...“

اس نے خوش ہو کر اسے دیکھا پھر لوگوں سے کہا۔ ”یہ
 ہے میرا معیتر... ان سب کے سامنے بولو عرفان! کیا میں
 تمہارے اعتقاد کو بھی پہنچا سکتی ہوں؟“

وہ بولا۔ ”ہرگز نہیں۔ تم یہاں آ کر جتنی شرارتیں کرتی
 رہی ہو وہ سب میرے علم میں ہیں۔ ابھی میں نے ہی تمہیں
 فون پر مولانا صاحب کے پاس جانے کی اجازت دی تھی لیکن
 جھٹ کے راستے آنے جانے کے باعث یہ لوگ تم پر شبہ کر
 رہے ہیں اور ہم مجبور ہیں ان کا شبہ دور نہیں کر سکیں گے۔“

پھر اس نے مولانا صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا ”اور
 آپ لوگ برسوں سے ان کی شرافت دیکھتے آرہے ہیں۔
 آج یہ اچانک گناہ گار کیسے بن گئے؟ یہ تو وہ فرشتہ ہیں جنہیں
 گناہ کا تصور بھی چھو کر نہیں گزرتا۔“ اس نے مزید کہا۔

”مولانا صاحب! لوگ تو پتھر مارتے ہی ہیں۔ بیٹے بھروسے
 پر بھی پتھر اڑا کرتے رہے ہیں۔“

اس نے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ عاقبت
 نااندیش ہیں۔ تماشا بین ہیں۔ ان کی پروا نہ کریں۔ میں نے
 اور یعنی نے طے کیا ہے کہ آپ نے صرف آپ سے ہی اپنا
 نکاح پڑھوائیں گے۔“

مولانا نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے میں یہ نیک کام نہیں

کر سکوں گا۔“
 یعنی نے کہا۔ ”جب آپ کی نیک نامی بحال ہوگی
 تب تو یہ نیک کام کریں گے؟“

”بھیک۔ میں پہلے اپنی نیک نامی چاہوں گا۔“
 عرفان نے کہا۔ ”ہم کوشش کریں گے کہ ان بہنوں
 بھائیوں اور بزرگوں کے دلوں سے شبہ دور کر دیں۔ یہ آپ کو
 پہلے کی طرح معزز سمجھیں۔ جب تک ہم آپ کی نیک نامی
 بحال نہیں کریں گے شادی نہیں کریں گے۔“

یعنی نے کہا۔ ”میری غلطی سے آپ پر یہ افتاد آپڑی
 ہے۔ میں اپنی غلطی کی تلافی کروں گی۔ یہ طے ہے کہ ہمارا
 نکاح آپ ہی پڑھائیں گے۔“

بڑی دیر بعد دروازہ نے بیٹی سے کہا۔ ”تم نے تو مجھے
 منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ اب... تو مولانا
 صاحب کو نیک نامی طے کی نہ تمہارا نکاح ہوگا۔ میرے ساتھ
 گھر چلو۔“

”میں عرفان کے گھر جاؤں گی۔“

”کیا نکاح کے بغیر جاؤ گی؟ کیا چاہتی ہو ماں شرم
 سے ڈوب مرے؟“

”میں نے بچپن سے اب تک یہ کبھی نہیں دیکھا کہ آپ
 کو کسی بات پر شرم آتی ہو۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ اپنی ماں کو بے شرم کہہ رہی ہو؟“
 ”میں اس بات کا جواب ضرور دوں گی لیکن میرے
 دل میں ایک پھاس ہے پہلے اسے نکال دیں۔“

ماں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔
 ”عرفان جانتا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں ایک مرد کے غٹھے
 میں آگئی تھی۔ اس نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ تب
 میں نے عزت بچانے کے لیے وہی کیا جو انیلانے کیا تھا اور پھر
 نعیم نے اس کے ساتھ یہی حرکت کی تھی۔ دروازے کو
 اندر سے قفل کر دیا تھا۔“

”تم بکواس کر رہی ہو۔“

مولانا اور دوسرے لوگ حیرانی اور توجہ سے سن رہے
 تھے۔ یعنی نے مردوں اور عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے
 پوچھا۔ ”کیا آپ میں سے کسی نے یقین کیا تھا کہ انیلانے قفل
 کمرے میں رہنے کے باوجود بے داغ رہی ہے؟“

وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ ”نہیں۔ کسی نے یقین نہیں کیا تھا
 لیکن میں جانتی ہوں۔ میں بھی انیلانے کی طرح اس شخصیت کو
 جھانساؤں سے کمرے سے نکل گئی۔ دروازے کو بند کر کے اس
 سے نجات حاصل کر لی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انیلانے عزت

بچانے کے لیے خود کو ایک کمرے میں بند کیا تھا جبکہ میں اس
 شخص کو بند کر کے آئی ہوں۔“

اس نے ماں سے کہا۔ ”اگر مقتول دروازے کے چھ
 ایک دہائی کے پچھلے سے پچھلے ممکن ہے تو میں بھی بدکار ہوں اور اگر
 بچاؤ ممکن ہے تو انیلانے بدکار نہیں ہے۔ آج بھی بے داغ ہے یہی سچ
 ہے۔ آپ ان سب کے سامنے بولیں! آپ کی بیٹی بے
 داغ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ابھی تسلیم کریں کہ انیلانے پارسائی
 اور پارسا ہے۔“

وہ ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں بے داغ
 کیسے کہوں؟ یہاں سب ہی تمہیں مولانا صاحب کے گھر میں
 دیکھ رہے ہیں۔“

”آپ تسلیم نہیں کریں گی کہ بیٹا آپ کے ساتھ
 جھوٹ بولتا آ رہا ہے۔“

”تم اپنے معاملے میں میرے بیٹے کو کیوں گھسیٹ
 رہی ہو؟ کیا وہ تمہارا سگ بھائی نہیں ہے؟“

”سگ ہے لیکن بچپن سے اس کے کڑوتے دیکھتی آرہی ہوں۔“
 وہ غصے سے بولی۔ ”تمہیں چلنا ہے تو چپ چاپ گھر
 چلو ورنہ جہنم میں جاؤ۔ میرے لیے تم مر چکی ہو۔“

اس نے بیٹی کے جواب کا انکار نہیں کیا۔ پاؤں جٹتے
 ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ ایک عورت نے کہا۔ ”جو کیا ہے
 وہی سامنے آ رہا ہے۔ منہ چھپا کر جا رہی ہو۔“

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس نے جھٹکی کو بدنام
 کیا تھا۔ اب اس کی بیٹی پر بھی یہی الزام آیا تھا اور وہ منہ چھپا
 کر جا رہی تھی۔

وہ جاتے جاتے ٹھٹھکی گئی۔ سلیمان نے اس کا راست
 روک لیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”جھٹکی کرنی ویسی بھرنی... آئندہ تم
 بھی میری طرح منہ چھپاتی چھوڑو گی۔ اب بھی خدا سے ڈرو اور
 سب سے کہہ دو کہ انیلانے گناہ گار نہیں ہے۔“

وہ پاؤں قح کر بولی۔ ”ہے۔ ہزار بار کہوں گی اس
 نے منہ کا لیا ہے۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”کیا تمہارے پاس عقل نام کی
 کوئی چیز نہیں ہے؟ موتی عقل سے ہی سوچو اگر کج بولوگی اور
 انیلانے داغ تسلیم کی جائے گی تو تمہاری بیٹی کے لیے بھی یہی
 تسلیم کیا جائے گا کہ یہ گناہ گار نہیں ہے۔“

قادر جان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”خدا کے لیے سچ بول
 دو۔ مولانا صاحب کی نیک نامی بحال ہو جائے گی۔“
 وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیچ پڑی۔ ”مجھے
 پریشان نہ کرو۔ میرا چچا چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔“

مولانا نے کہا۔ ”اے جانے دو۔“

وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ وہ بھاگنے کے انداز میں تیزی سے چلتے ہوئے سب کی نظروں سے اوجھل ہوتی چلی گئی۔ مولانا نے امام صاحب سے کہا۔ ”اس سے بچ اگلوں! فضول ہے اگر وہ بچ بولے گی تب بھی یہ لوگ کہیں گے کہ وہ اپنی بی بی کو الزام سے بچانے کے لیے ایٹلا کو بے گناہ کہہ رہی ہے۔ ایک جمہوری اور چال باز عورت کا بچ بھی بھوٹ بھما جائے گا۔“

یعنی نے مولانا کے سامنے آکر زمین پر گھٹنے ٹیک دیے۔ ایک دم روئے سکتے تھے۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولے۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

عرفان نے کہا۔ ”مولانا صاحب! یہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ میں بھی اس کی اعتقاد شراعت میں شریک رہا ہوں۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”اب ہماری یہی کوشش ہوگی کہ آپ کے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو کسی طرح مٹا دیں۔“

عرفان نے کہا۔ ”ہم جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی نکاح پڑھوانے آپ کے پاس آئیں گے۔“

یعنی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عرفان کے ساتھ جاتے ہوئے پھیر میں سے گزرتے ہوئے بولی۔ ”آج سے بن بیاہی عرفان کے گھر میں رہوں گی جو بدنام کرنا چاہے کرے۔ میرے اور عرفان کے درمیان شرافت اور حیا کی ضمانت صرف ایک کتاب ہوگی۔ آخری آسمانی کتاب۔“

عرفان نے کہا۔ ”بے شک۔ اللہ تعالیٰ ہی عزت دیتا ہے اور وہی ذلت دیتا ہے۔ یا اللہ! ہمیں خیر کثیر عطا فرما۔“

مولانا فضل کریم امام صاحب قادر جان اور سلیمان نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ”آمین۔“

وہاں کوئی عدالت قائم نہیں کی گئی تھی۔ نہ بھنے کی چٹائیت کھیتی کے کھیر آئے تھے۔ صرف آس پاس کی گلیوں کے مردوں اور عورتوں نے ان کا محاسبہ کیا تھا۔ وہ لوگ مولانا اور

یعنی برصغیر تھیں۔ ان کے خلاف یوں کہتے تھے مگر ان کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں سناسکتے تھے۔

وہ سب یہ کہہ کر چلے گئے کہ چٹائیت کھیتی میں فیصلہ کرایا جائے گا اور انہیں اس محاسبے سے نکال دیا جائے گا۔

ایٹلا اور عظیم کے معاملے میں بھی یہی کہا گیا تھا کہ باقاعدہ چٹائیت میں انہیں سزا سنائی جائے گی لیکن وہ یعنی اس وقت فیصلہ سنائی جب مقدمے کا دوسرا فریق عظیم حاضر ہوتا۔

اور وہ بھی حاضر ہونے والا نہیں تھا۔ دروازے سے بیٹے کو وہاں سے بھاگ دیا تھا۔ ہاں بیٹے نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ اس علاقے میں نہیں رہیں گے۔ وہ اپنا مکان بچ کر پندرہ اکھ

روپے حاصل کر سکتے تھے پھر مطلق ہونے پر دروازہ کو دو لاکھ روپے مل گئے تھے۔ اس طرح وہ کسی دوسرے علاقے میں مکان خرید کر رہائش اختیار کر سکتے تھے۔

وہ ماں بیٹا مطمئن تھے۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے انتقام لیا تھا۔ ایٹلا تمام عمر آبرو باختہ بھلانے والی تھی۔ اگرچہ دروازہ کی بیٹی یعنی کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا لیکن وہ ایسی ذہین اور پتھر دل تھی کہ ایٹلا کو بدکار ثابت کرنے کے بعد اپنے بیان سے پھرنے والی نہیں تھی۔

تمام لوگ جا چکے تھے۔ مولانا کے گھر میں چیش امام قادر جان سلیمان اور معزز تعلیم یافتہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ ”ہمارے محلے میں جاہل افراد زیادہ ہیں۔ انہیں جس سمت بہکایا جاتا ہے وہ اسی سمت چل پڑتے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہم دو دو چار چار افراد سے تنہائی میں مل کر انہیں پیار سے سمجھاتے رہیں گے تو وہ سمجھ جائیں گے۔ جاہلانہ انداز میں مولانا صاحب کی مخالفت نہیں کریں گے۔“

مولانا نے کہا۔ ”ہم اپنے رسول کے نقش قدم پر چلیں گے۔ وہ تافرانوں سے بحث نہیں کرتے تھے۔ دین اسلام کے خلاف مشتعل ہونے والوں سے نرم لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ کلام پاک کے مطابق ہدایات فرماتے تھے۔ ان ہدایات پر کوئی عمل کرے یا نہ کرے۔ وہ لوگوں کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔“

اور وہ بھی ابھی یوں بھی ہو جاتے تھے۔ مخالفین ان کی ہدایات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ جب وہ واپس ہوتے تھے تب ان پر وحی نازل ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا ہم نے آپ کو ہادی بنایا۔ آپ کا کام ہدایات دینا ہے۔ باقی ہم جانتے ہیں کہ کسے راہ راست پر لے جانا ہے اور کس گمراہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا ہے۔“

وہ ذرا غمگین ہوئے۔ ”ہم بھی بچ بولیں گے اور باقی نتائج اللہ پر چھوڑ دیں گے۔“

دوسرے دن علاقے کا چیز میں اور چٹائیت کھیتی کے بزرگ ان کے پاس آئے۔ ان سب وقتاً فوقتاً کاظم ہو چکا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا۔ ”مولانا صاحب! آپ کے خلاف غصوں ثبوت ہیں۔ یعنی آپ کے گھر سے برآمد ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم آپ کے کردار پر شرم نہیں کر رہے ہیں۔ تاہم لوگوں کو آپ کی حمایت میں سمجھانا نا ممکن ہے۔“

چیز میں نے کہا۔ ”اس کے باوجود ہم نادانوں کو سمجھائیں گے کہ محسوس ثبوت کے باوجود آپ پاک اور بے

داع ہیں۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کفار مکہ حضور کو صادق اور امین کہتے تھے لیکن سچا ماننے کے باوجود یہ نہیں مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود ہے اور حضرت محمد اس کے رسول ہیں۔“

پنچائیت کھیتی کے ایک بزرگ نے کہا۔ ”بے شک۔ ہم قیامت سوچ رکھنے والوں کو پیار و محبت سے سمجھاتے رہیں گے۔ اس طرح جلد ہی آپ کی حمایت میں بولنے والوں کا اضافہ ہو جائے گا پھر مخالفین اپنا سامنے لے کر رہ جائیں گے۔“

مولانا سے محبت کرنے اور ان سے عقیدت رکھنے والوں نے ایک مہم شروع کی۔ وہ لوگ ایک ایک دو دو آدمیوں سے تنہائی میں باتیں کرتے تھے۔ گھروں میں جا کر عورتوں کو بھی سمجھاتے تھے۔ ان سے کہتے تھے کہ دروازہ کی چال بازی رفتہ رفتہ سمجھ میں آ رہی ہے۔ اس نے بچے کو پنچائیت کھیتی سے دور کر دیا ہے۔ وہ بھی گناہ گار تھا۔ ہاں نہیں چاہتی! اسے سزا سنائی جائے۔ یادو گناہ گاروں کو رشتہ ازدواج میں خشک کرنے کا حکم دیا جائے۔

وہ کسی حال میں ایٹلا کو بھونٹنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی اپنی بی بی کسی دوسرے علاقے میں رہنے کے لیے عرفان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ دروازہ نے بی بی کو بھی بیٹے کی طرح پنچائیت کھیتی سے دور کر دیا ہے۔

دو دنوں کے اندر ہی مولانا کے درجنوں حمایتی ان کے دروازے پر آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”مولانا صاحب! آپ مسجد میں تشریف لے چلیں۔ ہم مخالفت کرنے والوں سے نمٹ لیں گے۔“

انہوں نے کہا۔ ”مخالفین کو چیلنج نہ کرو۔ خواہ مخواہ لڑائی جھگڑے ہوں گے خون خرابہ ہوگا۔“

ایک شخص نے کہا۔ ”ہم کسی سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ مسجد کھیتی اور پنچائیت کھیتی کے تمام ارکان مسجد میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلیں۔“

ایک اور شخص نے کہا۔ ”ہم میں سے کسی افراد صرف جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں۔ آج آپ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھیں گے۔“

ایک بزرگ نے کہا۔ ”میری اتنی عمر گزر گئی ہے۔ میں نے باقاعدہ نماز نہیں پڑھی۔ آپ چلیں گے تو میں پانچویں وقت کی نماز پڑھنے مسجد میں آیا کروں گا۔“

پہلے ہی مولانا اٹھتے ہوئے بولے۔ ”سبحان اللہ! نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں سر کے بل جاؤں گا۔“

وہ اپنے حمایتیوں کے ساتھ مسجد کے دروازے پر آئے تو چیش امام صاحب نے اور مسجد کھیتی کے ارکان نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ جن مخالفین نے کہا تھا کہ مولانا مسجد میں نہیں آئیں گے خدا کی قدرت سے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ نماز ادا کی۔

اس روز نمازیوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ مولانا خوشی سے رو پڑے۔ بے شک۔ اللہ نماز پڑھنے اور صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کو عزت دیتا ہے۔

امام صاحب نے نماز کے بعد کہا۔ ”الحمد للہ... آج مسجد بھری بھری سی لگ رہی ہے۔ مولانا صاحب! آپ کے طفیل نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور اسی حساب سے آپ کے حمایتیوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔“

مسجد کھیتی کے صدر نے کہا۔ ”اور بہت سے حمایتی ایسے ہیں جو بیماری اور دیگر مصروفیات کے باعث یہاں نہ آ سکتے لیکن وہ اپنے دفتروں، گلوں اور کارخانوں میں نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ کی قدر و منزلت میں اضافے کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔“

مولانا وہاں سے اٹھ کر مسجد کے ایک حصے میں جا کر سجدہ شکر ادا کرنے لگے۔ یہ بات پورے علاقے میں پھیل گئی کہ ان کی ٹیک نامی بحال ہو رہی ہے۔ حمایتیوں کی تعداد ابھی خاصی ہو چکی ہے۔ مخالفین کے متعلق کہا جا رہا تھا کہ وہ کم سے کم ہو گئے ہیں۔ اور وہ ایسے افراد ہیں جو فطرانہ خدا واسطے کا حیرت کھتے ہیں۔

مولانا نماز کے بعد گھر نہیں گئے۔ مغرب کی نماز تک عبادت میں مصروف رہے۔ قادر جان ڈیوٹی سے واپس آ گیا تھا۔ یہ سن کر اور دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ مولانا نماز پڑھنے مسجد میں آئے ہیں اور اپنے ساتھ خاصی تعداد میں نمازیوں کو لائے ہیں۔

وہ مغرب کی نماز کے بعد ان کے ساتھ گھر کی طرف جانے لگا۔ ایک گلی سے گزرتے وقت عورتوں اور مردوں نے آس پاس کے گھروں سے نکل کر انہیں سلام کیا۔ وہ سب کو سلام کا جواب دیتے ہوئے گزر رہے تھے۔

قادر جان نے کہا۔ ”کل آپ میرے ساتھ پرچوں کی دکان تک گئے تھے لیکن کسی نے آپ کو سلام نہیں کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے یہ لوگ اب پہلے کی طرح آپ کی عزت کرنے لگے ہیں۔“

وہ بولے۔ ”میں برسوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہوں تو کبھی کم ہے۔ بے شک۔ اللہ تعالیٰ مستحقین کو عزت دیتا ہے۔“

وہ اس گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں آئے۔ ایتلا نے سنا تھا کہ مولانا فضل کریم کی نیک نامی بحال ہوگئی ہے اور وہ مسجد میں ہیں تب سے وہ ان کی منتظر تھی۔ بار بار کھڑکی کے پاس آ کر دیکھتی تھی پھر وہ قادر جان کے ساتھ نظر آئے۔ کھڑکی کے پاس سے گزرنے لگے تو وہ بولی۔ ”مولانا صاحب! اسلام علیکم“

اس نے کھڑکی سے پہلی بار سلام کیا تھا۔ وہ رک کر بولے۔ ”علیکم اسلام۔“

”آپ کو مبارک ہو۔ نیک نامی بحال ہوگئی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”خدا کا لکھا لکھا شکر ہے۔“

”آپ میری طرح محسوسات کے ساتھ پکڑے گئے تھے پھر بھی آپ کے ساتھ مجوزہ ہو گیا۔ میرے ساتھ کب ہوگا؟“

یہ بڑا چونکا دینے والا سوال تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”آپ کے حق میں اس لیے فیصلہ ہوا کہ آپ عابد و زاہد ہیں۔ خدا جانتا ہے اور محلے کی سب ہی عورتیں جانتی ہیں۔ میں بھی پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ میری ذات سے بھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ میرے سر سے بھی آجکل نہیں دوھکتا۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”میں آپ کی طرح عالم فاضل نہیں ہوں لیکن تمام دینی احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں پھر مجھے ایک سچی اور دیندار لڑکی کیون تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے؟ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ خدا سے پوچھ کر بتائیں میرے ساتھ کب یہ مجوزہ ہوگا؟“

وہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہے تھے اور اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں خدا پر بھروسہ ہے؟“

”خدا شائد ہے میں اس پروردگار کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتی۔“

”تو پھر صبر کرو۔ تمہارے ساتھ بھی بہت جلد مجوزہ ہوگا۔“ یہ کہتے ہی وہ قادر جان کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ بولا۔ ”آج مجھے اس لڑکی پر غصہ نہیں آ رہا ہے ترس آ رہا ہے۔“

”ہاں۔ میں بھی سوچ رہا ہوں اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔“

”میں تو کیا پورا علاقہ جانتا ہے، فقیر جھوٹا فریبی، ہذا حرام اور نشے کا عادی ہے پھر ہم لوگوں نے اس جھوٹے حرام خور کی بات کیوں مان لی؟ ایلا کی بات کیوں نہیں مانی کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے؟“

”یہ بحث فضول ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ بات اہم ہے کہ کسی بھی طرح اس کی نیک نامی بحال کی جائے۔“ انہوں نے دوسری صبح نماز کے بعد پیش امام سے اور دوسرے تمام نمازیوں سے کہا۔ ”آپ حضرات کی محبتوں سے اور کوششوں سے میری نیک نامی مجھے واپس ملی ہے۔ میرے ساتھ انصاف ہوا لیکن پابری سلیمان کی صاحبزادی کے ساتھ تا انصافی ہو رہی ہے۔“

سلیمان پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔ اس وقت بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مولانا سے کہا۔ ”آپ پر خدا کی رحمت ہو۔“

وہ بولے۔ ”جو الزام مجھ پر لگا یا گیا تھا مجھ سے پہلے ویسا ہی الزام ایلا پر لگ چکا تھا۔ اگر میں سچا اور دین دار ہوں تو وہ بھی سچی اور پانچ وقت کی نمازی ہے۔ اس کے برعکس فقیر جھوٹا فریبی اور نشے باز ہے۔ ایک سچی لڑکی کہتی ہے کہ وہ بے دارغ ہے۔ وہ جھوٹا کہتا ہے کہ گناہ گار ہے۔ ہم سب جھوٹے کی بات کیوں مان رہے ہیں؟“ تمام نمازی قائل ہو کر ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”آپ درست فرماتے ہیں۔ ہم اس کی پارسائی تسلیم کر لیں گے لیکن سب لوگ نہیں مانیں گے۔“

مولانا نے کہا۔ ”لوگ کیا ہوتے ہیں؟ ہم سب مل کر ہی لوگ کہلاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے اب ہمارے علاقے میں حق بات کو سمجھنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہم سب مل کر اس کی حیا اور پارسائی کو تسلیم کریں گے تو اعتراض کرنے والے بھی رفتہ رفتہ مان جائیں گے۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”بے شک۔ ہم نے مولانا صاحب کے سلسلے میں کوششیں کیں اور کامیاب رہے۔ خدا سلیمان کی صاحبزادی سے راضی ہوگا تو اسے بھی ضرور عزت ملے گی۔“

مولانا نے کہا۔ ”قادر جان! تمہیں جو سمجھنا ہے وہ کرو۔ سلیمان کے ساتھ اس کے گھر جاؤ۔ ہم بھی وہاں آ رہے ہیں۔“ سلیمان خوشی سے پھوٹا نہیں سہ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ نے فرمایا تھا نماز قائم کرو اور یاد رکھو نماز پڑھتی ہی مجوزہ نہیں ہوگا۔ بھی برسوں کے بعد عبادت کا صلہ ملتا ہے اور کبھی پلک جھپکتے ہی وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔“

وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔ ”بے شک۔ اللہ قادر مطلق ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے پلک جھپکتے ہی میرے منہ کی کانگ نکل رہی ہے۔ اب یہ منہ ہمیشہ مسجد کے فرش پر جھکتا رہے گا۔“ کئی نمازیوں نے کہا۔ ”سبحان اللہ!۔۔۔!“

وہ قادر جان کے ساتھ مسجد سے باہر آیا پھر گھر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ میں منجھل منجھل چل رہا ہوں۔ میری گھروالی کے منہوں میں تکلیف ہے لیکن وہ سننے کی تو خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو جائے گی۔ اب میری ایلا کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔ میری بیٹیوں کی ڈولیاں اٹھیں گی۔“ وہ بولتا جا رہا تھا اور مسرتوں کے جھوم میں ڈوگتا جا رہا تھا۔ عرفان ہائیک پر ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔ ”قادر بھائی! مولانا صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ کیا مسجد میں ہوں گے؟“

”ہاں۔ وہ مسجد میں ہیں۔ کیا بات ہے؟ اتنی صبح ان سے ملنے آئے ہو؟“

”مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ لوگ پھر سے ان کی عزت کرنے لگے ہیں۔ میں انہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔ اب تو میں اور بیٹی رشتہ مازدواج میں منسلک ہو سکیں گے۔“ ”بے شک۔ مولانا صاحب تمہارا نکاح پڑھائیں گے۔ مسجد میں جاؤ۔ ان سے ملاقات کرو۔“

وہ مسجد کی طرف چلا گیا۔ سلیمان نے گھر پہنچ کر قادر جان کے لیے بیٹھک کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”رضیہ بیگم! کہاں ہو؟ میں تو خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔ میری ایلا کو پھر سے نیک نامی مل رہی ہے۔ ابھی مسجد میں یہ فیصلہ ہوا ہے۔ مولانا صاحب اور پیش امام صاحب یہاں آ رہے ہیں۔“

یہ ایسی خوش خبری تھی کہ وہ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ ایلا کہہ رہی تھی۔ ”میں نے مولانا صاحب سے پوچھا تھا ان کے ساتھ مجوزہ ہوا ہے۔ میرے ساتھ کب ہوگا؟ انہوں نے ہدایت کی تھی کہ میں صبر کروں۔ میرے ساتھ بھی مجوزہ ہوگا۔ اور اب ایلا ہی ہو رہا ہے۔“

وہ ٹھہر کر بولی۔ ”خدا! میں ساری عمر تیرا شکر ادا کرتی رہوں! تب بھی شکر یہ ادا نہیں کر سکیں گی۔ میری عمر چھوٹی پڑ جائے گی۔“

قادر جان بیٹھک میں تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ”یہ وی لڑکی ہے جو روزِ جمع مولانا صاحب کو طعنے دیتی تھی۔ آئندہ دل سے ان کی عزت کرے گی۔“ آدھا کھٹنا گڑ گیا۔ سلیمان نے قادر جان سے پوچھا۔

”مون! صاحب اور امام صاحب ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“ ”گناہ ہے مسجد کے کسی معاملے میں الجھ گئے ہیں؟“ وہ ان کے انتظار میں بیٹھک سے باہر آ گیا۔ سلیمان بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ باہر آتے ہی ٹھٹھک گیا۔ دروازے

اطوار اقوام

مختلف قوموں اور مختلف ممالک کے اطوار میں کس قدر فرق ہوتا ہے، آئیے دیکھیں۔

☆ برطانیہ اور ہالینڈ میں آستینیں چڑھانے کا مطلب کام کے لیے تیار ہونا ہے، جرمنی میں اس کا مطلب آرام کرنا اور پاکستان میں اس سے مراد لڑائی کے لیے تیاری بھی جاتی ہے۔

☆ امریکا کے دفاتر میں لوگ فون پر بات کرتے ہوئے پاؤں میز پر رکھ لیتے ہیں، جاپان میں اس کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

☆ فرانس کے بعض علاقوں میں آپ کیفے میں اس وقت تک نہیں بیٹھ سکتے جب تک کہ آپ وہاں موجود ہر جاننے والے کے ساتھ ہاتھ نہ ملا لیں۔

☆ افغانستان میں سر راہ ملنے والے لوگ حال احوال پوچھنے میں پانچ منٹ لگاتے ہیں۔

☆ عرب ممالک میں آپ میزبان کے گھر میں چیزوں کو غور سے دیکھیں تو وہ خیال کرے گا کہ آپ کو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔

☆ روس میں میزبان، مہمان کے مشروب کی مقدار اپنے مشروب کی مقدار جتنی رکھتا ہے ورنہ مہمان برا مان جاتا ہے۔

☆ جب آپ ملاقات کے لیے مختلف لوگوں کو

4 بجے کا وقت دیں تو جرمن عین وقت پر پہنچیں گے۔ امریکن 15 منٹ پہلے، برطانوی 15 منٹ تاخیر سے اور اطالوی شاید ایک گھنٹا تاخیر پہنچیں۔

☆ برٹس میٹنگ کے سلسلے میں برطانوی لوگ کاروباری معاملات، کھانے پینے کے دوران میں طے کرتے ہیں۔ جاپانی کھانے کے دوران میں کاروباری گفتگو نہیں کرتے، جرمن کاروباری معاملات، کھانے سے پہلے طے کرتے ہیں۔ فرانسس پہلے کھاتے ہیں بعد میں کاروبار پر بحث کرتے ہیں۔

مرسدہ، تفسیر جس باہر، ادکا زہ

کے سامنے مسجد کے چار نمازی اپنی بیویوں اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

سلیمان نے تعجب سے کہا۔ ”آپ چاروں مسجد میں تھے۔ اتنے لوگوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں اور مجھے آواز بھی نہیں دی؟“

ایک نمازی نے کہا۔ ”ابھی اور نمازی اپنے گھر والوں کے ساتھ آرہے ہیں۔ اس کے بعد ہم تمہیں بلائے والے تھے۔“

اور واقعی وہ سب اپنی عورتوں اور پڑوسیوں کے ساتھ آرہے تھے۔ سلیمان نے حیرانی سے قادر جان کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”دیکھتے جاؤ ابھی کیا تماشا ہونے والا ہے؟“

اس نے دیکھا، مولانا صاحب، پیش امام صاحب اور علاقے کا چیئر مین پنچایت کمیٹی کے ممبران کے ساتھ ادھر آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری گلی عورتوں اور مردوں سے بھر گئی۔ ایسی بھیڑ دیکھ کر محلے کے تمام لوگ گھروں سے نکل آئے۔ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

علاقے کے چیئر مین نے بلند آواز میں کہا۔ ”سلیمان!

ہم نے سوچ سمجھ کر یہ بھیڑ لگائی ہے۔ یہاں مولانا صاحب کے سیکڑوں حمایتی ہیں۔ ہم انیلا کی حمایت میں بولیں گے تو سب کی آواز گونجنے لگی، دور تک کانوں میں جائے گی۔“

مولانا نے کہا ”اور ہم بول رہے ہیں۔ دردانہ جھوٹی اور مکار ہے۔“

تمام حمایتیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”دردانہ جھوٹی اور مکار ہے۔“

”انیلا سچی بے داغ اور پارسا ہے۔“

سب نے کہا۔ ”انیلا سچی بے داغ اور پارسا ہے۔“

انیلا کھڑکی کے پیچھے خوشی سے رو پڑی۔ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بے شک۔ خدا ہی عزت دیتا ہے اور وہی عزت دیتا ہے۔ مجھے اس کے کرم سے عزت اور نیک نامی مل رہی ہے۔ اے اللہ! تیرا شکر ہے۔“

رضیہ بیگم اور دوسری بیٹیاں بھی خوشی سے رو رہی تھیں۔ گھر کے سامنے ایک دو تھیں، بے شمار لوگ انیلا کی پارسائی کا اعتراف کر رہے تھے۔

امام صاحب نے کہا۔ ”ہم سب نماز پڑھ کر آئے ہیں۔ وضو سے دھلی ہوئی زبان سے انیلا کو با حیا اور بے گناہ کہہ رہے ہیں۔ خدا دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ انیلا کو عزت اور نیک نامی دے رہا ہے۔ ہم حق تعالیٰ سے گزارش کریں گے کہ وہ خدا کی رضا کے آگے سر جھکا لیں۔“

قادر جان نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”سب سے اہم بات کہنے کا اعزاز مجھے حاصل ہو رہا ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم نے انیلا کی پارسائی تسلیم کی ہے لیکن صرف تسلیم کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ وہ سہا کن بنے گی، ایک مجازی خدا کے سامنے میں جائے گی تو سلیمان کی دوسری بیٹیوں کے رشتے بھی اچھے گھرانوں سے آسکیں گے۔“

ایک نمازی نے کہا ”لہذا ہم انیلا کا رشتہ مانگتے آئے ہیں۔“ دوسری خاتون نے کہا۔ ”ہم بھی اسی لیے آئے ہیں۔“ پھر تو کتنی ہی عورتیں اور مرد اس کا رشتہ مانگنے لگے۔

امام صاحب نے ہاتھ اٹھا کر ان سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر کہا۔ ”سلیمان! رشتہ مانگنے والے بے شمار ہیں مگر تمہاری صاحبزادی کا طلبہ گرا ایک ہی ہے۔ یہ سب لوگ مولانا صاحب کے لیے انیلا کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ تمہارے در پر سوالی بن کر آئے ہیں۔“

قریظہ مسرت سے سلیمان کے گھٹنے کا پٹنے لگے۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ گرنے کے انداز میں زمین پر بیٹھ گیا۔ دو افراد نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”یا خدا! تو میری اوقات سے بڑھ کر مجھے دے رہا ہے۔ مجھ سے خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔“

گھر کے اندر یہی حال رضیہ بیگم کا تھا۔ وہ چکر اکر بیٹھ گئی تھی۔ چھوٹی بیٹیاں خوشی کے مارے رو رہی تھیں۔

اور انیلا پرتو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ذات کی پستیوں میں گرنے کے بعد عزت کی ایسی بلندی ملے گی۔

وہ دعائیں مانگتی تھی کہ شوہر کے نام پر کوئی بھی آئے اور اس کے سر پر حیا کا آئینہ رکھے۔ اسے وہاں سے دور لے جائے۔

کیا خدا کی شان ہے کہ اُس نے ایک چلُو مانگا اور اسے سمندر مل رہا تھا۔ وہ ایک بے حد خور و اور عالم فاضل شخص کی شریک حیات بننے والی تھی۔

وہ ایک دم سے کھڑے کھڑے سجدے میں گر پڑی۔ یہ مرد سے زیادہ عورت کا مسئلہ ہے کہ پارسائی کیسے قائم رکھے اور مرد ہی اسے اپنی پناہ میں لے کر یہ مسئلہ حل کرتا ہے۔

کوئی انیلا سے پوچھے وہ کس طرح کانٹوں کے بستر پر کروٹ کروٹ لہو لہان ہوتی رہی تھی؟ لیکن کوئی بات نہیں۔

ال دُعا ہے تو بخشنے سے مراد وجدان کی آنکھ اب شگفتہ تھا کہ شہنشاہ کے دکانے سے انجا

